مفکر اسلام، شیخ طریقت، سلطان القلم

علامہ بدر القادری

کے علمی، تحقیقی و تبلیغی و اصلاحی نگارشات کا حسین مجموعہ

مقالات بدر

جمع و ترتیب

محمد ذیشان رضا

قادری امجدی

SABIYA VIRTUAL PUBLICATION

AMO
ABDE MUSTAFA OFFICIAL

مفکر اسلام، شیخ طریقت، سلطان القلم

علامہ بدر القادری

کے علمی، تحقیقی و تبلیغی و اصلاحی نگارشات کا حسین مجموعہ

مقالات بدر

جمع و ترتیب

محمد ذیشان رضا

قادری امجدی

SABIYA VIRTUAL PUBLICATION

AMO
ABDE MUSTAFA OFFICIAL

تفصیلی فہرست

ناشر کی طرف سے کچھ اہم باتیں

مختلف ممالک سے کئی لکھنے والے ہمیں اپنا سرمایہ ارسال فرمارہے ہیں جنھیں ہم شائع کر رہے ہیں۔ ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری شائع کردہ کتابوں کے مندرجات کی ذمہ داری ہم اس حد تک لیتے ہیں کہ یہ سب اہل سنت و جماعت سے ہے اور یہ ظاہر بھی ہے کہ ہر لکھاری کا تعلق اہل سنت سے ہے۔ دوسری جانب اکابرین اہل سنت کی جو کتابیں شائع کی جارہی ہیں تو ان کے متعلق کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں۔ پھر بات آتی ہے لفظی اور املائی غلطیوں کی تو جو کتابیں "ٹیم عبد مصطفی آفیشل" کی پیشکش ہوتی ہیں ان کے لیے ہم ذمہ دار ہیں اور وہ کتابیں جو ہمیں مختلف ذرائع سے موصول ہوتی ہیں، ان میں اس طرح کی غلطیوں کے حوالے سے ہم بری ہیں کہ وہاں ہم ہر ہر لفظ کی چھان پھٹک نہیں کرتے اور ہمارا کردار بس ایک ناشر کا ہوتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کئی کتابوں میں ایسی باتیں بھی ہوں کہ جن سے ہم اتفاق نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر کسی کتاب میں کوئی ایسی روایت بھی ہو سکتی ہے کہ تحقیق سے جس کا جھوٹا ہونا اب ثابت ہو چکا ہے لیکن اسے لکھنے والے نے عدم توجہ کی بنا پر نقل کر دیا یا کسی اور وجہ سے وہ کتاب میں آگئی جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں کہ کئی وجوہات کی بنا پر ایسا ہوتا ہے۔ تو جیسا ہم نے عرض کیا کہ اگرچہ ہم اسے شائع کرتے ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم اس سے اتفاق بھی کرتے ہیں۔

ایک مثال اور ہم اہل سنت کے مابین اختلافی مسائل کی پیش کرنا چاہتے ہیں کہ کئی مسائل ایسے ہیں جن میں علماے اہل سنت کا اختلاف ہے اور کسی ایک عمل کو کوئی حرام کہتا ہے تو دوسرا اس کے جواز کا قائل ہے۔ ایسے میں جب ہم ایک ناشر کا کردار ادا کر رہے ہیں تو دونوں کی کتابوں کو شائع کرنا ہمارا کام ہے لیکن ہمارا موقف کیا ہے، یہ ایک الگ بات ہے۔ ہم فریقین کی کتابوں کو اس بنیاد پر شائع کر سکتے ہیں کہ دونوں اہل سنت سے ہیں اور یہ اختلافات فروعی ہیں۔ اسی طرح ہم نے لفظی اور املائی غلطیوں کا ذکر کیا تھا جس میں تھوڑی تفصیل یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ کئی الفاظ ایسے ہیں کہ جن کے تلفظ اور املا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اب یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت بنے گی کہ ہم اگرچہ کسی ایک طریقے کی صحت کے قائل ہوں لیکن اس کے خلاف بھی ہماری اشاعت میں موجود ہوگا۔ اس فرق کو بیان کرنا ضروری تھا تاکہ قارئین میں سے کسی کو شبہ نہ رہے۔

ٹیم عبد مصطفی آفیشل کی علمی، تحقیقی اور اصلاحی کتابیں اور رسالے کئی مراحل سے گزرنے کے بعد شائع ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں بھی ایسی غلطیوں کا پایا جانا ممکن ہے لہذا اگر آپ انھیں پائیں تو ہمیں ضرور بتائیں تاکہ اس کی تصحیح کی جاسکے۔

SABIYA VIRTUAL PUBLICATION

POWERED BY
ABDE MUSTAFA OFFICIAL

تاثرات ودعائیہ کلمات

علمائے کرام ومشائخ عظام

شہزادہ صدر الشریعہ حضرت

علامہ مولانا **فداء المصطفیٰ قادری** مدظلہ العالی

شیخ الحدیث مدرسہ رضویہ بدر العلوم گھوسی

حضرت علامہ بدر القادری علیہ الرحمۃ والرضوان کی زندگی کا مقصد علم دین کی ترویج و اشاعت تھا۔ اسی لیے انھوں نے قصبہ گھوسی خاص میں ایک دار العلوم "بدر العلوم" کے نام سے قائم کیا، جس میں میں نے بھی ان کے اصرار پر درس و تدریس کی خدمات انجام دی ہیں۔

بدر العلوم ایک دو منزلہ چھوٹی سی عمارت میں قائم ہوا۔ اس چھوٹے سے مدرسہ کے قیام سے کما حقہ وہ مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے ایک بہت بڑا زمین کا رقبہ بدر العلوم کے لیے وقف کر دیا اور مدرسہ کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا گیا۔ پھر ان کی کوششوں سے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑی عمارت معرضِ وجود میں آگئی، جس میں آج کل تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اب ان کے انتقال کے بعد مدرسہ کے اخراجات ان کے صاحبزادے فراہم کرتے ہیں۔

علامہ بدر القادری مجھ سے بہت احترام کے ساتھ پیش آتے اور میری بڑی عزت کرتے تھے۔ مدرسہ سے متعلق اگر کوئی منصوبہ ہوتا تو مجھ سے ضرور مشورہ لیا کرتے تھے۔ میں نے بدر العلوم کی خدمات کے لیے کسی معاوضہ یا نذرانہ لینے سے بہت منع کیا، لیکن ان کے حکم سے مدرسہ کے ناظم اعلیٰ حافظ ارشد قادری صاحب زبردستی ایک اچھا خاصہ لفافہ میری جیب میں رکھ دیتے تھے۔

علامہ بدر القادری کی ذات علما کی گروہ بندیوں سے بالکل پاک و صاف تھی، وہ ہر ایک عالم سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے اور عزت افزائی بھی فرماتے۔

اللہ تعالیٰ ان کے کارناموں کو قبول فرمائے اور اجر عظیم عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

فداء المصطفیٰ قادری

قادری منزل گھوسی، مئو

۱۲؍ محرم الحرام ۱۴۴۴ھ

مؤرخ اسلام، امیر القلم

حضرت علامہ **ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی** صاحب قبلہ

شیخ الحدیث: مدرسہ اہل سنت شمس العلوم گھوسی

علما و ادبا کی جماعت میں اکثریت ایسے افراد کی ہوتی ہے، جو اپنے بعد اپنی یادگار وآثار علمیہ و ادبیہ دنیا کے لیے نہیں چھوڑ جاتے۔ مگر بعض ایسی مقتدر ہستیاں بھی زمرۂ علما میں موجود ہوتی ہیں، جو اپنے کارناموں کے لحاظ سے تاریخ ساز ہوتی ہیں۔ اور ان کے باقیات، علم وادب کا بیش بہا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ایسی ہی باوقار علمی شخصیتوں میں حضرت علامہ بدرِ عالم بدرالقادری علیہ الرحمہ بھی تھے۔

ان کی علمی و دینی خدمات کا کینوس بہت ہی وسیع تھا۔ ان کا تبلیغی و تصنیفی عہد، نصف صدی سے زیادہ ماہ وسال کا احاطہ کرتا ہے۔

انھوں نے مختلف موضوعات پر عمدہ تصانیف اور فکر انگیز علمی وادبی شہ پارے آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑے۔ شاعری میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کی نعتوں اور منقبتوں میں عشق رسالت اور بزرگوں سے حسن عقیدت کا والہانہ جوش و خروش دل کی دنیا میں تموج پیدا کردیتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ارادت مند جواں سال علما، ان کے مختلف موضوعات پر بکھرے ہوئے مؤقر مضامین ومقالات کا مجموعہ شائع کررہے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اسے قبولِ عام عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

محمد عاصم اعظمی

25/7/2022

ادیب شہیر، حضرت علامہ

مولانا رضوان احمد نوری شریفی

بانی: الجامعۃ البرکاتیہ گھوسی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واھل بیتہ اجمعین

نمونۂ سلف، عالم ربانی، میدانِ لوح وقلم کے شہ سوار حضرت علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ کی شخصیت ملک و بیرونِ ملک میں محتاجِ تعارف نہیں۔ جن کی تعلیم و تربیت، زہد وتقویٰ کے پیکر، بحر علم و عرفاں کے شناور وغواص محدثِ جلیل استاذ العلما، حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کے خاص سایۂ کرم میں ہو، اس کو جیسا ہونا چاہیے، ویسے ہی تھے۔ اشرفیہ کی زندگی میں اکثر وبیشتر حضور حافظ ملت قدس سرہ کے ساتھ جلسوں میں جایا کرتے تھے۔ اچھے خطیب تھے اور فی البدیہ شاعر بھی، اچھے قلم کار اور مضمون نگار بھی۔ اسی بنیاد پر ماہنامہ اشرفیہ کے ایڈیٹر بھی تھے۔ میرے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ شروع ہی سے ہمارے تعلقات اچھے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی مرتبہ ہالینڈ جارہے تھے تو دلی تک مجھے بھی اپنا رفیق سفر بنایا تھا۔ ان سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اشرفیہ کی زندگی بھی دیکھی اور ہالینڈ میں قیام پذیر رہ کر تبلیغ وارشاد کے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، ان سے بھی واقف ہوں۔ بہت ہی بااخلاق، ملنسار۔ غیبت وچغل خوری، نام ونمود اور تکبر سے مجتنب۔ بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت۔ غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی خبرگیری اور ان کی مدد کرنا، آپ کا بہترین مشغلہ تھا۔

حضور حافظ ملت کی تعلیم و تربیت کا اثر علامہ بدرالقادری کی پوری زندگی پر چھایا رہا۔ ان کی ذات، فکر ونظر، علم وعمل، فہم وفراست، فضل و کمال، حسن وجمال اور وقار ومتانت کا ایک ایسا حسین سنگم ہے، جہاں سے وعظ وخطابت، تبلیغ وارشاد کے چشمہ سے تیز دھارے اُبلتے ہیں۔ جس کا شیریں اور شفاف پانی دلوں کی بادِ سموم سے جھلسی ہوئی کھیتیوں کو سبزہ زار اور مرغ زار بنادیتا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں، بلکہ حقیقت بیانی ہے۔ جس کی تصدیق آپ کی گراں قدر کتاب ''بزمِ اولیا'' سے۔ جو امام عبداللہ بن اسعد یمنی یافعی قدس سرہ (۶۷۸ھ/۷۶۸ھ) کی مستند و معتبر کتاب ''روض الریاحین فی حکایات الصالحین'' کا اردو ترجمہ ہے۔ جس کے مطالعہ سے روح میں بالیدگی، ایمان میں افزونی وتازگی، تاریک دلوں میں روشنی اور مرجھائی ہوئی کلیوں میں شگفتگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ کی فی البدیہہ شاعری کا جوہر بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

امام یافعی علیہ الرحمہ نے جہاں جہاں الا ما شاء اللہ عربی اشعار کا ذکر کیا ہے، آپ نے ان کو، شاعر کی مافی الضمیر کو ادا کرتے ہوئے، اردو شاعری کا جامہ پہنایا ہے۔ جس میں فصاحت وبلاغت کی فراوانی، عشق ومحبت کی جولانی، دریا کی روانی اور سمندر کی طغیانی، تخیلات کی رفعت،

الفاظ کی شوکت، تشبیہ کی ندرت، بیان کی لطافت، زبان کی چاشنی اور بندش کی چستی، اشعار کے سانچوں میں ڈھل کر آگئی ہے۔

شروع ہی سے تحریر کی جانب میلان زیادہ تھا۔ اور آپ کے وقیع مضامین ومقالات، اشرفیہ اور دیگر ماہناموں میں شائع ہوتے رہے۔ آپ نے مختلف پہلو پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ آپ کی تحریرات سے متعلق جو پہلی جلد منظر عام پر آرہی ہے، آپ کی تصنیفات و تالیفات کے علاوہ صرف مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کی فہرست سے معلوم ہوا کہ سیرت سے متعلق ۹، تذکرہ سے ۲۳، اسلامیات سے ۲۶، کربلا سے ۴، تاریخ سے ۱۱، شخصیات سے متعلق ۹/ مضامین ہیں۔ اس طرح مضامین و مقالات کی کل تعداد ۸۲/ ہے۔ اور ان کے علاوہ نثر و نظم میں ۲۹/ انتیس کتابیں ہیں، جو علامہ موصوف کی قلبی طہارت اور علمی لیاقت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس طرح علامہ نے تحریری طور پر بھی تبلیغ و ارشاد کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دے کر قوم وملت کے لیے عظیم ذخیرہ چھوڑا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی خدماتِ جلیلہ ہیں، مثلاً اپنے وطن مالوف میں قوم مسلم کے لیے وسیع و عریض زمین میں ”بدرالعلوم“ کی عالی شان عمارت اور دینی درس گاہ، آپ کا عظیم کارنامہ ہے۔ اور المجمع الاسلامی مبارک پور کے عروج و ارتقا میں بھی آپ کا ایک خاص رول ہے۔

دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقہ وطفیل میں موصوف کی خدمات کو قبول فرمائے۔ اور آپ کی قبر پر رحمت وغفران کی بارش نازل فرمائے۔ آمین

بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ واھل بیتہ اجمعین

خاک پائے ساداتِ کرام واولیائے عظام

رضوان احمد نوری شریفی

خادم الجامعۃ البرکاتیہ گھوسی

۳/محرم ۱۴۴۴ھ/۲/اگست ۲۰۲۲ء

ادیب شہیر

حضرت **مولانا فروغ احمد اعظمی** صاحب قبلہ

سابق صدرالمدرسین دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی، بستی

گھوسی کے مشاہیر میں علامہ بدرالقادری مصباحی علیہ الرحمہ کی شخصیت بہت نمایاں اور اہم ہے، بلکہ بعض ذاتی خوبیوں اور دینی وعلمی خدمات کے حوالے سے امتیازی شان رکھتی ہے۔

وہ ایک اچھے انسان، سچے مسلمان اور صاحب کردار و عمل بندۂ رحمن تھے۔ تواضع و انکساری، صلہ رحمی، اپنوں کی خبر گیری اور حاجت روائی، خوش خلقی، شیرینی گفتار، فرض شناسی، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت و خورد نوازی، وقت کی قدردانی، عشق رسول، عقیدتِ اولیا ان کے ذاتی خاص اوصاف ہیں۔

پھر علمی وادبی اوصاف وکمالات اور گوناگوں دینی خدمات، فضل الٰہی سے ان کی خصوصی توفیقات وفتوحات ہیں، جو کم ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔

وہ ایک مخلص عالمی مبلغ بھی تھے، جن کے ہاتھوں پر سیکڑوں انسانوں نے ایمان کی دولت پائی اور بے شمار لوگوں نے توبہ کرکے مومنانہ زندگی اختیار کی۔

وہ حافظ ملت کے پروردہ تھے، ان سے بہت کچھ علمی وروحانی فیض پایا تھا۔ وہ حافظ ملت کی دعائوں کا مظہر تھے۔

وہ زبان و قلم کے دھنی، فطری شاعر اور صاحب طرز ادیب ونثر نگار تھے۔ بچپن ہی سے شاعری شروع کردی۔ ۱۹۶۹ء میں جب کہ وہ اشرفیہ مبارک پور میں طالب علم تھے، آپ کا ایک مختصر منظوم مجموعہ ”اشک خوں“ شائع ہوا۔ آپ نے علامہ اقبال کے رنگ میں پُر جوش، انقلابی شاعری کو آگے بڑھایا۔ آپ انتہائی زود گو، مگر پُر گو شاعر ہیں۔

نثر سلجھی ہوئی اور شیریں لکھتے ہیں۔ نثر میں جمالیاتی رنگ صاف دکھتا ہے، مگر مفہوم کی ترسیل میں جمالیاتی اسلوب حائل نہیں ہوتا۔

ان کی نثری خدمات بھی، شعری خدمات کی طرح اہم اور قابل قدر ہیں۔ کئی سال تک ماہنامہ اشرفیہ کی ادارت کی اور درجنوں کتابیں لکھیں۔

ان کی نثر میں خطابی رنگ، شکوہِ الفاظ، زورِ بیانی استدلال، طنز کی نشتریت اور جمالیاتی اسلوب کے جلوے قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ ان کے بکھرے نثر پاروں اور مطبوعہ وغیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو ان کے عزیز مولانا ذیشان سلمہ نے محنت سے جمع کرکے کتابی شکل میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

عزیز موصوف لائقِ ستائش ہیں، علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ کے اخلاف میں آپ کو یہ سعادت ملی ہے۔ خدا کرے عزیز موصوف حضرت بدر کے مزید علمی وقلمی آثار کو تلاش کر منظر عام پر لاتے رہیں اور ان کے سچے علمی جانشین ہونے کا ثبوت دیں۔ آمین

مخلص

فروغ احمد اعظمی مصباحی

۱۲/ محرم ۱۴۴۴ھ

تاثر

محمد فروغ القادری

ورلڈ اسلامک مشن انگلینڈ (برطانیہ)

آہ! علامہ بدرالقادری

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد

شاعر مشرق علامہ اقبال کے فکر و فن کے نقیب، حضور حافظ ملت کے تلمیذ رشید، باوقار عالم دین، مغرب و مشرق کی آبرو، اصنافِ سخن پر کمالِ عبور رکھنے والے مایۂ ناز شاعر وادیب، حضرت علامہ بدرالقادری مصباحی (خلیفۂ حضور مفتی اعظم ہند) یہاں ہالینڈ میں ایک طویل علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی

تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی

علامہ بدرالقادری رحمۃ اللہ علیہ اپنے فن میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا جانے والے اربابِ فقر و غیور میں تھے۔ ان کا سراپا زندگی حد درجہ متفوع، علم آشنا، فکر انگیز اور انقلابی تحریکات سے آباد تھی۔ ان کا نثری سرمایہ مغرب میں طلوعِ صبح درخشاں کی نوید ہے۔ ان کا نغمۂ شعر و سخن اپنے قاری کو توہمات اور بے یقینی کے اندھیروں سے نکال کر عزم و یقین کے اجالوں میں کھڑا کرتا ہے۔ وہ دعوت و عزیمت کے شاعر تھے۔ ان کی دور رس نگاہ نے امروز و فردا کے درمیان پائے جانے والے دبیز پردوں کو چاک کر دیا تھا۔ انھیں اس بات کا پیہم یقین تھا کہ ۲۱/ویں صدی مغرب میں اسلام کے غلبے کی صدی ہوگی۔ جو اربابِ بست و کشاد مغرب کے فکری، سیاسی اور اقتصادی طاغوت کے آگے سجدہ ریز ہیں، انھیں بہرکیف لوٹنا ہوگا اس نظامِ کرم کی طرف جو آقائے دوجہاں، تاجدار کائنات، ارواحنا فداہ لے کر جلوہ گر ہوئے تھے۔ جو عالم انسانیت کی فیصلہ کن منزل ہے۔

علامہ بدرالقادری نے اشعار میں فکر اقبال کی عملی تعبیر پیش کی ہے۔ وہ اس بات کے پُرجوش حالی تھے کہ جو عشاقانِ رسول، مجاہدانِ فردا اور مردانِ سحر، دین و سنت کے حقیقی غلبے کے لیے ملکوتی جواہرات سے آراستہ ہوں گے۔ جن کا سودائے عشق رموزِ بے خودی سے آگاہ ہوگا۔ دنیا کی کوئی طاقت انھیں منزلِ مراد کے حصول سے محروم نہیں کر سکتی۔ میرے نزدیک عصر حاضر کے اربابِ قلم میں ''علامہ بدرالقادری'' ایک منفرد لب ولہجہ کے حامل تھے۔ ان کی حیاتِ ارضی اور اقوال و افکار کی تفصیلات بیان کرنے کے لیے ان کے ہی ہم نشینوں میں کسی مزاج آشنا صاحب قلم کی ضرورت ہے۔ دیگر علمی شخصیات کی طرح علامہ بدرالقادری کی دبستانِ فکر و نظر کا بھی ان کی زندگی اور شخصیت سے گہرا ربط وضبط ہے۔ ان کی ایک جامع اور مستند سوانح عمری کی تدوین ہماری جماعت کے اصحابِ لوح و قلم کے لیے فرضِ کفایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اربابِ علم و فضل اور بدر شناس علما اس جانب توجہ کریں گے۔ علامہ بدرالقادری شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال کے رنگ و آہنگ میں اسلامی نشاتِ ثانیہ کے علَم بردار تھے۔ جس کا اثر عکس در عکس ان کی شاعری پر پھیلا ہوا ہے۔ اس حوالے سے خدا مان اردو کے حلقہ بگوش اچھی طرح واقف کار ہیں۔ ان کے دھن کا ہر ترانہ بانگ دراء، ان کی زندگی کا ہر لمحہ پیامِ مشرق، ان کے دل کی ہر آواز زبور عجم اور ان کے تخیلات کی بلند پروازی بالِ جبریل تھا۔ آج وہ عرشِ الٰہی کے سائے میں آسودہ خواب ہیں۔ ربِ قدیر ان کے مرقد انور پر اپنے رحمتوں کے پھول برسائے اور مغفرت دائمی سے نوازے۔ آمین یارب العالمین

مقامِ بندۂ مومن کا ورائے سپہر
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی
نہ تیرہ خاک لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

سوگوار اسیر

محمد فروغ القادری

ورلڈ اسلامک مشن انگلینڈ (برطانیہ)

۲۰ر ستمبر ۲۰۲۱ء

خادم اہل سنت

محمد علی قاضی مصباحی جمالی نوری ایم اے

جنرل سکریٹری: جماعت اہل سنت کرناٹک بنگلور

علامہ بدرالقادری علیہ الرحمۃ والرضوان

ایک بے مثال شخصیت

۱۹۷۳ء میں میرا داخلہ دارالعلوم اشرفیہ میں ہوا، جب تعلیم مبارک پور کے گولہ بازار والی عمارت میں ہوتی تھی اور طلبہ بھی وہیں رہتے تھے۔ شاید سال دو سال میں نئی عمارت کی تعمیر کے بعد شہر سے باہر تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہوا اور طلبہ ہوں کہ اساتذہ، سب کے سب

پیدل اور سائیکل پر سوار ہوکر آیا جایا کرتے تھے۔ مگر جب ہاسٹل کی بلڈنگ بن کر تیار ہوگئی تو پھر باقاعدہ قیام وطعام نئی عمارتوں ہی میں ہونے لگا۔ جہاں آج دارالعلوم اشرفیہ کی پُر شکوہ وعالی شان عمارتیں کھڑی ہیں۔ اس زمانے میں طلبائے اشرفیہ کے درمیان جنوب ہند کے صوبہ میسور (جو آج کرناٹک ہے) سے وارد ہونے والا اولین طالب علم میں ہی تھا۔ مجھ سے قبل موجودہ کرناٹک، آندھرا اور گوا سے کسی نے بھی مادرِ علمی دارالعلوم اشرفیہ میں داخلہ نہیں لیا تھا۔ ہاں قدیم صوبہ میسور کے ایک دو علما کا نام سننے میں آتا ہے کہ وہ ۶۰ء کی دہائی میں یہاں زیر تعلیم رہے یا یہاں سے فراغت حاصل کی ہے، مگر ان دونوں حضرات کی سابقہ دینی تعلیم کسی اور ادارے میں ہوچکی تھی، صرف دو چار سال اشرفیہ میں پڑھ کر انھوں نے یہاں سے درسِ نظامی میں فراغت لی تھی۔

میں اس اعتبار سے واحد منفرد ہوں کہ جس نے اعدادیہ جماعت سے لے کر ختم بخاری تک اشرفیہ میں مکمل درسِ نظامی کی تعلیم پائی اور اول درجہ سے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ میرا داخلہ بانی الجامعۃ الاشرفیہ حضور حافظ ملت علیہم الرحمۃ والرضوان کے حکم پر ہوا۔ حضرت نے خود ہی مجھے قدیم دارالمطالعہ کی لائبریری میں اپنے قریب بیٹھاکر دو تین سوالات فرمائے اور میں نے جواب میں کیا کہا، مجھے تو اب یہ یاد نہیں رہا۔ البتہ اتنا یاد ہے، حافظ ملت علیہم الرحمۃ والرضوان نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ بچہ ذہین ہے اور اس طرح میری سعادت رہی کہ جماعت اعدادیہ میں میرا داخلہ ہوگیا۔ اس زمانے میں ناظم اعلیٰ کا دفتر، مہتمم کا دفتر، محاسب کا دفتر، صدرالمدرسین کا دفتر، ماہنامہ اشرفیہ کا دفتر اور اساتذہ کے کلاسس سب یہیں ہوا کرتے تھے۔ مجھے سب ہی محمد علی میسوری کہہ کر پکارتے تھے اور میں سب کی خدمت میں حاضر رہتا، جس کی وجہ سے سب ہی مجھ سے خوش رہتے تھے اور میری مستعدی اور حاضر باشی اور خاکساری وخدمت گزاری کو سراہتے تھے۔ ماہنامہ اشرفیہ شروع ہوا تو اس کے پہلے ایڈیٹر کی حیثیت سے علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ کا تقرر ہوا۔ علامہ چوں کہ پہلی کرناٹک میں تدریسی خدمات پر چند ماہ کے لیے مامور رہ چکے تھے اور میری ان سے قربت کا یہی اولین سبب بنا۔ علامہ کو میسور سے جذباتی لگاؤ تھا، جس کے ظاہری طور مجھے دو اسباب سمجھ میں آئے۔ پہلا سبب تھا مجاہد آزادی شیر میسور حضرت ٹیپو سلطان شہید رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی محبت اور دوسرا سبب تھا کہ وہ ایک بلند پایہ شاعر و ادیب تھے۔ صوبہ میسور کے مرغ زاروں، سرسبز و شاداب جنگلوں اور خوش گوار و پُر سکون فضائوں سے اس قدر متاثر ومسرور رہتے تھے کہ میسور پر انھوں نے ایک طویل نظم لکھی ہے، جس کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے:

وادیٔ میسور ہے یہ وادیٔ میسور
نشۂ اخلاص میں ہے ہر ہر بشر معمور
شیر میسور کی ہے یہ سرزمیں
فرنگیوں کے آگے جھک نہ سکی جس کی جبیں
جس کے ہر ایک چمن میں کھلتا ہے گلاب
حسن کی دیوی کا پنپتا ہے شباب

الحمد للہ! کہ علامہ قبلہ ہی نے مجھے سرینام کی دعوت پر ہالینڈ بلایا اور خوب جی جان سے مجھ سے محبت کی اور ایک اجنبی ملک میں اسلام و اہل سنت کی خدمت کے لیے مجھے آمادہ کیا۔ وقتاً فوقتاً بذریعۂ فون اور بذریعۂ خط ملک اور لوگوں کے حالات کو سمجھنے اور ان کا مقابلہ کرکے دین

متین کی خدمت کرنے کے لیے سعی بلیغ کرنے کی ہدایت بھی دی۔ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوتے اور انتہائی شائستگی و وقار کے ساتھ بے تکلف ہوجاتے اور خوب خوب دعاؤں کے ساتھ الوداع فرماتے۔ بلا ریب علامہ علیہ الرحمہ بے شمار کسبی و وہبی اخلاق و اوصاف سے مزین تھے۔

رب العالمین حضور رحمۃ للعالمین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے صدقے ان کی مرقد انور پر پُر انوار و غفران کی بارش فرمائے، ان کی امثال جماعت اہل سنت میں پیدا فرمائے اور مخدومۂ مکرمہ اور ان کی اولاد کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

خادم اہل سنت

محمد علی قاضی مصباحی جمالی نوری ایم اے

جنرل سکریٹری: جماعت اہل سنت کرناٹک بنگلور

۲/ ربیع النور ۱۴۴۳ھ مطابق ۹/ اکتوبر ۲۰۲۱ء

خلیفۂ حضور اشرف الفقہا

حضرت مولانا افتخار ندیم قادری علیمی

شیخ الادب جامعہ شمس العلوم گھوسی مئو

قرطاس وقلم کے سچے سپاہی تھے بدر ملت!

گیسوئے مذہب ومسلک کی مشاطگی کرنے والوں میں ایک نمایاں نام بدر ملت حضرت علامہ ومولانا بدرالقادری مصباحی گھوسوی نور اللہ مرقدہ کا بھی ہے۔ آپ مدینۃ العلماء گھوسی کے سچے سپوت، درس گاہِ ابوالفیض کے پروردہ اور بارگاہِ مفتی اعظم ہند کے فیض یافتہ عالمی شہرت یافتہ داعی وخطیب اور شعر وسخن کے عظیم تاج ور تھے۔ آپ کی دینی، علمی، ادبی، تقریری، تصنیفی، ملی، سماجی اور فلاحی خدمات کا دائرہ دنیا کے متعدّد ممالک تک دراز ہے۔ مبدأفیض نے آپ کو گوناگوں محاسن وکمالات کا جامع بنایا تھا۔ آپ ان پُرکشش اور صاحب تسخیر علما میں تھے، جو ملنے والوں کو اپنی گفتار کی شیرینی اور کردار واخلاق کی نرمی کے ذریعہ اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ یقیناً آپ کی دل آویز شخصیت میں نگہ بلند، سخن دل نواز اور جان پُرسوز کا حسین امتزاج تھا۔

علامہ بدرالقادری منبر ومحراب کے ایک مخلص منادی اور قرطاس وقلم کے ایک سچے سپاہی تھے۔ آپ ایک طلیق اللسان خطیب، خوش بیان شاعر ہونے کے ساتھ ایک بہترین نثر نگار بھی تھے۔ آپ نے ادب اور سخن دونوں میں خامہ فرسائی کی اور خوب کی۔ ہمیشہ مقصدیت اور معنویت کو اولین ترجیح دی۔ آپ کے کلام میں جو روانی، کشش اور حسن و رونق ہے، وہ سب طبع زاد اور آورد سے پاک ہے۔ آپ کی بعض نظموں پر اقبالی رنگ اس قدر غالب ہے کہ وہ اثرانگیزی اور فکر وخیال میں روحِ اقبال کے بہت قریب ہیں۔

شاعری کی طرح آپ کی نثر بھی پاکیزگی اسلوب، جاذبیت ودل کشی اور حلاوت میں کسی طرح کم نہیں۔ آپ کے کثیر علمی انتاجات آپ کو زندہ و جاوید رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن آپ کی نگارشات کی اس کہکشاں میں اب مقالات بدر کا ایک اور خوبصورت اضافہ ہونے جا رہا ہے، جس میں جابجا نثرعالی کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں، جو دل آویزی اور اثرآفرینی میں حسن انشا اور فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہیں۔ پانچ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل گراں قدر مجموعہ مقالات وارثان فکر وفن کے لیے لائق اعتنا اور طالبانِ علم وادب کے لیے قابل استفادہ ہے۔

آفرین ہے! مولانا محمد ذیشان قادری امجدی گھوسوی کے لیے، جنھوں نے اپنی محبت مردانہ اور سعی جانفشانہ کے ذریعہ اس مجموعۂ مقالات کو رکاوٹوں اور موانع کے باوصف منصہ شہود پر جلوہ گر کرنے میں کامیابی حاصل کی، جس کے لیے بجا طور پر وہ شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مولیٰ تعالیٰ ان کے علم واقبال میں برکتیں عطا فرمائے اور صاحبزادہ والا تبار مولانا حسنین بدر صاحب کو بدر ملت کا حقیقی جانشین بنائے اور انھیں آپ کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ہمت وحوصلہ اور جذبۂ عطا فرمائے۔ آمین

تقدیم: علامہ مفتی فیضان المصطفیٰ قادری

فقیہ وادیب، محقق ومفتی، نبیرہ صدرالشریعہ

حضرت علامہ **مفتی فیضان المصطفیٰ قادری** مدظلہ العالی

بانی: جامعہ امام اعظم ابوحنیفہ وتاج الشریعہ آن لائن انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ

بچپن کی بات ہے جب ہماری کل کائنات قادری منزل کی حدودِ اربعہ تک محدود تھی، ناظرہ مکمل کرنے کے ساتھ کچھ اردو پڑھنا آگیا تھا، سمجھنا اگر چہ ابھی نہ آیا تھا، دل ودماغ کی تختیاں اس قدر سادہ تھیں کہ اس وقت جو دیکھا ہمیشہ کے لیے نقش ہوگیا، دائرۃ المعارف الامجدیہ تازہ تازہ معرضِ وجود میں آیا تھا، اس کی اور گھر کی کتابیں الماری میں رکھی رکھی کریم خوردہ اور دیمک زدہ ہونے لگتیں تو انھیں تازہ ہوا دینے کو آنگن میں پھیلا دیا جاتا تھا، اتنا یاد ہے کہ پہلی نظر جس کتاب پر پڑی اس کا سرورق پیلے رنگ کا تھا، جس پر جلی حرفوں میں لکھا تھا: ”زمین پر اللہ کا گھر“، کتاب ضخیم نہ تھی اس لیے ہاتھوں میں لے کر ورق گردانی کرنا کچھ مشکل نہ تھا، اِدھر اُدھر سے پڑھا، سمجھ میں کچھ نہ آیا، بہت دیر تک اس ٹائٹل کے متعلق سوچتا رہا، زمین پر اللہ تعالیٰ کا گھر آخر کہاں ہوگا؟ کیسا لگتا ہوگا؟ وہ کتابچہ آج تک مطالعہ نہ کرسکا، لیکن یہ ٹائٹل دماغ میں اُسی وقت سے رہا، جب کچھ شد بد پیدا ہوئی تو دماغ کی اسکرین پر جو ٹائٹل نقش تھا، ذہن نے فیصلہ دیا کہ وہ کتاب مسجدوں کی فضیلت اور تاریخ کے متعلق ہوگی۔ علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ کی عظمتوں کو سلام! یہ کتاب انھیں کے نوکِ قلم سے معرضِ وجود میں آئی تھی، اور اس سے ہماری ملاقات بہت بچپن میں ہوگئی تھی، جب ہم نے ہوش سنبھالا آپ ہالینڈ جاچکے تھے، سال دو سال پر جب وطن گھوسی تشریف لاتے تو قادری منزل ضرور آتے، خانوادۂ صدرالشریعہ سے بڑا والہانہ اور قلبی لگاؤ رکھتے تھے، قادری منزل میں کئی بار ملاقات رہی، رواروی میں سہی، مگر اس چلتی پھرتی ملاقاتوں میں بھی ہم نے ان کی شخصیت کی جاذبیت کو بھانپ لیا تھا، محسوس ہوا کہ موصوف بڑی حساس طبیعت کے مالک ہیں، خوش فکری اور خوش مزاجی نے آپ کی شخصیت کو مقناطیسی بنادیا تھا۔

حضور حافظ ملت کے پروردہ، حضور مفتی اعظم ہند کے فیض یافتہ، حضور صدرالشریعہ کے نیازمند، حضرت علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ مدینۃ العلماء گھوسی کی سرزمین پر ۱۹۵۰ء میں متولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقائی مدارس میں حاصل کرنے کے بعد حافظ ملت کی بارگاہ میں پہنچے اور ۱۹۶۹ء میں جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے فراغت حاصل کی۔

حضور حافظ ملت کی بارگاہ میں ”بدرِ ملت“ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جامعہ اشرفیہ کے علمی ترجمان ماہنامہ اشرفیہ کے لیے حافظ ملت کی اولین نظر انتخاب آپ پر ہی پڑی، جامعہ اشرفیہ کی تاریخ لکھنے کا کام بھی آپ کو سپرد کیا گیا، آپ نے ”اشرفیہ کا ماضی اور حال“ نامی کتاب پیش کی، ماہنامہ اشرفیہ کے ابتدائی شمارے اور حافظ ملت نمبر آپ کی ہی کاوشوں کا نتیجہ ہیں، آپ نے اپنی توجہات اور قلمی صلاحیتوں سے ماہنامہ اشرفیہ کو ایک مقام عطا کیا، اس وقت مدارس کے ترجمان رسالوں کی روایت نہیں تھی، علامہ بدرالقادری نے اپنے اداریوں سے ترجمان رسالوں کے خط وخال واضح کیے، اور ماہنامہ اشرفیہ کو علم وادب کی دنیا کا ایک مقبول رسالہ بنادیا۔

جن لوگوں نے بدر ملت کو نہیں دیکھا وہ یقیناً ایک نعمت سے محروم رہے، ان کے لیے عرض ہے کہ وہ پیدا ہوئے تو "بدر عالم" نام رکھا گیا، علم وادب میں مقام پیدا کیا تو "بدرالقادری" کے نام سے مشہور ہوئے، اور اب "بدر ملت" کہے جاتے ہیں۔ اُن کے نام کی طرح اُن کی شخصیت بھی چودھویں رات کے چاند کی طرح درخشندہ و تابندہ تھی۔ چہرہ نہایت پُرکشش، جلد کی رنگت ایسی صاف وشفاف کہ پیکر کی رعنائیوں میں گوناگوں اضافہ کرتی تھی، ہمہ دم مسکراتے لب گلہائے قدس کی پنکھڑیوں کا سا سماں پیدا کرتے تھے، اور جب لب کشا ہوتے تو ماحول ایسا بن جاتا جیسے گلشن میں ابھی کوئی تازہ کلی چٹکی اور اس کی پتیوں نے نکہتوں کا باڑا بانٹنا شروع کر دیا۔ آنکھوں میں جوہر شناسی کی چمک دکھائی دیتی تھی، متوسط قد مزاج کی لطافت اور اعتدال کا عکاس تھا۔

علم دوستی ایسی کہ علما اور طلبہ کو خوب نوازتے۔ ۱۹۹۴ء کی بات ہے جب جامعہ اشرفیہ میں فقیر جماعت سابعہ کا طالب علم تھا، اور مقالہ نگاری کے مقابلے میں تمام طلبہ میں اول پوزیشن حاصل کی تھی، اس محفل کے مہمان خصوصی حسن اتفاق سے "علامہ بدرالقادری" تھے۔ آپ نے اول پوزیشن پر ایک ہزار روپے کا انعام دیا تھا، اور دوسری پوزیشن کو پانچ سو روپے، اس دور میں صرف پچاس روپوں میں ہمارا ماہانہ خرچ پورا ہو جاتا تھا، اُن ایامِ عسرت میں ایک ہزار روپے پاکر ہم پھولے نہ سمائے، اور بہت شوق سے والدین کی خدمت میں پیش کر دیا۔

۲۰۱۴ء کی بات ہے جب میں ہیوسٹن نارتھ امریکہ میں تھا، اور "بدر ملت" ہیوسٹن تشریف لائے تھے۔ قادری منزل گھوسی میں تو بہت ملاقاتیں رہیں، لیکن وطن سے دور امریکہ کی سرزمین پر جو ملاقات رہی وہاں خوب وقت ملا، باتیں ہوئیں، موصوف نے کئی نشستوں میں اس فقیر کے تحریری کاموں کو سراہا، اور حوصلہ افزائی فرمائی، ہمارے گھر بھی تشریف لائے۔ حضرت کے متعدّد تقریری پروگرام ہوئے، ہیوسٹن کے لوگ آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئے۔ ہم اس وقت ہیوسٹن میں چند امریکی طلبا کو درس نظامی پڑھا رہے تھے، جس کا پہلا سال تھا، ہم نے آپ کو درسگاہ میں بلاکر طلبا کی تعلیمی لیاقت دیکھنے کی دعوت دی، تشریف لائے، ہم نے سامنے "مراقی الفلاح" رکھ دی، کتاب دیکھتے ہی مسکرائے اور برجستہ فرمایا: "جو پڑھا لکھا تھا ایاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا۔ حافظ ملت نے جس کام پر لگایا تب سے اسی میں لگا ہوا ہوں"۔ پھر طلبا کو تعلیم سے متعلق ہدایات دیں، اور فقیر کو بہت ساری دعاؤں سے نوازا۔ ہیوسٹن کے بہت لوگ آپ کے سلسلۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ ۸/ جنوری سے ۱۴ جنوری تک ہیوسٹن میں پروگرام ہوئے، ۱۷/۱۸/ جنوری کو ڈیلاس میں پروگرام ہوئے، ۱۹/ جنوری کو شکاگو عید میلاد النبی کے جلوس کی قیادت کو تشریف لے گئے اور وہاں دوروزہ پروگرام کر کے ہالینڈ واپس ہوئے۔ ان کے عالمی اسفار اور دوروں کی تفصیل اور پوری تاریخ معلوم کرنے کے لیے ان کی خود نوشت رودادِ سفر "جادۂ و منزل" دیکھنا چاہیے۔

ان کی زندگی کا کوئی پہلو مذہب و مسلک سے متصادم نہیں تھا، وہ جماعتی اتحاد واتفاق کے پرزور حمایتی تھے، اور جماعتی شیرازہ بندی کے سرگرم حامی اور وکیل تھے، بڑی حساس طبیعت کے مالک تھے، کسی بھی وجہ سے اپنوں میں کوئی بکھراؤ ہو جاتا تو ان کے دل کا آبگینہ ٹوٹ جاتا، اور احساسات کو ٹھیس پہنچتی تھی، اگر کہیں سے کچھ کرنے کی گنجائش نکل آتی تو ش و پنج کا شکار نہ ہوتے، بلاتوقف پیش قدمی کرتے۔ چنانچہ ۲۰۰۳ء میں جام نور نے جامعہ اشرفیہ کے تعلق سے بیکل اتساہی کا ایک انٹرویو شائع کیا، جس میں جامعہ اشرفیہ، حضور حافظ ملت، اور عزیز ملت کے تعلق سے کچھ واقعاتی امور کا تذکرہ تھا، دنیا کو معلوم ہے کہ اس تعلق سے حضور محدث کبیر کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، خصوصاً حضرت عزیز ملت کو سربراہ اعلیٰ مقرر کرانے میں حضور محدث کبیر کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ حضور حافظ ملت کی وفات کے بعد جامعہ اشرفیہ کی سربراہی

کے متعدّد دعویدار پیدا ہوگئے تھے، جن کی اشرفیہ پر گرفت بھی تھی اور مبارک پور قصبے پر اثر ورسوخ بھی تھا، ان حالات میں عزیز ملت کی نامزدگی ایک چیلنج بن گئی ۔ میں نے نجی مجلس میں حضور شارح بخاری علیہ الرحمہ سے اس تعلق سے سنا، آپ نے حضور محدث کبیر کے اقدامات، ذہانت اور قوتِ فیصلہ کا اعتراف کیا۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا، بعض لوگوں نے جب محسوس کیا کہ سربراہی ان کے ہاتھوں سے چلی نہ جائے تو حضور حافظ ملت کی وفات کے بعد اس نامزدگی میں عجلت کرنے سے روکا، جس پر حضور محدث کبیر نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا واقعہ پیش کرکے سب کو خاموش کردیا، یہ حضور شارح بخاری کا بیانیہ ہے۔ یہ وہ حقیقت تھی جس سے کسی کو انکار نہیں تھا، مگر جام نور کے انٹرویو میں محدث کبیر کی طرف خلاف واقعہ باتیں منسوب کردی گئیں، نہیں معلوم یہ بکل اتساہی کی زلت لسانی تھی یا مدیر کا تصرف، بہرکیف، اس شمارے کی اشاعت کے بعد بکل اتساہی نے فوراً بیزاری ظاہر کردی، مگر فتنہ جاگ چکا تھا، جام نور کا یہ انٹرویو ایک بڑے فتنے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ حضرت علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ جامعہ اشرفیہ کی تعمیر وترقی کے چشم دید گواہ بلکہ ہر ہر مرحلے میں سرگرم رکن کے طور پر شامل اور دخیل تھے، انھیں ساری داستان معلوم تھی، جب یہ انٹرویو شائع ہوا اتفاق سے انھیں دنوں آپ ہندوستان تشریف لا رہے تھے، دہلی میں اترے اور ایک دوروز قیام کرکے بکل سے ملاقات کی، جام نور کے ایڈیٹر سے ملاقات کی، اور حقائق سے آگاہ کیا، اور اس انٹرویو کے قابل اعتراض مواد سے رجوع نامہ شائع کرنے کی گزارش کی، مگر جام نور نے اپنی طرف سے ایسا کچھ نہ کیا، اس کا مقصد فتنہ جگانا تھا، جو کہ پورا ہوچکا تھا، اس دوران ہمیں بدرِ ملت کی جماعتی فکر کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

اس پورے واقعہ میں کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں تھا، جس سے خود "بدر ملت" کی کردارکشی ہوتی ہو، یعنی معاملہ آپ کا ذاتی نہیں تھا، بلکہ اپنی جماعت کے اکابر کا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید کہہ دیتا کہ "کون اس جھنجھٹ میں پڑے، اور لوگوں کو منانے سمجھانے میں سرکھپائے"، مگر علامہ بدرالقادری ان رجحانات کے مالک نہیں تھے، اس موقع پر جماعتی اتحاد کے لیے آپ کی بے چینی قابل دید تھی، آپ نے دلی قیام کا کل وقت اسی کام میں لگا دیا، آپ کی کوششوں سے یہ فتنہ تھم تو نہ سکا، لیکن بکل اتساہی کا اعتذار اور پھر اس مسئلے پر جام نور کی خاموشی آپ کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھی۔

طرزِ زندگی:

انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا، غربت وافلاس کی دنیا بھی دیکھی تھی، خاندان اور قرب وجوار کے لوگوں کا حال زار آپ کے سامنے مانند آئینہ تھا، بچپن کا کچھ وقت گلی کوچوں، اور کھیت کھلیانوں میں گزارا ہوگا۔ کچھ وقت کھیل کود میں بھی لگایا ہوگا۔ بل کھاتی پگڈنڈیوں سے چل کر پوش سوسائٹی کی شاہراہوں تک پہنچنے والے اس رجل عظیم نے خود اپنی زندگی میں نیرنگیٔ حیات کے بہت تماشے دیکھے ہوں گے، اور نہ جانے کتنے اتار چڑھاؤ کا سامنا کیا ہوگا۔ رکشے بیل گاڑی سے لیکر جیٹ طیاروں تک کا انقلابی سفر راتوں رات طے نہیں کیا تھا، اس میں ان کی خداداد ذہانت، شبانہ روز جدوجہد اور بزرگوں کی دعائیں سب شامل تھیں۔ وہ زمین کی پستی سے آسمان کی بلندی تک پہنچے، مگر کبھی نخوت وغرور کے شکار نہ ہوئے۔ عام سی زندگی گزارتے تھے، ہالینڈ سے گھوسی آتے تو ہفتوں یہاں گزارنے میں کچھ نخرے نہ تھے، لوگوں سے جاجاکر ملتے۔

شادی کے بعد ایک طویل عرصے تک اولاد نہ ہوئی، بہت دعائیں کیں منتیں مانیں، رب نے سن لی، اور انھیں جب یہ دولت دی تو چھپر پھاڑ کر دی، ایک ساتھ دو دو بیٹیاں، دونوں گود بیک وقت ایسی بھری کہ کبھی نہ رکنے والا قلم کچھ دنوں کے لیے خاموش ہوگیا، یہی ایام ان کی راحت وآرام کے ایام تھے۔ پھر موقع ملتے ہی اپنے کام پر لگ گئے۔

اس ادیب اور شاعر کے اندرون میں ایک عابدِ شب زندہ دار بھی چھپا تھا، جس سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے، وہ دن کے اجالے میں جو کام کرتے دنیا اس سے متعارف تھی، مگر رات کی تنہائیوں میں عبادت وتلاوت، اوراد ووظائف اور عبد ومعبود کے مابین ہونے والی مناجات باقی دنیا کے لیے راز ہی رہیں۔

تصنیف وتالیف اور طرزِ نگارش:

علامہ بدرالقادری زبان وقلم کے شہسوار تھے، زبان وبیان میں اپنا منفرد اسلوب رکھتے تھے، جو کچھ کہنا چاہتے الفاظ ان کا بھرپور ساتھ دیتے تھے، لکھتے تو فکر وفن کا ہجوم ہوتا، اور تخیلات بھی ساتھ ساتھ چلتے۔

تحریر وقلم کے حوالے سے ”علامہ بدرالقادری“ کا نام اب ایک مستقل عنوان کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ وہ ایک ادیب تھے، مافی الضمیر کو زبان وبیان کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ ایک مفکر تھے، ندرتِ فکر اور جودتِ نظر کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر جو بات کہتے وہ لوگوں کے لیے توجہات کا مرکز بن جاتی۔ وہ ایک شاعر تھے، ہر چیز کو دل کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور کسی چیز پر نظر ڈالتے ہی طائرِ تخیلات کو قوتِ پرواز دے کر شش جہات کی وسعتوں تک لے جاتے اور پھر اپنے الفاظ کے موتیوں میں معانی کا سمندر سمو کر قوم کے سامنے پیش کر دیتے۔ آپ کی درجنوں تصنیفات اور شعری دواوین اس کے شاہدِ عدل ہیں۔

ہم نے ”بدر ملت“ کی شخصیت کا مطالعہ زیادہ تر ان کی تصنیفات کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کا مزاج کیا تھا؟ ان کے رجحانات کیا تھے۔ ان کی سوچ کے زاویے کیا تھے؟ دعوت وتبلیغ کا طریقۂ کار کیا تھا؟ ان سب کو سمجھنے کے لیے ان کی تصنیفات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

وہ اپنی انقلابی نظموں سے نوجوان نسلوں کو خوابِ غفلت سے بے دار کرتے تھے، اپنے نثری شہ پاروں سے اہل علم وادب کی فکری تربیت کرتے تھے، اپنے ناصحانہ وعظ سے عوام الناس کی مذہبی تربیت کرتے تھے۔

”جادۂ ومنزل“ جب تازہ تازہ چھپ کر منظر عام پر آئی تھی ہم نے فوراً خرید لی اور فرصت نکال کر پوری پڑھ ڈالی، وہیں سے آپ کے فکر وفن اور افتادِ طبع کا گرویدہ ہوا، بہت کچھ سیکھا، اور بہت کچھ کرنے کا حوصلہ اور جذبہ ملا، پھر ان کی انقلابی نظموں نے بھی دل کی دنیا میں انقلاب برپا کیا۔ جب ان کی تالیف ”اسلام اور امن عالم“ کا مطالعہ کیا تو اسلامی تعلیمات کے وہ روشن پہلو کھل کر سامنے آئے جن میں پوری دنیا کے لیے امن وعافیت اور سکون وطمانیت کا پیغام دیا گیا ہے۔ جو لوگ اسلام کو دہشت گردی اور شدت پسندی کا مذہب قرار دیتے ہیں ان کے منھ پر یہ زوردار طمانچہ ہے، اس کتاب نے ثابت کر دیا کہ اسلام ہی امن عالم کا سب سے بڑا داعی ہے، یہ کتاب اپنے عہد کی بے نظیر اور اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے، عہد جدید میں اس کتاب کو اسلام کے تعارف کے لیے فخر کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے، ہماری جماعت کے حساس افراد آگے بڑھیں اور اس کتاب کا ہندی اور انگلش ورژن تیار کرا کر ہندوستان اور اس کے باہر مفت تقسیم کرائیں تو اس دور کا بہت بڑا دعوتی وتبلیغی کام ہوگا۔

ایک لمحۂ فکریہ یہ بھی ہے کہ ہمارے کچھ مفکرین اور محررین، اسلام کے روشن پہلو پیش کرکے غیر مسلمین میں اسلام کا تعارف توشوق سے کراتے ہیں، لیکن اہل سنت اور بد عقیدہ گمراہوں کی بحثوں میں نہیں پڑنا چاہتے ، فرقہائے باطلہ کے رد سے پہلوتہی کرتے ہیں، انھیں دینِ اسلام کی حمایت تو اچھی لگتی ہے ،مگر گمراہ فرقوں کا رد کرنا اپنے وقار کے خلاف لگتا ہے۔ اس جہت سے بھی ''بدر ملت'' کے کارناموں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ آپ نے ہر ضروری موضوع کو اپنے قلم وقرطاس کی زینت بنایا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کی مایہ ناز کتاب ''اسلام اور خمینی مذہب'' قابل قدر تصنیف قرار دی جاسکتی ہے ۔ یہ اس دور کی تصنیف ہے جب سنیوں میں بھی خمینی کے مداح پیدا ہونے لگے تھے ،کسی کو ایران جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے نظم وضبط کو دیکھ کر خمینی کی تعریف کرنے کا بخار چڑھ جاتا تھا، مگر ''بدر ملت'' نے حالات سے مرعوب ہونے کی روش اختیار نہیں کی ، بلکہ مسلمانوں کی مذہبی اور قومی ضرورت دیکھی، اوراس تصنیف میں آپ نے خمینی اور اس کے نظریات کی حقیقت کوواشگاف کیا ہے۔

مقالاتِ بدر ملت:

علامہ بدرالقادری کی ذات میں پوشیدہ صلاحیتوں کو حضور حافظ ملت کی جوہر شناس نگاہوں نے شروع میں ہی پہچان لیا تھا ، اور ان سے تحریری کام لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ان کو اپنے پاس رکھنے کے لیے ۱۹۷۴ء میں جامعہ اشرفیہ میں شعبۂ نشر واشاعت قائم فرماکر انھیں بلالیا، اسی وقت سے آپ نے لکھنا شروع کیا،اور تاحیات لکھتے رہے۔ اس دور میں چھوٹی بڑی درجنوں کتابیں منظر عام پر آئیں، اشرفیہ کا ماضی اور حال، اسلام اور امن عالم، یورپ اور اسلام، اسلام اور خمینی مذہب اور جادہ ومنزل (سفرنامہ) کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک درجن سے زائد تو آپ کے منظوم کلام کے دواوین شائع ہوکر اصحابِ ذوق سے داد وتحسین وصول کرچکے۔ آپ نے سیکڑوں مقالات بھی زیب قرطاس کیے، درجنوں مقالات تو ملک کے مختلف جرائد ورسائل کی زینت بن چکے، لیکن زیادہ تر وہ ہیں جو اب تک منظر عام پر نہیں آسکے، جن کی ترتیب کا کام کافی دنوں سے جاری تھا، اب جب کہ ان کے وصال کو ایک سال ہونے کو آئے ان کے وارثین نے ان کے مقالات کی ترتیب واشاعت کا منصوبہ بنایا۔ ترتیب کی ذمہ داری انھیں کے خانوادے کے ہونہار فرزند مولانا محمد ذیشان رضا امجدی کو دی گئی، انھوں نے بڑی جد وجہد اور لگن کے ساتھ یہ کام کیا اور کم وقت میں مکمل کرڈالا۔

''بدر ملت'' کے مقالات، تعداد میں اتنے ہیں کہ مرتب نے تین ضخیم جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ جس کی پہلی جلد کا نقش اول منظر عام پر لایا جارہا ہے۔ توقع ہے کہ بقیہ جلدیں بھی عن قریب پیش کردی جائیں گی۔

مقالات کی ترتیب وتدوین کتنا مشکل کام ہے، اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جو اس راہ سے گزر چکا ہے۔ اس لیے کسی مقام پر کوئی سقم ہو تو قارئین سے گزارش ہے کہ مرتب کو ضرور اطلاع دیں، تاکہ اگلے ایڈیشن میں اصلاح کردی جائے۔ اور اس کی ترتیب میں جتنے لوگوں کی کوششیں شامل رہیں، ان سب کو دعائے خیر میں یاد رکھیں، اللہ تعالیٰ سب کا حافظ وناصر ہو۔

علامہ بدرالقادری گھوسی میں پیدا ہوئے، مبارکپور میں تعلیم حاصل کی، پھر پچاس سالہ دور قلم وقرطاس کے حوالے کیا، اس دوران دنیا کے بیشتر ممالک کے تبلیغی دورے کیے، سب سے زیادہ وقت یورپ کو دیا۔ بالآخر ۱۹؍ستمبر ۲۰۲۱ء کو ہالینڈ میں یہ چاند غروب کرگیا، جس کے نتیجے

میں نصف صدی پر محیط علمی، ادبی، تحریری اور تبلیغی خدمات کے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ جنازہ بذریعہ طیارہ ہندوستان لایا گیا، اور وطن مالوف گھوسی میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے مرقد پر تاقیامت رحمت وانوار کی بارش برسائے۔ آمین

طالب دعا

فقیر **فیضان المصطفیٰ قادری** غفرلہ

۱۳/ محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲/ اگست ۲۰۲۲ء

مختصر سوانح حیات

حضرت علامہ بدرالقادری علیہ الرحمۃ والرضوان

الحمد للہ الٰھنا والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا

محمد شفیعنا وعلیٰ الہ وصحبہ وسائلنا اما بعد!

اپنی کم علمی، لکھنے کے ہنر سے ناواقفیت اور الفاظ کے چناؤ سے نابلد ہونے کے باوجود، آج جس شخصیت کے لیے قلم اٹھایا، وہ تاریخ اسلامی کا بلند وبالا پہاڑ ہے۔ جس نے برصغیر ہی نہیں، بلکہ یورپ و امریکہ و افریقہ اور دیگر ممالک میں اسلام کی ترویج اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا اور بہت سے غیر مسلم کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا۔ خدائے تعالیٰ ہر زمانے میں ایک ایسے مجاہد کو ہمارے درمیان مبعوث فرماتا ہے، جو لوگوں کو راہِ ہدایت پر گامزن کرے، بنجر دلوں میں گل و لالہ کے بیج بوئے۔ ان کی صحبت میں رہنے والا کبھی شکستہ حالی کے دن نہیں دیکھتا۔ کبھی بھی شقاوت میں مبتلا نہیں ہوتا کہ ان سے الفت و محبت کرنے والا، باسعادت اور فیض یاب رہتا ہے۔

میں جس مبارک ہستی کا ذکر کرنے جارہا ہوں، وہ ایک ایسی ذاتِ مبارکہ ہے کہ بندہ ناچیز کی زبان وقلم بولنے اور لکھنے سے قاصر ہے۔

یہ عظیم ذات، خلیفۂ مفتی اعظم ہند و حضور حافظ ملت (علیہ الرحمۃ والرضوان) حضرت علامہ مولانا بدرالقادری مصباحی نور اللہ مرقدہ کی ذات بابرکات ہے۔

یہ وہ عظیم ہستی ہے، جن کا فیضان صرف اہل گھوسی تک ہی محدود نہیں، بلکہ یورپ وامریکہ وافریقہ میں بھی جاری ہے۔ وہ ایک مفکر اور محقق اور مصنف کے ساتھ ساتھ، ایک سچے عاشق رسول بھی تھے۔

ولادت ونسب:

علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۵۰ء محلہ ملک پورہ، مرزا جمال پور، پوسٹ گھوسی، ضلع مئو یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

آپ کا اسم گرامی: محمد بدر عالم۔ عرفیت: بدرالقادری۔ اور تخلص: بدر ہے۔

ولدیت: حافظ محمد رمضان بن شیخ محمد اسحاق بن محمد حبیب (حبیباً)

مولانا بدرالقادری اپنے والدین کی چوتھی اولاد تھے۔ مولانا بدرالقادری کے پردادا کا نام جناب محمد حبیب تھا۔ آپ سے ایک صاحبزادے یعنی مولانا بدرالقادری کے دادا شیخ محمد اسحاق سردار مرحوم تولد ہوئے۔ آپ سے دس لڑکے اور ایک لڑکی سکینہ ہوئیں۔ نو لڑکوں کا انتقال طاعون میں ہوا، سکینہ کی شادی ہوئی، ایک بچی کی ولادت کے بعد وفات پاگئیں۔

مولانا بدرالقادری کے والد ماجد حافظ محمد رمضان صاحب اپنے والدین کے سب سے چھوٹے اور دسویں اولاد تھے۔

آپ کا انتقال ۲۲/ رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ مطابق ۲۹/ اگست ۱۹۷۸ء کو ہوا۔ جب کہ والدۂ محترمہ کا وصال ۱۵/ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ/ ۱۸/ دسمبر ۱۹۸۶ء کو ہوا۔

تعلیم وتربیت:

ابتدائی تعلیم مدرسہ ناصر العلوم ملک پورہ، مدرسہ خیریہ فیض عام گھوسی اور مدرسہ خیر المدارس مدا پور گھوسی میں ہوئی۔

درسِ نظامیہ کی تکمیل دارالعلوم اشرفیہ "مصباح العلوم" مبارک پور میں ہوئی۔

تاریخ فراغت ۱۰/ شعبان المعظم ۱۳۸۹ھ/ ۲۳/ اکتوبر ۱۹۶۹ء۔

قطعاتِ تاریخ فراغت:

مولانا بدرالقادری کی فراغت پر جناب رحمت الٰہی برق صدیقی اعظمی نے "قطعاتِ تاریخ فراغت" رقم فرمائے۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں:

آج دستارِ فضیلت بدر کے سر پر بندھی
کیوں نہ اشرفیہ کا دنیا بھر میں نام روشن ہو
برق تجھ کو فکر ہے تاریخ ہجری کی اگر
لکھ الٰہی بدر عالم خنجر اسلام ہو!

۱۳۸۹ھ

حافظ ملت کے دل کی آج بر آئی مراد
بدر کے سر پر ہے دستارِ فضیلت ضوفگن
برق کے دل کی دعا بھی ہے یہ ارخ عیسوی
بدر عالم ہو الٰہی روشنی بخشے زمن

۱۹۶۹ء

شیوخ واساتذہ:

☆...... حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز مرادآبادی علیہ الرحمہ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

☆...... حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ

☆...... حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی علیہ الرحمہ

☆...... حضرت علامہ شفیع اعظمی مبارک پوری قدس سرہ

☆...... حضرت مولانا قاری یحییٰ علیہ الرحمۃ والرضوان

☆...... حضرت مولانا سید حامد اشرف کچھوچھوی

☆...... حضرت مولانا شمس الحق گجڑوی (مرحوم)

بیعت وخلافت:

مرشد گرامی علیہ الرحمۃ والرضوان اپنے شرفِ بیعت کا واقعہ خود تحریر فرماتے ہیں:

”ہالینڈ میں کم وبیش دس ماہ پہلا قیام کرنے کے بعد وطن واپسی ہوئی تو آستانۂ عالیہ رضویہ پر روح کی کشش لے گئی میرے ساتھ ہالینڈ کے ایک معمر شخص اسحاق خدابخش اور برادرِ کریم ڈاکٹر محمد قاسم قادری مورانوی بھی تھے۔ سرکار مفتی اعظم نے کرم فرمایا اور اپنے آنگن میں بلا کر شرفِ زیارت و بیعت سے نوازا اور میری خواہش اور طلب کے بغیر شہزادۂ گرامی حضرت علامہ اختر رضاخاں ازہری قبلہ سے خلافت نامہ منگوا کر پُر کیا اور دستخط سے مزین کر کے عنایت کیا۔ میں اس الطافِ خسروانہ پر شرمندہ بھی تھا اور حیران بھی۔ ایک لا اُبالی، کھلنڈرا، غیر متوازن انسان، اعمال، اوراد و معمولات توالگ، جس کے فرائض و واجبات بھی اگر رحمن و رحیم قبول فرمالے تو قابل قبول ہیں، ورنہ: ؎

من آنم کہ من دانم

پھر بھی بزرگوں کا یہ فرمودہ میری تسکین کا ذریعہ بنا۔

داد حق را قابلیت شرط نیست

بلکہ شرطِ قابلیت داد اوست

خلافت نامہ کے ساتھ خاص اندرونِ خانہ سے منگا کر اپنا استعمال کردہ ہلکے ہرے رنگ کا ایک رومال عطا کیا۔ رومالِ مبارک برادرِ مکرم مولانا ڈاکٹر قاسم قادری، الحاج محمد اسحاق خدابخش اور مجھے مشترکہ عطا ہوا تھا۔ مگر کرم فرما دونوں رفیقوں نے اپنے حق سے دست بردار ہو کر مجھے ہی بخش دیا، جو آج بھی میری گراں قدر متاع ہے اور لباسِ عالم آخرت کا جزبنانے کے لیے بحفاظت رکھا ہوا ہے۔ فقیر قادری کو اس نعمت گراں بہا کا حصول سرکار مفتی اعظم کی غلامی میں داخلہ اور حصولِ خلافت ۲۳ / جمادی الاخریٰ ۱۳۹۹ھ / جون ۱۹۸۹ء کو ہوا۔

فالحمد للہ الوھاب علی نعمہ وکرمہ وفضلہ العظیم

خلفاومریدین:

(۱)... جانشین بدر ملت حضرت مولانا محی الدین حسنین بدر قادری ہالینڈ

(۲)... مفتی احمد القادری مصباحی مقیم حال امریکہ

(۳)... حضرت مولانا قاری حسام الدین صاحب

(۴)... حافظ سہیل اشرف قادری گھوسی

(۵)... حضرت مولانا شکیل احمد قادری (رحمۃ اللہ علیہ)

(۶)... حضرت مولانا نعیم اختر صاحب قادری مصباحی گھوسی

(۷)... حافظ و قاری ارشد رضا قادری صاحب گھوسی

(۸)... حضرت مولانا قاری مہتاب عالم قادری امریکہ

(۹)... حضرت مولانا شہید القادری صاحب

(۱۰)... مولانا حافظ عابد ایوب قادری انگلینڈ

(۱۱)... قاری شفیق الرحمن گمان قادری ہالینڈ

(۱۲)... حافظ و قاری عابد رضا جھارکھنڈ

(۱۳)... حضرت مولانا مفتی الفت رضا کشمیری

(۱۴)... حضرت مولانا قاری فیض الرحمن صاحب کریم الدین پور گھوسی

(۱۵)... مولانا رضوان عالم شمسی

(۱۶)... حضرت مولانا ابوالوفا صاحب رضوی بھیروی

(۱۷)... قاری محمد شفیق صاحب مبارک پوری

کچھ خاص مریدین کے نام، جنھوں نے ہر قدم پر علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ کا ساتھ دیا۔

(۱)... قاری محمد شفیق الرحمن گمان قادری

(۲)... الحاج محمد فیروز خان گمان قادری

(۳)... الحاج محمد اعجاز گمان قادری

(۴)... الحاج محمد شرف الدین انصاری قادری

(۵)... الحاج محمد راقم گمان قادری

(۶)... الحاج محمد عبدالشکور اسحاق قادری (مرحوم)

(۷)... الحاج محمد عبدالرشید گمان قادری

(۸)... محمد مشاہد کیانی

(۹)... بابا محمد اعظم رزاقی

(۱۰)... الحاج ابوبکر فدادین قادری

حج وزیارت:

حضرت علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ نے پہلا حج اپنی والدہ اور بڑے بھائی کے ساتھ ۱۹۷۹ء میں کیا۔ اور دوسرا حج اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ ۱۹۸۵ء میں کیا۔ اور تیسرا حج ۱۹۹۹ء میں کیا۔

زیارات کی تفصیل آپ کے سفرنامہ ''جادہ و منزل'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

تحریر وتصنیف:

علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ کی کن کن خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔ تصنیفی، تالیفی، تحریری، تنظیمی، تحریکی، دعوتی وغیرہ تمام کمالات کے عطر مجموعہ ہیں۔ علامہ بدر اپنی سادگی میں ایک انجمن، ایک اکیڈمی ہیں۔ ہر میدان میں وہ اپنے معاصرین سے ایک قدم آگے نظر آتے ہیں۔ اگر تصنیفی میدان میں دیکھا جائے تو آپ کا قد بہت بلند نظر آتا ہے۔

نثری نگارشات:

(۱)... تذکرہ سید سالار مسعود غازی (۲)... اشرفیہ کا ماضی اور حال

(۳)... اسلام اور امن عالم (۴)... اسلام اور تربیت اولاد

(۵)... مسلمان اور ہندوستان (۶)... مولانا رضوان احمد اعظمی

(۷)... اسلام اور خمینی مذہب (۸)... سنت کی آئینی حیثیت

(۹)... عورت اسلام میں (۱۰)... فلسفہ قربانی

(۱۱)... زمین پر اللہ کا گھر (۱۲)... یورپ اور اسلام

(۱۳)... جادہ و منزل (۱۴)... میاں بیوی اسلام کی روشنی میں (۱۵)... بزمِ اولیاء

شعری تصانیف:

(۱)... الرحیل (۲)... قم باذن اللہ (۳)... حریم شوق

(۴)... مناجاتِ بدر (۵)... قطعاتِ بدر (۶)... جمیل الشیم

(۷)... بادۂ حجاز (۸)... باب جبریل (۹)... تحفۂ حرمین

(۱۰)... شاخِ سدرہ (۱۱)... سلسبیل (۱۲)... حرفِ نیاز

(۱۳)... کسک (۱۴)... نشیدہ روح

کتابوں کے ترجمے:

مولانا بدرالقادری علیہ الرحمہ نے حسب ذیل کتابوں کے تراجم کیے ہیں:

(۱)... "فلسفہ قربانی"۔ کا ترجمہ بزبانِ انگریزی اور ڈچ۔

(۲)... "زمین پر اللہ کا گھر"۔ کا ترجمہ عربی اور انگریزی میں۔

(۳)... "میاں بیوی اسلام میں"۔ انگریزی۔

(۴)... "اسلام اور امن عالم"۔ عربی اور انگریزی۔

تدریسی خدمات:

فراغت کے بعد ۱۹۷۰ء میں صدر مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم غوثیہ ہبلی (کرناٹک) تشریف لے گئے۔ آپ بحیثیت صدر مدرس دارالعلوم غوثیہ (کرناٹک) ۱۹۷۰ء۔

(۲)... بحیثیت صدر مدرس مدرسہ سید العلوم بہرائچ شریف ۱۹۷۲ء۔

(۳)... مدرسہ ضیاء الاسلام مورانواں ضلع اناؤ یوپی ۱۹۷۳ء۔

امامت وخطابت:

(۱)... جامع مسجد انکولہ، ضلع کاروار (کرناٹک) ۱۹۷۱ء

(۲)... پنویل ضلع تھانہ (مہاراشٹر) ۱۹۷۱ء۔

(۳)... مسجد باغِ فردوس بھیونڈی، ضلع تھانہ (مہاراشٹر) ۱۹۷۲ء۔

(۴)... جامع مسجد خورد دمّن ضلع بلسار (گجرات) ۱۹۷۲ء۔

ماہنامہ اشرفیہ:

فراغت کے بعد علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ تقریباً ۵/ سال تک دوسرے شہروں میں تدریسی خدمات اور امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۱۹۷۴ء میں حضور حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز نے شعبۂ نشر واشاعت قائم فرمایا۔ اس شعبے کے قیام کی وجہ مولانا بدر القادری کو مبارک پور میں رکھنا بھی تھا۔ اس سے حضور حافظ ملت کی مولانا بدرالقادری سے محبت اور ان پر شفقت وکرم نوازی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۹/ جون ۱۹۷۴ء میں مولانا بدرالقادری علیہ الرحمہ نے اپنی مساعی جمیلہ سے الجامعۃ الاشرفیہ کا علمی ودینی ترجمان جاری کیا۔ حافظ ملت کے وصال کے بعد ان کی حیات وشخصیات اور کارناموں کو اجاگر کرنے کے لیے مولانا بدرالقادری علیہ الرحمہ نے ماہنامہ اشرفیہ کے حافظ ملت نمبر جو پونے چھ سو صفحات پر مشتمل تھا، پریس کے حوالہ کرنے کے بعد جولائی ۱۹۷۸ء میں ہالینڈ روانہ ہوگئے۔

حافظ ملت نمبر اگست ۱۹۷۸ء میں منظر عام پر آیا۔

ازواج واولاد:

۷/ مئی ۱۹۷۴ء کو جناب علیم الدین بن صوفی علی رضا مرحوم (اعظم گڑھ) کی صاحبزادی سے نکاح ہوا۔

علامہ بدرالقادری علیہ الرحمۃ والرضوان کی تین صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادے ہیں۔

(۱)... بشریٰ بدر قادری

(۲)... غزالہ بدر قادری

(۳)... محمد محی الدین حسنین بدر قادری

(۴)... اسماء بدر قادری

ہالینڈ کا سفر:

۱۲/ جولائی ۱۹۷۸ء کو صبح گھوسی سے الہ آباد اور الہ آباد سے بمبئی تشریف لے گئے۔

۲۰/ جولائی ۱۹۷۸ء بمبئی سے بذریعۂ طیارہ ایئر انڈیا دہلی آئے، دہلی سے رات میں کے۔ ایل۔ ایم (K.L.M) کے جہاز کے ذریعہ کراچی، بحرین اسٹاپ کرتا ہوا طیارہ ۲۲/ جولائی ۱۹۷۸ء صبح امسٹرڈم انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر لینڈ ہوا۔

اسلامی تاریخ کے حساب سے مولانا بدرالقادری علیہ الرحمہ ۱۴/ شعبان المعظم کو ہالینڈ پہنچے۔

ہالینڈ پہنچنے کے بعد ایک تنظیم قائم کی، جس کا نام "اسلامک سینٹر نیدرلینڈ (I.C.N) ہے اور ایک قدیم اسکول کی عمارت خرید کر مسجد اور سینٹر میں بدلا۔ اس تنظیم کا قیام، مولانا بدرالقادری کا اہم دینی کارنامہ ہے۔

اسی سینٹر کی مسجد میں پہلا جمعہ مولانا بدرالقادری علیہ الرحمہ کے برادرِ اکبر الحاج مولانا رضوان احمد شہید علیہ الرحمۃ والرضوان نے پڑھائی، جو ۲۷/دسمبر ۱۹۸۳ء کو ہالینڈ تشریف لے گئے تھے۔

مولانا بدرالقادری علیہ الرحمہ کے ہالینڈ آنے سے پہلے ہالینڈ اور بلجیم وغیرہ میں مسلمانوں کے پاس کوئی مستقل اوقات الصلوٰۃ نہیں تھا۔ لوگ محکمۂ موسمیات کی اٹکل خبروں پر نماز گزارتے تھے۔

مولانا بدرالقادری نے مسلمانوں کو صحیح اوقات الصلوٰۃ سے آگاہ کیا۔ یہ مولانا بدرالقادری علیہ الرحمہ کا قلب دینی اور شریعت پر عمل کرنے اور کرانے کا جذبہ، بلکہ عزیمت تھی۔ روزہ، نماز کے اوقات کی پابندی چاند کے معاملہ میں مسئلہ شرعیہ پر عمل کرنے کی تحریک چلائی اور لوگوں کو عمل پر آمادہ کیا۔

آپ کی تبلیغی و دینی خدمات سے آج نہ صرف ہالینڈ، بلکہ یورپ کے دوسرے ملکوں فرانس، جرمنی، بلجیم وغیرہ میں دین و شریعت کی روشنی بڑھتی جارہی ہے۔ آپ کی ذات سے مختلف یورپی اور امریکی ملکوں میں متعدّد اسلامی تنظیموں کو غذائے زیست مل رہی ہے۔

اگست ۱۹۹۱ء میں حضرت علامہ بدر القادری علیہ الرحمہ نے علمائے کرام کے اصرار پر تنظیم العلماء ہالینڈ کا قیام عمل میں لایا۔

تنظیم کے مقاصد:

دارالقضا، جہاں مسلمانوں کے ہر طرح کے مسائل حل کیے جائیں اور جدید مسائل پر ریسرچ اور تحقیق کی جائے۔

مجلہ اردو اور حتی الامکان ڈچ زبان میں دینی، اسلامی، علمی رسالہ کا اجرا اور حسب ضرورت کتابچہ اور اشتہارات شائع کرنا۔

علمی جلسے: اہم اسلامی ایام اور تقریبات کے موقع پر جلسوں کا انعقاد۔

ہفتہ وار مجلس نعت اور ذکر واذکار کا انعقاد۔

فریضۂ مسلم گری:

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے دعوت و تبلیغ سے ہالینڈ، سرینام، انڈونیشیا، مصر، گیانا اور دیگر علاقہ اور خطوں کے عیسائی، سکھ اور ہندو مرد و عورت آپ کے دست حق پرست پر قبولِ اسلام کر چکے ہیں۔ بعض اوقات پوری فیملی نے آپ کے ہاتھوں پر ایمان قبول کیا۔ الحمد للہ! آپ رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک پر تقریبًا پانچ سو افراد نے قبولِ اسلام کیا۔ آپ نے ان کا اسلامی نام بھی منتخب فرمایا۔ جس کی فہرست حیات و خدمات میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

وائس آف اسلام:

جولائی ۱۹۸۰ء میں انٹرنیشنل سہ ماہی میگزین (Voice Of Islam) انگلش، اردو اور ڈچ (نیدرلینڈ زبان) میں جاری کیا۔ حضرت علامہ بدر القادری علیہ الرحمہ میگزین کے اجرا تک اور مدیر مسئول کی ذمہ داریوں پر بحسن و خوبی کار فرما رہے۔ اس دوران حضرت علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ کے دو مذہبی رسالے طبع ہوئے: (۱) فلسفۂ قربانی (۲) زمین پر اللہ کا گھر۔

عشق رسول:

حضرت علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ کو سرور کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے والہانہ محبت اور گہرا عشق تھا، جس کے اثرات آپ کی نشست وبرخاست اور زندگی کے لمحات سے اطاعت وفرماں برداری کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔ سچ ہے:

''ان المحب لمن یحب مطیع''۔

اور یہی وجہ تھی کہ آپ کی زبان، ذکر محبوب ودیارِ محبوب سے ہمیشہ تر رہتی۔

''کن احب شیئا اکثر ذکرہ''۔

ترجمہ:۔ جس شخص کو کسی چیز سے محبت ہوتی ہے، اس کا تذکرہ کثرت سے کرتا ہے۔

اور ایسا کیوں نہ ہو کہ عشق رسول ایک مومن کی متاعِ زندگی، سرمایۂ حیات، اصل ایمان، بلکہ ایمان کی بھی جان ہے۔

جان ہے عشق مصطفی روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ نازِ دوا اٹھائے کیوں

آپ کی تحریریں پڑھیے، آپ کی کتابیں دیکھئے، آپ کی نعتیں دیکھئے، عشق رسول میں سرشار ہوکر لکھے گئے اشعار کا مطالعہ کیجیے! آپ کے مضامین اور مقالات کو دیکھئے تو آپ کے عشق رسول کی جلوہ سامانیاں قدم قدم پر دیکھنے کو ملیں گی۔ آپ نے بارگاہِ رسولِ انام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں تقریبًا ایک درجن نعتیہ مجموعہ لکھ کر عالم اہل سنت کے حوالے کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا عشق اس حد درجہ کا تھا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ خط بنام ڈاکٹر بیت اللہ قادری مورخہ ۱۴/ نومبر ۱۹۹۷ء میں لکھتے ہیں:

''آپ نے سنا نہیں، اپنے اس مریض کے مرض کی خبر، حضور شفیع ومشفع صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک پہنچ چکی ہے۔ مدینہ طیبہ کے صندوق برید نمبر ۹۲/ سے اس شفاخانۂ خاص اور شفائے اعظم کے ذریعہ کل ہی بلاوا آیا ہے کہ مدینہ طیبہ آجائو، شفائے کامل کے لیے، یقینا وہاں سے بہتر دارالمعالجہ کہاں ملے گا''۔

مکتوب بنام حضرت مولانا فضل الرحمن المدنی مورخہ ۹/ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ

''حضور تاج دار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مبارک دہلیز کو بوسہ دینے کے شرف سے محروم ہوں، ان کے کرم خاص کا محتاج ہوں۔ عرض صلاۃ وسلام کے بعد محتاج کی یہ عرض حضور رحمۃ للعالمین کی بارگاہ میں ہوجائے، سراپا ممنون ہوں گا''۔

وصال:

شہزادۂ بدر ملت مولانا محی الدین حسنین بدر قادری بیان کرتے ہیں کہ ۱۷/ اگست ۲۰۲۱ء کو حضرت علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، بذریعۂ ایمبولینس ہاسپٹل میں ایڈمٹ کیا گیا، اسی دوران طبیعت میں بہتری آئی، پھر چند روز بعد طبیعت خراب ہوگئی۔ ہفتوں تک یہ معاملہ چلتا رہا۔

۱۹/ستمبر کی صبح ڈاکٹر معالجہ کے لیے اندر لے کر گئے، پھر کچھ دیر کے بعد واپس آکر یہ جانکاہ خبر دیتے ہیں کہ علم وفن کا رازداں اور استقامت وثبات قدمی کا کوہِ ہمالیہ ہمیشہ کے لیے آغوشِ زمین میں محو خواب ہوگیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

کیا خبر تھی موت کا یہ حادثہ ہوجائے گا
یعنی آغوشِ زمیں میں آسماں سوجائے گا

ذیشان رضا امجدی قادری
استاذ جامعہ رضویہ بدر العلوم
گھوسی مئو (یوپی)

بارگاہِ غوثیت میں تمغۂ ولایت سے مشرف

''قَدَمِیْ هٰذِهٖ عَلٰی رَقَبَةِ کُلِّ وَلِیِّ اللّٰهِ'' کا سایہ
شیخ طریقت پیر و مربی حضرت علامہ بدرالقادری
بارگاہِ غوثیت میں تمغۂ ولایت سے مشرف

شہزادہ وجانشین وخلیفۂ حضور بدر ملت
از: حضرت مولانا محمد **محی الدین حسنین بدر قادری** صاحب
اسلامک اکیڈمی ہالینڈ

قطب الاقطاب، فردالافراد، قطب ربانی، محبوبِ سبحانی، سرکار غوث پاک شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات گرامی فضائل ومناقب اور جامع کمالات کی بنا پر جماعت اولیا میں انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔ سرکار غوثِ اعظم جملہ صحابۂ کرام اور بعض اکابرین تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے علاوہ سیدنا امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک کے تمام اولیائے کرام ومشائخ عظام سے افضل و اعلیٰ واکمل ہیں۔ تمام اولیائے کرام خواہ آپ کے پہلے کے ہوں یا ہم عصریا آپ کے عہد مبارک کے بعد ہوں گے، سب آپ کے مداح اور آپ کی نظر کرم کے امید وار ہیں۔

جو ولی قبل تھے یا بعد ہوئے یا ہوں گے
سب ادب رکھتے ہیں دل میں مرے آقا تیرا

آپ کے فضل وکمال کی انتہا کا یہ عالم ہے کہ اسی بغدادِ معلی کی سرزمین پر ایک دن وہ آیا جب آپ نے اللہ رب العزت کی مرضی سے یہ عظیم الشان اعلان فرمایا:

''قدمی ھٰذہ علی رقبۃ کل ولی اللہ'' (میرا یہ قدم تمام اولیا کی گردن پر ہے) اور تمام اولیا، اقطاب جہاں اور رجال الغیب نے آپ کے اس اعلان پر لبیک کہا اور ادب سے غوثیت کبریٰ کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کردیا۔ روئے زمین پر کوئی ایسا ولی نہ تھا، جس نے گردن نہ جھکا دی ہو۔

امام اہل سنت فرماتے ہیں:

واہ کیا مرتبہ اے غوث ہے بالا تیرا
اونچے اونچوں کے سروں سے قدم اعلیٰ تیرا
سر بھلا کیا کوئی جانے کہ ہے کیسا تیرا
اولیا ملتے ہیں آنکھیں وہ ہے تلوا تیرا

اس وقت سے لے کر آج تک امت مسلمہ کے تمام اولیائے کاملین اور علمائے ربانیین اس امر پر متفق ہیں کہ دولت ولایت آپ کے دسترخوان سے بٹتی ہے۔ آپ کا قدمِ مبارک جس کی گردن پر پڑ جائے، اسی کو مسند ولایت میسر آتی ہے۔ حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ یوں التجا فرماتے ہیں:

یہ دل یہ جگر ہے یہ آنکھیں یہ سر ہیں
جہاں چاہو رکھو قدم غوثِ اعظم

ایسی ہی التجا لیے ہوئے والد بزرگ وار خلیفۂ حضور مفتی اعظم ہند حضرت علامہ بدرالقادری علیہ الرحمہ، والدۂ محترمہ کو لیے ہوئے جدہ سے ۲۲/مارچ ۱۹۹۰ء صبح ساڑھے دس بجے سعودی ائرلائنس کی فلائٹ نمبر ۲۵۰/ ذریعہ ریاض ہوتے ہوئے بغداد معلی روانہ ہوئے۔

دراصل والد محترم کا یہ تاریخی سفر تین مقاماتِ مقدسہ کی حاضری پر محیط تھا۔ آپ ۱۱/ مارچ ۱۹۹۰ء کو ہالینڈ سے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے آقائے نامدار احمد مختار، دونوں عالم کے سردار رسولِ گرامی وقار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دربار اقدس کی حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ پانچ روز نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جوارِ رحمت میں نہایت پُرکیف گزارے۔ ایام حج کی ہماہمی نہ ہونے کی وجہ سے زیارت کی سہولت

میسر آئی۔ ریاض الجنۃ اور منبر رسول کے پاس ٹھہرے اور نوافل ادا کرنے کا خوب موقع ملا۔ ۱۷/ مارچ ۱۹۹۰ء کو صبح مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ میقات سے احرام باندھا۔ دوپہر دو بجے کے بعد مکہ معظمہ پہنچے۔ ۱۷/ مارچ سے ۲۱/ مارچ کی شام تک قیام رہا، اس درمیان عمرہ وزیارت کی برکتیں حاصل ہوئیں۔

پھر ۲۲/ مارچ ۱۹۹۰ء کو صبح ساڑھے دس بجے جدہ سے بغدادِ معلی روانہ ہوئے۔ اسی دن شام چار بجے کے لگ بھگ بغداد مقدس پہنچ کر باب الشیخ پر قیام فرمایا۔ باب الشیخ ہی وہ در ہے، جہاں دنیا بھر سے اہل اللہ، رجال الصوفیہ حاضر ہوتے ہیں۔ گیارہویں والے سرکار کا والد بزرگ وار پر ایسا کرم ہوا کہ گیارہ روز اپنے قیام کا موقع عنایت فرمایا۔ بارگاہ غوثیت میں حاضری کی پاکیزہ سعادتیں میسر آئیں۔ چوکھٹ کو بوسہ دیا، سلام عرض کیا، فاتحہ پڑھی۔

مدینہ طیبہ سے حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب مدنی نے جو عطر پیش کی تھی، اس خوشبوئے مدینہ کو آستانے کی جالیوں پر لگایا۔ پھر قدمین شریفین کے پاس باادب کھڑے ہوکر حضور غوث الاعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں قدم شیخ کو اپنے سر و چشم پر پانے کی التجا کی۔ یوں عرض گزار ہوئے:

شہ جیلاں مجھے بس ہے مجھے بغداد کافی ہے
زمانے کا نہیں محتاج میں مولیٰ کی رحمت سے
گدا کو بھیک میں دیتے ہیں وہ دولت ولایت کی
بڑی قدرت خدا نے دی ہے ان کو اپنی قدرت سے

اس طرح گیارہ روز تک حاضری کی سعادت ملتی رہی۔ والدہ محترمہ نے ہمیں بتایا کہ اس سفر میں ایک انتہائی اہم واقعہ پیش آیا، جسے حضرت والد صاحب نے کبھی اپنی زندگی میں بیان نہ فرمایا۔ اس اہم واقعہ کی ایک تنہا چشم دید گواہ ہماری والدہ محترمہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ روزانہ کے معمول کے مطابق ایک دن ہم لوگ زیارت کے لیے صبح سے نکلے تو رات دس بجے واپسی ہوئی۔ مائی فاطمہ کے مکان میں بیٹھے باتیں کرتے کرتے اچانک ہماری والدہ سے فرمایا: چلو، دربارِ غوث الاعظم میں حاضری دے آئیں۔ پہنچ کر دیکھا تو تالہ بند تھا، وہاں جو خادم تھے، انھوں نے دیکھا تو بغیر کچھ کہے تالہ کھول دیا، ہم اندر داخل ہوگئے، فاتحہ پڑھی، اس کے بعد خادم نے خاص روضے مبارک کی جالی کا دروازہ کھولا (جب کہ یہ جالی شریف کا دروازہ خاص دنوں میں کھولا جاتا ہے) والد محترم اندر تشریف لے گئے، کچھ دیر بعد جالی سے باہر آئے تو پائنتی کی جانب سے ہوکر سرہانے پہنچے اور سر خمیدہ ہوکر وہیں بیٹھ گئے۔

سنگ در جاناں پر کرتا ہوں جبیں سائی
سجدہ نہ سمجھ نجدی سر دیتا ہوں نذرانہ

مخدومہ والدہ صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ اس وقت ایک سفید پوش بزرگ ظاہر ہوئے اور اپنا دایاں قدم ان کی گردن پر رکھ دیا، ابھی ان بزرگ کو نظر بھر دیکھا ہی تھا کہ آنکھ جھپکی اور وہ اوجھل ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت والد صاحب نے سر اٹھایا اور والدہ کے ہمراہ قیام گاہ پر

تشریف لائے۔ والدہ کہتی ہیں کہ ہمارے درمیان اس موضوع پر کبھی کسی طرح کی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ والدہ نے حضرت والد صاحب کی زندگی میں کبھی اس راز کو بیان نہ کیا اور نہ ہی حضرت والد صاحب نے اس کا تذکرہ کہیں کیا۔ حضرت کے تقویٰ و طہارت، ظاہر و باطن اور جلوت و خلوت کا جو ہم نے مشاہدہ کیا ہے، اس بنیاد پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفید پوش بزرگ کوئی اور نہیں خود حضور غوث الاعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، جو اپنے غلام کو تمغۂ ولایت سے سرفراز کرنے آئے تھے۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے ہوئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

دعا ہے کہ رب قدیر اپنے پیارے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے حضرت والد علیہ الرحمہ کے درجات کو بلند فرمائے اور جملہ مریدین و متوسلین و متعلقین کو آپ کے فیوض و برکات سے وافر حصہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

ایں دعا از من و جملہ جہاں آمین

محمد محی الدین حسنین بدر قادری

۲۹/ جولائی ۲۰۲۲ء بروز جمعہ

باب اول: سیرت

النور

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ، يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (المائدۃ:۵/۱۷)

یعنی بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب، اللہ اس سے ہدایت دیتا ہے اس کو جو اللہ کی مرضی پر چلا سلامتی کے ساتھ اور انھیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جاتا ہے اپنے حکم سے اور انھیں سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

امام المفسرین علامہ ابن جریر لکھتے ہیں کہ:

''یعنی بالنور محمدًا صلی الله تعالیٰ علیه واٰله وسلم الذی انار الله به الحق واظهر به الاسلام ومحق به الشرك''۔

یعنی نور سے مراد یہاں ذات محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہ وسلم ہے، جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حق کو روشن کیا، اسلام کو ظاہر فرمایا، شرک کو نیست ونابود کیا۔

(تفسیر ابن جریر، تحت آیت مذکورہ)

اور کتاب مبین سے قرآن عظیم مراد ہے، اس میں کوئی ابہام نہیں۔ ''رضوانہ''کی قید اخلاص کی اہمیت پر زور دے رہی ہے۔ یعنی انوار محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم اور قرآن مجید سے پروردگار عالم ان قلوب کو ہدایت و رہنمائی کی دولت عطا فرماتا ہے، جو رضائے حق کی سچی طلب رکھتے ہیں۔

سبل السلام:

سلامتی کے راستے، جن پر چلنے والا دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران ہو۔ امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ السلام: اللہ عزوجل۔ اور علامہ بیضاوی فرماتے ہیں: او سبل اللہ۔ یعنی معرفت الٰہی کے مخصوص راستے، جن پر چلنے سے قربِ حق حاصل ہو، طالب و مطلوب کا بُعد ختم ہو، قربِ حق میسر آئے، محض اپنے خالق و مالک کی خوشنودی کے لیے صبر و قرار تھے کہ مجاہدہ میں غرق رہے۔ اور اس منزلِ حقیقی تک رسائی کے لیے نورِ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہ وسلم اور نورِ قرآن میں اصل اور بنیاد ہیں۔

ظُلُمٰتٍ:

تاریکیاں، یہ کئی قسم کی ہیں: شرک وکفر کی تاریکی، گناہ و سرکشی کی تاریکی، غفلت اور سستی کی ظلمت، ان تمام تاریکیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے نور محمدی اور نور قرآن کافی ہیں۔

النورقرآن میں:

''النور'' اپنے مادہ کے ساتھ مختلف صیغوں میں قرآن مجید کے اندر ۴۹/ مقامات پر آیا ہے:

۲۴/ مقامات پر : النور

۹/ مقامات پر : نُوْرًا

۱/ مقام پر : نُوْرِکُمْ

۱/ مقام پر : نُوْرَنَا

۴/ مقامات پر : نُوْرِہٖ

۴/ مقامات پر : نُوْرِھِمْ

۴/ مقامات پر : اَلْمُنِیْرِ

۲/ مقامات پر : مُنِیْرًا

النوردس معنوں میں:

اور لفظ ''نور'' قرآن عزیز کے اندر دس معنوں میں وارد ہوا ہے:

(۱)ذات نبی صلی اللہ علیہ وسلم (۲)دین اسلام

(۳)ایمان (۴)ہادی

(۵)دن کا اجالا (۶)چاند کی روشنی

(۷)پل صراط پر مومنوں کی روشنی (۸)توریت میں بیانِ حلت وحرمت (۹)قران میں بیانِ حلال وحرام (۱۰)عدل۔

''نور'' بمعنی دین اسلام، جیسے سورۂ توبہ میں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ۔ (سورۂ توبہ:۹/۳۳)

چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور (دین اسلام) اپنے منہ سے بجھادیں۔

اسی طرح سورۂ نور میں:

یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ۔ (النور:۲۴/۳۵)

اللہ اپنے نور (دین اسلام) کی راہ بتاتا ہے جسے چاہتا ہے۔

''نور'' بمعنی ایمان مثلاً سورۂ انعام میں فرمانِ خداوندی:

وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ۔ (الانعام:۱۲۳/۶)

اور اس کے لیے ایک نور کر دیا جس سے لوگوں میں چلتا ہے۔

اور سورۂ حدید میں:

وَيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ نُوۡرًا تَمۡشُوۡنَ بِهٖ۔ (الحدید:۲۸/۵۷)

اور تمہارے لیے ایک نور کر دے گا جس میں چلو گے۔

اور سورۂ بقرہ میں:

اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ۔ (البقرۃ:۲۵۷/۲)

اللہ والی ہے مسلمانوں کا، وہ انھیں اندھیریوں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔

"نور" بمعنی ہادی، جس طرح رب کائنات کا ارشاد عالی سورۂ نور میں ہے:

اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔ (النور:۳۵/۲۴)

اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔

"نور" دن کے اجالے کے مفہوم میں، جیسے سورۂ انعام میں:

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ۔ (الانعام:۱/۶)

اور اندھیریاں اور روشنی پیدا کی۔

"نور" چاندنی کے معنی میں، جیسے سورۂ نوح میں ہے:

وَجَعَلَ الۡقَمَرَ فِيۡهِنَّ نُوۡرًا۔ (نوح:۱۶/۷۱)

اور ان میں چاند کو روشن کیا۔

اور سورۂ فرقان میں:

وَجَعَلَ فِيۡهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيۡرًا۔ (الفرقان:۶۱/۲۵)

اور ان میں چراغ رکھا اور چمکتا چاند۔

"نور" پل صراط پر اہل ایمان کی روشنی کے معنی میں، جیسے سورۂ حدید میں ارشاد رب العالمین ہے:

قِيۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَكُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا۔ (الحدید:۱۳/۵۷)

کہا جائے گا اپنے پیچھے لوٹو، وہاں نور ڈھونڈو۔

"نور" حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام پر نازل ہونے والے صحیفۂ مبارکہ "توریت مقدس" میں حرام اور حلال، اوامر و نواہی، احکام و مواعظ کے بیان بھی فرمانِ خداوندی کے مطابق نور ہے، سورۂ انعام میں ہے:

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ الَّذِیْ جَآئَ بِہٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّھُدًی لِّلنَّاسِ (الانعام:۹۱/۶)

تم فرماؤکس نے اتاری وہ کتاب جو موسیٰ لائے تھے روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت۔

''نور''قرآنی ارشادات وفرامین کو بھی فرمایا گیا ہے، جیساکہ سورۂ تغابن میں رب ذوالجلال ارشاد فرماتا ہے:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا۔ (التغابن:۸/۶۴)

تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر جو ہم نے اتارا۔

اور سورۂ شوریٰ حم عسق میں ہے:

وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا۔ (الشوریٰ:۵۲/۴۲)

اور ہاں ہم نے اسے نور کیا۔

''نور''عدل وانصاف کے معنی میں بھی قرآن مجید کے اندر آیا ہے، سورۂ زمر میں ہے:

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّھَا۔ (الزمر:۶۹/۳۹)

اور زمین جگمگا اٹھے گی اپنے رب کے نور سے۔

اور ''نور' ذاتِ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وبارک وسلم کے معنی میں، مذکورۃ الصدر آیت المائدۃ:

قَدْ جَآئَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ۔ (المائدۃ:۱۷/۵)

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا۔

اسی طرح سورۂ نور میں ہے:

نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٌ۔ (النور:۳۵/۲۴)

نور پر نور (یعنی نبی کے بعد نبی)

سورہ احزاب میں ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝ وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ (الاحزاب:۴۶/۳۳)

اے غیب کی خبریں بتانے والے (نبی) بے شک ہم نے تمہیں بھیجا حاضر وناظر اور خوش خبری دیتا اور ڈر سناتا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلاتا اور چمکا دینے والا آفتاب۔

مَثَلُ نُوْرِہٖ کی تفسیر:

سورۂ نور کی آیت مبارکہ ''اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ''۔ (النور۲۵/۲۴) میں نور سے یا تو قلب مومن کی وہ نورانیت مراد ہے، جس سے وہ ہدایت پاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ کے اس نور کی مثال جو اس

نے مومن کو عطا فرمایا۔ بعض مفسرین نے اس نور سے قرآن مراد لیا ہے۔ اور ایک تفسیر یہ ہے کہ اس نور سے مراد سید کائنات، افضل موجودات، حضرت رحمت عالم صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم ہیں۔ (کنزالایمان، ص ۵۱۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعب احبار سے کہا کہ آپ اس قولِ خداوندی ''مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ'' کا مطلب بتائیں تو حضرت کعب نے فرمایا کہ جو رب تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہ وسلم کے لیے بیان فرمائی ہے۔ مشکٰوۃ سے مراد حضور کا سینۂ مبارکہ ہے۔ زجاجہ سے مراد سرکار کا قلب انور ہے۔ مصباح سے مراد نبوت ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ حضور کا نور، حضور کی شان لوگوں کے سامنے خود بخود ظاہر ہو رہی ہے، خواہ آپ اپنی نبوت کا اعلان نہ بھی فرماتے۔ (تفسیر مظہری تحت آیت مذکورہ)

''جاء ابن عباس الی کعب الادبار فقال حدثنی من قول اللہ عزوجل اللہ نور السمٰوٰت والارض، الآیۃ''۔

ترجمہ:۔ کعب احبار کے پاس ابن عباس رضی اللہ عنہما تشریف لائے، اللہ تعالیٰ کے فرمان ''اللہ نور السمٰوٰت'' کی تفسیر دریافت فرمائی۔

''فقال کعب مثل نورہ مثل محمد صلی اللہ علیہ وسلم''۔

ترجمہ:۔ تو انھوں نے فرمایا کہ مثل نورہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مثال ہے۔

مثل نورہ سے ذاتِ سرورِ کائنات مراد لے ہوئے اسی مفہوم کو کئی اور مفسرین کرام نے اپنے اپنے پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً:

☆ امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری علیہ الرحمہ، تفسیر ابن جریر، ج۱۸/ص۱۰۶۔

☆ امام ابو محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی علیہ الرحمہ، تفسیر معالم التنزیل، ج۵/ص ۶۳۔

☆ امام قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ، شفا شریف، ج۱/ص۱۰۔

قرآن مقدس کی اس آیت نورانی کی تفاسیر سے استفادہ کرتے ہوئے امام احمد رضا قدس سرہ فرماتے ہیں: ؎

شمع دل، مشکٰوۃ تن، سینہ زجاجہ نور کا
تیری صورت کے لیے آیا یہ سورہ نور کا

تفسیر مظہری کی نور افشانی:

حضرت عارف باللہ علامہ ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمہ تفسیر مظہری میں اس آیت مبارکہ کے تحت نورانی و عرفانی بحثیں نقل کرتے ہوئے بطورِ خاص ایک فصل اس باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ قبل بعثت ذاتِ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے علاماتِ نبوت اور رفعت شان کس طرح ظاہر ہوتی تھی۔ اس میں آقا و مولا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ظاہر ہونے والے ایمان افروز واقعات ہیں۔ ان میں یہ واقعہ بھی لکھا ہے:

علاقۂ وادئ القریٰ قحط میں جھلس رہا تھا، لوگ سخت حیران و پریشان تھے کہ بارش ہو۔ حضور کے چچا ابو طالب نے اپنے کمسن بھتیجے کی نورانی انگلیاں پکڑیں، حرم شریف میں آئے، رب کعبہ سے دعا کرنے کے لیے محبوبِ رب کعبہ کی طرف اشارہ کیا اور دعا کرنے لگے۔ اس سے پہلے

کہیں بادل کا نام و نشان تک نہیں تھا، دعا کرنے کی دیر تھی کہ

فاقبل السحاب من ھٰھنا وھٰھنا و اغدق واغدق وانفجر له الوادی۔

پر اسی وقت بادل اِدھر اُدھر سے اُمنڈ پڑے اور خوب موسلا دھار بارش ہوئی، یہاں تک کہ وادیاں بہنے لگیں۔

اس وقت ابو طالب نے مدحِ رسول میں یہ شعر کہا: ؎

وابیض یستسقی الغمام بوجهه

ثمال الیتٰمیٰ عصمة للارامل

ترجمہ:۔ وہ گورے مکھڑے والا جس کے روئے تاباں کے صدقے بادل کی التجا کی جاتی ہے، وہ یتیموں کا آسرا اور بیوائوں کی ناموس کا نگہبان ہے۔

اسی دور کے واقعاتِ عجیبہ میں وہ بھی تو ہے، جسے امام احمد رضا قدس سرہ نے نظم کیا: ؎

چاند جھک جاتا جدھر انگلی اٹھاتے مہد میں

کیا ہی چلتا تھا اشاروں پر کھلونا نور کا

نور کی آمد کا نورانی اعلان:

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌO

بالیقین تمہارے پاس اللہ کی طرف سے بہت بڑا نور آیا اور روشن کتاب۔

وہ ''نور'' ...کون؟...... آمنہ کا لال...... عبد اللہ کا لخت جگر...... ہاشمیوں کا چاند...... قریشیوں کا سورج...... مکہ کا ماہتاب...... مدینہ کا آفتاب...... زمین کا اجالا...... عالم سماوات کا ہالہ...... بوریہ نشین۔ لامکاں کا مکین...... امام السبل...... سید الرسل...... راحت عاشقاں...... مالک چنین و چناں...... سیدنا ومولانا ماوانا وملجانا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہ وصحبہ اجمعین الیٰ یوم الدین۔

ہاں ہاں!...... یہ بشارت انہی کی آمد کی ہے...... یہ مژدہ انہی کی تشریف ارزانی کا ہے...... یہ منادی انہی کے قدوم میمنت لزوم کی ہے۔

فصلی اللہ تعالیٰ علیٰ نور کزو شد نورہا پیدا

زمیں از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

محمد حامد ومحمود وے از خالقش بستور

کزو شد بود ہر موجود از وشد دیدہا بینا

از و در ہر تنے ذوقے وزو در ہر وے آمد شوقے

از وبر ہر زباں ذکرے وزو در ہر سرے سودا

دو چشم نرگسینش راکہ مازاغ البصر خوانند

دو زلف عنبرینش راکہ واللیل اذا یغشیٰ

نوری بشر

رسول کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ساری مخلوقات کے لیے رحمت اور انسانیت کو معبودِ حقیقی تک پہنچنے کا محکم ذریعہ ہیں۔ اس لیے لازم تھا کہ انھیں سارے عالم کے علوم پہ باخبری ہوتی اور خود اُن کے وجودِ گرامی میں ایسی تمام خصوصیات موجود ہوتیں، جو ایک طرف بارگاہِ رب ذوالجلال میں ان کی پذیرائی، عظمت شان اور تقرب کا ثبوت ہوتیں۔ دوسری طرف مخلوقات کو خدائی قدرت، ربوبیت و حاکمیت مطلقہ اور اپنی رسالت کے تسلیم کرانے میں ممد ومعاون بنتیں۔

بالفاظِ دیگر آپ کی ذات والا شان کی دو جہتیں ہونی چاہیے تھیں۔ ایک واصل الی اللہ۔ دوسری شامل فی الخلق، تاکہ خلق خدا کو توحید واسلام کی تعلیم دینے والا رسول گرامی اخلاقی بلندی، پاکیزگی کردار اور عملی پختگی سے انسانیت کے دل کو موہ لے۔ تو ایسا نہ ہو کہ اس کے دُکھ درد کا مداوا طلب کرنے کے لیے اس کا کوئی خدائی رابطہ نہ ہو۔ بلکہ جہاں بشری کمالات اور بنی نوع آدم کے سماجی ماحول میں رسول کو مقبولیت اور پذیرائی کی نظر سے دیکھا جا رہا ہو، رب تعالیٰ کے حضور بھی اس کا روز شب سے افضل ہو۔ دوسری خدائی پیغام لے کر مبعوث ہونے والا نبی، برہانِ الٰہی کی ساری آسمانی خصوصیتوں سے آراستہ ہو کر آئے۔ مگر انسانی دنیا میں نامانوسیت کے باعث انسانوں کی ہدایت ور ہنمائی کا کام نہ کر سکے۔ آدمی اسے کوئی مافوق الانسان وجود تصور کر کے پرے پرے رہ جاتا۔ ایسی صورت میں اسلام کی تبلیغ اور دین حنیف کی اشاعت کا کام کیوں کر ممکن تھا۔ لہٰذا رب دوعالم نے کائنات انسانی میں آنے والے رسول کو کائنات کی اشرف المخلوقات کا جامہ عطا فرمایا۔ اور وجود ایسا بخشا جو فطرتاً خود روشن ہو اور دوسروں کو روشنی بخشنے والا یعنی نور۔

اس طرح رسول خاتم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دو اہم کرداروں کے حامل بن کر سریر آرائے بزمِ عالم ہوئے۔ امام احمد رضا اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں: ؎

اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق میں شامل
خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا

گویا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نوری بشر کی حیثیت سے دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دینے کے لیے دنیا میں تشریف لائے۔ حضور کی نورانیت کوئی قیاسی اور استغراقی مسئلہ نہیں، جسے کوئی مسلمان مسلمان رہ کر نہ مانے۔ قرآن مجید کا ارشاد گرامی ہے:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ O (پ:۶/ع:۷)

ترجمہ:۔ بے شک اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ
كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ
زُجَاجَةٍ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ
شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا

ترجمہ:۔ اللہ کا نور ہے آسمان اور زمین،
اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک
طاق کہ اس میں ایک چراغ ہے، وہ چراغ
ایک فانوس میں ہے، وہ فانوس گویا ایک

غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌO (پ:۱۸/ع:۱۰)

چمکتا ہوا ستارہ ہے، روشن ہوتا ہے مبارک درخت زیتون سے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی، قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہوجائے اگرچہ اس کو آگ نہ لگے، نور پر نور ہے، اللہ ہدایت فرماتا ہے اس نور کی جس کو چاہتا ہے اور لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَO (پ:۱۰/ع:۱۰)

ترجمہ:۔ (دشمنانِ اسلام) تو چاہتے ہیں کہ اپنے مونہوں سے اللہ کا نور بجھا دیں، مگر اللہ اپنے نور کو پورا کرکے ہی رہے گا، اگرچہ کافر بُرا مانیں۔

ان مذکورہ آیاتِ مبارکہ میں نور سے مراد ذاتِ گرامی خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''قد جاءکم من اللہ نور ھو نور النبی صلی اللہ علیہ وسلم''۔

ترجمہ:۔ تحقیق کہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور آیا، وہ نور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔

علامہ حافظ الدین ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

''والنور محمد علیہ السلام لانہ یھتدی بہ کما سمی سراجا''۔

(تفسیر مدارک، ج:۱/ص:۷۔۱۴۱/بحوالہ الذکر الحسنین)

ترجمہ:۔ اور نور، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیوں کہ آپ کی نورانیت سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے، اسی لیے آپ کو سراج منیر بھی فرمایا گیا۔

محی السنہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

''قد جاءکم من اللہ نور یعنی نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم''۔

(تفسیر معالم التنزیل:۲/۲۳، حاشیہ خازن)

ترجمہ:۔ بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور آیا، یعنی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

اس طرح اور بھی اولوالالباب مفسرین کرام نے ''قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ'' میں نور سے مراد ہمارے آقا و مولا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کو تحریر فرمایا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم عربی عبارات سے احتراز کرتے ہوئے ان کی عبارتوں کے باحوالہ اردو تراجم پیش کرتے ہیں:

سید المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

''قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ'' یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

(تفسیر ابن عباس، ص ۷۲)

علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور آیا، یعنی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے کہ اللہ نے اس نور سے حق کو روشن کیا، اسلام کو ظاہر فرمایا اور شرک کو مٹایا۔

(تفسیر ابن جریر)

حضرت علامہ علاؤالدین علی بن محمد المعروف بالخازن علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

تمہارے پاس اللہ کا نور آیا، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام نور اس لیے رکھا کہ آپ کی نورانیت سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے، جس طرح تاریکیوں میں نور سے راہ پائی جاتی ہے۔ (تفسیر خازن، ۱/۴۱۷)

امام المتکلّمین علامہ فخرالدین رازی اس آیۂ کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

بلاشبہ اس نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ اور یہ قول ضعیف ہے کہ نور اور کتاب دونوں سے مراد قرآن کریم ہی ہے، کیوں کہ عطف، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغائرت ثابت ہے۔ (تفسیرِ کبیر ۳/۳۹۵)

حضرت علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وہ نورعظیم انوار نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہی مسلک حضرت قتادہ اور زجاج کا ہے۔ (روح المعانی: ۶/۸۷)

حضرت اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نور سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کتاب سے مراد قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور اس لیے رکھا کہ جس شی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے قدرت کے نور سے سب سے پہلے ظاہر فرمایا، وہ نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔ جیسا کہ حضور کا قول ہے: اول ما خلق اللہ نوری۔ (تفسیر روح البیان: ۱/۵۴۸)

آیۂ ثانیہ ''اللہ نور السموت والارض مثل نورہ الخ'' میں بھی نور ثانی کے بارے میں علمائے مفسرین کے اقوالِ تفسیری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

''المراد بالنور الثانی ھنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وقولہ تعالی مثل نورہ ای نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم''۔

(شفا شریف: ۱/۱۰)

اللہ تعالیٰ کے ارشاد "مثل نورہ" میں نور ثانی سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

مثال کے متعلق علامہ خازن فرماتے ہیں:

"کہا گیا کہ یہ تمثیل نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کعب احبار سے کہا: اللہ تعالیٰ کے اس قول "مثل نورہ کمشکوۃ" کا معنی بیان فرمائیے۔ انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال بیان فرمائی ہے۔ تو مشکوٰۃ (طاق) سے مراد آپ کا سینہ، زجاجہ (فانوس) سے مراد آپ کا قلب اور مصباح (چراغ) سے مراد نبوت ہے۔ یعنی آپ کا وجود گرامی نبوت کے مبارک شجر سے روشن ہے اور نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی اور چمک ایسی ہے کہ اگر آپ اپنے نبی ہونے کا اظہار نہ فرمائیں، پھر بھی از خود ظاہر ہوجائے"۔

(تفسیر خازن، ۱/ ۳۳۲)

مشک آنست کہ خود ببوید

نہ آں کہ عطار بگوید

اور آیۂ ثالثہ "یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا الخ" میں بھی نور سے مراد آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔ تفسیر ابن ابی حاتم میں حضرت ضحاک سے روایت ہے:

"فی قولہ تعالیٰ یریدون ان یطفئوا نور اللہ یقول یریدون ان یھلکو محمدا صلی اللہ علیہ وسلم"۔

(تفسیر در منثور: ۳/ ۲۳۱)

کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر میں فرمایا کہ کفار چاہتے ہیں کہ اپنے مونہوں سے اللہ کا نور بجھا دیں، یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہلاک کر دیں۔

تینوں آیات اور ان کی بیان کردہ تمام تفاسیر میں جو بات واضح ہو کر سامنے آئی اور ہمیں جو قرآنی عقیدہ نصیب ہوا، وہ یہ کہ پروردگار عالم نے سرور کائنات، خاتم النبیین، افضل الرسل، رہبر انسانیت، فخر موجودات حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "نور" بنایا ہے۔ آپ اللہ کی جانب سے نور بن کر رونق بخش بزمِ امکاں ہوئے۔ یہ نور پاک ہی اصل کائنات تھا۔ وجود آدم و بنی آدم ہی نہیں، کائنات اور نظام کائنات کی تخلیق سے پیشتر فلک و ملک کے عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی وجود پذیر تھا اور اپنے رب کی تسبیح میں مشغول بھی۔ خود سرکار کا ارشاد گرامی ہے:

"یا جابر ان اللہ تعالیٰ خلق قبل کل الاشیاء نور نبیك من نورہ ولم یکن فی ذالك الوقت لوح ولا قلم ولا جنۃ ولا

ترجمہ:۔ اے جابر اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے پہلے تمہارے نبی کے نور کو پیدا فرمایا اور اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم، نہ جنت نہ دوزخ، نہ آسمان نہ کوئی فرشتہ، نہ زمین

نار ولا ملك ولا سماء ولا ارض ولا شمس ولا قمر ولا جن ولا انس''۔ | نہ سورج، نہ چاند اور نہ کوئی جن تھا نہ انسان۔

(حجۃ اللہ علی العالمین، ص:۲۸)

مالک ازل نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اپنے حبیب کے نور کو ساری موجودات کی اصل اور ساری مخلوقات سے قبل تخلیق فرمایا۔ حضور سید الانبیاصلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت جبریل سے ان کی عمر دریافت فرمائی تو انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور عرض کی حجابِ چہارم میں ایک ستارہ جو ستر ہزار برس کے بعد چمکتا تھا، اس ستارہ کو میں نے بہتر ہزار دفعہ چمکتے دیکھا ہے۔ سرکار نے یہ سن کر جبریل کو جواب دیا:

''وعزۃ ربی انا ذالك الکوکب''۔ (روح البیان، ص:۹۷۴)

ترجمہ:۔ میرے رب کی عزت کی قسم میں ہی وہ تارا ہوں۔

حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو رب تعالیٰ کا ارشاد ہوا: اے آدم اپنا سر اٹھاؤ۔ تونھوں نے اپنا سر اٹھایا تو عرش کے پردوں میں ایک نور کو دیکھا تو سوال کیا کہ اے پروردگار عالم یہ کیا ہے؟ رب تعالیٰ نے فرمایا:

''ھٰذا نورنبی من ذریتك اسمه فی السماء احمد وفی الارض محمد لولاہ ما خلقتك ولا خلقت سماء ولا ارضا''۔

(مواہب اللدنیہ، ص:۹)

ترجمہ:۔ یہ نور ایک نبی کا ہے، جو تمہاری اولاد میں سے ہوں گے۔ آسمان میں ان کا نام احمد اور زمین میں محمد ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو میں نہ تمہیں وجود بخشتا نہ زمین وآسمان کو بناتا۔

آیات کے بعد ان اقوالِ احادیث نے بھی یہی بات بتائی کہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم دراصل نوری ہے اور یہی نور اصل کائنات ہے۔ زمین وزماں، مکین ومکاں، کروبیاں، ملک وفلک، جنت ودوزخ، عرش وکرسی، لوح وقلم، حتیٰ کہ خود گروہِ انبیاعلیہم السلام کی تخلیق بھی اسی نور مطہر ومنور کا صدقہ وطفیل ہے۔

(روح المعانی ۱/۷۱-۲۱۔ زرقانی علی المواہب، ص ۶۲۔ در منثور، المستدرک للحاکم ۲/۶۱۵)

امام احمد رضا قدس سرہ فرماتے ہیں:

وہی نورِ حق وہی ظلِ رب
انھیں کا ہے سب انھیں سے ہے سب

گویا وہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم اصلاً نور ہیں اور سارے موجودات ان کے وسیلہ اور واسطہ سے وجود پذیر ہیں۔ وہ محمد ہی ہے، جس نے عرش کی بلندیوں پہ رہ کر بھی تمام کائنات کو اپنے عکوس وظلال کی برکتیں تقسیم فرمائیں اور عالم ظہور میں آئے تو دنیائے انسانیت کو ہدایت کے فیض سے مالا مال کیا۔ اس نور کا لطف وکرم دوجہاں میں عام وتام ہے۔

نور محمدی مختلف مراحل میں:

رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کے نور کو اپنے نور سے پیدا فرمایا۔ اور ایک طویل عرصہ تک عرش کے پردوں میں رکھا۔ عرش و کرسی وغیرہ اور نظام کائنات اور عالم کو پیدا فرمانے کے بعد جب حضرت آدم علیہ السلام یعنی ابوالبشر کو پیدا فرمایا تو اس نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی پشت میں رکھ دیا۔ علامہ زرقانی فرماتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو:

''جعل اودع نور المصطفی فی ظهره فكان لشدته ويلمع فی جبينه''۔

(زرقانی علی المواہب، ص:۴۹)

ترجمہ:۔ نور مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پشت میں رکھ دیا، وہ ایسی شدید چمک والا تھا کہ باوجود پشت میں ہونے کے پیشانی سے چمکتا تھا۔

حضرت علامہ امام فخر الدین رازی علیہ الرحمہ نے تحریر فرمایا ہے اور یہی تمام علمائے اسلام کا فرمان ہے کہ فرشتوں کو سجدۂ آدم کا حکم صرف اس وجہ سے ہوا کہ تعظیم نور مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم مقصود تھی۔

''ان الملائكة امروا بالسجود لاٰدم لاجل ان نور محمد صلى الله عليه وسلم كان فی جبهة اٰدم''۔

(تفسیر کبیر:۲/۳۱۸)

ترجمہ:۔ سجدۂ آدم کا حکم فرشتوں کو جو دیا گیا، اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی پیشانی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور تھا۔

اور حضرت آدم علیہ السلام جب روئے زمین پر بھیجے گئے اور ان کی آہ وگریہ سے دنیا گونجنے لگی اور انھوں نے زمین پر قدم رکھنے کے بعد سے مارے شرم و ندامت کے تین سو سال تک آسمان کی جانب سر نہ اٹھایا اور یہی وردِ زبان رہا ''رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا الخ'' بالآخر تین سو سال بعد رب تعالیٰ کا دریائے کرم جوش میں آیا اور اپنے بندہ حضرت آدم علیہ السلام کو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ مرحمت فرمایا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے:

''یا رب اسئلك بحق محمد الا ما غفرت لی''۔

(زرقانی علی المواہب:۱/۶۲)

ترجمہ:۔ اے میرے رب! میں تجھ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے۔

تو رب تعالیٰ نے دعائے آدم کو قبول فرمایا۔ یہی نہیں وہی علامہ احمد ابن محمد القسطلانی مصری راوی ہیں: رب تعالیٰ نے دعائے آدم کی قبولیت پر ارشاد فرمایا:

''یا اٰدم لو تشفعت الینا فی اهل السموات والارض لتشفعناك''۔ (ایضاً)

ترجمہ:۔ اے آدم! اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر تمام آسمان والوں اور زمین والوں کی شفاعت کرتے تو قبول ہوتی۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد اسی طرح پاک ارحام اور طیب اصلاب سے منتقل ہوتا ہوا وہ نور سرکار کے والدین تک پہنچا۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے صُلب آدم میں رکھ کر زمین پر اتارا اور پھر صُلب نوح اور

صلب ابراہیم میں پہنچایا پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اصلابِ طیبہ میں منتقل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے میرے والدین سے نکالا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر میرے والدین تک کوئی زانی نہیں تھا۔ (خصائص الکبریٰ ا/۳۹)

اور یہ نورِ مصطفی ہر زمانے اور ہر دور میں جس مبارک رحم یا جس مقدس صلب میں رہا، اس سے اپنی نورانیت برساتا رہا۔ دنیا پر اس کی لمعانیاں فیض بار رہیں۔ اپنے فیضانِ کرم سے خوارق وکرامات کا صدور ہوتا رہا۔ بالآخر ربیع الاول شریف کو صبح صادق کے سہانے وقت خود لباسِ بشری پہن کر بطن آمنہ سے جلوہ گر ہوا۔ خالق ارض و سماوات نے اعلان فرمایا: قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ۔

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

جس نور کو کبھی عرشِ اعظم کے حجابات میں دیکھا گیا تھا، آج وہ ردائے بشری اوڑھ کر خاکیوں کی انجمن میں آن پڑا۔ ؎

وہ ہر عالم کی رحمت ہیں کسی عالم میں رہ جاتے
یہ ان کی مہربانی ہے کہ یہ عالم پسند آیا

خاکدانِ گیتی کو اپنے قدم کی برکتوں سے مالا مال فرمانے والے آقا و مولا کا اور خلقت کی رو سے نہ کوئی مماثل۔ اور نہ عظمت کی رو سے کوئی ہم پلہ۔ زبانِ جبرئیل کے اعتراف کا ترجمہ یوں ہے:

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیارِ خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

آنے والا آیا اور ویران کدہ میں فصل بہاری اتر پڑی۔ تاریکیوں میں نور کے قمقمے جل اٹھے۔ بے آب و گیاہ خطۂ عرب سے رحم و کرم کا وہ ابر کرم چلا کہ گنگ وجمن تک کی بستیاں سیراب ہوگئیں۔ اسی آنے والے کے روئے تاباں کی چمک نے خورشید و قمر کو شرمایا۔ تمام مخلوقاتِ ارضی و سماوی نے ان کی آمد آمد پر مؤدبانہ سلام و تبریک پیش کی۔ بے زبان شجر و حجر نے اپنی بے زبانی کے باوجود زبانِ حال سے گنگنایا۔ ؎

مصطفی جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمع بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

ربیع النور

ربیع الاول:

نور و نکہت کا ایسا موسم جس نے چشم زدن میں زمانہ کے خزاں رسیدہ ماحول کو رشک اِرم بنا دیا۔ اسی ماہِ منور کی بارہویں (مطابق ۲۰ر اپریل ۵۷۱ء) تاریخ کو خدا کے محبوب، دوعالم کے ممدوح، سرزمین گیتی پہ آیت نور کی تفسیر بن کر جلوہ گر ہوئے۔ ؎

مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

انسانیت کے محسن، صداقت کے پیامی، امن واخلاق کے داعی، جود وسخا کے پیکر، عفت وحیا کے دل دادہ، حلم ومروت کے خوگر، سراپا رحمت، الغرض جملہ کمالات وحسنات سے مزین ہوکر تشریف لائے۔ سارے عالم کو دنیا کے تمام باطل آستانوں سے ہٹا کر وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں جھکانے کے لیے خاتم الانبیا، خاتم الرسل بن کر ظلمت کدۂ ہستی میں وہ آئے۔ ؎

وہ آئے جن کے آنے کی زمانے کو ضرورت تھی

جن وملک نے جن کی بعثت کے ترانے گائے۔ بحر وبر نے جن کی آمد کے گیت سنائے۔ عرش تا فرش جن کے قدومِ میمنت لزوم کے اعزاز میں بقعۂ نور بنا۔ خاک نشینانِ عالم اپنی قسمت پہ رشک کناں، زبانِ حال سے کہہ رہے تھے: ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

بزمِ نور کے مکین، ہم خاکیوں کی انجمن میں۔ زہے قسمت! زہے نصیب!!!

نورانی چہرہ:

جس کی تابانیوں کے سامنے نورانی فرشتوں نے پیشانیاں خم کیں۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ، الخ۔

ترجمہ:۔ تمہارے پاس خدا کی طرف سے نور آگیا۔

نور والے دیکھ کر تیرا عمامہ نور کا

سر جھکاتے ہیں الٰہی بول بالا نور کا

”وَالضُّحٰی“ (رخِ زیبا کی قسم)

جس کے دیدار کی کیفیت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زبان سے: ؎

اذا نظرت الی اسرۃ وجھہ

برقت کبرق العارض المتھلل (ھبیرہ)

ترجمہ:۔ یعنی میں نے آپ کے روئے تاباں پہ نگاہ ڈالی تو جگمگاہٹ ایسی تھی گویا بدلی کی اوٹ سے بجلی کوندرہی ہے۔

حسن وجمال:

جسے ایک نظر دیکھنے والے ایمان وعرفان کے اس مقام پہ فائز کہ غوث الاعظم خود ان حضرات کے خاکِ قدم کو سرمۂ عظمت سمجھیں۔

''من رأنی فقد رأ الحق''۔ جس نے مجھے دیکھا اس نے حق کو دیکھا۔

اے کہ ترا جمال ہے زینت محفلِ حیات
دونوں جہاں کی رونقیں ترے حسن کی زکوٰۃ
وہ کمالِ حسن حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
وہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

وجودِ مسعود:

وجہِ تخلیق کائنات ''لولاك لما خلقت الافلاك والارض''۔

ترجمہ:۔ اے پیارے اگر تمہیں پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں زمینوں اور آسمانوں کو نہ پیدا کرتا۔

گر ارض وسما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں
آمد بروں ز پردۂ تقدیس شاہدے
کز بہر او زمانہ بسے انتظار نہ کرد

زلف معنبر:

جس کی نزہت سے کونین کی بہاروں کو صدقہ ملے۔ ''وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی''۔

ترجمہ:۔ آپ کی زلف شب گوں کی قسم جب وہ بکھر جائے۔

کعبۂ جاں کو پہنایا ہے غلافِ مشکیں
اُڑ کے ابرو پہ جو آئے ہیں تمہارے گیسو
بھینی خوشبو سے مہک جاتی ہیں کلیاں واللہ!
کیسے پھولوں میں بسائے ہیں تمہارے گیسو

چشم مبارک:

جس نے شب معراج جلوۂ ذاتِ باری کا مشاہدہ کیا، وہ اس شان سے کہ

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔

ترجمہ:۔ آنکھ نہ کسی طرف پھیری نہ حد سے بڑھی۔

نگاہیں پھیر لیں تو دو جہاں میں کچھ نہ رہے

اٹھائی آنکھ تو مردوں کو زندگی مل جائے

دست کرم:

وہ جس کی عطا خالق کائنات کی بخشش، جس کی حرکت و سکون مالک ارض و سما کی مشیت کا اشارہ۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰـکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔

ترجمہ:۔ (اے نبی) تم نے جو پھینکا وہ تم نے نہیں پھینکا بلکہ خدائے تعالیٰ نے پھینکا۔

ہاتھ جس سمت اٹھا غنی کر دیا

موجِ بحر سماحت پہ لاکھوں سلام

دل حق آشنا:

جس کا راز داں ان کا خالق و مالک کے سوا کوئی نہیں۔

مَاکَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی۔

ترجمہ:۔ دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا۔

وہ گنجورِ معارف جس کے اِک اِک حرف میں پنہاں

نکاتِ فلسفی، اسرارِ نفسی، راز عمرانی

تکلّم:

تکلم کے لیے زبان خیر البشر کی ہے اور کلام مالک الملک پروردگار کا۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَاِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔

ترجمہ:۔ اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں مگر وحی جو انھیں کی جاتی ہے۔

وہ ناطق جس کے آگے مہر بر لب بلبل سدرہ

وہ صادق جس کی حق گوئی کا شاہد نطق ربانی

لطف وراحت:

ایسی کہ مہد سے تا لحد غم امت میں خود رفتہ۔ ''وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ''۔

ترجمہ:۔ مومنوں کے ساتھ مہربان نہایت رحم کرنے والے۔

چشم پوشی وکرم شانِ شما

کارما بے باکی واصرار ہم

سرعت رفتار:

ایسی کہ نبض کائنات کی حرکت حیران و ششدر، نظامِ شمسی دم بخود۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا۔

ترجمہ:۔ پاکی ہے اسے جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔

شب اسریٰ کے دولہا پہ دائم درود

نوشۂ بزمِ جنت پہ لاکھوں سلام

اخلاق:

وہ جس نے خون کے پیاسے دشمنوں کو غلام بے دام بنا لیا۔

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ۔

ترجمہ:۔ بے شک آپ بہترین اخلاق پر فائز ہیں۔

دم خلقش کہ جاں دادہ عرب را

فرو کشتہ چراغِ بولہب را

اخلاق و مساوات و اخوت کا معلم

بے کس کا مددگار غریبوں کا سہارا

کفِ پا:

کف پاکی نسبت نے وادئ ام القریٰ کی شان و وقعت کو اتنا اجاگر کیا کہ ذاتِ باری نے اس کی قسم ارشاد فرمائی:

لَاۤ اُقۡسِمُ بِہٰذَا الۡبَلَدِ وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِہٰذَا الۡبَلَدِ۔

ترجمہ:۔ مجھے اس شہر کی قسم! کہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو۔

شد قدم گاہِ خلیل اور ابکام

عالی از ایمن قدومش آں مقام

کھائی قرآں نے خاکِ گزر کی قسم

اس کف پاکی حرمت پہ لاکھوں سلام

شہریارِ ارم تاجدارِ حرم

نوبہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام

جس کے قدمِ میمنتِ لزوم نے سارے عالم کو اپنے فیضان و رحمت سے نہال و سرشار کر دیا۔ ؎

ربیعٌ فی ربیعٍ فی ربیعٍ

ونورٌ فوق نورٍ فوق نورٍ

موسم گل میں مرا جانِ گلستاں آیا
ہر طرف شور اٹھا نیر فاراں آیا

جس نے انسان کو انسان بنایا

وہ دانائے سُبل مولائے کل فخر رسل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادئ سینا

صبح صادق کے منادی نے مشرق کے کنگوروں سے جب آفتاب عالم تاب کے آنے کی خبر دی تو پوری کائنات پر ظلمت کا تسلط تھا۔ خورشید کی ضیابار کرنوں نے طلوع ہوکر نہ صرف خطۂ خاص کو روشن کیا، بلکہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کے ایک ایک خطے اور ایک ایک گوشے کو ہر شہر اور ہر قریے کو اپنی فیض بخشی سے مالا مال کر دیا۔ اور اس کی شعاعیں جس طرح شاہی ایوانوں پر پڑیں، اسی طرح غریبوں کے جھونپڑوں پر بھی پڑیں۔

اسی طرح عرب کی سرزمین پر طلوع ہونے والے آفتابِ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس خاک دانِ گیتی کو اپنی بعثت کا شرف بخشا تو پوری کائنات پر جہالت و گمراہی کی حکمرانی تھی، سارا عالم کفر و شرک کے تیز و تند تھپیڑوں کی زد میں تھا، فارس کی سرزمین پر مجوسیوں کے لاکھوں سر آگ کے سامنے جھکے پڑے تھے اور اس نظریے کے پیروکار عراق سے لے کر ہندوستان کی سرزمین تک پھیلے ہوئے تھے۔ یورپ کا مذہب عیسائی تھا، جس کا طویل سلسلہ قدرے ایشیا اور افریقہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ متعدّد ممالک میں آفتاب و ماہتاب اور ان کی جلو میں رہنے والے ستارے، درخت، پہاڑ، سمندر کی پوجا ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ اپنی طرح زمین پر چلتے پھرتے انسانوں کے سامنے اس ظالم انسان نے اپنی پیشانی ٹیک دی تھی، جنھوں نے روزِ اول خداوند قدوس کی صدائے الست بربکم کے جواب میں ''بلٰی'' کا ادا کردہ جملہ فراموش کر دیا تھا۔ اس دور میں بھی ایک خدا کا تصور زندہ تھا، لیکن اسے یہ لوگ خداؤں کا خدا یا سب سے بڑا خدا کہتے تھے اور اس کی ربوبیت میں دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے۔ فاران کی چوٹی سے طلوع ہونے والے آفتابِ ہدایت نے ہمالہ جیسی تمام سر بفلک چوٹیوں کو اپنی صداقت کی کرنوں سے معمور و منور کر دیا۔ یونان و روم کی اولوالعزم حکومتوں کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں، کفر و شرک کے مینارے لرزہ بر اندام ہوگئے۔ اس کی روشنی سے جس طرح سلمان فارسی نے استفادہ کیا، صہیب رومی (رضی اللہ عنہ) بھی بہرہ مند ہوئے۔ آقاؤں میں جس طرح عثمان غنی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنے قلب کو منور کیا۔

صدیوں سے دنیا کے طویل و عریض علاقوں میں غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی حبشی قوم کو جس کا تصور ہی غلامی کا مرادف تھا، اپنے دامن پاک میں جگہ دی۔ جن میں کی مقدم ہستی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ وہی بلالِ حبشی جب تک صرف بلال تھے، یعنی دامن سید ابرار سے وابستہ نہ ہوئے تھے، اُمیہ ابن خلف کے کوڑوں کی ضرب سے وادئ حجاز میں بلال کی چیخیں بلند ہوتیں۔ مگر کسی عرب کے دل میں رحم کا ذرا شائبہ پیدا نہ ہوتا۔ لیکن وہی بلال جب غلامِ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بن گئے تو تمام کلمہ خوانوں کی نگاہ میں قابل صد احترام، لائق اعزاز ہوگئے۔ حضرت بلال کے بارے میں اہل حقائق اب بھی کہتے ہیں کہ: ؎

بدر اچھا ہے فلک پر نہ ہلال اچھا ہے

چشم بینا ہو تو دونوں سے بلال اچھا ہے

الغرض! آپ کے فیضان سے جس طرح ایک امیر آسودہ ہوا، اسی طرح غریب بھی سیراب ہوا۔ آپ کی رحمت کے چھینٹے جس طرح ایک رئیس کی قبا پر پڑے، اسی طرح فقیر کی گدڑی پر بھی پڑے۔ آپ کی نگاہِ رحمت کے صدقے غیر مہذب عربی بدوؤں کو وہ عروج و ارتقا نصیب ہوا کہ ان کی پائوں کی ٹھوکروں نے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو پاش پاش کر دیا۔ مے خانۂ توحید کے اس ساقی نے اپنے مے کشوں کو جب وحدت کا جام پلایا تو اسی پر بس نہ ہو گیا، بلکہ ان کے کام و دہن، امن و آشتی، علم و ہنر، اخوت و مساوات، عدل و انصاف، تقویٰ اور پارسائی سے بھی لذت آشنا ہو گئے۔

جامِ توحید:

توحید کا پیغام ہی وہ پہلی کڑی تھی، جس نے اسلام کو تمام ادیانِ باطلہ سے ممتاز کر دیا۔ جو سر ہزاروں معبودانِ باطل کے سامنے بیک وقت جھکنے کا عادی تھا، ایک خدائے واجب الوجود کی بارگاہ میں جھک گیا۔ مخلوقات کی پرستش کے بجائے خالق کی عبادت ہونے لگی۔ تثلیث کے گورکھ دھندوں میں الجھے ہوئے اذہان، صاف ستھری توحید کی تعلیم، ایک خدا کے پیغام پر لبیک کہہ اٹھے۔ مدتوں سے گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں نے اس آواز کو دل میں جگہ دی، آنکھوں سے لگایا اور توحید کے علم بردار بن گئے۔ آج صف اسلام میں یہ امتیاز مشکل ہے کہ کون کس ملت سے واحد ذوالجلال کی بارگاہ میں جھکا ہے۔ توحید ہی کا درس تھا، جس کی وجہ سے۔ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

خواہ وہ ایرانی ہو یا تورانی، عربی ہو یا عجمی، فاروقِ اعظم ہوں یا بلالِ حبشی، عثمانِ غنی ہوں یا دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہم، غلام ہو یا آقا، فقیر ہو یا داتا، وحدانیت کے متوالے، توحید کے نشے میں سب ایک ہیں۔

پیغامِ امن:

بعثت مبارک کے وقت پورا عرب بدامنی کی بھٹی میں سلگ رہا تھا۔ اس دور کے تمام دستور اسی ایک محور پر گردش کر رہے تھے۔ کسی انسان کا باعزت طریقہ سے سانس لینا دشوار تھا۔ بیٹیوں کو مائوں کی گود بھی پناہ نہ دے سکتی تھیں۔ ایسے پُر آشوب زمانے میں جب کہ آفتاب کی روشنی میں سر بازار عصمتوں پر ڈاکے ڈالے جا رہے تھے۔ ہادیٔ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے امن اور شانتی کا وہ درس دیا کہ کایا پلٹ گئی اور فرمانِ نبوی کے مطابق یمن کے دارالسلطنت صنعا سے ایک عورت تنہا سفر کر کے سونا اچھالتی ہوئی آئی، حج کر کے واپس بھی چلی گئی، مگر راہ میں کسی نے اس پر آنکھ تک نہ دکھائی۔ ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی

شرافت کے نشیمن جس سے ہوتے تھے تہ و بالا

اور اب وہی مقام ہے کہ جہاں سے شاہانِ زمانہ کو امن کا پیام دیا جانے لگا۔

دولتِ علم:

اور تمام خامیوں کی طرح اہل عرب علم وہنر کی دولت سے بھی محروم تھے۔ بعثت نبوی کے زمانے میں معددے چند انسان پڑھے لکھے تھے۔ جس نبی کے پاس پہلی وحی علم کی شان وشوکت بیان کرتی ہوئی نازل ہوئی، اس کے فیضانِ علم و ہنر نے جہالت کی آغوش میں پرورش پانے والے انسانوں کو معلّمِ زمانہ بناکر دنیا کے لیے باعث افتخار بنادیا۔ جیساکہ علی مرتضیٰ کے متعلق ارشاد فرمایا:

''انا مدینة العلم وعلی بابها''۔

میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ۔

انھیں علوم کی برکت تھی کہ نہ صرف اسلام کی آسمانی کتاب بجنسہٖ محفوظ ہے، بلکہ اس کے لانے والے رسول برحق کی زندگی کا ہر ہر شعبہ اور ہر جز ہماری نظر میں ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے اصحاب کی پوری زندگی بھی شرح وبسط کے ساتھ ہماری نگاہوں میں محفوظ ہے، جس کا اقرار غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔

جیساکہ ڈاکٹر اسپرنگر کی شہادت موجود ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی رجال کی کتابوں میں پانچ لاکھ انسانوں کی مکمل زندگی محفوظ ہے۔ یہی مؤرخ دوسری جگہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ اول تا آخر روشنی میں ہے۔ ؎

صداقت ہو تو دل سینے سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوالیتی ہے مانی نہیں جاتی

سرمایۂ اتحاد!:

قاسم رحمت نے جس طرح ساری دنیا کو اور نعمتوں سے بہرہ مند فرمایا، خصوصًا ملک عرب کے ان باشندوں کو خانہ جنگی جن کا آبائی ترکہ تھا، اخوت ومساوات کا ایسا درس دیا کہ تاریخ عالم جس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ صحابۂ کرام نے سرکار کی زبانِ فیضِ ترجمان سے بارہا یہ آواز سنی کہ اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جائو۔ یہیں تک نہیں آگے بڑھو تو حجۃ الوداع کے موقعہ پر زبانِ رسالت سے مساوات و بھائی چارگی کے یہ کلمات سنائی دیں گے کہ عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر کسی قسم کی فضیلت نہیں۔ تم سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور حضرت آدم مٹی سے بنے تھے۔ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ پوری دنیا میں ذلیل سمجھی جانے والی حبشی قوم نے آقائوں کا ساعروج حاصل کرلیا۔ اس وقت ہماری نگاہیں حضرت عکرمہ پر مرکوز ہوکر رہ جاتی ہیں، جو لاکھوں علما و مشائخ کے مخدوم ہیں۔ آقائوں کو غلاموں کے ساتھ برابری کا برتائو کرنے کا حکم دیا تو اس طرح عمل ہوا کہ محفل میں آنے کے بعد آقا و غلام میں تمیز دشوار ہوگئی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک صحابیِ رسول اپنے غلام سے کسی بات پر خفا ہوگئے، حتیٰ کہ زد وکوب پر اتر آئے۔ آقائے نامدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا گزر ہوتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس غلام پر تمہیں جس قدر قدرت ہے، اس سے کہیں زیادہ مالک قضا و قدر تم پر قادر ہے۔ خدا سے ڈرو۔ صحابیِ رسول نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا، دن میں کتنی دفعہ معاف کروں؟ سرکار نے فرمایا: ستر

بار۔ یہ سنتے ہی احساس ذمہ داری سے اس قدر مغلوب ہوئے کہ پکار اٹھے۔ یا رسول اللہ! آپ شاہد ہیں کہ میں نے اسے آزاد کر دیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی حکم آیا ہے کہ اپنے غلام کو ایسا کام نہ کہو، جس کا کرنا دشوار ہو۔ بلکہ ایسے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائو۔

یہ تو رہے انسان کے حقوق۔ سرکار دوعالم نے بے زبان جانوروں کے بھی حقوق مقرر فرمائے ہیں۔ ایک بار ایک اونٹ دربارِ رسالت میں مستغیث ہوا کہ یا رسول اللہ! مالک مجھ سے کام تو خوب لیتا ہے، مگر میری غذا کا خیال نہیں کرتا۔ آپ نے مالک کو بلا کر جانور کا حق یاد دلایا اور اسے آرام پہنچانے کی ترغیب دی۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ دوعالم کے مولیٰ پانی لے کر وضو کرنے بیٹھے ہیں اور پیاسی بلی پہنچ گئی تو برتن کا منہ جھکا دیا، تاکہ وہ آسودہ ہو لے۔ اگر اس تعلیم کا اثر دیکھنا ہو تو فاتح مصر حضرت عمرو ابن عاص کے خیمے میں دیکھو۔ جہاد کے دوران آپ کے خیمے میں ایک کبوتر نے گھونسلہ بنا لیا تو کوچ کے وقت فراش کو حکم دیا کہ خیمہ بدستور چھوڑ دیا جائے، تاکہ اس مہمان کو تکلیف نہ ہو۔ اس مقام پر فسطاط نامی شہر اس خیمہ کے یادگار کے طور پر موجود ہے۔

اسی تعلیم کا اثر تھا کہ حضرت رابعہ بصریہ نے ایک کتے کو پیاسا دیکھا تو اپنا موزہ اتار کر اوڑھنی اور چوٹی کی رسّی سے اس کو آسودہ کر دیا۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک بلند پایہ شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ شب کو تہجد سے فارغ ہو کر بستر کے پاس آئے تو دیکھا کہ ایک بلی پڑی سو رہی ہے، آپ کابل کی شدید سردی میں خود پوری رات کھڑے رہ گئے، مگر بلی کو لحاف سے نہیں اٹھایا۔ اس قسم کی ایک دو نہیں، بے شمار مثالیں تاریخ و سیرت کی کتابوں میں پڑی ہیں۔ حقیقت شناس اسلاف نے ان کی تعلیم کو نظر میں رکھا تو یہاں تک پہنچے۔ لیکن آج کے مسلمان خود اپنی تاریخ سے غافل ہیں۔ اسی لیے اپنے سرچشمۂ حقیقی سے استفادہ بھی کہاں کرتے ہیں۔ ؎

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اسی طرح عدل و انصاف کی تلاش کرو گے تو فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مکمل دس سالہ خلافت تمہارے سامنے مکمل عدل بن کر آجائے گی کہ ایک باپ نے اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم کے لیے اپنی اولاد کی محبت کا خیال نہ کیا۔

صرف یہی نہیں بعد کے فرمانروائوں نے بھی اس اسلامی امانت کی حسب مقدر حفاظت کی۔ جیساکہ سلجوقی خاندان کے باعظمت سلطان ملک شاہ کی سوانح میں ملتا ہے کہ ایک بار اپنے لشکر کے ساتھ کسی جنگل یا میدان میں قیام پذیر تھا کہ اس کے کچھ سپاہیوں نے ایک غریب بیوہ کی گائے پکڑ لی اور ذبح کر کے کھا گئے۔ اس غریب بیوہ کے پاس اس گائے کے سوا کوئی اور ذریعۂ معاش نہ تھا۔ وہ اسی کے دودھ کو بیچ کر اپنا اور یتیم بچوں کا پورا خرچ چلاتی تھی۔ جب اس کا وہ سہارا بھی ختم ہو گیا تو بڑھیا سر راہ پل کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ جب بادشاہ کی سواری گزرنے لگی تو پکار کر کہا: اے بادشاہ سلامت! یہ تو بتا کہ میرا اور تیرا حساب اسی پل پہ ہو گا کہ پل صراط پہ۔ بادشاہ نے سنا تو چکرا کر رہ گیا، خوفِ قیامت سے لرزہ براندام ہو گیا، صبح قیامت کا نقشہ اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔ پوری فوج کو رُکنے کا حکم دیا اور بُڑھیا سے مخاطب ہوا: بوڑھی ماں! آخر تجھے کیا تکلیف پہنچی ہے کہ سر راہ تو نے میرے گھوڑے کی رکاب پکڑ کر روزِ قیامت کی یاد دلا دی؟ بُڑھیا نے ماجرا بیان کیا۔

بادشاہ غصے میں لال پیلا ہو گیا، اس پر خشیت ایزدی کا اس قدر غلبہ ہوا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی اور پھر بُڑھیا کو اس کے حق سے زیادہ نواز کر روانہ کیا گیا اور مجرم کو سزا دی۔

یوہیں تقویٰ اور پرہیز گاری کو کمالِ انسانی کا تاج قرار دیا گیا ہے۔ تمام اعزاز و اکرام اس کے سامنے آکر سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ ''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ''۔ میں اسی جوہر گراں مایہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اگر اس کی زندہ تصویر دیکھنا چاہو، جنید و شبلی کی زندگی کا مطالعہ کرو۔ اور اگر ہندو پاک میں اس کی تفسیر دیکھنا ہو تو اجمیر کے خواجہ معین الدین چشتی، دلی کے محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیا کی سوانح حیات پڑھ جائو تو معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں نے کس راستہ کو اپنایا کہ خود دنیا کے لیے نمونۂ عمل بن گئے۔ اور اگر نگاہِ حق بیں سے دیکھا جائے تو یقینا معلوم ہو جائے گا کہ بغداد و کلیر، ملتان و بلخ کے روحانی پیشوائوں کا تاجدار مدینے کی سرزمین پر آج بھی سرچشمۂ رحمت بار ہوا ہے۔ ؎

سارے عالم پر برابر ہے عنایت آپ کی
راجدھانی ہے عرب دنیا حکومت آپ کی

اصول کی فتح

اسلام ایک انقلابی پیغام تھا۔ ایک خدائی آواز تھی۔ ہدایت کا ایک قدرتی مینار تھا۔ جسے دبا لینا آسان نہ تھا۔ ایک فطری قانون جو دلیل کی قوت پر دنیا کو مسخر کرنے آیا تھا، تاکہ جاہلی انتشار وافتراق کے بجائے اخوت و مساوات کا ایک محکم نظام قائم کرے۔ غیر اصولی سماج کو ضابطۂ حیات بخشے۔ غیر منظم افراد کو اجتماعیت کی راہ پر لگائے۔ لا قانونیت کو ختم کرکے ایک مکمل دستور رائج کرے۔ ظلم و عدوان کو فنا کرکے عدل و انصاف کا تسلط جمائے۔ ذہن و فکر سے جہالت کی آلائشیں صاف کرکے علم وادراک کی قوت کو تحریک عطا کرے۔ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کے اوراقِ گم شدہ کو پھر سے لوحِ عمل پر اجاگر کرے۔ معاش و معاشرے کے پہیے میں پستے ہوئے مظلوم طبقوں کو سماج کا معزز فرد قرار دے۔

بالفاظِ دیگر انسان کے خود ساختہ اصولِ حیات کی کتاب بند کرکے خدائے واحد کا نازل کردہ قانون جاری کرے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O (آل عمران:۱۰۴)

ترجمہ:۔ اور تم میں ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو دعوت دے بھلائی کی طرف اور نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

عرب کا جاہلی نظام جس میں فاسد معاشرے کی تمام بُرائیاں موجود تھیں، وہ کیسے یہ برداشت کر سکتا تھا کہ اس کے بجائے کوئی نیا قانونِ زندگی لاگو ہو۔ اسلام کا ہر نظریہ ان کے رسم و رواج کے خلاف تھا۔ اس لیے مکہ کی پوری فضا پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خلاف مشتعل ہو گئی۔ کفر وبددینی کی تاریکی میں قرنہا قرن سے زندگی کے دن کاٹنے والوں پہ جب یک بیک ہدایت کا سورج طلوع ہوا تو انھوں نے اسے

اپنی دنیا کے لیے چیلنج سمجھا اور اس کی افادیت کو نظر انداز کر کے معاندانہ روش اختیار کی۔ انھوں نے چاہا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو نیست و نابود کردیں اور اس کے لیے ہر ممکن تدبیر سے باز نہ آئیں۔ چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر اعلانِ نبوت کرنے سے پیشتر تک محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو پورا مکہ بالاتفاق امین و صادق کہتا تھا، جس کا ثبوت تعمیر کعبہ کے موقع حجر اسود کی نصبی کے سلسلہ میں واقع شدہ اختلاف اور حضور کے منصفانہ حل سے ظاہر ہے۔ (سیرت ابن ہشام، ج ا ر ص ۱۰۵)

حجر اسود کو اس مقام پر نصب کرنے کے مسئلہ پر تمام قبائل عرب آپس میں تن گئے۔ ہر قبیلہ اسی خواہش میں تھا کہ یہ شرف ہمیں ملے۔ تلوار کھینچنے کی نوبت آگئی۔ اس وقت کچھ سنجیدہ لوگوں نے باہم مشورہ کر کے طے کیا کہ کل جو شخص سب سے پہلے مسجد کے دروازہ سے داخل ہو، اس کے حکم پر تمام لوگ آمنا صدقنا کہیں۔ سب نے اس تجویز کو منظور کیا۔ صبح کو جب لوگ پہنچے تو انھیں سب سے پہلے آنے والے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ملے۔ اس وقت سب نے یہی کہا کہ آپ تو صادق و امین ہیں اور پھر آپ کی تجویز کے مطابق چادر میں حجر اسود رکھ کر سردارانِ قبائل نے ہر طرف سے چادر کو اٹھایا۔ خانۂ کعبہ کے پاس پہنچے تو سرکار محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اٹھا کر اس کی جگہ لگا دیا۔ اس واقعہ کے وقت آپ کی عمر شریف ۳۵ر سال تھی۔ پتہ چلتا ہے کہ اعلانِ نبوت سے قبل پورا مکہ آپ کے حسنِ اخلاق، پختگی کردار، راست بازی و امانت داری کا قائل تھا۔ مگر جونہی اعلانِ نبوت کیا اور پیغامِ اسلام سنایا، دوستی دشمنی میں اور محبت عداوت میں تبدیل ہوگئی۔ ابتداءً اس مخالفت کا زور کم تھا، مگر جوں جوں دعوتِ اسلام میں وضاحت آتی گئی، عداوت و مخالفت کے رجحان میں شدت پیدا ہوتی گئی۔

رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات روز بروز شدید سے شدید تر آزمائش میں مبتلا ہوتی گئی۔ مگر بارِ نبوت کا مقدس امانت دار کسی معمولی انسانی صبر و تحمل کا مالک تو نہ تھا، جسے صحیفۂ قرآنی کا گراں وزن اپنے سینے پہ اٹھانا تھا۔ مکہ کے مشرکین نے اسے اور اس کی آواز پر صدائے لبیک بلند کرنے والے مٹھی بھر انسانوں پر جینے کی راہیں تنگ کردیں۔ سماجی اور معاشرتی (Social Boycott) بائیکاٹ تک نوبت آئی۔ سردارانِ مکہ نے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کو حیاتِ انسانی کے وہ تمام مصائب جھیلنے پر مجبور کیا، جو کسی انسان کے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیش آسکتے ہوں۔ متواتر ظلم رانیوں سے تنگ آکر آپ نے اصحابِ کرام کی ایک جماعت کو حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس قافلۂ مہاجرین میں ۸۵ر مرد اور ۱۷ر عورتیں تھیں۔ اس سے قبل بھی ۱۱ر مردوں اور ۴ر عورتوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی جماعت نے حبشہ ہجرت کی تھی، جس میں حضرت عثمانِ غنی اور حضور کی صاحبزادی حضرت رقیہ بھی تھیں۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد ان لوگوں نے یہ افواہ سنی کہ قریش سب کے سب مسلمان ہوگئے تو وہ لوگ لوٹ آئے تھے۔

مشرکین کو یہ ہرگز گوارہ نہ تھا کہ محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ماننے والے مکہ سے نکل کر کسی اور جگہ بھی اطمینان کا سانس لے سکیں۔ مسلمانوں کا یہ قافلہ جب حبشہ پہنچ گیا تو حزبِ مخالف کی جانب سے عمرو ابن عاص اور عبداللہ ابن ربیعہ سفیر بن کر نجاشی شاہِ حبشہ کی خدمت میں پہنچے، تحائف و نذرانے پیش کرنے کے بعد کہا کہ ہمارے کچھ آدمی مکہ سے آپ کے شہر میں بھاگ آئے ہیں۔ ان لوگوں نے ایک

نیا دین اپنا لیا ہے، جو بُت پرستی اور نصرانیت کے علاوہ ہے۔ اگر ان لوگوں کو آپ کی پشت پناہی حاصل ہوگئی تو ممکن ہے کہ آپ کا شہر بھی ان لوگوں کی فتنہ انگیزی کا اکھاڑا بن جائے۔ نجاشی کے درباریوں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی، مگر بادشاہ پہ اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔

دوسرے دن دونوں فریق دربار میں طلب کیے گئے۔ اس وقت مسلم وفد کے قائد حضرت جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑے بلیغ انداز میں یہ تقریر فرمائی:

اے بادشاہ! ہماری قوم ایک جاہل قوم تھی، بتوں کو پوجتی تھی، مردار گوشت کھاتی تھی، بدکاریاں اور بدعنوانیاں کرتی تھی، ہم میں کے قوی لوگ کمزوروں پر بے حد ظلم وستم کرتے تھے۔ یہی حالت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک رسول بھیجا، جس کی خاندانی شرافت، نسبی بزرگی، فطری صدق وامانت اور اخلاقی خوبیوں سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے۔ اس پیغمبر نے ہمیں یہ دعوت دی کہ خدا کو ایک جانیں، اسی کی عبادت کریں، جس میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ بتوں کی پوجا چھوڑ دیں، سچ بولیں، امانت داری اختیار کریں، متعلقین سے محبت کا سلوک رکھیں، پڑوسیوں سے رواداری برتیں، قتال وخونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، پاک باز عورتوں پہ تہمت نہ لگائیں، نماز پڑھیں، صدقہ کریں، روزہ رکھیں۔ تو ہم لوگ اس رسول پہ ایمان لائے، اللہ کی عبادت کرنے لگے، شرک وبت پرستی ختم کردی، حلال وحرام میں امتیاز کرنے لگے۔ اسی وجہ سے ہماری قوم دشمن ہوگئی اور جور وستم کے ذریعہ پھر بُت پرستی کی طرف لوٹانے کی کوشش کرنے لگی، تاکہ ہم خدائے واحد کی عبادت ترک کردیں۔ حرام کو حلال سمجھنے لگیں۔ جب ان کا ظلم وستم ناقابل برداشت ہوگیا تو ہم تھوڑے لوگوں نے آپ کے ملک میں آکے پناہ لے لی۔ امید ہے کہ آپ کے یہاں ہم پہ کوئی ظلم نہ ہوگا۔

یہ تقریر سن کر نجاشی نے کہا: تمہارے پیغمبر پہ جو کلام اترا ہے، اس میں سے کچھ سنائو۔ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورۂ مریم کی چند آیتیں پڑھیں، جنھیں سن کر وہ بہت رویا، آنسوؤں سے اس کی داڑھی بھیگ گئی اور متاثر ہوکر کہا: یہ کلام اور انجیل مقدس دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔

پھر سفارت مکہ کی طرف متوجہ ہوکر کہا: تم لوگ واپس جائو۔ واللہ! میں ان کو تمہارے سپرد نہ کروں گا۔ عمرو ابن عاص اور عبداللہ ابن ربیعہ دربار سے نکل آئے۔ دوسرے روز پھر پہنچے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مسلمانوں کے عقیدہ کا ذکر کیا اور ورغلایا کہ یہ لوگ ان کے متعلق بہت بُرا عقیدہ رکھتے ہیں۔ نجاشی نے پھر مسلمانوں کو طلب کیا اور سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پیغمبر اسلام کیا کہتے ہیں؟

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ہمارے رسول نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو اعتقاد بخشا، وہ یہ ہے کہ وہ خدا کے بندے، پیغمبر، روح اللہ، حکمت اللہ ہیں۔

اس جواب سے نجاشی مطمئن ہوگیا۔ زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا: واللہ! تم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو کہا، وہ اس سے اس تِنکے کے برابر زیادہ نہیں۔

نجاشی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سفرائے مکہ اور دربار میں بیٹھنے والے دنگ رہ گئے۔ مارے غصہ کے ان کے نتھنے سے خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی، مگر بادشاہ پہ اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس طرح حضرت رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف کار پردازوں کو ایک زبردست دھچکا پہنچا اور اپنی سفارت کے خائب وخاسر لوٹ آنے پر انھیں بڑا قلق ہوا۔

حضرت جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر کی موزونیت اور بلاغت کے متعلق مستشرق مؤرخ لارڈ کرومر (Cromer) کہتا ہے کہ مشرق و مغرب کے علما جمع ہوکر اسلام کی حقیقت بیان کریں تو اس سے اچھا نہیں کہہ سکتے، جو مہاجرین حبشہ نے کہا۔ (دروس التاریخ، ص۲۱)

ایک شخص ایک امت

سرزمین عرب اور اس کا مرکزی مقام مکہ، مکہ مطلع مصطفی، مکہ وہ مقام ہے جہاں سے امن وانسانیت کا آفتاب نمودار ہوا اور کرۂ ارض نہیں، سماوات کی پنہائیوں میں جس کی تابانیوں کے خطبے پڑھے گئے۔ محسن کونین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے قبل ایک شب جب کہ چاندنی کی روپہلی چادر بساطِ عالم پر کھنچی ہوئی تھی۔ چاند کا من موہنا مکھڑا حسن کی ضیا پاشی کر رہا تھا۔ کہکشاں کی طنابیں ابروئے خمدار کا نقشہ مرتب کر رہی تھیں۔ صحن حرم میں قریش تقریب عید میں مصروف تھے۔ دیوار حرم پہ سجے سجائے بُت سجدوں کے نذرانے وصول کر رہے تھے۔ تمام حاضرین رنگ رلیوں میں یوں مصروف تھے گویا مسرت و انبساط کا یہ پہلا اور آخری موقع نصیب ہوگیا ہے۔

کہیں سازوں کی تان پر لہکتی ہوئی آواز فضا میں تیرتی چلی جارہی تھی۔ کہیں جام ومینا کے کھلونوں میں الجھے ہوئے کھلاڑی مئے ارغوانی سے مدہوش ہوکر لات وہبل کی ربوبیت کی شہادت دے رہے تھے۔ آوازیں بالکل بے ربط اور آپس میں گڈمڈ۔ اور یہ لڑکھڑاتے قدموں سے بھاگتے ہوئے لوگ اپنے فطری اور آفاقی لباس میں اپنے بتوں کا طواف کرکے شاید اپنی جبلت نفس کو تسکین دے رہے ہیں۔

اور ذرا ان زاویوں کی طرف بھی تو دیکھتے چلیے۔ رقص و سرور کی اس عبادت میں یہ بھی مردوں سے کچھ پیچھے نہیں۔ اس فتنۂ عزازیل سے دور، بالکل ایک طرف، چند انسان بیٹھے ہوئے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ بڑی راز داری اور پوشیدگی کے ساتھ۔

ذرا دیکھو تو سہی! یہ عبادت ہے یا نفس پرستی؟...ان میں ایک۔

ایہاالاخوان! دوسرے کی بارعب آواز اُبھری۔ قریش اپنے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کو چھوڑ چکے۔ اور ان کے طریقے کو خیر باد کہہ چکے۔ ان کی تعلیمات کو بھول گئے۔

اماں! صرف قریش کی کیا بات آج تو پورا عرب بُت پرستی کا شکار ہے۔ ابراہیمی مسلک تو کب کا دفن ہوچکا۔ ذرا سوچو! اور اپنے ضمیر کے آئینے میں دیکھو تو صاف صاف نظر آئے گا کہ پوری قوم گمراہی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ بت۔ جو نہ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں۔ ان کا طواف کیا جارہا ہے۔ الامان والحفیظ۔

تیسرے نے غبار آلود عبا کا دامن زانو پر دراز کرتے ہوئے کہا:اب وہ وقت آن پہنچا کہ بلا توقف اپنی اونٹنیوں پہ کَجاوے کسو اور ملکوں ملکوں دینِ حنیف کے پیروؤں کو تلاش کرو۔ دوستو اور ساتھیو! اپنی کوشش سے یا تو منزل کو پاؤ گے یا جہد مسلسل کے وسیع صحرا میں دفن ہو جاؤ گے۔ کوشش، کوشش، مسلسل اور متواتر کوشش۔

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے

جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

چاروں نے کعبے کی طرف رُخ کیا اور تلاشِ حق میں ثابت قدمی کی دعا مانگنے لگے۔ اے ابراہیم کے پروردگار! ہمارے مسند عزیمت کو جستجوئے حق میں مستقیم رکھ اور ہدایت کی جولا نگاہ میں فوز و فتح سے بہرہ مند فرما۔ ویرحم اللہ قال آمینا۔

یہ تھے دینِ حنیف کے چار متلاشی ورقہ ابن نوفل، عبد اللہ ابن جحش، عثمان ابن الحویرث الاسدی، زید ابن عمرو ابن نفیل عدوی۔ دعا کے مدھم بول پجاریوں کے ڈھول کی صدا میں گم ہو گئے اور بد دینی کی بھبھلاتی راکھ میں چند شراروں نے نئے عزم و ارادے کے ساتھ اپنی مجلس برخواست کی اور حرم کی سرزمین بدستور رقص گاہِ ابلیس بنی رہی۔ یہ سچ ہے کہ گھناؤنے ماحول کی پلیدگی ہر ذہن کو اپنی نجاست میں نہیں سمیٹ سکتی۔ تاریکیوں کے اتھاہ ساگر میں ننھے سے جگنو کی چمک بھی منفیات کے دفتر میں ایک مثبت وجود کا ثبوت ہے۔ چاروں نے صیغۂ راز میں کیے گئے اس وعدے کو عملی جامہ پہنایا۔

عثمان نے تسکینِ روح کی خاطر ترکِ وطن پر کمر باندھی اور دور دراز ملکوں کی خاک چھانتے ہوئے روم کے بادشاہ قیصر تک رسائی حاصل کی اور بالآخر صحیفۂ نصرانیت میں حقیقت کی کچھ لمعانیوں کا احساس کر کے نصرانیت اختیار کر لی۔

عبداللہ ابن جحش نے دورِ اسلام پایا۔ لیکن اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی اپنی متردد اور چنچل طبیعت کو برقرار نہ رکھ سکے اور دینِ مسیح میں داخل ہو گئے۔

ورقہ ابن نوفل اسدی اولاً تو عیسائی ہو گئے اور اس کے مذہبی دفاتر کو خوب اچھی طرح جانچا پرکھا اور پھر بعد میں ان کے اسلام لانے کی روایت بھی نہیں ملتی۔ ورقہ نے اپنے اشعار کے ذریعہ بُت پرستی سے اجتناب اور نکوکاری کی ترغیب دی ہے۔ ان کے اشعار میں قیامت کی ہولناکیوں کا ذکر بھی ملتا ہے، جن سے ان کی خدا ترسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مشرکانہ رسموں سے اقتباض کے بارے میں لکھتے ہیں: ؎

لا تعبدن الها غير خالقكم

فان دعيتم فقولوا دونه حدد

ترجمہ:۔ اپنے پروردگار کے علاوہ کسی کی عبادت ہرگز ہرگز نہ کرنا، اگر بلائے بھی جاؤ تو کہہ دو کہ غیر اللہ کی عبادت ممنوع ہے۔

ربِ ابراہیم کی حمد یوں کرتے ہیں: ؎

سبحان ذی العرش لا شیء یعادله

رب البرية فرد واحد صمد

ترجمہ:۔ عرش والا خدا بے نیاز ہے، جس کا کوئی ہمسر نہیں۔ وہ تمام مخلوقات کا پالنہار ہے، بے مثل ہے، اکیلا اور بے نیاز ہے۔

سبحان ثم سبحان نعوذ به

وقبلنا سبح الجودی والجمد

ترجمہ:۔ پناہ مانگتے ہوئے ہم اس کی بار بار پاکی بیان کرتے ہیں اور اس سے قبل کوہِ جودی وجمد نے بھی پاکی بیان کی ہے۔

بے ثباتیِ عالم کی تصویر کشی کا اندازہ ملاحظہ فرمائیے: ۔

لا شیء مما تری تبقی بشاشته

یبقی الاله ویودی المال والولد

ترجمہ:۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کا موجودہ حسن باقی رہنے والا ہو، پروردگار عالم رہنے والا ہے اور مال واولاد سب فنا ہوجانے والے ہیں۔

موت کی یقینی پیش کش کو بیان کرنے کا تیور قابل غور ہے: ۔

حوض هنالك مورود بلا كذب

لابد من وردہ یوما کما وردوا

ترجمہ:۔ موت ایک ایسا حوض ہے کہ جس پر ایک نہ ایک دن تو اترنا ہی پڑے گا۔

ان تمام متلاشیانِ صداقت میں زید ابن عمرو ابن نفیل عدوی کو عجیب عجیب صبر آزما دور سے گزرنا پڑا۔ انھوں نے نہ تو نصرانیت قبول کی، نہ یہودیت اور نہ مجوسیت کا شکار ہوئے۔ البتہ اپنے ارد گرد کے مشرکانہ مذہب سے بے نیاز ہوگئے۔ اکثر کہا کرتے: ''انا اعبد رب ابراہیم''۔ میں ابراہیم کے پروردگار کا پرستار ہوں۔ اپنے تینوں ہم مشربوں کی طرح انھوں نے بھی مکہ سے نکل کر حق کی جستجو کرنی چاہی، مگر صفیہ بنت الحضرمی ہر ارادہ کی راہ کا روڑہ بن جاتی۔ تلون مزاج اور خشونت کیش بیوی ہر وقت زید کے سر پر سوار رہتی اور جب سے اسے معلوم ہوگیا تھا کہ زید اپنے آبائی مذہب سے بے زار ہوگئے ہیں، سخت نگرانی اور کڑی نگہداشت کرتی۔ اور جب خود نہ روک سکی تو خطاب ابن نفیل کو آگاہ کردیتی۔ وہ زید کے ساتھ بہت بُری طرح پیش آتا۔ اور پھر زید کو اپنا ارادہ منسوخ کرتے ہی بنتی۔

سنا ہے لوہا تپ تپ کر زنگ سے منزہ ہوجاتا ہے اور خوب پک جانے کے نتیجہ میں خالص باقی رہ جاتا ہے۔ زید کو قریش سے باغیانہ کردار اپنانے کی پاداش میں عجیب عجیب حوصلہ شکن مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ صفیہ اور خطاب وغیرہ کی سختیوں نے انھیں اپنے اعتقاد میں اور پختہ کردیا۔ دین حنیف سے لگن اور زیادہ بڑھ گئی۔ اور شرک سے تنفر کا جذبہ آتش فشاں کی شکل اختیار کرتا گیا۔ زید کی سر مستگی اور طلب کا یہ عالم کہ حرم خلیل میں قدم رکھتے تو بے اختیار پکار اٹھتے: ''لبیک حقا حقا تعبدا حرقا''۔ یعنی اے معبودِ برحق میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں، میری حاضری عاجزانہ اور غلامانہ ہے۔ پھر پکارنے میں رُو بقبلہ ہوکر اس ذاتِ پاک کی پناہ ڈھونڈتا ہوں، جس کی پناہ حضرت ابراہیم نے طلب کی۔

حضرت اسما بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے بوڑھے سردار زید ابن عمرو کو کعبہ سے ٹیک لگائے ہوئے دیکھا، وہ اہل قریش سے کہہ رہے تھے: اے صنادید قریش! قسم ہے زید ابن عمرو کے معبود کی، میرے سوا تم میں سے کوئی بھی اپنے باپ ابراہیم کے دین پر قائم نہیں ہے، ورنہ میں اسی طرح عبادت کرتا۔ پھر ہتھیلیوں کو زمین پر ٹیک کر سجدہ کرتے۔ شرک کی لعنت کے گرفتاروں کو دیکھتے تو یہ اشعار پڑھتے: ؎

اربًّا واحدا ام العذب

او دین اذا تقسمت الامور

ترجمہ:۔ رب ایک چاہیے یا سیکڑوں، اب میں ایسے مذہب میں کیسے رہوں، جب کہ مسائل زندگی کئی معبودوں سے۔

عزلت اللات والعزیٰ جمیعًا

کذالك تفصل الجلد الصبور

ترجمہ:۔ میں نے لات اور عزیٰ تمام کو چھوڑ دیا، مستحکم اور صابر شخصیتیں ایسا ہی کرتی ہیں۔

ولکن اعبد الرحمان ربی

لیغفر ذنبی الرب الغفور

ترجمہ:۔ مگر ہاں اب میں اپنے معبود رحمان کا عبادت گزار ہوں، تاکہ وہ بخشش کرنے والا میرے گناہوں کو بخش دے۔

فتقوی الله ربکم احفظوها

متی ما تحفظوها لا تبور

ترجمہ:۔ لہٰذا تم اللہ ہی کے تقویٰ کی حفاظت کرو، جب تک یہ معاملہ قائم رکھو گے خسارہ نہ اٹھاؤ گے۔

خطاب ابن نفیل نے جب انھیں اپنے قدیم مذہب پر لوٹتے نہ پایا اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں شب و روز سرگرم دیکھا تو مرتد قرار دے کر شہر بدر کر دیا۔ زید کی زندگی کا یہ وہی موڑ ہے، جہاں سے طلب صادق کی آواز اُبھرتی ہے: ؎

عشق میں پاس میرے اور تو کیا رکھا ہے

اِک ترے درد کو سینے سے لگا رکھا ہے

اور طرفہ تماشہ! شہر بدر بھی یوں کیا کہ مکہ کے بالائی جانب حرّا کے قریب انھیں ٹھہرنے پر مجبور کیا، جہاں وہ کسی سے مل جل نہ سکیں۔ اور چند ہم خیال کمینہ خصلت بدنیتوں کو صفیہ وغیرہ نے ان کی نگرانی پر مامور کر دیا۔ آخر کار زید اس زندگی سے تنگ آگئے اور کسی طرح الجزائر اور شام کا راستہ اپنایا۔ اور خالص پیروانِ ابراہیم کو تلاش کرتے رہے، مگر اپنے مقصد میں کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ بالآخر دمشق کے ایک مقام بلقا میں ایک راہب سے ملاقات کی اور اپنی منزل کا راستہ پوچھا۔ راہب نے بتایا کہ دین حنیف کا ماننے والا آج دنیا میں کوئی بھی فرد بشر شاید ہی مقدر سے نصیب ہو۔ ہاں میں تمہیں ایک خوش خبری دیتا ہوں کہ تم جس خاک زار سے نکل کر آرہے ہو، اسی کے دامن میں ایک پھول کھلنے

والا ہے، جو اپنی شمامہ بیزیوں سے خاور خس کو رشک گلستاں بنادے گا۔ وہ دعائے حنین کا ثمرہ۔ نوید مسیحا کی لاج بن کر مکہ کی سرزمین پر رونما ہونے والا ہے۔ وہ دین ابراہیم کی اجڑی ہوئی انجمن کو بسانے والا اسی دھرتی پر آئے گا، جہاں سے نکل کر تم اسے ڈھونڈ رہے ہو۔

راہب نے مزید کہا: زید جہاں تک صحیفہائے آسمانی کی پیشین گوئیوں سے واضح ہے، وہ نبی موعودِ بعثت پذیر ہو چکا ہے اور اس کے دامن میں پناہ گزیں ہو جائو۔

شوقِ زیارت کے طالب زید نے راہب کی خوش خبری سنی اور بڑی تیزی کے ساتھ مکہ کی جانب لپکے۔ ضعیفی کا دور اور نقاہت کا اثر تھا۔ مگر ایک تڑپ تھی جو رگ و ریشہ کو حرارت مہیا کیے جا رہی تھی۔ دو منزلوں کی ایک منزل کرتے ہوئے، عرب کے صحرا کا تصور باندھے ہوئے یہ بوڑھا بلادِ عجم تک پہنچا ہی تھا کہ دشمنوں کی شمشیر نے اس کی بے قرار روح کو قید جسم سے آزاد کر کے وادئ مکہ میں پہنچا دیا۔ کفر نے قہقہے لگائے، شیطنت نے بزمِ مسرت رچائی، دنیائے باطل میں شادیانوں کے الاپ الاپے گئے۔ دوسری جانب فطرت مسکرائی، انسانیت کو حلۂ کامیابی سے سرفراز کیا گیا، صداقت کی مانگوں میں سیندور بھرے گئے، روحِ معاشرہ اپنی رگوں میں ایک فدائی کا لہو پا کر مسرور ہو گئی، عشق کو اپنی قربان گاہ پر سرفرازی کی منزل مل گئی۔ دنیا تو یہ کہے گی کہ: ؎

قسمت کی بد نصیبی کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

لیکن نہیں۔ جبلت، بشریت کی زبان میں کہہ رہی تھی ''السعی منی والاتمام من اللہ''۔ زید نے سعی پیہم اور جہد مسلسل کا دِیا وقت کے طوفانی جھوکوں کی زد پر روشن کیا۔ اور ایسے ماحول میں جب کہ صرف انسانی ضمیر کی خفیف سی رہنمائی کے سوا دنیا کے تمام رہنمائوں کے دربار سرد پڑ چکے تھے۔ کوششوں کے گل دستے ماحول کی تپش میں جھلس کر خاک ہوتے جا رہے تھے۔ مگر وقت کے رحیم و کریم ہاتھ نے اجابت و قبولیت کے دامن میں حیاتِ دائمی اور زندگی جاوداں عطا کر دی۔

اسی لیے تو جب ایک دن سید کون و مکاں، مرادِ عاشقاں، انیس بے کساں، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ضیا بخش محفل تھے۔ دلوں کے کشکول کھولے ہوئے اصحابِ کرام رحمت و نور کی برکھا میں نہا رہے تھے۔ مجلس میں حضرت عمر ابن ابی الخطاب کے بغل میں بیٹھے ہوئے نوجوان صحابی سعید کا چہرہ کچھ مضمحل اور اداس سا محسوس ہو رہا تھا۔

دکھی دلوں کے درماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفا بیز نگاہیں اٹھیں، التفات سعید کی جانب تھا۔ سعید خاموش ہیں۔ مگر آنکھیں رخسارِ ناز پر گڑی ہوئی ہیں۔ مگر خاموش آنکھوں کی نمی اپنی زبان میں کوئی غم ناک حقیقت سنا رہی ہے۔ نگاہِ رحمت اٹھی تو سعید کی ڈوبتی ہوئی روح کو طوفان میں ناخدا مل گیا۔

یا رسول اللہ! میرے باپ زید ابن عمرو ابن نفیل عدوی ہیں۔ کیا ہم ان کے لیے دعا کر سکتے ہیں؟ زبانِ رحمت نے فرمایا: ہاں۔ "فانہ یبعث امۃ واحدۃ"۔ وہ قیامت کے دن ایک جداگانہ امت بنا کر اٹھائے جائیں گے۔

جب آگئی ہیں جوشِ رحمت پہ وہ نگاہیں
جلتے بجھا دیے ہیں روتے ہنسا دیے ہیں

فلاحِ دارین

معلم انسانیت واخلاق سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خصوصیات و کمالات میں سے آپ کا ''جوامع الکلم'' ہونا بھی ایک عظیم کمال ہے۔ چند لفظوں میں حکمت و دانائی کے آبدار موتی پرو دینا میرے آقا و مولا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وصف ہے۔

مشہور محدث علامہ جلال الدین سیوطی (۸۴۹ھ تا ۹۱۱ھ) کنزالعمال کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے بارگاہِ رسالت مآب میں حاضر ہوکر متعدّد سوالات کیے۔ آقا و مولا سرکار رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جوابات ارشاد فرمائے۔ آپ کے وہ فرمودات تمام انسانی دنیا کے لیے نسخۂ کیمیا ہیں۔

ایک بندۂ مومن کی خواہشات اور ان کی تکمیل، تعلق مع اللہ کے سیدھے راستے۔ اور دنیوی و اخروی زندگی میں کامیابیوں، کامرانیوں سے بہرہ ور ہونے کے لیے بے قرار، بے چین اور در بدر بھٹکتی ہوئی انسانیت کو رسول اکرم واعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہدایت کی قندیلیں عطا فرمادی ہیں۔ لیجیے آپ بھی خزینۂ نبوت کے ان جگمگاتے موتیوں سے دامن دل کو آباد کیجیے۔

س: یارسول اللہ! میری خواہش ہے کہ بڑا عالم بنوں۔

ج: اللہ کا تقویٰ اختیار کر! عالم بن جائے گا! (یعنی خوفِ خدا اور اس کے حکموں پر عمل کرنے سے خزانۂ علم و حکمت تک پہنچ جائے گا)

س: میں دولت مند بن جانا چاہتا ہوں۔

ج: قناعت اختیار کر! مالدار ہو جائے گا۔

س: میری تمنا ہے کہ سب سے بہتر بن جاؤں۔

ج: سب سے اچھا انسان وہ ہے، جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔

س: میں سب سے عادل بننے کی آرزو رکھتا ہوں۔

ج: اگر تو ہر شخص کے لیے وہی پسند کرے گا، جو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو سب سے عادل انسان بن جائے گا!۔

س: میں بارگاہِ رب العزت میں مقرب ہونا چاہتا ہوں۔

ج: ذکرِ الٰہی کو لازم پکڑ تو تیری یہ خواہش پوری ہوگی!۔

س: میں چاہتا ہوں کہ احسان کرنے والا اور نیکوکار بنوں۔

ج: اللہ تعالیٰ کی عبادت اس لگن سے کر! جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر ایسا نہ ہو پائے تو کم از کم اس طرح کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

س: میں چاہتا ہوں کہ میرا ایمان کامل ہوجائے۔

ج: اپنے فرائض کی نگہداشت کر! فرماں بردار بندگانِ حق میں شمار ہو گا۔

س: میں خداوند تعالیٰ کے حضور اس طرح حاضر ہونا چاہتا ہوں کہ گناہوں سے پاک وصاف رہوں۔

ج: جنابت سے غسل کیا کر! اس کی برکت سے قیامت کے روز گناہوں سے پاک کر کے اٹھایا جائے گا۔

س: میری آرزو ہے کہ روزِ حشر نور کے ساتھ اٹھایا جائوں۔

ج: تو کسی پر ظلم کا مرتکب نہ ہو! روزِ قیامت نور میں اٹھایا جائے گا۔

س: میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم فرمائے۔

ج: تو اپنی جان اور خدا کی مخلوق پر رحم کر! پروردگارِ عالم تجھ پر رحم فرمائے گا۔

س: میں چاہتا ہوں کہ میرے گناہ کم ہوں۔

ج: زیادہ سے زیادہ استغفار کر! تیرے گناہ کم ہوجائیں گے۔

س: میں بزرگی کا خواہش مند ہوں۔

ج: ہمیشہ پاک و صاف رہ! تیرے رزق میں فراخی و وسعت ہوگی۔

س: میں اللہ اور رسول کا دوست بننا چاہتا ہوں۔

ج: جو چیزیں اللہ اور رسول (جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو پسند ہیں ان کو پسند کر اور جن سے اللہ اور رسول کو نفرت ہے، ان تمام سے نفرت کر!۔

س: میں اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچنا چاہتا ہوں۔

ج: کسی پر بلا وجہ غضب نہ کر! تو اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب سے محفوظ و مامون رہے گا۔

س: میں دربارِ خداوندی میں مستجاب الدعوات بننا چاہتا ہوں۔

ج: حرام چیزوں اور حرام باتوں سے پرہیز کر! (یعنی اعمال وافعال اور استعمال کے تمام محرمات سے الگ رہ!)

س: میں چاہتا ہوں کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور سب کے سامنے میری رسوائی نہ ہو۔

ج: اپنی شرم گاہ کی حفاظت کر! رب تعالیٰ تجھے رسوائی سے بچائے گا۔

س: میں چاہتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ میرے عیبوں کو چھپالے۔

ج: تو اپنے بھائیوں کا عیب پوشیدہ رکھ! اللہ تعالیٰ تیرے عیبوں کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

س: میری غلطیوں کے معاف ہونے کی کیا صورت ہے؟

ج: اللہ کے ڈر سے رونا، اور اللہ تعالیٰ کے حضور عجز و انکساری کرنا، اور بیماروں کی عیادت کرنا، غلطیوں کو مٹاتا ہے۔

س: کون سی نیکی رب تعالیٰ کے حضور افضل ہے؟

ج: خوش خلقی، انکساری، مصائب پر صبر اور مرضیٔ حق پر اظہار خوشی۔

س: اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟

ج: بد خلقی اور بخل۔

س: کون سا عمل اللہ کے غضب کو روکتا ہے؟

ج: چھپا کر صدقہ دینا، اہل قرابت کا حق ادا کرنا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا برتائو کرنا۔

س: آتش جہنم کو بجھانے والی کیا چیز ہے؟

ج: نماز اور روزہ۔

حضور رحمت دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان ۲۲؍ سوالات کے جواب میں عالم انسانی کے لیے جو بیش بہا اور انمول جواہر عنایت فرمائے ہیں۔ وہ ہر دور اور ہر خطۂ زمین پر بسنے والے مسلمانوں کے لیے دولت بے کراں ہیں۔

آج جب کہ مادی چکا چوند نے سب تو سب مسلمانوں کو بھی نئے نئے ''ازم'' نئی نئی تحریکوں کا غلام بنا رکھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنے کو آقا و مولا حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دامن کرم میں چھپائیں۔ ان کی غلامی کو اپنائیں، ان کے ارشادات و فرامین کی روشنی میں زندگی کی راہیں تلاش کریں۔ ورنہ فکر و نگاہ کی آوارگی سے یہ خطرہ ہو چلا ہے کہ آخرت کی ابدی زندگی کے طالب دنیا کے معمولی مفاد اور معاش و اقتصاد کے نام پر اٹھی ہوئی شیطانی تحریکوں کے جال میں پھنس کر گمراہ نہ ہو جائیں۔ (العیاذ باللہ!)

حقیقی اور کامیاب زندگی اور آخرت کی ضمانت صرف قدمِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے لگ کر رہنے میں ہے۔ اس سے بے گانگی، یا برگشتگی ہی کا دوسرا نام بربادی اور ناکامی ہے۔

طریق مصطفیٰ کو چھوڑنا ہے وجہ بربادی
اسی سے قوم دنیا میں ہوئی بے اقتدار اپنی

طوفانِ نوح

اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی یہ دنیا، خیر و شر کی بازی گاہ ہے۔ یہاں نیکوں اور بھلائیوں کے لہکتے مہکتے گلزار بھی آراستہ ہوئے اور سرکشی، تمرّد، خدا دشمنی اور بغاوت کے الائو بھی بھڑکے۔ اسی زمین کے سینہ پر انبیا، رسل، اولیاء اللہ، نیک اور پرہیز گار انسانوں نے بھی قیام کیا۔ اور کتنے فرعون وہامان، نمرود وشداد بھی پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ، انسانیت کے بہی خواہ، نیک نفوس کی برکت سے اس زمین پر آسمانی فرشتے خدائی نعمتیں اور رحمتیں لے کر بھی اترے۔ اور اللہ تعالیٰ سے بغاوت کرنے والوں اور سرکش ہوکر عذابِ الٰہی کو چیلنج کرنے والوں پر کئی بار آسمان سے آگ اور پتھر کی بارشیں بھی ہوئیں۔ زمین دھنسادی گئی اور طوفان و سیلاب، آندھیوں اور متعدّد عذاب نے خدا کے باغیوں کو ملیامیٹ کرڈالا۔

اسی زمیں پہ براہیم اور کلیم اُبھرے
اسی میں دھنس گیا قارون بے وفابن کر
خدا سے جنگ نہ لوظلم وجور بند کرو
جہاں والو! جیو بندۂ خدابن کر

دنیا میں ایسی اقوام بھی گزری ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب نے مسخ کرڈالا اور ان کی شکلیں بدل دی گئیں، کیوں کہ ان سرکشوں نے اپنے خالق ومالک کے معاملہ میں خیانت کی، اس کے ساتھ شرک کیا، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو تکلیفیں دی، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو جھٹلایا، بار بار موعظت و نصیحت کے باوجود اپنے غرور پر اڑے رہے۔ ان عبرت ناک واقعات میں نہایت اہم واقعہ طوفانِ نوح ہے۔

عظمت سیدنا نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسولوں میں سے تھے۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے بعد آپ پہلے صاحب شریعت نبی ہوئے ہیں۔

(صحیح بخاری، ج۲، ص۴۳۴)

حضرت نوح علیہ السلام کا مقامِ ولادت سرزمین عراق ہے۔ قوم نوح اسی مقام پر آباد تھی۔ آثارِ قدیمہ کے محکم نے ''اُر'' کے علاقہ میں جو کھدائی کی ہے، اس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ زمانۂ نبوت ۲۸۵۰/ تا ۳۸۰۰/ ق م قیاس کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر نہایت احترام وعزت کے ساتھ ہوا ہے۔ اور خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دینی تبلیغ کے مختلف مراحل میں اللہ تعالیٰ نے انھیں سیدنا نوح علیہ السلام کے حوالے سے تسلی عطا فرمائی ہے۔ قرآن مجید کی ۲۸/ سورتوں کے اندر ۴۳/ ایسی آیات موجود ہیں، جن میں حضرت نوح علیہ السلام کا بالصراحت ذکر پایا جاتا ہے۔ مگر واقعۂ نوح کی اہم تفصیلات جن سورتوں میں پائی جاتی ہیں، وہ ہیں: الاعراف، آیت ۴۹/ و ۶۹۔ ھود، آیات ۲۵/ ۳۲/ ۳۶/ ۴۲/ ۴۵/ ۴۶/ ۴۸/ ۸۹۔ المؤمنون ۲۳/ الشعراء ۱۰۵/ ۱۰۶/ ۱۱۶۔ القمر ۹۔ نوح ۱/ ۲۱/ ۲۶۔

حضرت نوح علیہ السلام نے ایک ہزار سال کی عمر طویل پائی۔ (العنکبوت ۲۹/ ۱۴)

کارنبوت کاآغاز:

عمر کے پچاسویں سال آپ نے اعلانِ نبوت فرمایا اور تبلیغ دین شروع فرمائی۔

(البدایۃ والنہایۃ، ج۱ر ص۱۰۱)

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے وقت ان کی قوم شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھی۔ لوگوں میں دولت و ثروت کا غرور پیدا ہوگیا تھا، بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے تقرب اور نبوت و رسالت تک کو دولت اور سرمایہ کی میزان پر تولنے کا مزاج راسخ ہوگیا تھا۔ ایسے گھناؤنے ماحول میں حضرت نوح علیہ السلام نے کارِ نبوت کا آغاز فرمایا اور لوگوں کو راہِ حق کی جانب پکارا تو قوم بدک گئی۔

قومِ نوح کی سرکشی:

مال و دولت کا غرور ابتدائے آفرینش سے بنی آدم کی گمراہی کا سبب بنتا رہا ہے۔ بعض اہل دولت و ثروت خود کو سب سے عقل مند اور ہر کمال و خوبی کا مجموعہ خیال کرکے اللہ کے رسولوں، نبیوں اور سچے غریب دین داروں کی تحقیر کرتے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک مال و دولت ہی شرافت کا معیار رہا ہے۔ غریب و مفلس، خدا کے مخلص بندوں کو انھوں نے ہمیشہ ذلیل خیال کیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے سچے دین کی دعوت دی تو انھوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی، انھیں جھٹلایا اور غریب اہل ایمان سے اظہار نفرت کیا۔ نوح علیہ السلام کو ''بَشَرٌ مِّثْلُنَا'' (اپنے جیسا آدمی) کہا، ان کے متبعین کو ذلیل گردانا اور یہاں تک کہہ ڈالا۔

''بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ''۔ (القرآن، ھود:۲۷)

ترجمہ:۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

خدا سے باغی دولت مندوں کی یہ بھی خصلت ہے کہ وہ خدائی نمائندوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم اور نصیحت سنتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ یہ ہماری دولت کے لالچ میں سنا رہے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں ہم نوا بنا کر ہماری دولت پر قبضہ کریں۔ سیدنا نوح علیہ السلام ان کی اس دنایت سے بھی واقف تھے۔ اس لیے آپ نے صاف صاف یہ بھی فرمادیا:

''يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا''۔ (ھود:۲۹)

ترجمہ:۔ اے قوم! (تبلیغ حق کے بدلے) میں تمہاری دولت کا طالب نہیں ہوں۔ بلکہ میرا اجر دینے والا اللہ ہے۔

ہوس کارانِ دنیا کا یہ طریقہ ہے کہ اپنے مقصد کے لیے وہ مخلص غربا و مساکین کو دھتکار دیتے ہیں اور دولت و ثروت والوں سے سانٹھ گانٹھ کرلیتے ہیں۔ انبیا و رسل اور ان کے سچے وارثین، مخلص غربا و مساکین ساتھیوں کے ساتھ خوش رہتے ہیں۔ قومِ نوح کے باغی و طاغی دولت مندوں نے حضرت نوح علیہ السلام سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے قریب آئیں تو ان کم تر درجہ لوگوں (غربائے امت نوح) کو اپنے سے دور کیجیے۔ آپ نے ان ذلیلوں کو جواب دیا:

''وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا''۔ (ھود:۲۹)

ترجمہ:۔ اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں اہل ایمان کو اپنے پاس سے ہنکا دوں۔

باغیانِ قومِ نوح نے اپنے نبی کو ایذا اور تکلیف دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ دکھ دینے اور اذیت پہنچانے کے جتنے راستے ہو سکتے تھے، ہر راہ سے انھوں نے اپنے پیغمبر کو ستایا۔ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ سرکشی کی۔ اپنی شرک اور بُت پرستی پر خم ٹھونک کر اڑے رہے۔

ان کے سرداروں نے اپنے عوام سے کہا کہ اپنے بتوں کو ہرگز نہ چھوڑو۔ وُد، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی پوجا برابر کرتے رہو۔ (نوح)

حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے رہے۔ خود قرآن مجید میں ان کا بیان نقل ہوا ہے:

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّنَهَارًاO فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًاO وَاِنِّیۡ كُلَّمَا دَعَوۡتُهُمۡ لِتَغۡفِرَ لَهُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَهُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوا اسۡتِكۡبَارًاO ثُمَّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُهُمۡ جِهَارًاO ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَهُمۡ وَاَسۡرَرۡتُ لَهُمۡ اِسۡرَارًاO فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًاO (نوح:۵ تا ۱۰)

ترجمہ:۔ (حضرت نوح علیہ السلام نے) عرض کی: اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات دن بلایا تو میرے بلانے سے ان کے بھاگنے میں اضافہ ہی ہوا، اور میں نے جتنی بار انھیں دعوت دی کہ تو ان کو بخشے، انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور اپنے کپڑے اوڑھ لیے، ضد پر اڑے رہے اور بڑا غرور کیا، پھر میں نے انھیں علانیہ بلایا، پھر میں نے ان سے اعلان کے ساتھ بھی کہا اور آہستہ خفیہ بھی کہا کہ اپنے رب سے معافی مانگو، وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے۔

جرأت باطل کی انتہا اور خدائی فیصلہ:

قوم اپنی سرکشی میں اس حد تک بڑھ گئی کہ حضرت سیدنا نوح علیہ السلام سے عذاب لانے کا مطالبہ کرنے لگی:

''قَالُوۡا یٰنُوۡحُ قَدۡ جٰدَلۡتَنَا فَاَكۡثَرۡتَ جِدَالَنَا فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ''۔

(القرآن، ھود:۳۲)

ترجمہ:۔ کافر بولے کہ اے نوح! تم ہم سے جھگڑے اور بہت ہی جھگڑے تو (وہ عذاب) لے آئو جس کا ہمیں وعدہ دے رہے ہو، اگر سچے ہو۔

کفار کی اس جرأت اور دیدہ دلیری پر حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

''قَالَ اِنَّمَا یَاۡتِیۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ اِنۡ شَآءَ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ''۔

(القرآن، ھود:۳۳)

ترجمہ:۔(نوح علیہ السلام نے) کہا وہ تو اللہ تم پر لائے گا، اگر چاہے اور تم تھکا نہ سکو گے۔
سورۂ نوح میں ہے کہ قوم کی سرکشی سے تنگ آکر آپ نے ان کی ہلاکت و بربادی کے لیے بد دعا کی:
''رَبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ دَیَّارًا''۔

(نوح:۲۶،۷۱)

ترجمہ:۔اے میرے رب زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ۔

بالآخر وہ وقت آیا کہ رب تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اب آپ کی قوم میں سے کوئی مسلمان نہ ہوگا، جو ہو چکے ہو چکے۔ آپ ایک کشتی تیار کیجیے اور ظالموں کے بارے میں ہم سے تخاطب نہ کیجیے۔(القرآن، ھود۷ ۳۶،۳)
باغیانِ قوم نوح، قوانین الٰہی کا تمسخر کرنے والے فاسق و فاجر لوگ تھے۔

(القرآن، الذٰریٰت ۴۶)

احکامِ الٰہیہ کے خلاف بغاوت ان کی فطرت بن چکی تھی، ان ظالموں نے خدا کے رسول حضرت نوح علیہ السلام کی نہ صرف تکذیب کی، بلکہ انھیں سنگسار کرنے کی دھمکی بھی دی۔(الشعراء۱۱۶)
اور بڑی بڑی چالبازیاں کیں۔(نوح۲۲)
جس کے بعد جلالِ ربانی نے اس قوم کو مٹا دینے کا فیصلہ سنایا۔

کشتی نوح:

پروردگار عالم کے حکم پر حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنانے کا کام شروع کیا۔ غالبًا اس وقت تک پانی پر انسانوں کو لے کر چلنے والی کوئی سواری ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنے اصحاب باوفا کے ساتھ کشتی بنانے لگے تو باغی کہتے: اے نوح! یہ کیا کر رہے ہو؟ آپ فرماتے: ایسا مکان بنا رہا ہوں جو پانی پر چلے۔ جس علاقے میں کشتی بنائی جا رہی تھی وہ جنگل تھا اور اس سے کافی دور دور تک کوئی دریا وغیرہ نہیں تھا۔ کفار یہ دیکھ کر مذاق اڑاتے اور کہتے: پہلے تو آپ نبی تھے، اب بڑھئی بھی ہو گئے۔

(علامہ نعیم الدین مرادآبادی، خزائن العرفان، ص۳۲۶)

کفار کشتی بنتی دیکھ کر طرح طرح کی پھبتیاں کستے، مذاق اڑاتے اور ہنستے۔ آپ فرماتے: عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ ہم تم پر ہنسیں گے۔(القرآن، ھود۳۸)

کشتیٔ نوح کی تیاری میں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے اصحاب دو سال لگے رہے۔ دو سال بعد یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ کشتی کیا تھی، گویا دورِ حاضر کا ایک بحری جہاز تھا۔ اس میں تین درجے بنائے گئے تھے۔ سب سے نیچے کا حصہ وحشی جانوروں اور درندوں کے لیے خاص تھا، درمیانی طبقہ میں چوپائے رکھے گئے تھے اور اوپری منزل میں حضرت نوح علیہ السلام، ان کے ساتھی، حضرت آدم علیہ السلام کا جسد مبارک

جو زنانے اور مردانے کیبنوں کے درمیان رکھا گیا تھا، وہیں کھانے پینے کا سامان اور پرندے بھی تھے۔ چوں کہ فرمانِ رب یہی تھا کہ ہر جاندار کا ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کر لیا جائے۔ اسی لیے ایسا کیا گیا۔ (القرآن، ھود ۴۰)

کشتی کی لمبائی تین سو گز، چوڑھائی پچاس گز اور اونچائی تیس گز تھی۔

(علامہ نعیم الدین مرادآبادی، خزائن العرفان، ص ۳۲۶)

جدید پیمائش کے لحاظ سے اندازہ کرنے والوں نے ۳۲۵/ فٹ لمبی، ۲۸۷ء۱ فٹ چوڑی، ۵۲ ۲۔۱ فٹ اونچی ہونے کا اندازہ لکھا ہے۔

(عبدالماجد دریابادی، تفسیر ماجدی، ج۲ / ص ۴۶۶)

رب ذوالجلال کے حکم سے اس کشتی میں حضرت نوح علیہ السلام نے جانداروں کے جوڑے رکھ لیے، مسلمانوں کو سوار کر لیا۔

اس وقت فرمایا: ''بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا''۔ (القرآن، ھود ۴۱)

ترجمہ:۔ اللہ کے نامِ پاک ہی سے اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے۔

باغیانِ نوح پر اس وقت عذاب کی ابتدا ہوئی۔ تنور سے پانی کے فوارے اُبلنے لگے۔ آسمان سے موسلا دھار بارش ہونے لگی، جس نے سرکش باغیانِ خدا کو غرق آب کر دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے اہل خانہ اور تین بیٹے سام، حام اور یافث جو اہل ایمان تھے، پہلے ہی کشتی میں سوار ہو چکے تھے۔

(مولانا نعیم الدین مرادآبادی، خزائن العرفان علی کنزالایمان، مطبوعہ اشاعۃ الاسلام دہلی، ص ۵۷۵)

مگر کنعان جو دشمنانِ خدا میں سے تھا، جب طوفان زوروں پر ہوا تو حضرت نوح علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ غوطے کھا رہا ہے۔ انھوں نے کنعان کو آواز دی کہ مومنوں میں شامل ہو کر کشتی میں پناہ لے لے، مگر اس نے کہا کہ میں کسی بلند پہاڑ پر چڑھ کر جان بچا لوں گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: آج کوئی بلند پہاڑ بھی کسی کو خدا کی مرضی کے بغیر نہیں بچا سکتا۔ بالآخر کنعان طوفان کی موجوں میں فنا ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کنعان کے حق میں رب تعالیٰ کے حضور التجا کی، تو ارشاد ہوا:

''يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ''۔ (القرآن، ہود: ۴۶)

ترجمہ:۔ اے نوح! وہ (کنعان) تیرے گھر والوں میں نہیں، بے شک اس کے کام بڑے نالائق ہیں۔

شیخ سعدی شیرازی فرماتے ہیں:

پسر نوح بابدوں بنشست
خاندان نبوتش گم شد

طوفان کی مدت:

طوفانِ نوح کی یہ کیفیت ایک سو پچاس روز تک قائم رہی، طوفان کی موجیں پہاڑوں کی طرح اٹھتی تھیں اور آبادیوں کو لقمۂ اجل بناتی تھیں۔ قرآن عظیم میں ''مَوْجٌ كَالْجِبَالِ'' آیا ہے۔ (علامہ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ج۱ / ص ۱۱۶)

توریت میں ہے کہ ۱۵۰/ دن تک پانی برابر بڑھتاچڑھتا رہا، پھر ۱۵۰/ روز پانی کے اترنے میں لگے۔ اور جوئش انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ ۳۶۵/ دن بعد کشتی نوح پہاڑ سے جالگی۔ (جوئش انسائیکلوپیڈیا، ج۹/ص ۳۲۰)

یہ عظیم طوفان اتنا ہولناک تھا، جس نے باغیانِ خدا میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑا۔ مفسرین کی عام رائے یہ ہے کہ یہ طوفان عالمگیر تھا۔ اور ایک طبقہ کہتا ہے کہ اس دور تک چوں کہ انسانی آبادی انہی علاقوں تک محدود تھی، اس لیے طوفان وہیں تک آیا، جس کا رقبہ تقریبًا چالیس ہزار مربع کلومیٹر تھا، جو دریائے دجلہ و فرات کا درمیانی خطہ ہے۔ (اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، ج۲۲/ص ۴۷۸)

جبل جودی:

طوفانِ عظیم کی جبال نما موجوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی صحیح و سلامت تیرتی رہی۔ کشتی میں سوار جانیں خدا اور رسولِ خدا کی امان میں محفوظ رہیں۔ باغیانِ خدا کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم فرمایا کہ تو اپنا پانی نگل جا اور آسمان کو حکم فرمایا کہ تو اپنی بارش روک لے۔ اللہ تعالیٰ نے ظالم کفار کے حق میں جو فیصلہ کر دیا تھا وہ تو پورا ہو چکا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کا سفینہ جودی پہاڑ پر لنگر انداز ہوا۔ (القرآن، ھود ۴۴)

بائبل میں سفینہ لنگر انداز ہونے کے مقام کا نام "ارارات" یا "اراراط" آیا ہے۔ یہ دراصل کردستان کے خطہ میں، جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرقی جانب واقع سلسلۂ کوہ کا نام ہے، جو آگے جاکر گرجستان کے سلسلۂ کوہ سے مل جاتا ہے۔ اس طرف ارارات کے آخری سرے پر ایک اونچا پہاڑ ہے، جس کا نام جودی ہے۔ قدیم تاریخی ذخائر میں بائبل کے ایک مذہبی رہنما براسس نے کلدانی روایات کی روشنی میں ایک تاریخ لکھی تھی، اس میں اس نے بھی لکھا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر رُکی تھی۔ براسس حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ڈھائی برس پہلے تھا۔

(اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ج۲۲/ص ۴۷۸)

کشتی نوح کے سوار جانداروں کے ذریعہ رب کائنات نے روئے زمین کو پھر آباد فرمایا۔ (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۱۳)

جرم عظیم:

بیانِ واقعہ کے بعد سب سے اہم قابل غور سوال یہ ہے کہ یہ طوفان کیوں آیا؟ تو جواب صاف ہے کہ کفر و شرک، فسق و فجور کے نشہ میں چور انسانوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت الی اللہ کو رد کیا، پیغمبر کی تکذیب کی، اپنی دولت و ثروت کے نشہ میں مسلمانانِ قوم نوح کو ذلیل خیال کیا، متاعِ دنیوی کے غرور میں سرکش ہو کر خاصانِ خدا کی دشمنی پر آمادہ ہوئے۔ اور اپنے لیے ہدایت کی تمام راہیں بند کر لیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب میں گرفتار کیا اور دنیا والوں کے لیے سامانِ عبرت بنا دیا۔ اور ابھی عذابِ آخرت ان کے انتظار میں ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے:

"وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً وَّاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝" ۔ (الفرقان: ۳۷)

ترجمہ:۔ اور قوم نوح کو جب انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی، ہم نے غرق کر دیا اور دنیا بھر کے لوگوں کے واسطے نشانِ عبرت بنا دیا اور ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہم نے تیار کر رکھا ہے۔

چند اور معذب اقوام:

جس طرح حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کی دعوتِ حق کا انکار کرنے والے فرعون اور فرعونیوں کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر دیا۔ (الفرقان ۳۶)

جس طرح عاد و ثمود کے لوگ حضرت ھود اور صالح علیہما السلام کی نافرمانی کرنے کے جرم میں برباد کر دیے گئے۔

(الفرقان ۳۸، مع تفسیر خزائن العرفان، ص۵۲۵)

اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم، جن کی آبادی ایک کنویں کے گرداگرد تھی، اپنے پیغمبر کی نافرمانی کر کے بت پرستی پر اڑی رہنے کے سبب دھنسا دی گئی تھی۔

(الفرقان ۳۹، مع تفسیر خزائن العرفان، ص۵۲۵)

اور جس طرح حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں سے سدوم کے باشندے آسمانی سنگ باری سے زیر و زبر کر ڈالے گئے تھے۔

(الفرقان ۴۰، مع تفسیر خزائن العرفان، ص۵۲۵)

باغیانِ قوم نوح کو بھی صفحۂ دہر سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔

عالمی طوفان ادیان ما سبق کی کتب میں:

قوم نوح پر اترنے والا یہ عذاب نہایت بھیانک، دور رس اور غیر مبہم تھا۔ جس سے پوری دنیا متاثر ہوئی۔ جیساکہ ''وَجَعَلۡنٰهُمۡ لِلنَّاسِ آيَةً'' سے بھی پتہ چلتا ہے۔ خداوند ذوالجلال نے اس طوفان کو بنی نوعِ انسان کے لیے سامانِ عبرت و نصیحت بنا دیا۔ اس کے مظاہر میں سے یہ بھی ہے:

دنیا کے تمام قابل ذکر مذاہب نے عالمی طوفان کے واقعہ کو اپنی روایات میں سمیٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہودیت و مسیحیت کا اصل سرچشمہ تو وحی ربانی تھا، جسے ان اقوام کے ظالموں نے خرد بُرد، کانٹ چھانٹ، حذف و اضافہ اور کتربیونت سے ناقابل اعتبار بنا دیا۔ (بامورس بوکائیے، بائبل قرآن اور سائنس (اردو) اختتامیہ باب اول وباب چہارم صفحات ۶۲/ تا ۶۵/ و ص۲۸۵/ تا ۲۹۲)

تاہم موجودہ بائبل میں ''طوفانِ عالمگیر'' سے متعلق روایات ملتی ہیں، جو کچھ اختلافات کے ساتھ قرآنی معلومات سے قریب ہیں۔ پروفیسر بوکائیے نے طوفانِ نوح کے بارے میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کے بیانات کو سائنسی مسلمات کی خوردبین سے دیکھ کر نہایت صفائی سے ان کے اندر انسانی دخل اندازی کو واشگاف کیا ہے، جو اپنے مقام پر نہایت اہم کام ہے۔

حضرت نوح قرآن اور بائبل میں:

قرآن وحدیث میں حضرت نوح علیہ السلام ایک جلیل الشان پیغمبر، صاحب شریعت رسول کی حیثیت سے پائے جاتے ہیں۔ ان کا شمار ان پانچ عظیم المرتبت رسولانِ عظام میں ہے، جن سے خصوصی عہد و میثاق ہوا۔ (الاحزاب ۷)

ان کو پندرہ امتیازات سے نوازا گیا۔ (عراس المجالس للثعلبی، ص۴۶)

ان کا اسم گرامی نہایت ادب واحترام سے ۲۸ر قرآنی سورتوں کے اندر تقریباً ۴۳ر آیات میں آیا۔
(المعجم المفہرس لالفاظ القرآن، بذیل مادہ، نوح)

وہ خداوند کریم کے قہر و غضب سے ڈرانے والے، اپنے مالک و مولا کے شکر گزار بندے، رب ذوالجلال کی جانب سے امن و سلامتی اور برکات کے حق دار، رسول مبین تھے۔ وہ عظمت و رسالت کے اس بلند رتبہ پر فائز تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی جماعت کے ایک فرد تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت، شریعت اسلامیہ کے قریب تھی۔ (الصّٰفّٰت ۸۱)

محدثین کرام نے حضرت نوح علیہ السلام کے روزوں اور ان کے حج کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ طوفان کے بعد انھوں نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ، ج ۱ر ص ۱۱۸)

اسلامی اصول و عقائد کی رو سے تمام انبیا و رسل علیہم السلام معصوم اور گناہوں سے پاک و منزہ ہوتے ہیں۔ اور سیدنا نوح نجی اللہ اس نورانی گروہ کے باوقار فرد ہیں (صلوات اللہ تعالیٰ علی نبینا وعلیہم اجمعین)

اس کے برخلاف بائبل میں حضرت نوح علیہ السلام کی شخصیت کو نہایت گھنائونے انداز میں پیش کیا گیا ہے، جو یقیناً محرفین کی دستکاری ہے۔ یہاں نمونۃً صرف ایک روایت کا حوالہ دیا جاتا ہے، جس میں انھیں شراب پینے والا اور بدمست ہوکر برہنہ ہوجانے والا لکھا ہے۔ العیاذ باللہ۔ (توریت، کتاب پیدائش، باب ۷)

طوفانِ نوح کا ذکر توریت میں:

توریت کتاب پیدائش میں طوفانِ نوح کا ذکر ہوا ہے۔ چھٹا، ساتواں اور آٹھواں باب اس کے لیے وقف ہے۔ اس کی ایک روایت کا خلاصہ یہ ہے:

''اور خدا نے زمین کی طرف دیکھا اور زمین معصیت سے بھری ہوئی تھی اور خدا نے نوح سے کہا، میں زمین پر طوفان نازل کروں گا اور زمین پر جو چیزیں ہیں سب کے سب مر جائیں گی۔ کشتی میں تو بیٹھے گا اور تیرے بیٹے، تیری بیوی اور تیرے بیٹوں کی بیویاں، ہر جاندار چیز کا ایک جوڑا کشتی میں رکھ لینا تاکہ ان کی نسل قائم رہے اور خدا نے نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کو برکت دی اور ان سے کہا کہ پھلو پھولو اور دنیا کو از سرِ نو آباد کرو''۔ (مورس بوکائیے، بائبل قرآن اور سائنس، اردو، ص ۲۸۷)

طوفان اور ہندو کتب:

واضح رہے کہ توریت میں حضرت نوح علیہ السلام کی ایک گمراہ بیوی اور ایک بیٹے کا ذکر نہیں ہے۔

ہندوؤں کی قدیم کتابوں مثلاً پران کو مختلف اقسام میں اس عالمی طوفان کا ذکر الگ الگ پیرایہ میں ملتا ہے۔ بھاگوت پران، مہا بھارت اور ستیہ پتھ برہمن میں بھی دنیا کو ڈبونے والے طوفانِ عظیم کا قصہ درج ہے۔ جس کا خلاصہ جناب ثناء الحق صدیقی صاحب کے توسط سے ہم یہاں درج کرتے ہیں:

''ایک صبح ''منو'' نہا رہا تھا، ایک مچھلی اس کے ہاتھ میں آگئی، اس مچھلی کی درخواست پر منو نے مچھلی کی پرورش کی۔ پہلے اسے ایک برتن میں رکھا، پھر تالاب میں، پھر گنگا میں، اس کے بعد سمندر میں۔ مچھلی نے بتایا کہ میں پرجاپتی برہما ہوں، تجھے ایک طوفان کی اطلاع دیتی ہوں تو

ایک جہاز تیار کر، میں طوفان کے وقت تیری مدد کروں گی۔ چنانچہ طوفان آیا، منو نے جہاز کی رسی مچھلی کے سینگ سے باندھی اور ہمالیہ تک پہنچ گئی“۔

(مورس بوکائیے، بائبل قرآن اور سائنس، اردو، ص ۲۸۷)

طوفانِ نوح اور حضریاتی تحقیقات:

مقامِ اُر پر ”حضریاتی کام“ برطانیہ محکمہ آثار قدیمہ کے سابق ڈائریکٹر جنرل سر ہونارڈ دولے کی ایک کتاب ہے، جس میں مقامِ اُر پر کھدائی کے دوران طوفانِ نوح سے غرق آب ہونے والوں کے آثار وعلامات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ہے کہ میسیو ٹامیہ کے علاقہ کی کھدائی سے ثابت ہوگیا ہے کہ ”عالمگیر طوفان“ کی بات کوئی افسانہ نہیں ہے، جو لوگوں کو ڈرانے کے لیے اختراع کیا گیا ہو۔ بلکہ واقعی یہ طوفان آیا تھا اور اس سے ایک دنیا غرق آب ہوئی تھی۔

آثار قدیمہ اور ذکر طوفان:

کلدانی اور اشوری زمانہ کی دستیاب تختیوں پر مرقوم طوفانی حالات اس طرح ہیں:

(۱) ای آدیو تا نے مجھ سے کہا: اہل دنیا مجھ سے باغی ہوگئے ہیں، میں انھیں سزا دوں گا، آسمان سے تباہ کن بارش ہوگی، وقت مقرر آگیا ہے۔

(۲) میں اپنے ساتھ لایا اور جہاز میں ذخیرہ کردیا ہر چیز کے تخم کا، میں اپنے ساتھ اپنے اہل خاندان، خدمت گاروں اور عورتوں اور عزیز ترین دوستوں کو لے آیا۔

(۳) زہسی ساورا کو کوئی خاص کام تفویض نہیں ہوا، بلکہ اسے اور اس کی بیوی دونوں کو حیاتِ ابدی عطا ہوئی۔

(محمد ثناء الحق صدیقی، بائبل قرآن اور سائنس، حاشیہ، ص ۲۸۶)

اشور بنی پال کے کتب خانہ کی جو تختیاں ملی ہیں، ان میں جلجمش کی نظم کے اندر طوفان کا ذکر یوں ہے:

”اس علاقہ میں بُرائیاں بہت پھیل گئی تھیں، اس لیے دیوتا انسان سے بہت ناخوش ہوگئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے انسانی آبادی کے تباہ کرنے کا ارادہ کیا، مگر عذاب بھیجنے سے پہلے زیوسدو (اُت نفشیتم) کو ایک کشتی بنانے کا حکم دیا، اس نے کشتی تیار کی اور حکم کے مطابق اس میں سونا، چاندی، جانور اور اعزا واقارب کو سوار کیا، اس کے بعد ایک طوفان اٹھا اور خوف ناک کڑک چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی، چھ دن اور چھ رات لگاتار پانی برستا رہا، یہاں تک کہ پورا علاقہ غرق آب ہوگیا اور اُت نفشیتم کی کشتی بہتی ہوئی جبل نصیر سے جالگی۔ ساتویں دن بارش کا سلسلہ ختم ہوا تو اُت نفشیتم نے ایک فاختہ کو کشتی سے اُڑایا، جو چکر کاٹ کر پھر کشتی میں واپس آگئی، اس سے اندازہ کیا گیا کہ پورا علاقہ پانی میں غرق ہے۔ چند دنوں بعد کالے کوے کو اُڑایا گیا جو واپس نہیں آیا۔ اُت نفشیتم نے کشتی سے اُتر کر قربانی پیش کی“۔

(محمد ثناء الحق صدیقی، بائبل قرآن اور سائنس، حاشیہ، ص ۲۸۶، مطبوعہ علی گڑھ، ہند)

الغرض طوفانِ نوح کا واقعہ عذابِ الٰہی کی وہ انمٹ کہانی ہے، جسے تمام قابل ذکر مذاہب نے اہمیت دی ہے اور اسے اپنے اپنے طور پر سمیٹا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شرک وارتداد کی لعنت میں گرفتار باغیانِ قوم نوح کو جن عظیم جرائم کی پاداش میں اس خدائی گرفت میں لیا گیا تھا،

شرک والحاد کی تبلیغ کرنے والے مذاہب نے اس عظیم واقعہ سے عبرت حاصل کرکے توحید کی طرف خود پلٹنے کے بجائے اپنے اپنے طور پر نفس واقعہ کو ردو بدل کرکے شرک وارتداد کا مؤید بناڈالا۔ (العیاذ باللہ)

ہمیں کیا سبق ملا؟:

بہر حال یہ واقعہ مسلمانانِ عالم کے لیے بطورِ خاص اور کتب سماویہ (خواہ محرف سہی) سے تعلق رکھنے والی اقوام کے لیے بطورِ عام آج بھی سامانِ عبرت و نصیحت ہے۔ الٰہی احکام اور قوانین ربانی کے مقابلہ میں سرکشی اور تمرد کے بجائے ہمیں چاہیے کہ ہر وقت قہر قہار اور غضب جبار سے ڈریں اور اس کے حضور انابت کی پیشانی جھکائیں۔ رب تعالیٰ اپنے کرم سے ہمیں اپنی سچی محبت اور خوف عطا کرے۔ آمین

اسلامی بھائیوں سے:

مسلمانو! کیا واقعی تم اتنے بھولے ہو کہ اپنے دوست، دشمن کا امتیاز نہیں رکھتے۔ وہ تمہیں نوچ نوچ کر کھا رہا ہے اور تم پھر اسی کی غلامی کر رہے ہو۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین عالم تمہیں اپاہج بنانے میں صدیوں سے منہمک ہیں اور تم اپنے خونِ جگر سے ان کے بازوؤں کو تقویت دینے میں لگے ہو۔ تم خدا اور رسول کی پناہ سے بے یقین ہو کر امریکہ، یورپ اور روس کے دامن میں پناہ لے رہے ہو۔ تمہیں اپنا منہ چھپانے کے لیے غلافِ کعبہ اور روضۂ رسول کی چادر میسر تھی، ان کی بے حرمتی کرکے تم نے خود پر لعنت کی چادر ڈال لی اور خنزیر خوروں کے منحوس وجود سے حرمین کی فضائوں میں تعفن پھیلانے کا ارتکاب کیا۔ کیا اسلامی ضمیر تمہارے ان کالے کرتوتوں کو رہتی دنیا تک معاف کرسکتا ہے۔؟

آہ! اے جوانانِ عرب! تمہاری غیرتِ ایمانی تو زمانے کو آئینہ دکھاتی تھی۔ تمہارے ایثار و قربانی کے جذبہ نے تو دشت و جبل کو مسخر کرلیا تھا۔ تم نے تو دریائوں اور سمندروں کے سینے پھاڑ کر بحیرۂ اسود کی تاریکیوں تک تکبیر کا اُجالا پھیلایا تھا۔ وہ تمہارا ہی نعرۂ مستانہ تھا، جس کی صدائے بازگشت ایشیا، افریقہ اور یورپ کی دہلیزوں تک آن کی آن میں جا پہنچی تھی، جسے مشرق کے نوا سنج نے یوں کہا تھا: ؎

آگ توحید کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلالِ حبشی رکھتے ہیں

اور اب آخر تم میں یہ تنزل وادبار کیوں کر آیا۔ کیا کبھی اس کا محاسبہ کیا؟

لہو زمیں پہ بہتا ہوا یہ کس کا ہے:

آج جب کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ سے بغاوت کا طوفان زور و شور پر ہے۔ قوی اور زور آور قومیں، غریب اور لاچار انسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہیں۔ دولت دنیا اور اقتدار و بالا دستی کے لیے انسانی جان اور آبادیوں پر دن دہاڑے بم برسائے جارہے ہیں۔ انسانی شیطانِ اعظم اپنے مکر و فریب کے آہنی جنگل میں دنیا بھر کے غریبوں، مجبوروں اور کمزوروں کو دبوچ رہا ہے۔ خاص طور پر مسلمانانِ عالم پر عرصۂ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔ توحید کے متوالوں سے ان کا تشخص چھینا جارہا ہے۔ ملت مسلمہ میں غداروں کی افزائش کے کارخانے چل رہے ہیں اور ناعاقبت اندیش مسلمان خود ظالموں کے آلۂ کار بن کر اپنے بھائیوں کی شہ رگ پر خنجر چلانے میں مصروف ہیں۔ خدا کا خوف اٹھ گیا ہے۔ محبت اور

غیرت پامال ہوگئی ہے۔ مسلمان خود مسلمان کے خون کا پیاسا بن چکا ہے۔ سیاست کے نام پر خدائے تعالیٰ سے کھلم کھلا بغاوت کی جارہی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا والوں کو قادر و قیوم، قہار و جبار، پروردگار کے انتقام کی جھلک دکھائی جائے، جس کے جلال و جبروت کی ایک نظر دنیا کے سارے سمندروں کو خشک کرسکتی ہے۔ جو ایسا قابض ہے کہ ایک آن میں لاکھوں کروڑوں ظالموں کے تنفس کی ڈور کھینچ کر ہلاک کرسکتا ہے۔ جس کے قانون میں محض ایک خونِ ناحق دنیا کی تباہی کے برابر ہے۔

''اَنَّہٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا''۔ (القرآن، مائدۃ:۳۲)

ترجمہ:۔ جو کسی کو ناحق قتل کرے، یا فساد انگیزی کے لیے جان مارے، گویا وہ پوری نوعِ انسانی کا خون کرتا ہے۔

میں سرزمین عراق پر بمباری کرنے والی اتحادی افواج اور اب جنگ ختم ہونے کے بعد لاکھوں عراقی باشندوں پر رزق کے دروازے بند کرنے والوں اور علاج سے محروم دم توڑنے والے بچوں کے ذمہ دار اور سالہا سال سے خون میں نہائی ہوئی فلسطینی قوم کے پژمردہ چہروں کی ذمہ دار عرب مسلم ممالک کے سامنے اللہ تعالیٰ کی چند آیات پیش کرتا ہوں۔

حکومت و دولت کے نشہ میں سرشار عرب اور اتحادی مسلمان حکمراں عبرت حاصل کریں اور دیکھیں کہ یہ اقتدار کی کرسیاں اور زمام حکومت چند روزہ ہیں۔ انھیں بھی بہر حال ایک دن منتقم حقیقی کے روبرو پیش ہونا ہے۔ عراقی باشندوں کے یہ قاتل کیا اس دن اپنے امریکی اور یورپی آقائوں کے پیچھے ہوں گے، جس عراق نے دنیا کے شیطانِ اعظم کو للکارا تھا، اس کی مخالفت کرکے عالمی دسترخوان پر اسلام اور مسلمانوں کے کھلے دشمنوں کی غلامی سے نہ شرمانے والے، کاش! قیامت کے دن رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے ہی شرم کریں۔

''وَلَقَدْ جَآئَ تْھُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ''۔

(التوبہ:۳۲)

ترجمہ:۔ اور ہمارے رسول ان کے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے، پھر بھی ان میں سے بہتیرے زمین میں فضول کام کرتے ہیں۔

خونِ مسلم سے ہاتھ رنگنے والو!:

☆...اے بغداد، بصرہ اور مدن عراق پر بمباری کرانے والو!

☆...اے امریکہ، یورپ اور کفارِ عالم کے ساتھیو!

☆...اے اسرائیل کے خفیہ معاونو!

☆...اے مسیحی اور یہودی پالیسیوں میں الجھ کر اسلام کو بھول جانے والو!

سنو! رسول اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں:

''اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یقینا ایک مومن کا قتل اللہ کے نزدیک دنیا کے برباد ہوجانے سے اہم ہے''۔ (سنن نسائی)

”بے شک دنیا کا برباد ہوجانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان کے قتل سے آسان ہے“۔(سنن نسائی)

”دنیا اور مافیہا کا برباد ہوجانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان کے قتل کی بہ نسبت معمولی ہے“۔

(سنن ترمذی، کتاب الدیات واقضیۃ رسول اللہ لابن طلاع مالکی، ص۲۸)

حضرت عبداللہ ابن مسعود سے صحیح مسلم میں روایت ہے:

”شرک باللہ کے بعد کوئی گناہ کسی انسانی جان کے تلف کرنے سے عظیم نہیں“۔

(صحیح مسلم، کتاب القسامۃ باب المجازاۃ بالدماء)

سنن ابوداؤد اور صحاح کی دیگر کتابوں میں تکرار کے ساتھ یہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے آئی ہے:

”قیامت کے روز لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خون کا فیصلہ کیا جائے گا“۔

(سنن ابوداؤد)

نبی رحمۃ للعالمین کے طفیل ہوسکتا ہے کہ ہم پر طوفانِ نوح جیسا کوئی طوفان نہ لایا جائے اور ہم عاد و ثمود کی طرح تباہ و برباد نہ کیے جائیں۔ کیوں کہ رحیم و کریم رب ذوالجلال افضل الرسل کی امت کو خیر الامم فرما چکا ہے۔ مگر کیا ہم آخرت کی باز پُرس سے بھی بچ جائیں گے۔ نہیں۔ اور یقیناً نہیں۔ تو مجھے بتائو کہ کیا یہ خدا بیزار اتحادی وہاں تمہارے کچھ کام آسکیں گے۔

قریب ہے یارا! روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کب تک
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

شہنشاہِ انبیا اور قیصر روم

غالباً وہ یکم محرم ۷ھ /۱۱ر جولائی ۶۲۸ء کا ایک تاریخ ساز عہد آفریں اور روشن و منور دن تھا۔ جب رسولِ رحمت سراپا برکت، خاتم النبیین حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، مقدس جماعت صحابہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے مجمع میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اسلام کو عالمگیر نظام حیات کے طور پر برپا کرنے کے اقدامات میں سے ایک اہم اقدام کا خطبہ۔ جلالِ وسطوتِ نبوت کو وقت کی عالمی شہنشاہی قوتوں کے معیار پر رکھ کر، خدائی دین اور الٰہی نظام کو برتر و بالا ثابت کرنے کا خطبہ۔

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام لوگوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اللہ تم لوگوں پر رحم کرے، تم لوگ میری طرف سے کام سرانجام دو، کسی اختلاف میں مبتلا نہ ہونا، جس طرح عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواری اختلاف کا شکار ہوگئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسی کام کے لیے اپنے حواریوں سے مطالبہ کیا تھا، جس حواری کو دور دراز مقام پر بھیجنا چاہتے تھے، اسی نے جانے میں تامل کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حضور شکایت پیش کی، رب تعالیٰ کے حکم سے یہ معجزہ رونما ہوا کہ شب بھر میں جسے جس جگہ بھیجنا چاہتے تھے، اسے اس علاقہ کی زبان آگئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں سے فرمایا: رب تعالیٰ ارادہ فرما چکا ہے کہ تم لوگ اس کام کو سرانجام دو“۔ (تاریخ طبری، ج۳ر ص۸۵)

رسول خدا سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جاں باز صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم لوگ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے سربکف ہیں۔ آپ جہاں چاہیں ہمیں جانے کا حکم فرمائیں۔

رسول اللہ کے قاصد:

چنانچہ رسول اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چھ حکمرانوں کے نام ایک ہی دن، اسلامی دعوت کے مکتوبات اپنے سفرا کے ذریعہ روانہ فرمائے۔ ان کے اسما یہ ہیں:

(۱) حضرت دحیہ بن خلیفہ الکلبی کو قیصر، شاہِ روم کے پاس۔

(۲) حضرت عمرو بن امیہ الضمری کو نجاشی، بادشاہ حبشہ (ایتھوپیا، افریقہ) کے پاس۔

(۳) حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی کو کسریٰ خسرو پرویز، شاہِ ایران و عراق کے پاس۔

(۴) حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کو مقوقس، حاکم اسکندریہ (مصر) کے پاس۔

(۵) حضرت سلیط بن عمرو عامری کو رؤسائے یمامہ کے پاس۔

(۶) حضرت شجاع بن وہب الاسدی کو حارث غسانی، رئیس حدودِ شام کے پاس۔

(ابن ہشام، باب خروج رسول اللہ الی الملوک)

مسور بن مخرمہ کی روایت میں انہی چھ حضرات کے ساتھ حضرت علا بن حضرمی کا نام بھی آتا ہے، جنھیں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عمان کے دونوں حکمراں جیفر و عبار جلندی کے پاس اپنا مکتوبِ گرامی دے کر روانہ فرمایا تھا۔ اسی روایت میں ابن مخرمہ نے یہ بھی وضاحت فرمائی کہ مذکورہ بالا چھ سفرا تو حضور کی حیاتِ ظاہری ہی میں واپس مدینہ پہنچ گئے تھے، مگر حضرت علا ابھی بحرین میں تھے کہ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

(اخرج الطبرانی عن المسور بن مخرمۃ، قال الہیثمی فیہ محمد بن اسمٰعیل بن عیاش وھو ضعیف، کذا فی المجمع، ص۳۰۶)

سیرت کی کتابوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ ان سات کے علاوہ:

(۸) حضرت مہاجر ابن ابوامیہ بن حارث اور جریر کو، ذوالکلاع کے پاس۔

(۹) حضرت سائب کو، مسیلمہ کذاب کے پاس روانہ فرمایا۔

احادیث کی تقریباً تمام معتبر کتابوں میں مذکورہ بالا چھ قاصدین رسول کے ایک ہی روز روانہ ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اور دیگر سفرائے رسول کی دیگر مواقع کی روانگیوں کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ (کذا قال الحافظ فی الفتح، ج۸/ص۸۹)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وصال سے قبل کسریٰ اور قیصر اور نجاشی اور ہر سرکش حکمراں کے پاس اپنے مکتوباتِ گرامی روانہ فرما دیے تھے۔ ان مکتوبات میں آپ نے ہر ایک کو دین حق کی دعوت دی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ، ج۴/ص۲۶۲)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وصال سے پہلے کسریٰ اور قیصر اور دوسرے سرکش حکمرانوں کو خطوط کے ذریعہ اسلام کی دعوت پیش فرمائی''۔

اعجازِ نظر:

مذکورہ بالا چھ سفرائے رسول جن کے اسمائے گرامی سیرت و حدیث کی تمام کتابوں میں ملتے ہیں، ان سب کو رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک ہی دن روانہ فرمایا۔ ارادۂ سفر سے پہلے یہ لوگ جہاں کے لیے روانہ ہو رہے تھے، وہاں کی زبان سے ناواقف تھے، مگر رسول اعظم واکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں جب آمادۂ سفر ہوئے تو روانگی سے قبل کی رات سو کر اٹھے تو سب کے سب اپنے مقامِ سفر کی زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے۔

(طبقات ابن سعد، ج ۱ر جز ۳ر ص ۲۵۸)

یقیناً یہ اعجازِ نظر تھا سیدنا محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا، جنھوں نے پتھر کو پارس اور ذرۂ خاک کو عروجِ افلاک عطا فرما دیا۔

ہمہ گیر رسالت:

اسلام کی ترقی اور فروغ کے تاریخی عوامل پر غور کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیغام کی عالمگیریت کا دور شروع ہوتا ہے۔

آپ ۷ھ بمطابق ۶۲۸ء میں صلح حدیبیہ کے ذریعہ دشمنانِ مکہ سے دس سال کا معاہدۂ امن پختہ کیا تھا، جو قرآنی زبان میں ''فَتْحًا مُّبِيْنًا'' سے تعبیر ہے۔ اس سلسلہ میں ہم عالمی تاریخی حالات پر روشنی ڈالنے سے پہلے رسول اعظم و اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عالمگیر اور قیامت تک کے لیے بنی نوعِ بشر کا نجات دہندہ ہونے کے قرآنی ارشادات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور ان آیات کی تلاوت کرتے ہیں، جن سے ثابت ہے کہ آپ کل خدائی کے نبی ہیں۔ اور آپ ہی خاتم الرسل ہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔

(الاعراف:۷ر۱۵۸)

ترجمہ:۔ تم فرماؤ! اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کو ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

سورۂ انبیا میں ہے:

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (الانبیاء:۲۱ر۱۰۷)

ترجمہ:۔ اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔

سورۂ فرقان کے شروع میں ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ۙ۔ (الفرقان:۲۵ر۱)

ترجمہ:۔ بڑی برکت والا ہے وہ کہ جس نے اتارا قرآن اپنے بندے پر جو سارے جہان کو ڈر سنانے والا ہے۔

سورۂ سبا میں ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ O۔ (السباء:۳۴/۲۸)

ترجمہ:۔ اور اے محبوب! ہم نے تم کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام آدمیوں کو گھیرنے والی ہے، خوش خبری دیتا اور ڈر سناتا، لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

سورۂ کوثر کی یہ آیت کریمہ بھی دست رسول پر کل عالمی فتوحات کی طرف اشارہ کرتی ہے، جیساکہ بعض تفاسیر سے ظاہر ہے:

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۔ (الکوثر:۱۰۸/۱)

ترجمہ:۔ اے محبوب! بے شک ہم نے آپ کو بے شمار خوبیاں عطا فرمائیں۔

تاریخی عوامل:

۷ھ ۔۶۲۸ء میں صلح حدیبیہ کے بعد محبوب خدا سیدنا محمد رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی ہمہ گیر نبوت و رسالت کے پیغامات اس دور کے اکثر حکمرانوں، بادشاہوں اور دنیا کی سطح پر تمرد کے ساتھ حکومت کرنے والوں تک پہنچائے۔

اس زمانے میں دنیا کے نقشہ پر روم و فارس کی دو طاقتور حکومتیں تھیں، جنھیں موجودہ دور کے امریکہ اور روس سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ روم اور فارس کے مطلق العنان بادشاہ اس وقت باہم دگر دست و گریباں تھے۔ روم عیسائی مذہب کا پیرو تھا اور ایرانی آتش پرست تھے، جو خیر اور شر کے دو الگ الگ خدا مانتے تھے۔ کسریٰ نے ۶۲۱ء میں روم کے علاقوں پر حملہ کر کے شام، مصر اور ایشیائے کوچک پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ وہی دور ہے جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مکہ میں مصائب کفار سے تنگ آکر رب تعالیٰ سے ہجرت کی اجازت کے منتظر تھے۔

ہم جس روما یا روم کا ذکر کر رہے ہیں، وہ اِس زمانے کے اٹلی کا دارالسلطنت نہیں ہے، بلکہ بازنطینی حکومت (BYZANTINE) کو اس دور میں اس نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس حکومت روما اور کسرائے ایران دونوں کی سرحدیں عرب کے شمال میں دریائے دجلہ و فرات پر آکر ملتی تھیں۔ یہ بیزنطینی حکومت چوتھی صدی عیسوی میں دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اس کے مشرقی حصے میں کونسٹنٹائن نے ۳۲۶ء میں اپنے تمام مشرقی خطوں کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک شہر جدید کی بنیاد رکھی، جسے قسطنطنیہ کہتے ہیں، بعد میں جس کو استنبول کہا جانے لگا۔ اس بادشاہ کو قیصر (Caisar) کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ دورِ نبوی کی تاریخوں میں اس علاقے کا ذکر ملتا ہے۔ اس مشرقی بازنطین یعنی قیصر روم کی حکومت ایشیائے کوچک، مصر، شام، فلسطین وغیرہ ممالک پر مشتمل تھی۔ ایرانی بادشاہ کسریٰ نے بادشاہِ روم ہرقل (HERACLIUS) پر متواتر حملے کر کے جب اسے شکست دی اور اس کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تو کفار مکہ جو رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی معاندت اور مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے تھے۔ خسرو پرویز بادشاہِ ایران کے ہاتھوں رومی سلطنت کی شکست پر خوشیاں منائیں۔ یہ وہی زمانہ تھا، جس وقت مشرکین مکہ نے متفقہ طور پر رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ اور بنی ہاشم کو شعب ابی طالب میں نظر بند کر رکھا تھا۔

مشرکین مکہ کو ایران سے باطل پرست اور مشرک ہونے کے ناطے اپنائیت تھی اور عیسائی قوم جو اگرچہ تحریف و تنسیخ کا شکار تھی، مگر ان میں وحی خدا، پیغمبر اور آخرت کا تصور موجود تھا، اس لیے ان کی شکست کو اسلام ہی جیسے ایک آسمانی مذہب کی شکست تصور کر کے وہ بہت خوش تھے۔ اور یہ ان کا قیاس فاسد تھا کہ جس طرح اہل فارس مجوسی، رومی، اہل کتاب کو آج شکست دے رہے ہیں، ہم بھی پیغمبر اسلام اور ان کے پیروؤں کو فنا کر دیں گے۔

رات کی کرشمہ سازیاں:

کسریٰ خسرو پرویز بادشاہِ ایران، قیصر روم پر جس طرح متواتر چڑھتا جا رہا تھا، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی شکستہ بازوؤں میں کبھی وہ قوت و طاقت آئے گی کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیافت کر پائے گا۔ عراق، شام، مصر کو اپنے زیر اقتدار لانے کے بعد ایرانی فوج جو ایک طرف ایشیائے کوچک کو پامال کر رہی تھی۔ اور ۶۱۷ھ تک تمام مشرقی بڑے بڑے علاقوں پر ایران قابض ہو چکا تھا۔ اس کے حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ روم کا مشرقی دارالسلطنت قسطنطنیہ بھی خطرے کی زد میں تھا۔

تقویم عالم کے یہ وہی شب و روز ہیں جب سرزمین مکہ پر خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ ابوطالب کی گھاٹی میں محصور، قید و بند اور مظلومیت کی سانسیں لے رہے تھے۔ ان کا باہر کی دنیا، بازار مکہ اور آبادی کے لوگوں سے ہر قسم کا رابطہ کاٹ دیا گیا تھا۔ خرید و فروخت، لین دین، رسم و راہ، بات چیت تک پر پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔ مکہ کے مشرکین اپنے کفر و شرک کی قوت سے توحید و رسالت کی آواز کو بایں ظلم و تشدد شعب ابی طالب میں دفن کر دینا چاہتے تھے۔ قبائل مکہ نے تحریری طور پر اس بائیکاٹ کو موثق کر کے دیوارِ کعبہ سے لٹکا دیا تھا۔ اتنی شدید ناکہ بندی تھی کہ بھوک اور پیاس سے حضور اقدس اور صحابہ وصحابیات، نیز افرادِ بنی ہاشم نڈھال ہوئے جاتے تھے۔ اس عالم بے چارگی میں سوکھے چمڑے کا کوئی ٹکڑا اگر کسی کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اسے چبانے لگتا۔ عورتوں کے بلکنے اور بچوں کے رونے کی آوازیں بلند ہو جایا کرتی تھیں۔

قرآنی پیشین گوئی:

بظاہر کون کہہ سکتا تھا کہ ایسی گھٹن اور مظلومیت کی فضا میں تحریک اسلامی پنپ کر دنیا کے لیے شجر رحمت بن جائے گی۔ مگر قدرتِ خداوندی کن سنگلاخ چٹانوں سے شیریں چشمے رواں کر دے۔ کن پستیوں کو بلندی کی معراج بخش دے۔ اور عروج وارتقا کے دلدادگان کو تنزل کے قعر مذلت تک پہنچا دے۔ کسے معلوم۔؟

عین اس عالم میں جب کہ قیصر روم پستا جا رہا تھا اور اس کی حدودِ سلطنت سمٹتی اور تنگ ہوتی جا رہی تھیں۔ قرآن مجید نے ایک لافانی پیشین گوئی فرمائی:

الٓمّٓ O غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ O فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ	ترجمہ:۔رومی مغلوب ہوئے پاس کی زمین میں اور اپنی مغلوبی کے بعد عنقریب غالب ہوں گے چند برس میں، حکم اللہ ہی کا ہے آگے اور پیچھے اور اسی دن

وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ O بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ O وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ O۔ (الروم:۳۰؍آیت:۱؍تا۶)	ایمان والوں کو خوشی ملے گی اللہ کی مدد سے، مدد کرتا ہے جس کی چاہے، اور وہی ہے عزت والا مہربان، اللہ کا وعدہ، اللہ اپنا وعدہ خلاف نہیں کرتا، لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

اس آیت قرآنیہ میں دو بشارتیں تھیں۔ ایک تو اس بات کی کہ آج کے شکست خوردہ رومی چند ہی سالوں میں پھر غالب ہوکر ایرانیوں کو شکست دیں گے۔ دوسری پیشین گوئی یہ تھی کہ نصرتِ خداوندی کے ذریعہ مسلمانوں کو بھی خوشی نصیب ہوگی۔

جس زمانے اور جس ماحول میں ایسی تعجب خیز پیشین گوئی کی جارہی ہے، اس کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ فکر و نظر کے کسی گوشہ میں اُن باتوں کا وقوع پذیر ہونا ممکنات میں سے نہیں گنا جاسکتا تھا۔ زوالِ روم کی تاریخ لکھنے والا مؤرخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے:

"جب یہ پیشین گوئی کی گئی تو اس زمانے میں قبل از وقت کہی جانے والی کوئی بھی بات اتنی زیادہ خلاف قیاس میں نہیں ہوسکتی تھی"۔

اس قرآنی بشارت کا حال جب مشرکین مکہ کو معلوم ہوا تو اُبی بن خلف نے اس شد و مد سے اس کا انکار کیا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شرط لگا بیٹھا کہ اگر یہ بات سچ ہوگئی تو میں تمہیں سو اونٹ دوں گا اور غلط ثابت ہونے پر میں تم سے سو اونٹ لوں گا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چند ہی سالوں کے اندر ۶۲۲ء وہ انقلابی سال ثابت ہوا کہ ادھر رسول خاتم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مکے کے تیرہ و تار مشرکانہ شکنجہ سے نکل کر مدینے پہنچتے ہیں اور تحریک اسلامی ایک نئی آب و تاب، جدید عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنے ارتقائی سفر کا آغاز کرتی ہے۔ ادھر اسی سال ہرقل قیصر روم قسطنطنیہ سے اپنی فوجیں لے کر نکلتا ہے اور بحری کمک کو منظم کرکے بحر اسود کے راستے چل کر آرمینیا پہنچ جاتا ہے۔ اور سالہا سال کے زخموں کا اندمال اتنے بھرپور طریقے سے کرتا ہے کہ ایرانی حواس باختہ ہوجاتے ہیں۔ اس غیر متوقع حملے کے لیے فارس کی افواج بالکل تیار نہ تھی، اچانک حملہ نے ان کی کمر توڑ دی اور ایرانی افواج پسپا ہونے لگی۔ حتیٰ کہ رومی فوجوں نے دوسرے سال آذر بائیجان میں گھس کر آتش پرستوں کے سب سے بڑے معبد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور شاندار عبادت خانہ ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ اس فتح عظیم کی خوشی میں قیصر روم نے قسطنطنیہ سے بیت المقدس کا پاپیادہ سفر کیا۔

(تاریخ طبری، ج۳؍ص۷۸۵)

"عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتب الی قیصر یدعوہ الی الاسلام وبعث بکتابہ الیہ دحیہ کلبی متفق علیہ"۔

(مشکوٰۃ، ص:۳۰۴)

قیصر روم کے پاس حضور خاتم المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دعوت نامہ لے کر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بصریٰ کے امیر کے بتوسط پہنچے۔ مکتوبِ رسول کا مفہوم درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد کی جانب سے جو اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔

بنام ہرقل ''عظیم روم''

سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرتا ہے۔ بعد آزاں میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، مسلمان ہو جائو، سلامت رہو گے۔ اور اللہ تمہیں دہرا اجر دے گا۔ اگر تم نے روگردانی کی تو تمہاری جاہل رعایا کا گناہ بھی تم پر ہو گا۔

اے اہل کتاب (آل عمران ۳/۶۴) (اختلاف و انتشار کی ساری باتیں پس پشت ڈال کر) اس بات پر متفق ہو جائو جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر مسلم ہے، یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ اگر تمہیں اس بات سے انکار ہے، تو تمہیں معلوم رہنا چاہیے کہ ہم بہرحال خدا کی یکتائی کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نامۂ مبارک متن یہ ہے:

بسم الله الرحمن الرحيم۔

من محمد رسول الله، الى هرقل عظيم الروم، سلام على من اتبع الهدى اما بعد! فانى ادعوك بدعاية الاسلام، اسلم تسلم، يوتك الله اجرك مرتين۔ فان توليت فان عليك الاريثيين۔ ويا اهل الكتاب! تعالوا الى كلمة سواء بيننا وبينكم الا تعبد الا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون۔ محمد رسول الله

قیصر روم کا ابو سفیان سے دریافت احوال:

ہرقل کے روبرو جب نامۂ مبارک پڑھا گیا تو اس نے حکم دیا کہ مدعیٔ نبوت کے خاندان یا قریب کا کوئی عرب شہر میں موجود ہو تو اسے لایا جائے۔ چنانچہ تلاش کرنے پر ''غزہ'' نامی مقام پر قریش کے تاجروں کا ایک قافلہ دریافت ہوا، جس کے امیر قافلہ ابو سفیان تھے (جو اس وقت تک دولت اسلام سے سرفراز نہیں ہوئے تھے) ہرقل نے ابو سفیان کو دربار میں بلا کر بٹھایا اور رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں متعدّد سوالات کیے۔ ابو سفیان صرف اس عزت داری میں کہ میں کہیں جھوٹا مشہور نہ ہو جائوں۔ ہرقل کے ہر سوال کا جواب نہ چاہتے ہوئے بھی سچ سچ دیا۔ اگرچہ اپنے اندازِ گفتگو سے بادشاہ کی نظر میں حضور کی عزت گھٹانے کی کوشش بھی کی تو بادشاہ نے ٹوک دیا۔ اپنی بات شروع کرتے ہوئے:

ابو سفیان : آپ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ جو کچھ آپ کو بتایا گیا ہے، اس سے وہ بہت کمتر ہے۔

ہرقل : (ابو سفیان کی بات کا اثر قبول نہ کرتے ہوئے) صرف ان باتوں کا جواب دو جو میں دریافت کروں۔ بتائو اس کا خاندان کیسا ہے؟

ابو سفیان : نہایت شریف، عزت دار۔

ہرقل : انبیا عالی نسب ہوا کرتے ہیں۔ ان کی خاندانی شرافت بھی علاماتِ نبوت میں سے ایک ہے۔ کیا اس کے خاندان میں پہلے بھی کسی نے دعویٔ نبوت کیا؟ یا کوئی بادشاہ ہوا ہے؟

ابوسفیان : کبھی نہیں۔
ہرقل : اگر ایسا ہوتا تو خیال کیا جاتا کہ خاندانی عزت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ جن لوگوں نے اس کا دین قبول کیا ہے، ان کا تعلق کمزور طبقے سے ہے یا متمول لوگوں سے ؟
ابوسفیان : وہ اکثر غریب لوگ ہیں۔
ہرقل : انبیا و رسل کے متبعین شروع میں غربا و مساکین ہی ہوتے آئے ہیں، ان کے ماننے والے روز بروز بڑھ رہے یا گھٹ رہے ہیں ؟
ابوسفیان : ان کی تعداد روز بروز ترقی پذیر ہے۔
ہرقل : ایمان اور صداقت کی علامتوں میں سے یہ بھی ہے۔ کیا کچھ لوگوں نے اسلام قبول کرکے چھوڑ بھی دیا ہے ؟
ابوسفیان : نہیں۔
ہرقل : یہ بھی علاماتِ نبوت میں سے ایک ہے۔ کیا اس سے کسی نے کبھی کوئی جھوٹ بھی سنا؟
ابوسفیان : نہیں، اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔
ہرقل : جو شخص خود پر جھوٹ کا داغ نہیں رکھتا، خدا پر کذب کا بہتان کیسے باندھ سکتا ہے؟ کیا اس نے کبھی وعدہ خلافی کی ؟
ابوسفیان : اب تک تو ایسا نہیں ہوا، لیکن اب جو معاہدہ (حدیبیہ) ہوا ہے، دیکھئے اس پر وہ قائم رہتا ہے یا نہیں ؟
ہرقل : عہد شکنی پیغمبروں کا شیوہ نہیں۔ کیا تم لوگوں سے اس کی کوئی جنگ بھی ہوئی ؟
ابوسفیان : کئی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔
ہرقل : جنگوں میں فتح و شکست کا کیا حال رہا؟
ابوسفیان : کبھی ہم جیتے وہ ہارے، کبھی وہ جیتے ہم ہارے۔
ہرقل : انبیا و رسل کا یہی حال ہوتا ہے۔ مگر بالآخر فتح و نصرت انہیں کے قدم چومتی ہے۔ اس کی تعلیم اور دعوت کیا ہے ؟
ابوسفیان : اس کی دعوت یہی ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ پاک دامنی اختیار کرو۔ سچ بولو۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ آبا و اجداد کے مشرکانہ عقائد چھوڑ دو۔ نماز قائم کرو۔
ہرقل : نبیٔ موعود کی یہی علامات ہمیں بتائی گئی ہیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ نبی عنقریب ظہور پذیر ہوں گے، مگر یہ گمان نہ تھا کہ وہ سرزمین عرب پہ تشریف لائیں گے۔ اے ابوسفیان! اگر تم نے سب باتیں سچ بتائی ہیں تو ایک روز وہ اِس (میری حکومت) کا ضرور مالک ہو جائے گا۔ کاش! میں پہنچ سکتا تو اس کے پاؤں دھوتا۔

(صحیح البخاری، ج ا رص ۵،۴/اصح المطابع/ تاریخ طبری، ج ۳ر ص ۸۶ر و ۸۷)

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ابوسفیان سے گفتگو کے بعد ہرقل نے بھرے دربار میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مکتوبِ گرامی پڑھوایا۔ اہل دربار ابوسفیان سے مکالمہ ہی پر ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ خط پڑھا گیا تو اور آگ بگولہ ہو گئے۔ اپنے اہل دربار کا یہ

رنگ دیکھ کر ہرقل نے حضرت دحیہ کلبی سے کہا: اگر مجھے ان لوگوں سے اپنی جان کا خطرہ نہ ہوتا تو تمہارے نبی کی اتباع ضرور کرتا۔ بلاشبہ آپ وہی نبی ہیں، جن کا ہم انتظار کیا کرتے تھے۔

(صحیح البخاری، ج ا ر ص ۵، ۴/اصح المطابع/تاریخ طبری، ج ۳ ر ص ۸۸)

روم کے بڑے پادری کا اعلانِ حق:

تاریخ و سیر کے ذخائر سے پتہ چلتا ہے کہ قیصر روم سے ملاقات کرنے اور مکتوبِ نبوی اسے پیش کرنے کے بعد حضرت دحیہ کلبی نے مسیحی مذہب کے سب سے بڑے رہنما پاپائے اعظم "ضغاطر" سے ملاقات کی۔ (روایت ابونعیم فی الدلائل، ص ۱۲۱)

اور اسے الگ سے حضور اقدس کا ایک مکتوبِ گرامی پیش کیا۔ پاپائے روم نے مکتوبِ مبارک کو پڑھ کر آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور گرجا میں داخل ہو کر لوگوں سے خطاب کیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

اے لوگو! میرے پاس عرب میں مبعوث ہونے والے پیغمبر احمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا خط آیا ہے۔ انھوں نے ہمیں ایک خدا کی دعوت دی ہے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ اور احمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔

(تاریخ الکامل، ج ۲ ر ص ۱۴۴، مطبوعہ بیروت/تاریخ طبری، ج ۳ ر ص ۸۸)

اس اعلان اور تصدیق نبوت کو سن کر سب رومی مسیحی سخت برہم ہوئے۔ اور ضغاطر پر ٹوٹ پڑے اور اسے مار مار کر ختم کر دیا۔

قیصر کا اضطراب:

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مکتوبِ گرامی پاکر اور کتب ماسبق و دیگر پیشین گوئیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قیصر روم ہرقل کو یقین ہو گیا تھا کہ آپ وہی پیغمبر آخر الزماں ہیں، جن کا زمانہ بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔ مگر اپنے اہل دربار اور اعیانِ دولت کی ناراضگی اس کی قبولِ اسلام میں مانع ہوئی۔ اور تخت و تاج اور حکومت کی کشش سے آزاد ہو کر وہ انوارِ حقیقت کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

صحیح بخاری میں ابن ناطور کے توسط سے مذکور ہے کہ قیصر بیت المقدس کے سفر میں ایک صبح نہایت بے چینی سے اٹھا، دریافت کرنے پر بتایا کہ آج رات ستاروں کی گردش سے مجھ پر منکشف ہوا کہ مختون قوم کا رہنما تمام ملکوں پر غالب آنے والا ہے۔ اس کی تصدیق اپنے درباری منجم کے ذریعہ چاہی تو اس نے جواب دیا کہ:

"یہ نبی آخر الزماں کا زمانہ ہے اور ان کی بعثت ہو چکی ہے"۔

(تاریخ طبری، ج ۳/صحیح البخاری، ج ا ر ص ۵)

تاریخ طبری میں ہے کہ شام سے قسطنطنیہ لوٹتے ہوئے وہاں قیصر نے اپنا دربار کیا اور اپنے درباریوں سے کہا:

"تم سب کو معلوم ہے کہ ہماری مقدس کتابوں میں محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا ذکر موجود ہے۔ اور ان کی صفات سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ وہی نبی موعود ہیں جن کا ہمیں انتظار تھا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم ان کے تابعدار بن جائیں، تاکہ ہماری دنیا اور آخرت دونوں محفوظ ہو جائیں۔ اہل دربار اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ اور انھوں نے اس بات میں عار محسوس کیا کہ عرب قوم کی فوقیت تسلیم کریں۔ ان کا منفی

جواب پاکر قیصر ناراضگی کے ساتھ دربار سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور کہا کہ اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو مستقبل قریب میں انہیں کے ہاتھوں مغلوبیت کی ذلت اٹھانے کے لیے تیار رہو"۔ (تاریخ طبری، ج۳/ص۸۸)

تاریخی ذخائر بتاتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جوابِ مکتوب میں قیصر نے بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس خط روانہ کیا تھا۔ جس کا مفہوم یہ ہے:

"بحضور احمد رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) جن کے ظہور کی بشارت عیسیٰ (علیہ السلام) نے بھی دی۔ من جانب قیصر روم۔ حضور کا فرمان آپ کے سفیر کے توسط سے دستیاب ہوا۔ میں آپ کے رسول ہونے کا اقرار کرتا ہوں۔ آپ کے ظہور کی بشارت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) نے بھی انجیل میں دی۔ میں نے اپنی ساری رومی رعیت کو آپ پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ اگر وہ آپ پر ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا"۔

اصابہ میں ہے کہ سفیر رسول حضرت دحیہ کلبی سے قیصر روم نے کہا:

"تم پر افسوس! واللہ! میں خوب جانتا ہوں کہ تمہارے حضور ہی مرسل ہیں۔ اور یہ وہی ذات ہے جس کے ہم منتظر تھے اور ان کا تذکرہ ہماری کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن مجھے روم کے باشندوں سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ضرور ان کا اتباع کرتا۔ تم ضغاطر پادری کے پاس جاؤ۔ اور ان سے حضور کا تذکرہ کرو۔ اس لیے کہ سرزمین روم پر وہ مجھ سے زیادہ بااثر ہے۔ اس کی بات زیادہ مانی جاتی ہے۔ اسکے بعد حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پادری کے پاس آئے، اس سے بات چیت ہوئی۔ اس نے حضور کی تصدیق کی۔ پھر اپنے حجرے میں داخل ہوا۔ اپنے کپڑے اتارے، سفید کپڑے پہنے اور باہر آکر لوگوں کے سامنے کلمۂ حق کی شہادت دی۔ جس کے نتیجہ میں رومیوں نے انھیں شہید کر دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون"۔ (الاصابۃ، ج۲/ص۲۱۶)

قیصر کا قاصد دربارِ نبوی میں:

ہرقل قیصر روم کی طرف سے تنوخی نامی قاصد دربارِ رسالت میں حاضر ہوا تھا۔ سعید بن ابی راشد نے ان سے حمص میں ملاقات کی تھی، جب وہ نہایت بوڑھے اور کمزور ہوگئے تھے۔ سعید بن ابی راشد کی فرمائش پر انھوں نے ہرقل سے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مکاتبت کے حالات پر روشنی ڈالی۔ جس میں ابتداءً تو انھوں نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تبوک تشریف لے جانے اور حضرت دحیہ کلبی کے ذریعہ اپنا مکتوب روانہ کرنے کا ذکر کیا۔ پھر کہا کہ حضور کا مکتوب پاکر قیصر نے اپنے تمام پادریوں اور مشیروں کو محل میں جمع کیا اور حضور کے بارے میں ان سب کی رائے پوچھی کہ کیا تمہیں ان کی کچھ معلومات ہے؟ پھر خود ہی کہا کہ انھوں نے تین باتیں ہمیں پیش کی ہیں: (۱) یا ہم ان کا دین قبول کرلیں۔ (۲) اگر دین نہیں قبول کرتے تو انھیں خراج ادا کریں اور ہمارا ملک و سلطنت ہمارے پاس ہی رہے۔ (۳) دونوں میں سے کوئی منظور نہ ہو تو جنگ کے لیے تیار ہوجائیں۔

خدا کی قسم! تمہیں اپنی کتابوں سے خوب معلوم ہے کہ جو زمین آج میرے قدموں تلے ہے، اس پر وہ ضرور قابض ہوجائے گا۔ لہٰذا آؤ اس کی بات مان کر اس کی پیروی کرلیں۔ یا اسے ٹیکس دینے کا فیصلہ کرلیں۔

یہ سن کر ساری قوم نے چیخنا، غرانا اور ٹوپیاں اُچھال کر اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اور کہا کہ تو ہمیں نصرانیت چھوڑنے اور حجاز کے ایک اعرابی کا اتباع کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ماحول بالکل برعکس دیکھ کر قیصر نے کہا: میں نے تو یہ بات تم لوگوں کی آزمائش کے لیے کہی تھی۔

اس کے بعد اس نے تجیب کے رہنے والے ایک نصرانی عرب کو بلایا اور کہا کہ کسی ایسے شخص کو لائو، جس کا حافظہ قوی ہو۔ اور عربی زبان پر عبور رکھتا ہو۔ تجیب مجھے لے گیا۔ قیصر نے پسلی کی ہڈیوں پر لکھا ہوا ایک خط میرے حوالے کر کے کہا کہ میرا یہ خط ان (حضور) کے پاس لے جا اور وہاں جو باتیں ہوں، ان میں تین باتوں کا خاص دھیان رکھنا کہ انھوں نے جو خط مجھے بھیجا ہے، انھیں اس میں سے کتنا حصہ یاد ہے؟ دوسری بات یہ کہ میرے خط پہنچنے کے بعد رات کا ذکر ہوتا ہے یا نہیں؟ اور ان کی پشت کی طرف غور کرنا کہ کوئی ایسی نشانی تجھے ملتی ہے جو شک میں مبتلا کرنے والی ہو؟۔

میں ہرقل کا خط لے کر تبوک پہنچا۔ آپ صحابہ کے ہمراہ ایک پانی کے کنارے تشریف فرما تھے۔ میں نے پوچھا: تمہارے حضرت کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا: یہ ہیں حضور۔ میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا، خط دیا۔ آپ نے خط کو اپنی گود میں رکھ لیا اور پوچھا: آپ کس خاندان سے ہیں؟ میں نے کہا: قبیلۂ تنوخ سے۔ آپ نے فرمایا: کیا آپ کو اپنے جد اعلیٰ ابراہیم علیہ السلام کے دین سے رغبت ہے؟ میں نے کہا: میں ایک قوم کا قاصد ہوں اور جب تک لوٹ نہ جائوں، اسی دین پر رہوں گا۔ آپ نے یہ آیتِ قرآنیہ تلاوت فرمائی:

اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰـکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآئُ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ O۔

(القصص:۵۶/۲۸)

ترجمہ:۔ بے شک یہ نہیں کہ تم اپنی طرف سے جسے چاہو ہدایت کر دو، ہاں اللہ ہدایت فرماتا ہے جسے چاہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت والوں کو۔ (ترجمہ رضویہ)

پھر فرمایا: اے تنوخی بھائی! میں نے ایک خط کسریٰ کے پاس بھیجا تھا، اس نے اس کو پھاڑ ڈالا۔ اللہ اس کے اور اس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ اور میں نے تمہارے بادشاہ کے پاس خط بھیجا، اس نے صحیح سالم رہنے دیا۔ لوگ ہمیشہ اس سے رعب محسوس کریں گے، جب تک اس کی زندگی میں خیر مقدر ہے۔ میں نے اپنے جی میں کہا: جس کی ہرقل نے تاکید کی تھی، ان میں سے یہ ایک بات ہے۔ میں نے اپنی یادداشت کے لیے ترکش سے ایک تیر نکال کر تلوار کی نیام میں رکھ لیا۔ پھر آپ نے اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک شخص کو وہ خط پڑھنے کے لیے دیا۔ میں نے عرض کیا: یہ کون ہیں؟ فرمایا: معاویہ۔ خط میں تھا:

"آپ مجھ کو ایسی جنت کی طرف بلا رہے ہیں، جس کی وسعت آسمانوں اور زمین سے بھی زیادہ ہے، جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ تو جہنم کہاں ہوگی؟ (اس پر) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: سبحان اللہ! جب دن آتا ہے تو رات کہاں چلی جاتی ہے؟ میں نے دوسرا تیر حسب سابق رکھا۔ جب خط ختم ہو چکا تو آپ نے فرمایا: تم قاصد ہو، تمہارا کچھ حق ہے۔ اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو ضرور دیتے، سفر کا عالم ہے اور زادِ راہ ختم ہو چکا ہے۔ اتنے میں ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اسے جائزہ دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے کجاوے سے نکال کر صفوریہ کپڑے کا جوڑا مجھے دیا۔ لوگوں نے بتایا: یہ عثمان ہیں۔ پھر حضور اقدس نے پوچھا: کوئی ہے جو ان کی میزبانی کرے؟ ایک

انصاری جوان نے عرض کی: میں یا رسول اللہ!۔ میں انصاری کے ہمراہ چلنے لگا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بلایا اور فرمایا: اے تنوخی بھائی! میں لپک کر پھر وہیں پہنچ گیا، جہاں پہلے آپ کے حضور تھا۔ آپ نے اپنی پشت مبارک سے چادر اتاری اور فرمایا: اس جگہ کو دیکھ، جس چیز کا تجھے حکم دیا گیا تھا۔ میں نے آپ کی پشت مبارک پر "مہر نبوت" کی زیارت کرلی، جو کاندھے اور پشت کے درمیانی حصہ میں کبوتر کے انڈے برابر تھی"۔ (البدایۃ والنہایۃ، ج۵ر ص۱۵)

قیصر نے حضور کی اطاعت نہیں کی۔ بالآخر شہنشاہِ انبیا کے غلاموں نے دورِ فاروقی میں سرزمین روم پر اسلامی پرچم لہرا کر خاتم الانبیا کی پیشین گوئی کو سچ کر دکھایا۔

باب دوم: تذکره

سیدہ مریم علیہا السلام ایک معتکف خاتون

حضراتِ انبیا و مرسلین علیہم السلام کی زندگیاں تو سراپا اطاعت ربانی کے لیے وقف ہوا کرتی تھیں۔ اور ان کے خلوت کدے انوارِ الٰہی سے شب و روز جگمگاتے رہتے تھے۔ تحقیق کی جائے تو سوانح انبیا و رسل میں اعتکاف کی قیمتی مثالیں دریافت ہو سکتی ہیں۔

اسی طرح تاریخ انسانی میں صالح مومنین اور امم سابقہ کے اولیا و صلحا نے بھی اپنے اوقات خالص عبادتِ ربانی کی غرض سے گوشۂ تنہائی میں لگائے ہیں اور قربِ خداوندی کی دولت سے سرفراز ہوئے ہیں۔ زہد و تجرد کی تاریخ میں سیدنا عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا اسم گرامی فہرست انبیا میں بہت نمایاں ہے۔ باب اعتکاف میں امم سابقہ سے بھی استفادہ کرنے کی غرض سے میں خواتین عالم میں منتخب اور سیدۃ النساء فی الجنۃ۔ (مسند احمد)

''وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ۝''۔

مادرِ مسیح، سیدہ صدیقہ مریم علیہا السلام کا حسین حیاتی اعتکاف بیان کرنا چاہتا ہوں۔

یہ وہ مقدس ترین خاتون ہیں، جن کی طہارت و عظمت اور بزرگی و کرامت پر قرآن مجید ناطق ہے۔ رب کائنات نے انھیں صدیقہ کا لقب عطا فرمایا۔ اور انبیا و مرسلین کی طرح ان کو سیدنا جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ اپنا پیغام بھیجا:

''وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا''۔

ترجمہ:۔ ہم نے مریم کے پاس اپنے فرشتے (جبریل) کو بھیجا۔

اور قرآن میں خود سیدنا جبرئیل علیہ السلام کا قول یوں ذکر ہوا ہے کہ بی بی مریم علیہا السلام کے پاس آکر انھوں نے فرمایا: ''اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ''۔

ترجمہ:۔ بے شک میں تمہارے رب کی طرف سے پیغامبر ہوں۔

کتابِ الٰہی میں جس طرح جلیل القدر انبیا و رسل کے تذکرے کیے گئے ہیں، اسی طرح مادرِ مسیح علیہا السلام کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ مثلاً:

''وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ''۔

اسی اسلوب اور اسی انداز سے ''وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ''۔ (مریم ۱۶)

ترجمہ:۔ اور کتاب میں مریم کو یاد کرو۔ بھی آیا ہے۔

خدا کی اس نیک پارسا بندی نے بیت المقدس کے ایک گوشہ میں اعتکاف کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ:

حضرت مریم علیہا السلام کے والدین اولاد سے محروم تھے۔

حضرت عمران بن ماثان بنی اسرائیل میں ایک متقی اور پرہیزگار شخص تھے۔ ان کے زہد و تقویٰ اور پارسائی کی وجہ سے بیت المقدس کی امامت انہیں کے سپرد تھی۔ ان کی زوجہ حنہ بنت فاقوذا بھی نہایت پرہیزگار، عبادت گزار خاتون تھیں (مسیحی روایات میں حضرت عمران جو

حضرت مریم کے والد ہیں، ان کا نام یوآخیم آیا ہے) حضرت عمران اور ان کی اہلیہ کے بارے میں ماہرین انساب اس بات پر متفق ہیں کہ دونوں سیدنا داؤد علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ (البدایۃ والنہایۃ، ج۲/ص۵۶۔ ولوقا ۵/۱)

علامہ ابن کثیر محدث بن اسحاق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حضرت مریم کی ماں نے ایک دن دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے ننھے بچے کو پیار کر رہا ہے۔ دیکھ کر ان کے سینے میں ممتا نے ہوک ماری کہ کاش! مجھے بھی اولاد ہوتی۔ اسی عالم میں انھوں نے رب قدیر سے دل کی گہرائیوں کے ساتھ اولاد کی دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبولیت بخشی اور وہ حاملہ ہوگئیں۔ (مختصر تفسیر ابن کثیر، ج۱/ص۲۷۸)

حضرتِ حنہ والدۂ مریم کو جب چند روز بعد اپنے شکم میں ایک بے دار روح کے وجود کا احساس ہوا تو وہ پھولی نہ سمائیں۔ بنی اسرائیل میں یہ مذہبی طور پر نہایت مقدس طریقہ چلا آتا تھا کہ اولاد کو خانۂ خدا کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے۔ اس طرح بہت سے مرد و عورت ہیکل مقدس کے حجروں میں ہمیشہ معتکف رہتے اور ان کے شب و روز عبادت میں گزرتے۔ (البدایہ والنہایہ، ج۲/ص۵۶)

انھوں نے بھی اپنے ہونے والے بچے کے لیے نذر مانی کہ اسے مسجد اقصیٰ کے لیے وقف کر دوں گی۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

''اِذْ قَالَتِ امْرَاَةُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝'' ۔ (آل عمران:۳۵)

ترجمہ:۔ جب عمران کی بیوی کہہ رہی تھی کہ میرے پروردگار! میں تیرے لیے منت مانتی ہوں کہ خالص تیری ہی خدمت میں رہے تو تو مجھ سے قبول کرلے، بے شک تو ہی سننے جاننے والا ہے۔

نہایت الحاح ولجاجت اور منت و زاری کے بعد حضرت حنہ جب شکم میں اولاد کو پاکر سرور و شاداں تھیں، اسی زمانے میں ان کے شوہر حضرت عمران کا انتقال ہوگیا۔ (فتح الباری، ج۶/ص۳۶۴)

حضرت حنہ سے مدتِ حمل پوری ہونے کے بعد لڑکی کی ولادت ہوئی۔ اس لحاظ سے حنہ کی خوشیوں کا کیا پوچھنا کہ وہ ماں بن گئیں، مگر ہیکل مقدس کی خدمت کے لیے لڑکی ذات؟۔ وہ تکمیل نذر کے لیے پریشان ہوئیں۔

''فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝'' ۔ (آل عمران:۳۶)

ترجمہ:۔ پھر جب وہ بچی اس کے یہاں پیدا ہوئی، تو اس نے کہا: اے رب میرے! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے، حالاں کہ جو کچھ اس نے جنا تھا اللہ کو خبر تھی اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔ میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

بیٹا کے بجائے بیٹی پیدا ہونے پر بھی حضرت حنہ نے اس کے سلسلہ میں اپنی نذر پوری کرنے کے لیے عزم بالجزم کا اظہار کیا اور اسی مناسبت سے اس کا نام بھی مریم (خادمہ) رکھا اور رب تعالیٰ سے حفاظت وصیانت کی دعا مانگی کہ مریم اور اس کی ذریت کو شیطان سے محفوظ رکھ۔ خداوند کریم نے اس دعا کو قبول فرمایا۔ فرماتا ہے:

''فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا'' ۔

ترجمہ:۔ تواسے اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا اور اسے اچھا پروان چڑھایا۔

حضرت حنہ نے ولادت کے بعد حضرت مریم کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر بیت المقدس میں احبار کے سامنے رکھ دیا۔ یہ احبار حضرت ہارون کی اولاد میں تھے اور بیت المقدس میں ان کا منصب ایسا تھا جیساکہ کعبہ شریف میں حجبہ کا۔ چوں کہ حضرت مریم ان کے امام اور صاحب قربان کی دختر تھیں اور ان کا خاندان بنی اسرائیل میں بہت اعلیٰ اور اہل علم کا خاندان تھا۔ اس لیے ان سب نے جن کی تعداد ۲۷ر تھی، حضرت مریم کو لینے اور ان کا تکفل کرنے کی رغبت کی۔ حضرت زکریا نے فرمایا کہ میں ان کا سب سے زیادہ حق دار ہوں، کیوں کہ میرے گھر میں ان کی خالہ ہیں۔

(خزائن العرفان، ص۸۰)

اس سے پہلے بیت المقدس کی خدمت اور اس میں اعتکاف دائی کرنے والے شاید مرد ہی ہوتے تھے۔ اور حضرت مریم کا تعلق صنف نسواں سے تھا، اس لیے بھی۔ اور بقولِ بعض اس زمانے میں قحط کا زور تھا، اس کی وجہ سے بہت لوگ معاشی بحران میں مبتلا تھے، اس لیے ان کے مستقل کفیل کی ضرورت تھی۔

(تفسیر ابن کثیر، ج ار ص ۳۶۰)

بیت المقدس کے تمام احبار حضرت مریم کی کفالت اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے، اس لیے محض اہل قرابت ہونے کی وجہ سے حضرت زکریا کو دینے پر راضی نہیں ہوئے، بلکہ قرعہ اندازی ہوئی اور تین بار کی قرعہ اندازی میں ہر بار قرعہ حضرت زکریا ہی کے نام نکلا۔ لہٰذا انھیں کے ساتھ تائید غیبی سمجھ کر سب لوگوں نے اپنی پیش کش واپس لے لی۔

کفالتِ مریم علیہا السلام کے سلسلہ میں احبار کی باہمی کشمکش کو بھی قرآن مجید نے ضبط فرمایا ہے۔ اور رب تعالیٰ نے نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بڑے پیارے انداز میں اس غیبی خبر سے باخبر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

’’ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ O‘‘۔
(آل عمران:۴۴)

ترجمہ:۔ یہ غیب کی خبریں ہیں کہ ہم خفیہ طور پر تمہیں بتاتے ہیں اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنی قلموں سے قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ مریم کس کی پرورش میں رہیں اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

اس طرح نہایت رد وکد اور قرعہ اندازی کے بعد حضرت مریم حضرت زکریا کی کفالت میں آگئیں اور انھیں کی نگرانی میں رہنے لگیں۔ (ابن جریر نے عکرمہ وقتادہ وسعدی کی روایت سے قرعہ کا واقعہ لکھا ہے کہ سب اپنے قلم دریا میں پھینکتے، سب کے قلم روانی میں بہہ جاتے اور زکریا کا قلم پانی پر ٹھہر جاتا، جس طرح خشک زمین پر ٹھہر جاتا ہے)

’’وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا‘‘۔ (آل عمران:۳۷)

ترجمہ:۔ اور زکریا کو ان کا سرپرست بنا دیا گیا۔

حضرت مریم علیہا السلام کا وجود خدا کی قدرت کا زندہ معجزہ تھا۔ ''وَاَنۡۢبَتَہَا نَبَاتًا حَسَنًا'' کی تفسیر میں مفسرین لکھتے ہیں کہ آپ کی جسمانی نشو ونما میں بھی اس اعجاز کا اظہار ہوتا تھا کہ عام طور پر بچے جتنا ایک سال میں بڑھتے ہیں، آپ اتنا ایک روز میں بڑھتی تھیں، آپ نے کسی عورت کا دودھ نہ پیا۔ شکل وصورت میں بھی نہایت حسین وجمیل تھیں۔ اور لوگوں کے قلوب کی کشش کا یہ عالم تھا کہ جو آپ کو دیکھتا عزت واحترام کرتا۔ اسی طرح حضرت زکریا جیسے عالم روزگار کی تربیت نے آپ کو علوم وخبر اور زہد ومعرفت میں بھی طاق کردیا تھا۔ اور اصلاً یہ سب ''وَاَنۡۢبَتَہَا نَبَاتًا حَسَنًا'' کے جلوے تھے۔

پارسا ماں باپ نے جس حسن نیت سے اس اولاد کو مانگا تھا اور علامت حمل ظاہر ہونے پر جو نذر مانی تھی، خداوند قدوس نے مریم بتول کو اس سے کہیں زیادہ عزمت وفضیلت سے سرفراز کیا۔

مسجد بیت المقدس کے گرد اعتکاف کرنے والوں اور احبار کی عبادت کے لیے پردے لگے ہوئے وہ معتکف تھے، ان میں وہ دنیا سے بے نیاز ہوکر صرف یادِ مولا میں مستغرق رہتے۔ ان اعتکاف کی جگہوں کو قرآن نے اپنے اسلوب میں ''المحراب'' فرمایا ہے۔

تفسیر مواہب الرحمن، ج۳رص ۲۳۴ر بحوالہ تفسیرِ کبیر مرقوم ہے کہ حضرت زکریا نے مریم کے لیے ایک غرفہ بنایا کہ جس میں پہنچنے کے لیے زینہ چڑھ کر جانا ہوتا تھا۔ زکریا کے سوا اس زینے پر کوئی نہ جاتا تھا۔ وہ مریم کے لیے کھانا پانی اور روشنی کے لیے تیل لاتے تھے۔ اور ربیع انس سے راوی ہیں کہ زکریا مریم کے پاس سے نکلتے تو سات دروازے مقفل کرتے۔ (ابن جریر)

(اس محراب سے مراد مسجد کا وہ شاہ در نہیں جہاں امام قیام کرتا ہے)

حضرت عمران اور حنہ کی یہ پاکیزہ خصلت پارسا شہزادی ماں کے عہد کو بحسن وخوبی نبھارہی تھیں اور شب وروز عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتیں۔ مسجد بیت المقدس (ہیکل سلیمانی) کی خدمت کرتیں۔ زہد وتقویٰ، عبادت وریاضت اور خدا رسی کے لیے مجاہدہ ہی میں آپ کے اوقات بسر ہوتے۔ خدا کی قدرت کہ بڑے بڑے زاہدین وعابدین اور اہل روحانیت بھی آپ کی عظمت کو تسلیم کرنے لگے۔ حضرت زکریا احبار میں عالمِ کبیر تھے۔ بارگاہِ الٰہی میں قربانیاں انھیں کے ذریعہ پیش کی جاتی تھیں۔ مسجد بیت المقدس میں آپ کی اجازت کے بغیر کوئی داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ تمام علما اور احبار احترام کرتے تھے، مگر وہ حضرت زکریا جب حضرت مریم کی ضروری نگہ داشت اور ضرورتوں کے پیش نظر ان کے معتکف میں جاتے تو کیا دیکھتے کہ وہاں بے موسم کے پھل رکھے ہوئے ہیں۔ سردی کے موسم میں گرمیوں کے پھل اور گرمی کے زمانے میں سردیوں کے میوے۔

حضرت سیدہ مریم نے اپنے اعتکاف کو اس خوبی اور کمال سے پورا کیا کہ رب کریم کی رحمتیں اور نعمتیں ان پر متوجہ ہونے لگیں۔ ان کا روحانی تعلق ملأ اعلیٰ سے قائم ہوگیا۔ اور ان سے کرامات کا ظہور ہونے لگا۔ حضرت زکریا جیسے جلیل القدر عالم ربانی اس محیر العقول بات پر ششدر رہ جاتے۔ وہ حضرت مریم کے لیے کھانا لے کر جارہے ہیں اور وہاں رزق پہلے سے موجود ہوتا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس خلوت گزینی اور اعتکاف اور اس عالم میں عبادت وریاضت اور بندگی اور عفت تابی کا یہ انعام تھا کہ حضرت مریم کو جنتی غذائیں ملنے لگیں اور حقیقی توکل علی اللہ کا یہی ثمرہ ہے۔ توکل کی حقیقت بھی یہی ہے کہ اس میں کسی مخلوق کی طرف التفات نہ ہو۔ یہ شانِ ولایت ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ انسانی کفالت کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ اس سے بے نیاز ہیں۔ اولیاء اللہ کی خدمت ان پر احسان نہیں ہے، بلکہ سعادت ہے۔ بلکہ خزانۂ رزق میں اولیاء اللہ کے ذریعہ برکت نازل ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا٥ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ٥۔

(آل عمران:۳۸)

ترجمہ:۔ جب زکریا اس کے پاس اس کے غرفے میں جاتے، اس کے پاس نیا رزق پاتے۔ کہا: اے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ بولیں: وہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ جسے چاہے بے حساب روزی عطا فرمائے۔

حضرت زکریا نے حضرت مریم پر انعاماتِ الٰہیہ اور اکرام کی بارش کا منظر دیکھا تو ان کے دل میں بھی خدا کی رحمت سے امید کی نئی کرن نمودار ہوئی اور انھوں نے اپنے بُڑھاپے اور اپنی زوجہ کے بانجھ پن کے باوجود بارگاہِ رب الصمد میں اولاد کی تمنا پیش کردی، جو بار آور ہوئی۔

خدا کے گھر خدا کی نیک بندی مریم اعتکاف اور عبادات میں شب و روز مشغول تھیں، قدرت کو ان کے ذریعہ اپنے اعجاز کا اظہار منظور ہوا کہ دنیا کی عام روِش کے خلاف انھیں ایک فرزند صالح دیا جائے اور سرزمین گیتی پر آج تک جس امتحان سے کوئی عورت نہ گزاری گئی، مریم کو اس میں ڈالا جائے۔ قربان جائیے! اس عظمت والی پاکیزہ خاتون کے جس پر اللہ کا کلمہ اترا۔ خدا نے اسے منتخب فرمایا اور اپنی جانب سے اسے طیب و طاہر کیا اور خواتین عالم میں ممتاز فرمایا۔ ارشادِ قرآنی ہے:

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ٥۔

(آل عمران:۴۲)

ترجمہ:۔ اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ نے تجھے چن لیا اور خوب ستھرا کیا اور دنیا کی عورتوں سے تجھے پسند کیا۔

زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت سے اپنے حجلۂ اعتکاف کو منور فرمانے والی دنیا کی اس عظیم الشان خاتون کی شان میں یہ قرآنی قصیدہ ابدی اور سرمدی ہے اور ''وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ'' ایسی سند ہے، جس پر صنف نسواں جس قدر ناز کرے کم ہے۔

اگرچہ امت محمدیہ میں امم سابقہ کی طرح اولاد کو عبادت الٰہیہ اور خدمت مسجد کے لیے وقف کرنا جائز نہیں، تاہم بابِ اعتکاف میں سیدہ مریم علیہا السلام کی حیاتِ طیبہ روشن مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔

خاص عبادت کے لیے دنیا سے کنارہ کش ہوکر مسجد میں عزلت نشین ہوجانے والے بندگانِ حق کے لیے آقا و مولا سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد پیش نظر رہے:

'' ان للمسجد اوتادا الملائكة جلسائهم ان غابوا يفقدوهم وان مرضوا عادوهم وان كانوا في حاجة اعانوهم ''۔

(الفتح الربانی، بحوالہ مسند احمد عن ابن لہیعہ، ج:۱۰/ص:۲۴۲)

ترجمہ:۔ کچھ لوگ مسجدوں کے لیے میخ بن جاتے ہیں (ہر دم وہیں رہتے ہیں) ایسے لوگوں کے ہم نشین فرشتے ہوتے ہیں۔ اگر یہ مسجد سے چلے جائیں تو وہ انھیں تلاش کرتے ہیں، بیمار ہو جائیں تو عیادت کرتے ہیں، کوئی ضرورت پیش آجائے تو ان کی مدد کرتے ہیں۔

سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آغوشِ اسلام میں:

مخزومیوں کے جم گھٹے میں ابو جہل بیٹھا ڈینگیں مار رہا ہے۔ صحن کعبہ میں بتوں کے آسن پر پجاریوں کی آمد و رفت جاری ہے۔ سورج حجلۂ مغرب کی طرف جھکتا جارہا ہے۔ ابو عمارہ، حمزہ حسب معمول گھوڑے پر سوار، کندھے پر کمان سجائے صحن کعبہ کی طرف آرہے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ بنو ہاشم کا یہ جیالا، شکار اور سیر و سیاحت کا متوالا ہے۔ اندھیرے منہ گھر سے نکل جانا، جنگلوں اور وادیوں کی خاک چھاننا، شکار کھیلنا اور دن ڈھلے واپس آنا، ان کا معمول ہے۔ نیزہ بازی، شمشیر زنی اور شہ سواری تو ان کی گھٹی میں شامل ہے۔ حمزہ صحن کعبہ میں پہنچے اور سیدھا ابو جہل کی طرف بڑھے۔ چہرہ غصہ سے تمتمارہا تھا، کاندھے کی کمان اب ہاتھ میں تھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ تیور اچھے نہیں، ابو جہل پر جھپٹے اور کمان اس کے سر پر دے ماری، سر سے خون جاری ہوگیا۔ بنو مخزوم کے لوگ حمزہ کی طرف یہ کہتے ہوئے لپکے:

حمزہ لگتا ہے تو بھی بدمذہب ہوگیا ہے؟۔

جواب ملا: بے شک جب حقانیت مجھ پر واضح ہوگئی تو اس کی متابعت سے کون روک سکتا ہے۔ (مستدرک حاکم، ج۳ر ص ۱۹۳)

سنو! میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد خدا کے رسول ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں، حق ہے۔ قسم خدا کی! اب میں اس سے پلٹ نہیں سکتا۔ اگر تم سچے ہو تو مجھے روک کر دیکھ لو۔ مخزومی زخمی ابو جہل کو لے کر چلتے بنے۔ اور اس بپھرے ہوئے ہاشمی شیر کو مزید چھیڑنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ ابو جہل نے کہا: ابو عمارہ سے تعرض نہ کرو۔ بخدا! میں نے ابھی اس کے بھتیجے کو سخت گالیاں دی ہیں۔

ہوا یہ کہ آج شکار سے لوٹتے ہی راہ میں صفا پر انھیں کنیز نے بتادیا کہ حرم میں ابو جہل نے تمہارے بھتیجے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سخت بے حرمتی کی ہے اور انھوں نے اس پر اُف بھی نہ کی۔ کاش! تم اس دل گداز منظر کو دیکھتے۔

کنیز کی اس بات کی پاداش میں نہ صرف ابو جہل کا سر ٹوٹا، بلکہ ابو عمارہ حمزہ بن عبدالمطلب کا قفل دل قبولِ اسلام کے لیے کھل گیا۔ اس کے بعد وہ حضور کی خدمت میں پہنچے اور کہا:

بھتیجے! میں نے ابو جہل سے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔

آپ نے فرمایا: بدلہ لینے سے مجھے کیا خوشی حاصل ہوگی، خوشی تو تب ہوگی کہ مسلمان ہوجائو۔

جرأتِ مندانہ:

حمزہ کے دل میں اسلام کا نور تو پہلے ہی راہ بنا چکا تھا، رحمت و نور کی سرکار نے نورانی زبان سے اس لَو کو اور بڑھا دیا۔ اور آزاد منش، سیر و شکار کے سرمست حمزہ، مئے توحید کے متوالے بن گئے۔ (سیرتِ ابن ہشام، ج۱ر ص ۱۱۲)

آپ کی جواں مردی، شجاعت و بصالت اور بارعب شخصیت نے اسلامی تحریک و دعوت کو بہت تقویت بخشی۔ اہل مکہ آپ کی بہادری و جواں مردی کا لوہا مانتے تھے۔ آپ کے قبولِ اسلام کے تیسرے ہی دن جب نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چند نفوسِ قدسیہ کے ساتھ دارِ ارقم میں تشریف فرما تھے۔ کسی نے خبر دی کہ:

عمر اپنے ہاتھ میں ننگی تلوار لیے چلے آرہے ہیں۔ مسکین مسلمان یہ سن کر خائف ہوئے۔ سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنا تو فرمایا: دروازہ کھول دو اور عمر کو شمشیر بکف آنے دو۔ اگر اس کی نیت بخیر ہے تو خیر، ورنہ اسی کی تلوار سے اس کی گردن کاٹ ڈالوں گا۔ (طبقات ابن سعد، قسم اول، جز۳/ص ۱۶۲)

عمر داخلِ دربارِ رسالت ہوئے اور جن کی حمایت میں گھر سے برہنہ تلوار لے کر نکلے تھے، ہمیشہ کے لیے انھیں دشمنانِ اسلام کے حق میں خود برہنہ تلوار بن گئے۔

اسلام کو تقویت ملی:

حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت ''ابو عمارہ'' اور ''ابو یعلی'' ہے۔ اور آپ کا لقب ''اسد اللہ'' ہے۔ آپ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حقیقی اور ہمجولی چچا ہیں، عمر میں حضور سے صرف دو سال بڑے ہیں۔

اعلانِ رسالت کے بعد سے مشرکین مکہ نے جور و استبداد اور تشدد کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور خود ذاتِ رسول اور کمزور اتباع اسلام کو نت نئی ترکیبوں سے ستاتے رہتے تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبولِ اسلام سے وہ سلسلہ یک گونہ تھم گیا۔

ہجرت و مواخات:

بعثت نبوی کے تیرہویں سال صحابۂ کرام کی کثیر جمعیت کے ہمراہ آپ نے بھی مدینہ شریف کی طرف ہجرت فرمائی اور غزوۂ احد تک اسلامی لشکر کے سربراہ کی حیثیت سے دادِ شجاعت حاصل کرتے رہے۔ مدینہ پہنچ کر رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے درمیان ''مواخات'' قائم فرمائی تو آپ زید بن حارثہ کے بھائی قرار پائے۔ ان کو زید سے غایت درجہ محبت تھی۔ جہاد کے لیے جب روانہ ہوتے تو اپنے مال و متاع کے سلسلہ میں زید ہی کو وصیت کر جاتے۔

سربراہِ لشکر اسلام:

ہجرت کے بعد کفارِ مکہ کے زور کو توڑنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قریشی قافلہ روکنے کی پہلی مہم آپ کے سپرد کی۔ ابو جہل کے ساتھ تین سو قریشی سواروں کا مقابلہ کرنا تھا، اسی موقع پر تیس آدمیوں پر مشتمل طلایہ کا عَلَم سیدنا امیر حمزہ کے ہاتھ میں تھا، آپ اپنے ہمراہیوں کو لے کر ساحلی علاقہ کی جانب روانہ ہوئے۔ قافلۂ قریش سے سامنا بھی ہوا، مگر مجدی بن عمرو جہنی نے بیچ بچاؤ کر کے خوں ریزی نہ ہونے دی اور قریشی قافلہ چلا گیا۔ (طبقات ابن سعد، حصہ مغازی، ص ۴۷)

اس کے تھوڑے دنوں بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قریش کا راستہ روکنے کے لیے اپنے ساٹھ صحابہ کے ساتھ ابواء پر چڑھائی، اس وقت بھی حضرت حمزہ کو عَلَم اور فوج کی کمان سپرد کی گئی۔ لیکن مشرکین قریش کا قافلہ پہلے نکل چکا تھا، اس لیے معرکہ پیش نہ آیا۔ بنو حمزہ سے دوستانہ معاہدہ اسی سفر میں ہوا۔

معرکۂ بدر کا شہ سوار:

۲ھ میں غزوۂ بدر ہوا، شرک و کفر کی آندھیاں اٹھیں اور اسلام کی قندیل کو گل کرنے کے درپے ہوئیں۔ بدر کے میدان میں جب دونوں طرف کی فوجیں صف آرا ہوئیں تو صف مشرکین سے تین بہادر میدان میں نکلے۔ عتبہ، شیبہ اور ولید۔ اور مقابل طلب کیا۔ غازیانِ

اسلام اور جاں بازانِ مصطفیٰ میں سے انصاری نوجوان سامنے آئے، توانھیں دیکھ کر عتبہ نے آواز دی:

اے محمد! ہمارے مقابل والوں کو بھیجو، غیر جنس والوں سے ہم نہیں لڑیں گے۔

آقا و مولا سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ کو بھیجا۔ یہ تینوں نیزے ہوا میں لہراتے ہوئے ان کے قریب پہنچے۔ حضرت حمزہ نے پہلے ہی حملے میں عتبہ کا کام تمام کر ڈالا۔ ادھر حضرت علی کی ذوالفقار نے شیبہ کو واصل جہنم کیا۔ عبیدہ ولید سے دیر تک الجھے رہے، ولید نے انھیں زخمی کر دیا۔ اپنے اپنے مقابل سے فارغ ہو کر حضرت حمزہ اور حضرت علی نے ولید کا بھی صفایا کر دیا۔ (ابوداؤد، ج ۱ ص ۲۶۳)

اپنے تینوں سورماؤں کا یہ انجام دیکھ کر کفارِ قریش کا خون کھول اٹھا، جوشِ غضب میں طعیمہ بن عدی میدان میں کودا، مگر خدا کے شیر سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک ہی وار میں اسے بھی ڈھیر کر دیا۔ اپنا چوتھا بہادر مرتے دیکھ کر کافروں نے یک بارگی ہلہ بول دیا۔ اور ان جاں بازانِ اسلام کو نرغے میں لے لیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر مسلمانوں نے بھی حملہ کیا۔ حضرت حمزہ نے اپنی تلوار کے خوب جوہر دکھائے، دشمنوں کی صف میں گھس جاتے اور قتال کرتے تو لوگ انھیں ان کے عمامہ پر لگی ہوئی کلغی کے ذریعہ شناخت کرتے۔ وہ کلغی شترمرغ کے پر کی تھی۔ بدر کے دن حضرت حمزہ نے دونوں ہاتھوں سے تلوار چلائی اور بالآخر دشمن کے ستر آدمی مقتول ہوئے اور ستر قیدی ہوئے۔ کفارِ مکہ کی کمر ٹوٹ گئی۔ کیوں کہ اس معرکہ نے ان سے ان کے مشہور بہادروں کو چھین لیا تھا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف کہتے ہیں: مجھ سے جنگ بدر میں امیہ بن خلف نے پوچھا: یہ کون شخص ہے؟ جو اپنے سینے پر شترمرغ کا جھنڈا لگائے ہوئے ہے۔ میں نے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب ہیں۔ اس نے کہا: انھوں نے آج ہم پر بہت ستم ڈھائے ہیں۔ (الہیثمی، ج ۶ ص ۸۱)

غداروں کی سرکوبی:

مدینہ منورہ کے نواح میں یہود کا ایک قبیلہ آباد تھا، جس کا نام بنو قینقاع تھا۔ اس سے مسلمانوں کا حلیفانہ معاہدہ ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کو غزوۂ بدر میں کفار پر جب نمایاں فتح ملی تو انھیں آتش حسد نے جلایا اور ان لوگوں نے معاہدہ فسخ کر کے سرکشی اور تمرد اختیار کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے ان کی عہد شکنی کا مزہ چکھانے کے لیے اسی سال شوال میں ایک لشکر تیار کیا، اس لشکر کے علَم بردار سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ فوج کشی ہوئی اور اس باغی گروہ کو اطرافِ مدینہ سے نکال دیا گیا۔ (طبقات ابن سعد، حصہ مغازی، ص ۱۹)

اسلام اور کفر کی آویزش کا عظیم ترین معرکہ غزوۂ بدر تھا۔ جس میں رب تعالیٰ کی نصرت سے محض تین سو تیرہ صحابۂ کرام نے ایثار و قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ کی تاریخ کا مقدمہ اپنے لہو کی روشنائی سے تحریر کیا تھا۔ صحابہ کرام میں ''السابقون الاولون'' کے درجات بہت بلند ہیں۔ اسی طرح جن صحابہ نے غزوۂ بدر کبریٰ میں شرکت فرمائی، وہ نہ شریک ہونے والوں سے افضل ہیں۔ رب کائنات نے بدر والوں کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمادیے ہیں۔ پھر ان میں غازیانِ بدر کے علَم بردار اور سربراہ سیدنا امیر حمزہ کے مقام و مرتبے کا کیا کہنا، جو میدانِ بدر میں اسلامی لشکر کے سید و سردار تھے، جن کی خاراشگاف تلوار دشمنانِ قریش پر صاعقۂ مرگ بن بن کر کوندی اور جن کے حملوں نے کئی بہادر مشرکین کو خاک میں ملا دیا۔

غزوۂ بدر کے بعد مشرکین مکہ کے دنوں کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ ان کے دل و دماغ پر صرف انتقام، انتقام اور انتقام سوار تھا۔ معرکۂ بدر میں مقتول ہونے والوں کا انتقام۔ چنانچہ ایک سال بعد مکہ کے سرداروں نے اپنی ساری قوت مجتمع کر کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑنے کا پروگرام بنایا۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپ نے جاں باز مسلمانوں کو ساتھ لے کر وادئ اُحد میں قیام کیا۔

امیر حمزہ اور میدانِ اُحد:

شوال کی سات تاریخ ہفتہ کا دن تھا، جب اسلامی تاریخ کا دوسرا معرکہ ''غزوۂ احد'' شروع ہوا۔ کافروں کی طرف سے ''سباع'' باہر نکلا اور مبارز طلب کیا۔ سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقابل آئے۔ تلوار آپ کے ہاتھ میں لہرا رہی تھی۔ آپ نے کہا: اے ام انمار ختنہ گر عورت کے بیٹے! کیا تو خدا اور اس کے رسول سے جنگ کرنے آیا ہے۔ اور اس زور کا وار کیا کہ اسے ایک ہی بار میں ڈھیر کر دیا۔ زوروں کی لڑائی شروع تھی، شمع رسالت کے پروانوں نے جان کی بازیاں لگا دیں۔ سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ حال تھا کہ دشمن کی صفوں کو کائی کی طرح پھاڑتے چلے جاتے تھے اور مقابلے پر آنے والا مشکل سے اپنی جان بچا پاتا تھا۔ اپنی جواں مردی، شجاعت اور بہادری سے آپ نے کافروں کو بھونچکا کر دیا۔ آپ شیر ژیاں کی طرح جھپٹتے اور اپنے حملوں سے کفار کی صف کو الٹ دیتے۔ ایک طرف یہ جاں بازی اور جاں سپاری۔ اور دسری طرف لشکر ابوسفیان کے ناپاک ارادوں کے خلاف رب کائنات سے مسلمانوں کی فتح و نصرت کی دعائیں بھی کرتے جاتے تھے۔

حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت میں ہے کہ:

''ایک شخص نے کہا: میں نے انھیں اس درخت کے پاس یہ کہتے ہوئے سنا، میں اللہ اور اس کے رسول کا شیر ہوں۔ اے اللہ! میں برأت چاہتا ہوں اس شے سے جو یہ (ابوسفیان اور اس کے ہم رکاب) لائے ہیں اور معذرت خواہ ہوں جو ان لوگوں نے کیا۔ یعنی مسلمانوں کی شکست کا سامان''۔ (الحاکم، ج ۳ر ص ۱۹۹)

لیلائے شہادت کی بانہوں میں:

غزوۂ بدر میں سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں چیدہ چیدہ سردارانِ کفار مارے گئے تھے۔ اس لیے کفار قریش آپ کی جان کے دشمن ہوگئے تھے۔ اور اس بات کے درپے تھے کہ کسی طرح احد میں انھیں ختم کر دیا جائے۔ آپ کی شہادت کا واقعہ بدایہ میں خود حضرت وحشی کی زبان سے تفصیلاً مذکور ہے۔ اس کے راوی حضرت جعفر بن عمرو بن امیہ ضمری بیان کرتے ہیں کہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں وہ اور عبداللہ بن عدی بن خیار نکلے اور حضرت وحشی کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں، تاکہ آپ ہم سے حضرت حمزہ کے قتل کا واقعہ بیان فرمائیں۔

حضرت وحشی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دریافت فرمانے پر میں نے جس طرح یہ واقعہ بیان کیا تھا، ابھی تم سے بھی بیان کرتا ہوں۔

''میں جبیر بن مطعم کا غلام تھا، اس کا چچا طیمہ بن عدی بدر میں مار ڈالا گیا تھا۔ قریش جب جنگ احد کے لیے روانہ ہوئے تو مجھ سے جبیر نے کہا کہ اگر تو عم رسول حمزہ کو میرے چچا کے بدلے قتل کر ڈال تو میں تجھے آزاد کر دوں۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور میں ایک حبشی نژاد انسان تھا، حبشیوں کی طرح چھوٹا نیزہ پھینک کر مارنا مجھے بھی آتا تھا اور میرا نشانہ بہت کم خطا کرتا۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔

میں حضرت حمزہ کو تلاش کر رہا تھا، میری نظر ان پر جمی، میں نے دیکھا وہ خاکی رنگ کے اونٹ کی طرح لوگوں کی بھیڑ کو روندتے جا رہے ہیں۔ ان کا مقابلہ کوئی چیز نہ کر پاتی تھی۔ پھر بخدا! میں نے ان کے قتل کی تیاری کی اور ان سے درخت یا پتھر کی اوٹ لیتا رہا، تاکہ وہ نزدیک ہو جائیں۔ اچانک ان کی طرف میرے سامنے سے سباع بن عبد العزی بڑھا۔ جب اسے حضرت حمزہ نے دیکھا تو فرمایا: میری طرف آ، اے عورتوں کی ختنہ گر کے بیٹے! اس پر انھوں نے اس طرح تلوار ماری کہ اس کے سر سے اتر گئی۔ اس اثنا میں میں نے اپنے نیزے کو حرکت دی۔ جب میں نشانہ سے مطمئن ہو گیا تو اس کو حضرت حمزہ پر پھینک دیا، وہ ان کی ناف کے نیچے لگا اور دونوں پیروں کے درمیان سے نکل گیا۔ انھوں نے میری جانب لپکنا چاہا، مگر ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی، میں اس وقت انھیں اور نیزوں کو چھوڑ کر آ گیا۔ جب ان کی وفات ہو گئی تو میں نے جا کر اپنا نیزہ لے لیا اور لشکر میں لوٹ کر آ بیٹھا، کیوں کہ ان کے قتل کے سوا اور میری کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ میں نے صرف اپنی آزادی کی خواہش میں انھیں مارا تھا۔ جب میں مکہ پہنچا تو آزاد کر دیا گیا"۔ (البدایۃ والنہایۃ، ج۴/ص۱۸)

حضور رُو پڑے:

لشکر کفار کے سردار ابو سفیان کی بیوی نے سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جنازے سے نہایت بے حرمتی کا سلوک کیا، اپنے خنجر سے آپ کی ناک اور کان کاٹ کر ہار بنایا اور پہن لیا۔ پھر آپ کے سینۂ مبارک کو چاک کر کے جگر نکالا اور چبا لیا۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معرکۂ احد ختم ہونے کے بعد مجاہدین میں آپ کو نہیں پایا تو تلاش کرتے ہوئے جنازے تک آئے۔ پیارے جاں نثار چچا کا جنازہ اس حال میں پاکر آپ بے ساختہ رُو پڑے۔ داخل اسلام ہونے کے بعد سے آخری دم تک حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس کی حفاظت، دین کی نصرت اور جہاد کے مواقع پر پیش پیش رہے تھے۔ آپ کی شہادت پر کفار نے خوشی کے شادیانے بجائے اور مسلمانوں کے گھر صف ماتم بچھ گئی۔ حضور اقدس پر اس حادثۂ جاں کاہ کا بے حد اثر ہوا۔ صفیہ آپ کی پھوپھی نے سیدنا حمزہ کی شہادت کی خبر سنی تو جنازہ کے قریب آگئیں۔ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں جنازہ دیکھنے سے منع کیا کہ مبادا دیکھ کر بے قابو ہو جائیں، مگر انھوں نے غایت استقلال کا مظاہرہ کیا تو حضور نے اجازت مرحمت فرما دی۔

سید الشہدا کا جنازہ:

حضرت صفیہ زبیر کو سید الشہدا کے کفن کے لیے دو چادریں دے گئی تھیں، مگر ایک انصاری کا برہنہ جنازہ دیکھ، ایک چادر میں انھیں کفن دے دیا گیا۔ اور ایک چادر سید الشہدا امیر حمزہ کے کفن میں استعمال ہوئی، مگر چادر چھوٹی پڑ گئی، سر چھپایا جاتا تو پاؤں کھلتے، پاؤں چھپاتے تو چہرہ کھل جاتا۔ حضور اقدس نے حکم فرمایا کہ چہرہ کفن سے چھپا دو اور پاؤں پر گھاس اور پتے ڈال دو۔ اس طرح خدا و رسول کے شیر، قریش کے دلاور اور خانوادۂ بنو ہاشم کے مردِ بہادر، بدر و حنین کے جرنیل، سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جنازہ تیار ہوا۔ اشکوں اور آہوں کے ساتھ جنازہ اٹھایا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے تقریبًا ستر شہدائے احد کے جنازے ان کے پہلو بہ پہلو رکھے گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سب کی الگ الگ نماز ادا فرمائی اور اسی میدان میں سپرد خاک کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حاکم، سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ سید الشہدا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہوئی تو آپ حالت جنابت میں تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں نے دیکھا فرشتے حضرت حمزہ کو غسل دے رہے ہیں''۔

علامہ ابن سعد سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی:

''سرور کائنات حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ فرشتے حضرت حمزہ کو غسل دے رہے ہیں''۔

کتابِ زندگی:

سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ایک شجیع و وجیہ اور بہادر سپہ سالار تھے۔ اور بہادری کی تمام صفتیں آپ میں موجود تھیں۔ اسلام کے ابتدائی اور ہنگامی دور میں آپ نے اسلام قبول کیا اور کفر و شرک کے خلاف معرکہ آرائی کرتے ہوئے سید الشہدا کے لقب سے ملقب ہو کر رب تعالیٰ کے رضوان و غفران میں جا پہنچے۔ اس لیے آپ کی کتابِ زندگی صرف چند صفحات پر مشتمل ملتی ہے۔ مگر خدا شاہد ہے کہ وہ چند صفحات ایسے روشن و تاباں ہیں کہ ان پر کتابوں کے پشتارے نچھاور کیے جائیں۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چچا حمزہ کی شہادت کا حال سنا اور ان کے جنازے کے پاس پہنچے تو آپ اپنی زبانِ مبارک سے ان کے محاسن پر اپنے چند نورانی اور جامع الفاظ میں روشنی ڈالی:

''رحمة الله عليك فانك كنت ما علمت وصولا للرحم فعولا للخيرات''۔

(طبقات ابن سعد، قسم اول، جز ثالث، ص:۱۷)

ترجمہ:۔ آپ پر خدا کی رحمتیں ہوں، جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ اہل قرابت کا سب سے زیادہ خیال رکھتے تھے اور نیک کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم احد سے لوٹ کر مدینہ طیبہ پہنچے تو سنا کہ بنی عبدالاشہل کی عورتیں اپنے عزیزوں پر گریہ و زاری کر رہی ہیں۔ فرمایا: حمزہ پر رونے والا کوئی نہیں؟ یہ سن کر انصار کی خواتین آستانۂ نبوی پر حاضر ہوئیں اور اس دور کے طریقہ کے بموجب گریہ و زاری شروع کی (واضح رہے کہ اس وقت تک نوحہ گری کی ممانعت نہیں ہوئی تھی) اسی عالم میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے استراحت فرمایا۔ آپ کی آنکھیں لگ گئیں۔ بے دار ہوئے تو عورتیں رونے میں مصروف تھیں۔ فرمایا: ارے یہ اب تک رو رہی ہیں، کہہ دو واپس جائیں اور آج کے بعد پھر کسی مرنے والے پر نہ روئیں۔ (طبقات ابن سعد، قسم اول، جز ثالث، ص۱۰)

حضرت حمزہ نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے اور ہر ایک سے اولاد ہوئی، مگر آپ کی نسل کا سلسلہ ایک کے بعد آگے نہ بڑھ سکا۔ آپ کی ازواج کے نام یہ ہیں: بنت الملمہ، خولہ بنت قیس اور سلمہ بنت عمیس۔ لڑکوں کے نام ابو یعلیٰ، عامر اور عمارہ ہیں۔ آخری دونوں بیٹے لا ولد رہے۔ ابو یعلیٰ کی چند اولادیں ہوئیں، مگر انھیں کم سنی ہی میں دست قضا نے اچک لیا۔ سلمی کے بطن سے امامہ نامی ایک صاحبزادی تھیں۔

(طبقات ابن سعد، قسم اول، جز ثالث، ص۱۷)

فتح مکہ کے بعد حضور جب لوٹے تو بھائی بھائی کہہ کر انھوں نے حضور کا استقبال کیا تھا۔ حضرت حمزہ کی شہادت کے بعد انھیں اپنی کفالت میں لینے کے لیے حضرت علی، حضرت جعفر اور حضرت زید جو حمزہ کے بھائی بن گئے تھے، نے درخواست پیش کی۔ حضور اقدس صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے امامہ کو حضرت جعفر کی تربیت میں دے دیا، کیوں کہ حضرت جعفر کے نکاح میں امامہ کی حقیقی خالہ اسما بنت عمیس تھیں۔ حضرت علی نے ایک بار حضور اقدس کی خدمت میں امامہ سے نکاح کی درخواست کی تھی تو حضور نے یہ کہہ کر رد فرمادی کہ "حمزہ میرے رضاعی بھائی تھے"۔

(طبقات ابن سعد، قسم اول، جز ثالث، ص۱۶)

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کے دورِ اول کا وہ شہید اپنے ہمراہ اپنی نسل نرینہ کی تاریخ بھی سمیٹ لے گیا۔

جذباتِ قلبی:

اسلام جیسی عظیم نعمت کی حصولیابی پر آپ ہمیشہ خدا کی حمد و ستائش اور شکر کرتے تھے۔ اور دین کی دولت پاکر پھولے نہ سماتے تھے۔ اسلام کی انقلاب انگیز تعلیمات اور رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے انسیتِ خاص، کتاب اللہ کی آیات سے غایت درجہ محبت اور اس کے پیغامِ ہدیٰ ہونے کا روشن بیان، نیز دشمنانِ خدا اور دشمنانِ مصطفیٰ پر غیظ و عتاب کا اظہار آپ کی جانب منسوب اشعار سے ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

حمدت الله حين هدى فؤادى

الى الاسلام والدين المنيف

لدين جاء من رب عزيز

خبير بالعباد بهم لطيف

اذا تليت رسائله علينا

تحدر دمع ذى اللب الحصيف

رسائل جاء احمد من هداها

بآيات مبينة الحروف

واحمد مصطفى فينا مطاعا

فلا تغشوه بالقول العنيف

فلا والله نسلمه لقوم

ولما نقض فيهم بالسيوف

ترجمہ:۔ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل کو "اسلام" اپنے عظیم الشان دین کی ہدایت بخشی تو میں نے خدا کی حمد و ستائش کی۔

کہ مجھے وہ دین عطا ہوا، جو بندوں پر مہربان اور ان کے حالات سے باخبر اور غالب پروردگار کی طرف سے ہے۔

جب اس کے پیغامات ہمیں سنائے جاتے ہیں تو صائب و صحیح رائے رکھنے والے اہل عقل بے ساختہ رو پڑتے ہیں۔
وہ پیغامِ ہدایت جو حضرت محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) واضح حروف والی آیتوں کی شکل میں لائے ہیں۔
حضرت احمد محمد مصطفی ہم میں اطاعت و پیروی کے قابل ہیں، پس تم ان کے سامنے تند و سخت کلمات نہ کہو۔
خدا کی قسم! ہم انھیں ایسی قوم کے حوالہ نہیں کریں گے، جس کے ساتھ ہمیں یہ جھگڑا تلوار کے ذریعے چکانا ہے۔

پیارے رسول کا پیار:

پیارے رسول سے حضرت حمزہ کو جو غایت محبت تھی، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی پیارے ہمجولی، شفیق اور جاں نثار چچا کو بے حد چاہتے تھے۔ آپ کی شہادت کی خبر پاکر بے ساختہ رو پڑے اور جب لوگوں نے بیان کیا کہ ہندہ نے آپ کا جگر چبا لیا ہے، تو آپ نے دریافت فرمایا: اس نے اس کا کچھ حصہ کھا تو نہیں لیا، لوگوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: خدا حمزہ کے کسی جز کو داخل جہنم نہ ہونے دیگا۔ (طبقات ابن سعد، قسم اول، جز ثالث، ص ۷)

حضرت جابر فرماتے ہیں: رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"قیامت کے دن اللہ کے نزدیک شہیدوں کے سردار حمزہ ہوں گے"۔

حضرت وحشی جن کے ہاتھوں حمزہ کی شہادت ہوئی تھی، فتح مکہ کے بعد جب وہ مسلمان ہوکر خدمت رسول میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے کہا: تم میرے روبرو نہ آیا کرو تو بہتر ہے (کیوں کہ اس طرح عزیز ترین چچا کا بھیانک قتل نگاہوں میں بھر جائے گا)

جعفر بن عمرو بن امیہ ضمری کی مذکورہ بالا روایت (جس میں حضرت وحشی نے حضرت حمزہ کے قتل کی تفصیل خود بیان کی ہے) کا آخری حصہ خود وحشی کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں:

"(حضرت حمزہ کی شہادت کے بعد) جب میں مکہ پہنچا تو آزاد کر دیا گیا۔ آزادی کے بعد میں وہیں رُکا رہا، جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مکہ فتح کرلیا تو میں طائف بھاگ گیا اور وہاں سکونت اختیار کی، جب طائف کے لوگ بشکل وفد اسلام لانے کے لیے روانہ ہوئے تو مجھ پر راہیں تنگ ہوگئیں۔ میرے ذہن میں خیال اُبھرا کہ شام، یمن یا کسی اور علاقہ میں چلا جائوں۔ بخدا! میں اپنے اسی اضطراب میں تھا کہ مجھ سے ایک شخص نے کہا: تجھ پر افسوس ہے، محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جو ایمان لاتا ہے، ان میں سے کسی کو وہ کبھی قتل نہیں کرتے۔ اس شخص کی یہ بات سن کر میں چل پڑا اور مدینہ حاضر ہوا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس بات سے اچنبھے میں آ گئے کہ میں ان کے سرہانے کھڑا ہوا کلمۂ شہادت پڑھ رہا تھا اور حق کی گواہی دے رہا تھا۔ جب آپ نے مجھے دیکھا تو فرمایا: کیا تو وحشی ہے؟ ہاں یا رسول اللہ!۔ بیٹھ جا اور بیان کر کہ تو نے حمزہ کو کس طرح شہید کیا تھا؟

میں نے حضور سے اسی طرح بیان کیا تھا، جس طرح تم دونوں (راویان، جعفر بن عمرو اور عبداللہ بن عدی) سے بیان کیا ہے۔ پھر جب میں سنا کر فارغ ہوا تو حضور نے ارشاد فرمایا: مجھے تجھ پر بڑا افسوس ہے، تو مجھ سے اپنا چہرہ غائب رکھ!۔ اسی وجہ سے میں حضور سے ہمیشہ اتنا ہٹ کر رہتا تھا کہ آپ مجھے نہ دیکھیں۔ حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی۔

اس کے بعد جب مسلمان یمامہ والے مسیلمہ کذاب سے جنگ کرنے نکلے، تو میں بھی مسلمانوں کے ساتھ اپنا وہی نیزہ جس سے حمزہ کو شہید کیا تھا، لے کر نکلا۔ جب لوگ مجتمع ہوئے تو میں نے مسیلمہ کو کھڑا ہوا دیکھا، اس کے ہاتھ میں تلوار تھی، اس سے قبل میں اس سے ناواقف تھا، میں نے اس کے قتل کی تیاری کی اور دوسری جانب ایک انصاری بہادر نے بھی اس کو مارنے کا ارادہ کیا۔ ہم دونوں اس کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ میں نے اپنے نیزے کو حرکت دی، حتیٰ کہ جب میں نشانے سے مطمئن ہوگیا تو نیزہ اس پر پھینک مارا، میرا نیزہ اس میں پیوست ہوگیا اور اس انصاری نے اس پر تلوار سے حملہ کیا۔ اب رب ہی زیادہ جاننے والا ہے کہ ہم دونوں میں سے اسے کس نے مارا۔ اگر اسے میں نے قتل کیا تو ذاتِ رسول کے بعد لوگوں میں بہترین شخص (حمزہ) کو اور بدترین انسان (مسیلمہ کذاب) کو میں نے قتل کیا۔

(البدایۃ والنہایۃ، ج۴/ص۱۸)

سید الشہدا امیر حمزہ کا مثلہ کرنے والی اور آپ کا جگر چبانے والی ہندہ بنت عتبہ ابو سفیان کی بیوی فتح مکہ کے بعد جب داخل اسلام ہوئیں تو رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے چہرہ پھیر کر بیعت لی۔

ابن مندہ کی روایت ہے کہ ہندہ نے اپنے شوہر ابو سفیان سے کہا کہ میں محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیعت کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ابو سفیان نے کہا: میں تو تجھے ان کی بات کا ہمیشہ انکاری پاتا ہوں۔ ہندہ نے کہا: ہاں، بخدا! بات تو ایسی ہی تھی، مگر اس مسجد (حرم) میں آج شب سے پہلے کبھی کسی کو اتنی عبادت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ واللہ آج تو مسلمانوں نے ساری رات عبادت میں گزار دی۔ کوئی قیام میں تھا تو کوئی رکوع اور سجدے میں۔

ابو سفیان: اب تو تو نے جو کچھ کیا، کیا۔ اب قوم کے کسی آدمی کو لے کر حضور کی خدمت میں جا۔ ہندہ حضرت عمر کے ہمراہ حاضر ہوئیں۔ حضرت عمر نے ہندہ کی حاضری کے لیے اجازت طلب کی۔ یہ چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے اندر گئیں اور عورتوں کی طرح حضور نے ان سے بھی بیعت لی کہ شرک نہ کریں، چوری نہ کریں۔ ہندہ نے کہا: میں نے اپنے شوہر کا بہت سامان ضائع کیا ہے۔ حضرت ابو سفیان نے کہا: میرا جو مال تم خرچ کر چکی ہو، وہ میں نے تمہارے لیے حلال کیا۔

تفسیر ابن کثیر کے اندر عبداللہ بن عباس کی طویل حدیث میں اس طرح مذکور ہے:

''ابو سفیان نے کہا: میرے مال میں سے جو تم لے چکی ہو، وہ فنا ہوگیا ہو یا باقی ہو، وہ سب میں نے تمہارے لیے مباح کیا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہنس پڑے۔ آپ نے ہندہ کو پہچان لیا اور انھیں بلایا۔ ہندہ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور عذر کرنے لگیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تو ہندہ ہے؟ ہندہ نے کہا: ہاں۔ اللہ میری ماضی کی غلطیوں کو معاف فرمائے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے چہرہ پھیر کر بیعت لی''۔ (تفسیر ابن کثیر، ج۴/ص۳۵۳)

کرامات:

سید الشہدا کی کرامات بے شمار ہیں۔ عالم اسلام کے خوش عقیدہ مسلمان ہر زمانے میں آپ کے مزار مبارک سے اکتساب فیض کرتے رہے ہیں۔ شہدا کی زندگی پر تو قرآن ناطق ہے۔ دور امیر معاویہ میں احد کے میدان سے نہر نکالنے کے دوران ایک کھودنے والے کا پھاوڑا آپ کی قبر پر پڑا، پھاوڑا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاؤں پر لگا اور پاؤں سے خون جاری ہوگیا۔ لوگوں نے پہچان کر مٹی ڈال دی۔

قبر سے سلام کا جواب:

مشہور عارفہ سیدہ فاطمہ خزاعیہ عم رسول سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مرقد انور کی زیارت کے لیے تشریف لے گئیں اور وہاں پہنچ کر آپ نے سلام عرض کیا: اے رسول اللہ کے پیارے چچا! آپ پر سلام ہو۔

تو قبر مبارک سے جواباً آواز آئی: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

سیدہ فاطمہ خزاعیہ نے یہ آواز صاف سنی۔ اہل اللہ اور شہدا کی کرامات سے یہ بعید نہیں۔ اور آپ تو سید الشہدا اور رسول اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جاں نثار چچا ہیں۔ جن کے ہاتھوں قرنِ اول کے جاہلی فراعنہ نیست و نابود ہوئے۔ اور جنھوں نے اپنی سرفروشی اور جاں سپاری کے ذریعہ عالمِ غربت میں اسلام کو سہارا دیا۔ مذکورہ بالا کرامت امام بیہقی نے بسند واقدی روایت کی ہے۔

بشارت:

اسی طرح ایک جاں نواز واقعہ عارف باللہ شیخ محمود کردی شیخانی نزیل مدینہ منورہ کی کتاب "الباقیات الصالحات" میں مذکور ہے۔ انھوں نے سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت کی۔ جب قبر شریف پر پہنچ کر سلام عرض کیا تو بالکل صحیح طور سے سلام کا جواب سنا اور ساتھ ہی یہ بشارت بھی کہ

"تمہارے گھر بیٹا ہوگا، تو اس کا نام حمزہ رکھنا"۔

شیخ فرماتے ہیں کہ میرے گھر لڑکا ہی ہوا اور حسب الحکم اس کا نام حمزہ رکھا۔ (جامع کرامات اولیاء للعلامہ یوسف النبہانی (اردو) ص۳۸۹)

حاجت روائی:

سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روشن کرامت، جامع شریعت و طریقت الشیخ احمد بن محمد دمیاطی المعروف بہ ابن عبدالغنی البناء، متوفی مدینہ منورہ محرم ۱۱۱۶ھ سے علامہ حموی نے اپنی کتاب "نتائج الارتحال والسفر فی اخبار اھل القرن الحادی العشر" میں روایت کی ہے:

"واقعہ یوں ہے کہ شیخ احمد نے اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ سفر حج اختیار کیا۔ اس سال قحط بہت زوروں پر تھا۔ مصر میں خریدے ہوئے دو اونٹوں کے ذریعہ ان ماں بیٹے نے حج کا سفر کیا، مکہ معظمہ پہنچے، ارکانِ حج مکمل کیے۔ پھر وہاں سے زیارتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ مدینے پہنچ کر دونوں اونٹ مر گئے۔ پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ سواری خرید سکیں یا کرایہ کی سواری لے سکیں۔ اس عالم تنگ دستی میں شیخ احمد بہت پریشان ہوئے۔ ان دنوں مدینہ شریف میں شیخ صفی الدین قشاشی قدس سرہ تشریف رکھتے تھے۔ شیخ احمد ان کے پاس حاضر ہوئے اور اپنی پریشانی بتائی۔ شیخ قشاشی نے ان کی روداد سننے کے بعد کچھ دیر خاموشی اختیار کی۔ پھر فرمایا: تم فوراً سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر پر حاضری دو، جس قدر ہو سکے قرآن مجید کی تلاوت کرو۔ پھر اول تا آخر ان سے اپنا حال بیان کر ڈالو۔ شیخ احمد وہاں سے روانہ ہوئے اور فوراً مزارِ سید الشہدا پر حاضر ہوئے۔ چاشت کا وقت تھا، بعد عرضِ سلام قرآن مجید کی تلاوت سے فارغ ہو کر اپنا مفصل حال بیان کر دیا اور ظہر سے قبل وہاں سے واپس آئے۔

خود بیان کرتے ہیں:

ظہر سے پہلے واپس ہوا۔ باب الرحمۃ کے طہارت خانے میں وضو سے فارغ ہوکر مسجد نبوی شریف میں داخل ہوا تو وہاں والدہ ماجدہ کو موجود پایا۔ انھوں نے فرمایا: ابھی ایک آدمی تمھیں تلاش کر رہا تھا، وہ حرمِ نبوی کے پیچھے گیا ہے۔ میں لمبے قدم وہاں پہنچا تو ایک پُر جلال، سفید ریش، بارُعب شخص ملا۔ مجھے دیکھ کر فرمایا: شیخ احمد مرحبا۔ میں نے احتراماً ان کی دست بوسی کی۔ کہنے لگے: مصر کے لیے روانہ ہوجائو۔ کس طرح جائوں؟ میں کسی آدمی سے آپ کی روانگی کا بند و بست کیے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر مجھے ساتھ لیا اور مصری حاجیوں کی اقامت گاہ کی طرف چل پڑے۔ ایک خیمہ کے اندر داخل ہوئے، میں بھی ساتھ تھا، انھوں نے جب خیمہ کے مالک کو سلام کیا تو وہ احترام میں کھڑا ہوگیا، آپ کے ہاتھ کا بوسہ دیا اور نہایت تکریم کا برتائو کیا۔ آپ نے اس کو نہایت پیار بھرے الفاظ سے مخاطب کیا اور کہا: شیخ احمد اور ان کی والدہ کو مصر پہنچا دو۔ اس شخص نے آپ کے حکم کی تعمیل میں حامی بھری۔ قحط اور اونٹوں کی بیماری کے سبب بہت اونٹ مر چکے تھے، اس لیے کرایہ میں اضافہ ہوچکا تھا، سواریوں کی قلت تھی۔ آپ نے پوچھا: شیخ احمد اور ان کی والدہ کو مصر پہنچانے کا کیا کرایہ لے گا؟ جو آپ کی مرضی ہوگی، لے لوں گا۔ ٹھیک ہے، اتنا اتنا لے لینا۔ کرایہ کا پیشتر حصہ آپ نے خود ادا کر دیا اور بقیہ کے بارے میں کہا کہ مصر پہنچ کر شیخ احمد سے لے لینا، مصری نے رضا مندی میں سر کو جنبش دی۔ آپ نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور اس کو میرے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی۔ اٹھ کر چلنے لگے، میں بھی ہمراہ ہی نکلا۔ جب ہم لوگ مسجد شریف تک پہنچ گئے تو فرمایا: تم پہلے مسجد میں چلے جائو۔ میں مسجد میں داخل ہوگیا، نماز کا وقت ہوگیا، مگر مجھے ان کی شکل نظر نہ آئی، میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔

میں نے مصری سے دریافت کیا کہ آپ کون تھے؟ اور کہاں رہتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: میں نے تو انھیں عمر میں پہلی بار دیکھا۔ مجھے کیا معلوم کہ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ ہاں جب وہ میرے خیمہ میں تشریف لائے تو مجھ پر ان کی زیارت سے ایسی ہیبت طاری ہوگئی جیسی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

روانگی سے پہلے تک میں متواتر ان کی جستجو کرتا رہا، مگر سراغ نہ مل سکا۔ بالآخر الوداعی سلام کرنے کے ارادے سے حضرت شیخ صفی الدین قشاشی کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں سارا ماجرا سنایا تو انھوں نے فرمایا:

”وہ سیدنا امیر حمزہ بن عبدالمطلب کی روحِ پاک تھی، جو جسمانی شکل میں آئی تھی“۔

اس کے بعد شیخ احمد اپنی والدہ کو لے کر مصری کے ہمراہ نہایت آرام سے وطن پہنچ آئے۔ اس مصری نے دورانِ سفر نہایت حسن اخلاق کا برتائو کیا۔ یہ سب سید الشہدا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روحانی برکت ہے۔

(جامع کرامات الاولیاء ص ۳۹۰/ تا ۳۹۲)

اسلام اور مسلمانوں کی ترقی اور عروج کا زمانہ وہی تھا، جس میں اسلام کے نامور اور جلیل القدر فرزندوں سے حسن عقیدت کا دور دورہ تھا۔ اس زمانے میں علما، صلحا، عرفا اور عام مسلمان سب اولیاء اللہ، شہدا اور بزرگانِ دین کے مزارات سے روحانی شغف رکھتے تھے۔ اہالیانِ مدینہ منورہ کا عام طریقہ تھا کہ ۱۲/ رجب کو سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے اور ان کے وسیلے سے دین و دنیا کی حاجتیں طلب کرکے رحمت خداوندی سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

زائرین کے نگہبان:

حضرت علامہ برزنجی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے:

''اہل مدینہ کی عام روش تھی کہ سیدنا حمزہ کی زیارت کے لیے ۱۲/ رجب کو جایا کرتے تھے۔ مگر قطب ربانی ابراہیم کروی کے صاحبزادے حضرت شیخ سعید تاریخ مذکور سے پہلے ہی احد تشریف لے گئے۔ آپ سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت کے لیے بہت جایا کرتے تھے۔ اس بار گئے تو ہر بار کی طرح ۱۲/ رجب تک وہیں ٹھہر گئے۔ اس سال ان کے ہمراہ شیخ عبداللطیف مالکی مدنی بھی تھے۔ جب رات ہوئی اور سب لوگ سو گئے تو شیخ عبداللطیف نگہبانی کے ارادے سے جاگتے رہے، انھوں نے دیکھا کہ ایک شہسوار بار بار گھوڑے پر سوار چکر لگا رہا ہے، کئی چکر کے بعد انھوں نے ہمت کی اور پوچھا: کون ہو؟ سوار: تونے پوچھنے کی جرأت کیسے کی؟ خود میری پناہ میں اترا ہے اور نگہبانی کے لیے جاگ کر مجھے اذیت دے رہا ہے۔ میں تو خود حفاظت کر رہا ہوں۔ سن! میں حمزہ بن عبدالمطلب ہوں۔ یہ کہا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئے''۔

(جامع کرامات الاولیاء للعلامہ النبہانی، ص ۳۹۳،۳۹۲، مکتبہ حامدیہ لاہور۔ مترجم پروفیسر محمد ذاکر چشتی، مطبوعہ ۱۹۸۲ء)

'' واخرج البیہقی وصححه من طریق العطاف بن الخالد المخزومی حدثنی عبد الاعلی ابن عبد اللہ ابن ابی فروۃ عن ابیه ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم زار قبور الشهداء باحد فقال اللهم ان عبدك ونبیك یشهد ان هؤلاء شهداء وانه من زارهم وسلم علیهم الی یوم القیمة ردوا علیه''۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شہدائے احد کی قبروں کی زیارت کی اور ارشاد فرمایا: اے اللہ! میں تیرا بندہ اور تیرا نبی شہادت دیتا ہوں کہ یہ سب شہید ہیں اور جو ان کی زیارت کرے اور ان پر سلام بھیجے، قیامت تک یہ لوگ ان کے سلام کا جواب دیتے رہیں گے۔

اور عطاف کہتے ہیں کہ ان کی خالہ نے بتایا کہ انھوں نے قبورِ شہدا کی زیارت کی اور ان کے ہمراہ سواریوں کے نگہبان دو غلاموں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ تو انھوں نے شہدا کی خدمت میں سلام پیش کیا تو سلام کا جواب بھی سنا۔ اور یہ بھی انھیں کہتے سنا:

'' واللہ انا نعرفکم کما یعرف بعضکم بعضا''۔

بخدا! ہم تمہیں اس طرح پہچانتے ہیں جیسے تم میں کے بعض دوسرے پہچانتے ہیں۔ (حجۃ اللہ علی العالمین، ج۲/ ص۸۷۵)

دورِ حاضر کے مسلمانوں کی پستی اور ذلت و رسوائی کا اسباب میں سے یہ بھی ہیں کہ اسلاف کی طرح ہم میں خدا و رسول سے بے لوث محبت کا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ راہِ حق میں جس طرح ان پاکیزہ نفوس نے بے دریغ قربانی اور جہاد کا مظاہرہ کیا، ہم اس سے تہی دامن ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مفسد عناصر نے معاشرہ میں ایسے زہر بھر دیے ہیں کہ بڑے بڑے مذہبی کلاہ بردار کھلم کھلا عصبیت کی تعلیم دینا ہی اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ مگر قابل غور امر یہ ہے کہ اب جب کہ حق اور باطل الگ الگ دودھ پانی کی طرح ممیز ہو چکا، دین داری اور بے دینی کی راہیں واضح ہو چکیں۔ ان فاسد ہتھیاروں سے ملت مسلمہ کو کب تک ذبح کیا جاتا رہے گا۔

رب کریم ہم مسلمانوں کو سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نقوشِ قدم کی برکتوں سے صراطِ مستقیم پر گامزن اور استحکام عطا فرمائے۔ آمین

خدا ہمیں کسی طوفاں سے آشنا کر دے
ہمارے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف

آپ کا اسم گرامی عبدالرحمن اور کنیت ابو محمد تھی، والد کا نام عوف اور والدہ کا شفا تھا۔ آپ نسباً زہری تھے۔ ابتدائے اسلام میں جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد تبلیغی مہم شروع فرمائی، اسی سے متاثر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس وقت نام عبد عمرو بدل کر عبدالرحمن پڑا۔ آپ کی پیدائش عام الفیل کے دسویں سال ہوئی۔ اس طرح آپ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے تقریباً دس سال چھوٹے تھے۔ آپ کا رنگ سرخ و سفید، قد لمبا، چہرہ خوبصورت، داڑھی لمبی، سر دراز، کاکلیں انگلیاں موٹی اور مضبوط، کلائی گٹھی ہوئی۔

اسلام لانے کے بعد شروع شروع میں کفار مکہ نے اہل ایمان پر ستم رانیوں کا جو طریقہ اختیار کیا، اس سے تاریخ اسلام لبریز ہے۔ اللہ کے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس وقت مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ اس قافلہ میں حضرت عبدالرحمن ابن عوف بھی شریک تھے۔ وہاں سے کچھ روز بعد لوٹ کر پھر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت ہوئی۔ مدینہ طیبہ میں پہنچنے کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتہ محبت کو اور زیادہ مضبوط کرنے کی غرض سے نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ''مواخات'' قائم کی۔ اس کی شکل یہ تھی کہ ایک مہاجر کو مدینے کے بسنے والے ایک انصاری کا حکمی بھائی بنا دیا، اس طرح تمام مہاجرین اپنے انصاری بھائیوں میں بٹ گئے اور ہر ایک کے گزران کا ایک احسن طریق نکل آیا۔

حضرت عبدالرحمن ابن عوف کی حضرت سعد بن ربیع انصاری سے بھائی چارگی ہوگئی۔ مواخات کے بعد ہر انصاری اپنے مہاجر بھائی کو اپنے گھر میں ایک سگے بھائی کی طرح رکھتا اور اس کے لیے ہر قسم کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ سعد ابن الربیع نے کہا: بھائی عبدالرحمن! میں اپنا مال واسباب تمہیں بانٹ کر دے دیتا ہوں اور میری دو بیویوں میں سے جسے تم اپنے لیے پسند کرو، اسے طلاق دے دیتا ہوں، عدت گزار لینے کے بعد تم اس سے اپنا نکاح کرو۔ عبدالرحمن ابن عوف نے کہا: پیارے بھائی! پروردگار تمہارے مال و دولت اور اہل وعیال میں برکت دے، بس مجھے تو تم اپنی مہربانی سے مدینہ کا بازار دکھا دو۔ ان شاء اللہ میں اپنی روزی خود کماؤں گا۔ چنانچہ آپ کو بازار قینقاع میں پہنچا دیا گیا اور آپ نے تجارت کرکے رفتہ رفتہ اس کو کافی فروغ دیا۔

جانباز صحابہ نے جس طرح دین اسلام کے لیے اپنے کو وقف کر دیا تھا اور رنج و راحت ہر حالت میں حضور رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ اسی طرح آپ بھی ہر جنگ میں پرچم اسلام کی حفاظت کے لیے شمشیر بکف رہے۔

۲ھ میں غزوۂ بدر ہوا، اس میں آپ نے نہایت پامردی سے کفار کے بالمقابل جنگ لڑی۔

یوں ہی ۳ھ کے غزوۂ احد میں آپ نے دادِ شجاعت دی، شمع نبوت کی حفاظت وصیانت میں نہایت دلیرانہ جنگ کی۔ اس جنگ میں آپ کے جسم پر بیس زخم لگے تھے، پائوں کا زخم اتنا کاری تھا کہ صحت مند ہوجانے کے بعد بھی سیدھے نہ چل سکتے تھے، بلکہ پائوں میں ژولیدگی باقی تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ۶ھ میں آپ کو دومۃ الجندل کی مہم کا امیر بنایا۔ حضور نے اپنے دست مبارک سے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور حکم دیا کہ خدا کا نام لے کر راہِ حق میں نکل جائو، خدا اور رسول کے باغیوں سے جہاد کرو۔ لیکن سن! کسی کو فریب نہ دینا، کم سن بچوں کو نہ مارنا، دومۃ الجندل کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دے، اگر وہ مسلمان ہوجائیں تو ان کے حکمراں کی لڑکی سے نکاح کر۔

چنانچہ عبدالرحمن نے دومۃ الجندل پہنچ کر سرکار کے حکم کے مطابق اسلام کی تبلیغ اس طرح کی کہ قبیلۂ کلب کا سردار اسعد بن عمرو کلبی مع اپنے معززین قبیلہ کے دین تثلیث چھوڑ کر مسلمان ہوگیا۔ اخبغ نے اپنی صاحبزادی تماضر کو حضرت عبدالرحمن کے نکاح میں دے دیا، اس کے بعد فتح مکہ اور تمام جنگوں میں آپ نے اپنی اسلام دوستی کا ثبوت دیا۔ حجۃ الوداع میں سرکار کے ساتھ رہے۔

۱۰ھ میں سرکار کے پردہ فرمانے پر جب خلافت کا معاملہ اٹھا تو اس عالم رستاخیز میں حضرت عبدالرحمن نے نہایت دانشمندی سے اس معاملہ کو سلجھانے میں اپنی ذہانت اور دانائی سے کام لیا۔ اور سقیفۂ بنی ساعدہ کے اجلاس میں اخیر تک شریک رہے۔ اور جن لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، ان میں آپ کا نمبر تیسرا تھا۔ دورِ صدیقی میں جب حضور کی وراثت کا اختلاف ہوا تو آپ نے مسلک صدیقی کی پُرزور تائید کی۔

۱۳ھ میں جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وقت اخیر آیا تو آپ نے عبدالرحمن بن عوف کو سب سے پہلے بلایا، کیوں کہ خلافت صدیقی کے پورے زمانے میں آپ ہر اہم موڑ پر نہایت دانش مندی اور درد کے ساتھ ہر معاملہ کو سلجھانے کے مشورے دیتے تھے۔ اس لیے خلیفۂ اول نے اپنے بعد جانشینی کے بارے میں استصوابِ رائے کے لیے سب سے پہلے آپ ہی کو بلایا۔

حضرت عمر کے بارے میں رائے لی تو انھوں نے نہایت خلوص ودیانت کا جواب دیا۔ دورِ فاروقی میں بھی آپ مجلس مشاورت کے اہم رکن کی حیثیت سے رہے۔ دورِ فاروقی میں عراق پر حملہ کرنے کے لیے جب ایک عظیم الشان فوج تیار کی تو اس کی سیادت کے لیے بڑی الجھن پیدا ہوئی۔ عوام نے اصرار کیا کہ اس اہم معرکہ میں خلیفۃ المسلمین خود شریک ہوں۔ مگر حضرت عبدالرحمن نے اس کی سخت مخالفت کی اور سعد بن ابی وقاص کا انتخاب کیا، جو بعد میں واقعی ایک باصلاحیت امیر لشکر ثابت ہوئے۔

مسلمانوں کا امیر ہونے کی حیثیت سے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اور بھی بہت سی ذمہ داریاں تھیں، جنھیں آپ کے علاوہ اور کوئی انجام نہ دے سکتا تھا۔ ملکی انتظام، مقدمات ومعاملات اور دیگر بے شمار ضرورتیں اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں یوں ہی ملکی انتظام وانصرام کے بے شمار کام شروع ہوئے، جن کی تکمیل کے لیے ان کی پوری توجہ درکار تھی۔ یہ اور بات تھی کہ ان سب پر مقدم اسلام کی تبلیغ اور جہاد تھا، جو اسلام کا بنیادی مشن اور اہم رکن ہے۔ مگر اس کے لیے ہر قسم کے لوازمات کی فراہمی امیر المومنین دارالامارۃ مدینہ طیبہ ہی میں رہ کر فرما سکتے تھے، کیوں کہ فتوحات برابر ہو رہی تھیں، اسلامی سرحدیں نہایت تیزی سے وسعت اختیار کر رہی تھیں۔ مگر عامۃ المسلمین کا کثرت سے یہ رجحان رہا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بذاتِ خود شریک جہاد ہوں۔ صاحب الرائے اور دور اندیش صحابہ کرام نے ہمیشہ مصالح مدینہ کے پیش نظر اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ معرکۂ نہاوند میں جانے سے حضرت کو روکنے والے بھی عبدالرحمن بن عوف ہی تھے۔

۲۳ھ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فجر کی نماز میں ابو لولو نے خنجر سے زخمی کیا تو امامت کے مصلے پر حضرت عبدالرحمن ابن عوف ہی کو کھڑا کیا گیا۔ نماز سے فارغ ہوکر تمام مسلمان حیران و پریشان خلیفۂ دوم کے گھر کو دوڑے اور مسلمانوں کے عام اصرار پر آپ نے خلافت کے لیے چھ آدمیوں کے نام لیے۔ حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمن، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ اور فرمایا کہ ان لوگوں سے اللہ کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اخیر دم تک راضی و خوش تھے۔ یہ لوگ اپنے میں سے کسی کو منتخب کرلیں۔ حضرت عبدالرحمن کے متعلق ارشاد فرمایا کہ عبدالرحمن نہایت ہی عقل مند، صاحب الرائے اور سلیم الطبع ہیں۔ ان کے مشورے کو بغور سننا اور مخالفت کی صورت میں ان کی ہم نوائی کرنا۔

۲۴ / ذو الحجہ ۲۳ھ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال پر تجہیز و تکفین سے فارغ ہوکر مسلمانوں نے اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ کی۔ دو روز تک مسئلہ حل ہونے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ اس کے بعد عبدالرحمن ابن عوف نے کہا: یہ مسئلہ چھ آدمیوں کے درمیان ہے، اسے تین شخصوں میں محصور کر لیجیے۔ وہ اس طرح، ہم میں سے ہر ایک اپنا حق کسی کو دے دے۔ چنانچہ حضرت زبیر نے حضرت علی کو، حضرت سعد نے عبدالرحمن کو اور حضرت طلحہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اپنے اپنے اختیارات سونپ دیے۔ یہاں تک کر لینے کے بعد حضرت عبدالرحمن نے اعلان کیا کہ میں اپنے حق سے تو دست بردار ہوتا ہوں، اب آپ دونوں میں سے جو خدا و رسول کے احکام کی پابندی اور شیخین کے نقش قدم کی ملازمت کا عہد کرے، اس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔ حضرت عبدالرحمن نے دونوں کو راضی کر کے اس کا فیصلہ بایں طور اپنے ہاتھ میں لے لیا کہ ان دونوں حضرات سے تنہائی میں گفتگو کی کہ مجھے امید ہے کہ اگر آپ کے ہاتھ پر بیعت کی جائے تو آپ اسلام اور مسلمانوں کی فلاح کے لیے خود کو وقف کر دیں گے اور اگر آپ کے ساتھی کی بیعت کی جائے گی تو آپ ان کا اتباع اور اعانت کریں گے۔ اس پر دونوں راضی ہوگئے۔ پھر آپ نے مجمع عام میں ایک نہایت جاندار تقریر کی اور اس کے بعد حضرت عثمان سے فرمایا: آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے، انھوں نے ہاتھ بڑھایا اور آپ نے بڑھ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں آپ اکثر گوشہ نشین رہے، ملکی سیاست میں آپ کی شمولیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ ۳۱ھ میں بعمر ۷۵ / سال مدینہ طیبہ ہی میں انتقال فرمایا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی موت کے بعد حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہایت دردناک انداز میں یہ جملہ ارشاد فرمایا:

"اذہب یا ابن عوف فقد ادرکت صفوہا وسبقت رتقہا"۔

ترجمہ:۔ اے ابن عوف! آپ نے پیشۂ دنیا کا صاف پانی پایا اور گدلا پانی چھوڑ دیا۔

خلیفۂ ثالث نے آپ کے جنازے کی نماز پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کیا۔ حضرت عبدالرحمن ابن عوف کی شخصیت اخلاق و عادات، صلح و مروت، دیانت و اصابت جیسے صفات کی جامع تھی۔ آپ کی ذات میں خوفِ خدا، حب مصطفی، صدق و صفا، رحم و عطا، جود و سخا بدرجہ اتم موجود تھی۔ خشیت الٰہی کا یہ حال کہ ایک مرتبہ دن بھر روزہ رہنے کے بعد شام کو افطار کے بعد کھانا سامنے آیا تو مسلمانوں کی گزشتہ تنگ حالی یاد کر کے بے اختیار اشک بار ہوگئے اور فرمانے لگے: مصعب مجھ سے بہت اچھے تھے، جب وہ شہید ہوئے تو ان کے کفن کے لیے صرف ایک چادر موجود تھی، وہ بھی اتنی چھوٹی کہ جب سر چھپایا جاتا تو پاؤں کھل جاتا اور پاؤں کی طرف کھینچا جاتا تو سر کھل جاتا۔ یوں ہی حضرت حمزہ مجھ

سے اچھے تھے، وہ بھی شہید ہوگئے۔ اب حال یہ ہے کہ ہمارے لیے روئے زمین کشادہ ہے، رب تعالیٰ کی نعمتیں اس طرح برس رہی ہیں کہ مجھے خوف ہوگیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری تمام نیکیوں کا بدلہ دنیا ہی میں مل جائے۔ گریہ و زاری کی ایسی شہرت ہوئی کہ کھانا تناول نہ کرسکے۔ عشق نبی بھی آپ کی ذات میں کچھ اس طرح رچا بسا ہوا تھا: ؎

بوئے گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

اسی کا اثر تھا واقعۂ احد میں آپ نے اپنے جسم پر تیر و تلوار کے بیس زخم کھائے، مگر میدانِ کارزار سے رُخ نہ پھیرا۔ سرکار کے پردہ فرما جانے کے بعد بھی محبت رسول کی چنگاریاں دل کے نہاں خانے میں جب بھڑکتیں تو جلوۂ محبوب کی زیارت کے لیے بے قرار ہوجایا کرتے۔

ایک مرتبہ نوفل ابن ایاس کو اپنے ساتھ گھر لے گئے، تھوڑی دیر کے بعد گھر میں سے کھانا آیا روٹی اور گوشت، بے اختیار رو پڑے۔ نوفل نے پوچھا: کیا ماجرا ہے؟ فرمایا: اللہ کا پیارا محبوب اس دنیا سے روپوش ہوگیا، لیکن تمام عمر اس مقدس ذات کو اور اہل وعیال کو پیٹ بھر کی روٹی نہ ملی۔

ایک مرتبہ گیہوں اور آٹے سے لدے ہوئے سات سو اونٹ راہِ خدا میں صدقہ کردیا، سورۂ برات کے نزول کے بعد جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صدقہ و خیرات کی فضیلت بیان فرمائی تو حضرت عبدالرحمن ابن عوف نے اپنے مال کا آدھا حصہ راہِ خدا میں خیرات فرمادیا۔ اس کے دو مرتبہ چالیس چالیس ہزار دینار بندگانِ خدا پر لٹائے۔ ایک بار محبانِ دین کے لیے پانچ گھوڑے اور پانچ سو اونٹ وقف کیے۔

جب آیت مبارکہ "لَنْ تَنَالُوا، الخ" نازل ہوئی تو اپنی ایک زمین حضرت عثمان کے ہاتھ چالیس ہزار دینار میں بیچ کر کل کا کل راہِ حق میں لٹا دیا۔ کبھی کبھی ایک ہی دن میں تیس تیس غلام آزاد کردیا کرتے تھے۔ اللہ کے راستے میں صدقہ و خیرات کا یہی ذوق اخیر دم تک قائم رہا۔ عین وفات کے وقت بھی آپ نے پچاس ہزار دینار اور ایک ہزار گھوڑے فی سبیل اللہ دیے۔

نیز بدریؓ صحابہ کو چار سو دینار کے لیے وصیت فرمائی۔ ۳۱ھ تک ایک سو اصحاب بقید حیات تھے۔ موت ہی کے وقت امہات المومنین کی خدمت میں ایک عالی شان باغ کا نذرانہ پیش کیا، جس کی قیمت چار لاکھ درہم تھی۔ آپ کا ذریعۂ معاش تجارت اور زراعت تھی۔ خیبر کے علاقے میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک وسیع جاگیر عطا فرمائی تھی، اس کے علاوہ اپنی کمائی سے بہت سی قابل کاشت زمینیں خریدی تھیں۔ آپ کے کاروبار میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بے شمار برکت عطا فرمائی۔ خود فرماتے ہیں کہ میں پتھر اٹھاتا تو اس کے نیچے سے بھی سونا نکل آتا۔ آپ کے وارثوں نے انتقال کے بعد دولت کی تقسیم کی تو چار بیویوں میں سے ہر ایک نے اسّی اسّی ہزار دینار پائے۔ سونے کی اینٹیں اتنی بڑی بڑی تھیں کہ کلہاڑی سے کاٹ کاٹ کر تقسیم کی گئیں۔ نقدی کے علاوہ ایک ہزار اونٹ، سو گھوڑے اور تین ہزار بکریاں چھوڑیں۔

لباس اکثر ریشم کا ہوتا، کیوں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیماری کی وجہ سے بطورِ خاص اجازت فرمائی تھی۔ ابو سلمہ بن عبدالرحمن کو حضرت فاروقِ اعظم نے ایک مرتبہ ریشمی لباس پہنے ہوئے دیکھا تو گریبان میں ہاتھ ڈال کر پھاڑ ڈالا۔

حضرت عبدالرحمن نے کہا: آپ کو معلوم نہیں کہ حضور کی طرف سے مجھ کو اجازت ہے۔ فرمایا: اجازت تمہارے لیے ہے، نہ کہ تمہارے خاندان والوں کے لیے۔

آپ نے متعدّد شادیاں کیں، جن میں چودہ بیویوں کا ذکر کتب سیر و تاریخ میں ملتا ہے۔ آپ کی اولاد بھی نہایت کثیر تھی، ۲۸/ کے نام معلوم ہیں، جن میں اکیس لڑکے اور سات لڑکیاں تھیں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

سچی تڑپ اور جذبۂ صادق انسان کو منزل سے ضرور ہم کنار کردیتے ہیں۔ رسول عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فداکاروں کی صف اول میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسم گرامی آتا ہے۔ آپ کی زندگی کا سب سے روشن گوشہ یہ ہے کہ متعدّد فلسفۂ مذاہب کا جائزہ لینے کے بعد دامن کائناتِ پناہ، سرور انس وجاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں آکر پناہ گزیں ہوئے اور پھر گویا سارے عالم سے بے نیاز: ؎

کچھ شمع کی لو ہی میں تاثیر کشش ہوگی

ہر آگ کا پروانہ ہوتا نہیں شیدائی

ملک فارس کے شہر رامہر مز میں شاہی خانودہ میں بور خشاں کے گھر ایک ہونہار بچہ پیدا ہوا۔ جس کی تحریر پیشانی سے ؎

می تافت ستارۂ بلندی

مابہ، نام رکھا گیا۔ آغوشِ مادر اور مہد کی ناز برداریوں سے گزر کر ہوش مندی کی عمر تک کھلے آسمانوں نہ چھوڑا گیا۔ مادر و پدر کی نگاہیں ہر وقت فرشِ راہ رہیں۔ کنیزیں و خادمائیں قدم قدم پر بچھی رہتیں۔ بور خشاں بہر حال سردار تھا اور اسی کے ساتھ آتش کدہ کا خازن بھی۔ اس کے پاس دولت کی کیا کمی تھی۔ سارا شہر اس کی عزت کرتا تھا اور عوام تو عوام، خواص وحکام سب کے سب اس کے مذہبی منصب کا لحاظ کرتے تھے۔ کیوں نہ ہو سرپرست اور وہ بھی مقدس آتش کدہ کا۔

ہزار ناز ونعم کے باوجود مابہ کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ وہ مذہب مجوس کی ساری تعلیمی روح سے گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی رہ کر ماہر ہوگیا تھا، کیوں کہ بور خشاں کی اس اکلوتی اولاد کو اپنے باپ کی گدی پر بیٹھنا تھا۔

بور خشاں نے ایک روز صاحبزادے کو مکان سے کچھ دور زمین دیکھنے کے لیے بھیجا۔ مابہ چوں کہ گھر سے باہر بہت کم نکلتا تھا، اس لیے باہر کی دنیا کے حالات اس پر مخفی تھے۔ راستہ میں اسے ایک کلیسا نظر آیا، جس میں نصاریٰ نماز پڑھ رہے تھے۔ مابہ کی ساری زندگی تو آتش کدہ کے روبرو گزری تھی، اس لیے اسے یہ تعجب ناک اندازِ عبادت دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ کلیسا میں گھس گیا اور حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ شام تک اسی کلیسا میں رہ کر رات کو مابہ اپنے گھر لوٹا تو اس کا دل بھڑکتے ہوئے انگاروں سے اچٹ چکا تھا اور وہ نصرانیت کے اندازِ عبادت کو اس پر فوقیت دینے لگا تھا۔ جہاں دیدہ بور خشاں نے جس شیشہ کو زمانہ کے سرد وگرم سے بچانے کے لیے اتنے جتن کیے تھے، اس میں اب اُبال آگیا تھا۔ مابہ کو وہ لاکھ آنکھوں کا نور اور دل کا سرور سمجھتا تھا۔ مگر جب بیٹے نے صاف لفظوں میں مجوسیت کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ جس اکلوتے کو وہ لڑکیوں کی طرح رکھتا تھا، اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور گھر کی کوٹھری میں قید کردیا گیا۔ مگر فکر واحساس کا دریا کہیں روکے باندھے رکتا ہے۔ بور خشاں نے لاکھ تدبیریں کیں، لیکن کوئی کارگر نہ ہوئی۔ ؎

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

آخر اس بیماری دل نے اپنا کام تمام کیا

ایک روز رات کی تاریکی میں موقع پاکر مابہ نے شام کی راہ لی، کیوں کہ شام ہی نصرانیت کا مرکز تھا۔ وہاں کے سب سے بڑے عالم سے ملاقات کی۔ ان سے کہا کہ میں آپ ہی کے ہمراہ رہ کر مکمل دین نصرانیت کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ عالم راضی ہوگیا۔ مابہ کا کام علم سیکھنے اور عبادت گزاری کے سوا کچھ نہ رہا۔ کچھ روز کے بعد اس عالم کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ دوسرا پرہیزگار اور فاضل شخص اس کی جگہ بیٹھا، مابہ نے اس کی بھی بہت خدمت کی اور علم حاصل کیا۔ وہ فاضل بھی ضعیف تھا، کچھ روز بعد مرنے کے قریب آیا تو اس نے مابہ کو وصیت کی کہ موصل میں ایک زبردست عالم ہے، تو وہیں چلا جا، تیری سیرابی ہوجائے گی۔ مابہ تو اپنی دھن کا پختہ تھا، موصل جا پہنچا۔ عجیب اتفاق کہ اس عالم کے پاس بھی زیادہ روز نہ رہ پایا، اس نے اپنا مقصد بیان کیا تو انھوں نے اسے عمودیہ بھیجا کہ وہاں ایک جید عالم ہیں، ان کے پاس جا، یقیناوہ تجھے قابل عمل مشورہ دیں گے اور علم اصلی سے نوازیں گے۔ مابہ عمودیہ پہنچے اور کچھ روز رہے اور اس عالم کو اپنا مقصد بتایا کہ مجھے سچے راستے کی طلب ہے۔ انھوں نے فرمایا: آج کوئی شخص اس برگزیدہ طریقہ پر قائم معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ ایک نبی کا زمانہ قریب ہے، جو دین ابراہیمی لے کر آئیں گے، وہ ایسی جگہ ہجرت کرکے جائیں گے، جہاں کھجور کے درخت ہیں، ان کے مونڈھوں کے درمیان خاتم نبوت ہوگی، وہ صدقہ کی چیز نہ کھائیں گے، ہدیہ قبول کریں گے۔ اے طالب صادق! اگر تم سے ممکن ہو تو ان کی خدمت میں چلے جانا۔ مابہ کو عمودیہ میں آکر کافی روز ہوگئے تھے اور ان کے پاس مویشی خاصی مقدار میں جمع ہوگئے تھے۔ نبی آخر الزماں کی بعثت کا تذکرہ سننے کے بعد مابہ کو عمودیہ کی زمین بھی ناگوار ہونے لگی، ایک عرب قافلہ اسی موقع پر واپس ہو رہا تھا، مابہ قافلہ میں پہنچا اور سردار قافلہ سے بولا۔ اگر آپ حضرات مجھے بھی اپنے ساتھ لیے چلیں تو یہ سب جانور آپ لوگوں کی نذر کردوں گا۔ قافلہ وادی القریٰ میں داخل ہوا۔ اہل قافلہ نے دغابازی کرکے مابہ کو غلام کی حیثیت سے مکہ میں بیچ ڈالا۔

یثرب کا متمول یہودی بڑے تبختر سے اپنے لہلہاتے ہوئے کھجور کے باغ میں ٹہل رہا تھا، غلام کام میں مصروف تھے، ٹہلتے ٹہلتے از خود بڑ بڑایا: یہ بنی قیلہ (یعنی انصار) بھی کتنے نادان لوگ ہیں، مکے سے آئے ہوئے ایک شخص کے گرد جمع ہورہے ہیں، جو اپنے کو نبی بتاتا ہے۔

مابہ کے ہاتھ خود بخود رُک گئے اور یک بیک گویا اسے کچھ یاد آگیا۔ اس نے اپنے آقا کی باتوں پر غور کرنا شروع کردیا اور گزرے ہوئے لمحات میں کھوگیا۔ فارس سے ماں باپ کو چھوڑ کر سچی روشنی کی طلب میں شام آیا، وہاں سے موصل پہنچا اور موصل سے عمودیہ کا رُخ کیا اور پھر نور کی کرنوں کا سراغ مل گیا۔

مگر اب تو میں غلام ہوں، خود مختار نہیں، وعدہ شکن لوگوں نے مجھ سے میرے جانور بھی لیے اور غلام بنا کر بیچ بھی دیا۔ آج میں بنو قریظہ کے اس کٹر یہودی کا زر خرید غلام ہوں، جو شاید اسی بشارت والے پیغمبر کی خبر پر جھنجھلا رہا ہے تو کیا ابراہیمی دعا مستجاب ہوگئی، کیا نوید مسیحا کا ظہور ہوچکا ہے۔ موسیٰ و یحییٰ نے جس کے آنے کا مژدہ سنایا تھا، وہ نورانی مکھڑے والا شاید آج یثرب کی کھجوروں والی بستی میں رونق افروز ہوگیا۔

یہودی آقا نے بڑھ کر مابہ کی پیٹھ پر ایک دھپ لگایا اور وہ چونک پڑا۔ تو کیا سن رہا ہے، چل اپنا کام کر۔ مابہ پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ مگر نبی آخر الزماں کی آمد کا سراغ لگانے سے غافل نہ رہا۔

ایک روز موقع نکال کر خدمت میں حاضر ہوا، اس کے ہاتھ میں کچھ کھانے کی چیز بھی تھی، حاضر خدمت کیا اور کہا: یہ صدقہ ہے، سیدالمرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود ہاتھ کھینچ لیا اور اپنے حق دار صحابہ کو کھلا دیا۔ مابہ اس روز کے بعد پھر دوبارہ حاضر خدمت ہوئے، اس

بار بھی کچھ کھانے کی چیز لیتے گئے اور کہا: یہ ہدیہ ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس میں سے خود بھی تناول فرمایا اور اپنے اصحاب کو بھی کھلا دیا۔ تیسری مرتبہ مابہ کو جب حاضری کا موقع ملا تو آپ کی پشت مبارک کی جانب جاکر بیٹھ گیا، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مبارک چادر کو مونڈھوں سے نیچے گرادیا، دونوں مونڈھوں کے درمیان مہر نبوت کی نورانی قندیل آویزاں تھی، مابہ نے بے تحاشہ آگے بڑھ کر چوم لیا اور فرطِ مسرت میں رونے لگے۔ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تسلی دی اور اپنے غلاموں کے حلقہ میں شامل کرلیا۔

مابہ اب مسلمان بن گئے، جس کے لیے در در کی ٹھوکریں کھائیں، وطن سے بے وطن ہوئے، والدین کی زندگی میں یتیمی پر قناعت کی، تنگ دستی اور عسرت کا شکار ہوئے، پے بہ پے مسافرت سے دوچار ہوئے، آقائی کو خیرباد کہا اور غلامی کی صعوبتیں برداشت کیں۔ جب اس گوہر مراد کو پالیا تو نہ پوچھئے درد کافور اور ہر غم دور ہوگیا۔

تمنا تو تھی کہ ہر دم خدمت محبوب میں حاضر رہتے، مگر کیا کریں کہ آقا نے زر نقد دے کر خریدا ہے، اس کی حکم عدولی ممکن نہیں۔ ایک روز محسن کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مشورہ دیا، سلمان! تم اپنے آقا سے کتابت کرلو (کتابت اس کو کہتے ہیں کہ غلام اپنے آقا سے تحریری معاہدہ کرے کہ اتنا معاوضہ ادا کردوں تو آزاد ہوجاؤں گا) آپ نے اپنے آقا سے چالیس اوقیہ چاندی اور تین سو پودوں کے لگانے اور ان میں پھل آجانے کی شرط پر معاہدہ کرلیا، اس معاہدہ کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اصحاب میں اعلان فرمایا:

''اعینوا اخاکم''۔ ترجمہ:۔ اپنے بھائی کی مدد کرو۔

تو ان لوگوں نے میری مدد کی، پھر کیا تھا، اصحابِ کرام نے دو دو چار چار کرکے تین سو پودے جمع کردیے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے لگا دیے، جو تمام کے تمام اسی سال پھل لائے۔ شمائل ترمذی میں ہے کہ ان تمام پودوں میں ایک پودہ پھل نہیں لایا تو حضور نے فرمایا: ایسا کیوں ہوا؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! یہ پودا میں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے اکھاڑ کر اپنے دست اقدس سے لگایا تو اس سال اس میں بھی پھل آگیا اور بہت جلد مالِ کتابت ادا کرکے آپ نے آزادی حاصل کرلی اور اپنے شب و روز خدمت نبوی میں وقف کردیے۔

غزوۂ احزاب میں آپ ہی کے مشورہ پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ میں رہ کر مدافعانہ جنگ لڑی اور خندقیں کھدوائی گئیں، جو عربوں کے لیے نیا اندازِ جنگ تھا۔ ایک موقع پر انصار و مہاجرین میں اختلاف ہوا کہ سلمان کس زمرہ میں ہیں؟ انصار میں یا مہاجرین میں۔ دونوں طرف کے لوگ انھیں اپنا اپنا کہہ رہے تھے، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ سلمان میرے اہل بیت سے ہیں۔ آپ کو سلمان مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی کہا جاتا تھا۔ اسلام سے غایت عشق کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ سے اگر کوئی باپ کا نام پوچھتا تو آپ فرماتے: میں سلمان ابن اسلام ہوں۔ ؎

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کاں دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

(بسند احمد والکبیر والبزاز، جمع الفوائد، ج۲رص ۲۲۴۔۲۲۵)

☆☆☆

ظلمت سے نور کی طرف

خالد بن ولید وعثمان بن طلحہ وعمرو بن عاص رضی اللہ عنہم

ایک نہایت تیرہ و تار تنگ وادی ہے ۔ دم گھٹ رہا ہے ۔ ہو کا عالم ہے ۔ کہیں کسی طرف کچھ دکھائی نہیں دیا۔ یکہ و تنہا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کسی جانب روشنی کی کوئی کرن تلاش کر رہا ہوں۔ اسی تگ و دو میں تھک کر چور ہو جاتا ہوں، جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے۔ .... دفعتاً ایک طرف روشنی کی ایک لکیر دکھائی دیتی ہے ...... ایک روشن لکیر...... ایک تابناک کرن .... اور ایک پھیلتا ہوا اجالا...... میں اس کی جانب بڑھا...... اور بڑھتا گیا........ حتی کہ ایک سرسبز و شاداب ...... پر فضا...... پر بہار...... بقعہ نور ماحول میں پہنچ گیا...... جہاں ... روشنی ہی روشنی........ خوشبو ہی خوشبو، اور فرحت ہی فرحت تھی........ اور اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

حضرت خالد بن ولید نے دور کفر میں یہ خواب دیکھا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب نور اسلام مدینہ طیبہ کے علاقہ سے نکل کر اطراف عرب میں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ بدر و احد کے معرکے گزر چکے تھے۔ صلح حدیبیہ کو ایک سال کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس دوران خالد بن ولید اسلام کے خلاف مشرکین مکہ کی جاہل تحریک کا پورا پورا ساتھ دیا تھا اور اپنے عزم و شجاعت کا استعمال کیا تھا۔ مگر معرکے سے لوٹنے کے بعد اس کے نہاں خانہ دل سے آواز آتی تھی کہ اے خالد! تو نے اپنی طاقت اور شجاعت کا استعمال بے محل کیا۔ تیری بہادری اور جواں مردی اس کام کے لیے نہیں ہے۔ کہ قدرت نے تجھے کسی اور بلند مقصد کے واسطے پیدا کیا ہے۔ متعدّد واقعات ایسے سامنے آئے، جنھوں نے خالد کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا۔ ان سے ایک موقع وہ بھی تھا۔ جب غزوہ بدر کے بعد خالد بن ولید اور ہشام بن ولید، اپنے بھائی ولید بن ولید کو مسلمانوں کو فدیہ دے کر رہا کرانے کے لیے مدینہ پہنچے تھے۔ ولید بن ولید عبداللہ بن جحش کے پاس تھے، انھوں نے چار ہزار درہم فدیہ طلب کیا تو خالد اتنی بڑی رقم دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ مگر ہشام کے کہنے پر بمشکل راضی ہوئے۔

ولید بن ولید جب قید سے رہا ہو کر مکے پہنچے تو پہنچتے ہی مسلمان ہو گئے۔ اور اپنے اسلام لانے کا کھلم کھلا اعلان کر دیا خالد اور دوسرے اہل قرابت نے وجہ پوچھی! کہ اگر مسلمان ہونا تھا تو ہم سب کو مدینے بلا کر ذلیل کیوں کیا۔ اور مستزاد یہ کہ چار ہزار درہم بھی خرچ کرا دیئے؟

ولید بولے اگر میں بحالت اسیری اسلام قبول کرتا تو شاید یہ خیال گزرتا کہ میں قید کی صعوبتوں کے ڈر سے یا فدیہ کی رقم سے بچنے کے لیے مسلمان ہو رہا ہوں۔ اور مجھے یہ گوارہ نہیں کہ اسلام جیسی نعمت سے حاصل کرنے میں کسی دنیوی مفاد کا شائبہ بھی ہو۔

خالد بن ولید یہ سن کر فکر اور تامل میں ڈوب گئے۔ اس واقعہ نے ان پر گہرا اثر ڈالا۔ عمرۃ القضا کے وقت ولید بن ولید حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہمراہ مکہ شریف آئے۔ اور اپنے بھائی خالد بن ولید کو بہت تلاش کیا۔ مگر خالد اور بہت سے مشرکین مکہ اسی طرح اس موقع پر شہر چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے۔ کیونکہ مسلمانوں کا تین روز تک حرم میں رہنا انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ بھلا ایسے منظر کو وہ لوگ کیسے دیکھ سکتے تھے۔ ولید بن ولید جب بھائی کو نہیں پایا تو واپس جا کر انھیں خط لکھا کہ:

”مجھے اس سے زیادہ تعجب کسی شئ پہ نہیں کہ تم جیسا عقلمند انسان اور اسلام سے متنفر ہو۔ سنو! رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے تمہارا حال دریافت کیا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ رب تعالیٰ ایک روز خالد کو آپ کی خدمت میں ضرور لائے گا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ خالد

جیسا شخص اسلام سے جاہل نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی دلیری اور شجاعت کو مسلمانوں کی امداد میں استعمال کرتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ اور ہم انھیں اس بارے میں اوروں پر مقدم رکھتے"۔

ولید نے یہ بھی لکھا کہ:

خدمت اسلام کے بہت سے قیمتی مواقع تم ضائع کر چکے ہو۔ اب سے تاخیر نہ کرو۔ اور تلافی مکافات کر ڈالو۔ بھائی کا یہ مکتوب پاکر خالد کے اندر ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ذہن و دماغ پر پچھلی بہت سی باتوں کا اثر موجود تھا ہی اس خط نے گرم لوہے پر ضرب کا کام کیا۔ خالد تفکر اور تعقل میں ڈوب گئے۔ اسی دوران مذکورہ بالا خواب نظر آیا۔ جس نے خالد کے ارادوں کو اور پختگی دی۔ رفتہ رفتہ نور اسلام عقل کے سوراخوں سے گزرتا ہوا دل کے آنگن تک پہنچ رہا تھا۔

چاندنی چھٹکی، فصل خدا کی خوب ہوئی آبادی دل
نور ہدیٰ نے مکھڑا کھولا دور ہوئی ناشادی دل
صدیق و فاروق ہے کوئی، اور کوئی خالد جرار
بدر مقدر سے بنتی ہے وادی ایمن۔ وادی دل

ایک انقلابی دھچکا:

اس سے پہلے حضرت خالد کے دل پر ایک دھچکا اور اس وقت لگا تھا، جب حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ۱۷ر سو صحابہ کے ہمراہ عمرہ کی نیت سے نکلے تھے۔ حضرت خالد خود فرماتے ہیں:

"جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حدیبیہ کے لیے روانہ ہوئے، قریش سواروں کے ایک دستہ کے ہمراہ میں بھی ان کی نگرانی پر مامور تھا۔ حضور اور ان کے صحابہ سے میرا سامنا عسفان میں ہوا۔ میں آپ کے سامنے جاکے کھڑا ہوگیا۔ اور ارادہ کیا کہ کچھ چھیڑ چھاڑ کروں (مگر نہ کر سکا) آپ نے اور آپ کے صحابہ نے ہمارے سامنے ظہر کی نماز ادا کی ہم نے سوچا نماز ہی کی حالت میں ان لوگوں پر حملہ آور ہوں۔ لیکن یہ ارادہ بھی ناتمام رہا۔ اور اسی میں خیر ہوئی ہمارے اس فاسد ارادہ کا حضور کو علم ہوگیا۔ لہٰذا آپ نے نماز عصر خوف کے طریقہ پر ادا فرمائی۔ یہ دیکھ کر ہمارے دلوں پر بہت اثر ہوا۔ اور میرے ضمیر نے آواز دی۔ اس انسان کی ضرور غیبی طور پر حفاظت کی جاتی ہے"۔

اور یقیناً یہ حق ہے۔ کیونکہ اشرار مکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے در پے آزار تھے تو جان نثار صحابہ کرام سرکار کی حفاظت کیا کرتے تھے کہ رب کریم نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ:۔ اور اللہ تمہاری نگہبانی کرے گا لوگوں سے بیشک اللہ کافروں کو راہ نہیں دیتا۔ (المائدہ ۶۷)

اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام جو پہرہ دیتے تھے، انھیں فرمایا کہ تم لوگ چلے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ خود میرا حافظ و ناصر ہے۔

بہر حال حضرت خالد خود کہتے ہیں کہ:

”جب آپ نے قریش سے حدیبیہ میں صلح کرلی، اور بغیر جنگ و جدال کے اہل مکہ نے آپ کو مدینے واپس کر دیا۔ تو میں نے جی میں کہا: بھلا اب کون سا راستہ باقی ہے؟ اگر حبشہ کی طرف جاتا ہوں تو نجاشی پہلے ہی مسلمان ہو کر صحابہ رسول کو پناہ دے چکا ہے اور وہ لوگ وہاں سکون و اطمینان سے رہ رہے ہیں۔ اور اگر روم کی طرف جاکر ہرقل کے دامن میں پناہ لیتا ہوں تو نصرانیت اور یہودیت کی راہ اختیار کرنی پڑے گی۔ اب یا تو عجم کا راستہ اختیار کیا جائے یا اپنے وطن میں قیام کیا جائے اس کے سوا چارہ نہیں۔

نور دل کوئی نہیں، نور نظر کوئی نہیں
ہے جبیں آزردہ خاطر سنگ در کوئی نہیں
سب دروں کو بند کر کے نور وحدت نے کہا
جز مری آغوش اب تیرا مقر کوئی نہیں

مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ:

حضرت خالد بن ولید کو یقیناً رب کائنات نے عظیم اسلامی مقاصد کے لیے پیدا فرمایا تھا۔ ان کی شجاعت و صداقت، عزم و جوانمردی پرچم اسلام لہرانے میں صرف ہونے والی تھی۔ اور انھیں تاریخ اسلام کا ناقابل فراموش جرنیل بن کر اپنی شمشیر خار شگاف سے کفر و باطل کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کرنا تھا۔ چنانچہ کفر و شرک کی غلیظ چادر کو انھوں نے روند ڈالا۔ اور مدینہ طیبہ سرکار محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور میں حاضری کا ارادہ کر کے اٹھے۔ پھر خیال آیا کہ اگر کوئی رفیق سفر مل جاتا تو کیا بہتر ہوتا۔ صفوان بن امیہ سے ملے۔

خالد: ....اے ابو وہب! کیا تم دیکھتے نہیں کہ اب ہم کس حال میں ہیں۔ اب تو ہماری مثال منہ میں باقی دو ڈاڑھ کی سی ہے۔ اور محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) عرب و عجم پر غالب آگئے۔ میں تو مناسب سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ بھی ان کی اتباع کرلیں۔ اب تو محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی عزت ہی ہماری عزت ہے۔

صفوان:......(منہ بگاڑ کر) اگر میں تنہا بھی رہ گیا جب بھی ان کی اتباع نہیں کر سکتا۔

صفوان کا جواب سن کر حضرت خالد نے سوچا کہ اس کا بھائی اور باپ مسلمانوں کے ہاتھ مارے گئے ہیں۔ اس لیے اس کا دل ہنوز بہت زخمی ہے۔ وہ ہمت کر کے عکرمہ بن ابی جہل سے ملے۔ اور اس سے بھی وہی بات کہی جو صفوان سے کہہ چکے تھے۔ عکرمہ نے بھی صفوان ہی کا جواب دیا۔ انھوں نے عکرمہ سے کہا خیر چھوڑو۔ میری اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ اور آپ نے تن تنہا سفر کا ارادہ کر لیا۔ اسی اثنا میں عثمان بن طلحہ سے ملاقات ہوگئی۔ وہ حضرت خالد کے دوست تھے۔ انھوں نے سوچا چلو آخری بار ان سے بھی کہہ کر دیکھ لیں۔ پھر خیال آیا کہ ان کے اہل خانوادہ بھی تو مسلمانوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے ہیں۔ مگر قدرے تذبذب کے بعد کہ آخر تو مجھے جانا ہی ہے انھوں نے عثمان بن طلحہ سے اپنی بات کہہ ڈالی کہ اب تو ہم لوگوں کی مثال بھٹ میں گھسی ہوئی لومڑی جیسی ہے کہ اگر ایک ڈول پانی ڈالو تو نکل بھاگے۔ اور سابقہ باتیں جو صفوان اور عکرمہ سے کہی تھیں وہ بھی کہہ دیں۔ ان کی گفتگو کا حاصل یہ ہوا کہ عثمان بھی مدینہ طیبہ جانے کے لیے تیار ہوگئے دونوں وقت

معینہ پر مقام یاجج پر ملے۔ اور ایمان و نور کی بارش میں نہانے کے لیے۔ کفر و شرک سے بر طرف ہونے کے لیے صحابہ رسول خاتم کی فہرست میں نام لکھوانے کے لیے۔ مدینہ کی جانب چل پڑے۔ اب اس کے بعد کی داستان خود حضرت خالد کی زبان سے سماعت کیجیے:

''ابھی فجر طلوع نہیں ہوئی تھی کہ ہم مقام یاجج سے نکل پڑے۔ اور جدہ پہنچ گئے۔ وہاں ہماری ملاقات عمرو بن عاص سے ہوئی۔ انھوں نے ہمیں دیکھ کر مرحبا کہا۔ ہم نے بھی مرحبا کا جواب مرحبا سے دیا۔ عمرو بن عاص نے پوچھا آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں؟ ہم جواب دینے کے بجائے انہیں سے پوچھا: آپ تو بتایئے کس طرف کا رخ ہے؟ ہم نے پھر کہا: ہم لوگ اسلام کے دامن میں پناہ لینے جا رہے ہیں۔ عمرو بن عاص نے کہا: یہی کشش تو مجھے بھی لئے جا رہی ہے۔ اب ہم تینوں ایک ہی ساتھ چل پڑے اور مدینہ جا پہنچے۔ ہم لوگ حرہ کے قریب اترے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہمارے آنے کی خبر ملی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ میں نے اپنا عمدہ لباس پہنا اور حضور کی بارگاہ کا قصد کیا۔ راستے میں بھائی (ولید بن ولید) سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا: جلدی کرو۔ حضور کو تمہاری آمد کی خبر دی گئی ہے۔ حضور تمہاری آمد سے بہت خوش ہیں۔ اور شدت سے انتظار فرما رہے ہیں۔ میں بھی تیز تیز چلا اور حضور کے پاس پہنچ گیا۔ آپ میری جانب دیکھ کر تبسم فرماتے رہے۔ حضور کے عین سامنے کھڑے ہو کر میں نے عرض کیا: ''السلام علیک ایہا النبی'' اے اللہ کے نبی آپ پر سلامتی ہو۔ آپ نے نہایت خندہ پیشانی سے میرے سلام کا جواب مرحمت فرمایا۔ پھر میں نے کہا: اشہد ان لا الہ الا اللہ وانک رسول اللہ۔ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں) حضور نے فرمایا: آؤ بیٹھ جاؤ۔ اس خدا ہی کی ذات حمد و ثنا کے لائق ہے، جس نے تمہیں ہدایت بخشی۔ تمہاری عقل و دانائی کے سبب مجھے پہلے ہی یہ امید تھی کہ رب تعالیٰ تمہیں اس خیر (اسلام) کی ضرور توفیق دے گا۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ سے لڑنے کے تمام مناظر اور حق سے ٹکرانے کے وہ تمام واقعات مجھے یاد آ رہے ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ سب معاف فرما دے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام، ماقبل کے تمام گناہوں کو پاک و صاف کر دیتا ہے۔ میں نے پھر دعا کی درخواست کی۔ آپ نے دعا فرمائی: اے اللہ! خالد بن ولید کی وہ تمام تگ و دو جو راہِ حق میں رکاوٹ بنی سب معاف فرما''۔

(البدایۃ والنہایۃ ج ۴/ ص ۲۳۸۔ و تاریخ الکامل ج ۲/ ص ۱۵۶، طبع بیروت)

میرے بعد عثمان بن طلحہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما آگے بڑھے۔ اور حضور کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی حضرت خالد بن ولید عثمان بن طلحہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کی یہ حاضری ماہ صفر ۸ھ میں ہوئی۔ حضرت خالد بن ولید نے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنے خواب کا ذکر کیا۔ تو آپ نے تعبیر میں فرمایا:

''تنگ و تاریک ماحول سے کشادگی اور روشنی کی طرف آنا۔ کفر و شرک کے اندھیرے سے دین فطرت اسلام کی طرف آمد ہے''۔

عبداللہ ابن سلام !آغوشِ رحمت میں

عبد اللہ ابن سلام کھجور کے پیڑ پر چڑھے ہوئے تھے اور اس کی تراش خراش میں مصروف تھے۔ قبا کے باغات اور ہرے بھرے درخت سرمستی میں لہرا رہے تھے۔ آبادی کے بہت سے لوگ نبی آخرالزماں کے استقبال میں گائوں کے باہر نکلے ہوئے ہیں اور اپنے جلوس میں دو نورانی چہرے لیے ہوئے جوش و مسرت کے نعرے بلند کرتے ہوئے لوٹ رہے تھے۔ بچوں کی شیریں زبانی مسرت کے گیت گا رہی ہے۔ ے

ایھا المبعوث فینا

جئت بالامر المطاع

ترجمہ:۔ اے ہم میں بھیجے گئے نبی! آپ ایسی چیز لے کر تشریف لائے، جس کی اطاعت ہم پر واجب ہے۔

دم زدن میں قبا کے چاروں طرف یہ مسرت بار خبر گشت کر گئی۔ نعروں کی آواز عبد اللہ ابن سلام نے پیڑ ہی پر سنی اور خوشی سے چیخ اٹھے ''اللہ اکبر'' یاحصین ابن سلام (آپ کا غیر مسلم نام) خدا تجھے برباد کرے۔ ارے اتنا خوش کیوں ہو رہا ہے؟ آپ کی پھوپھی جو درخت کے نیچے بیٹھی تھیں، یہ تکبیر سن کر چیخیں۔

پھوپھی جان! کیا جانتی ہو کون آیا؟ ہاں ہاں، چل میں تو دیکھتی ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی آتے تو شاید تو اتنا خوش نہ ہوتا۔

پھوپھی! یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی سردار انبیا ہیں، ہدایت کا وہی پیغام لائے ہیں، جو حضرت کلیم اللہ لائے تھے۔ خیر اچھا۔

عبد اللہ ابن سلام جلدی جلدی پیڑ سے اترے اور خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ آپ توراۃ اور آسمانی کتابوں کے زبردست عالم تھے اور نبوت کی بے شمار نشانیاں پہلے ہی سے جانتے تھے۔ اس لیے رُخِ انور کو دیکھتے ہی پکار اٹھے ''لیس ہٰذا وجہ کذاب''۔ یہ جھوٹے انسان کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔

آپ فوراً مسلمان ہوئے اور واپس آکر اپنے گھر والوں کو خوش خبری دی تو سب کے سب حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ایک ہفتہ قبا میں قیام فرمانے کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے۔

یہود ایک نہایت عیار اور زمانہ ساز قوم ہے اور اس قوم کی یہ فطرت نہایت قدیمی ہے اور اسلام دشمنی کے بارے میں تو ان کا نام مشرکین سے بھی پہلے لیا جاتا ہے۔

کلامِ الٰہی میں صاف صاف ارشاد ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا۔

(مائدۃ،ع:۱۱)

ترجمہ:۔ بلاشبہ مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تم یہودیوں اور مشرکوں کو پائو گے۔

یہود کے بارے میں اس صراحت قرآنیہ کے بعد مزید کسی دلیل کی حاجت باقی نہیں رہ جاتی۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل یثرب میں بسنے والے یہود قبیلۂ اوس اور خزرج کے لوگوں کو ڈرایا دھمکایا کرتے تھے کہ گھبرائو نہیں ایک رسول آنے والا ہے، جس کا سکہ دلوں پر چلے گا اور ہم اس کے ساتھ مل کر تمہیں مار ڈالیں گے۔ چوں کہ یہ قومِ یہود جس طرح مال و دولت میں زیادہ تھے، اسی طرح اپنے پاس علمی سرمایہ اور آسمانی صحائف بھی رکھتے تھے۔ اور ان پیشین گوئیوں کی روشنی میں اس بات پر مطلع تھے کہ فلاں زمانہ میں نبی آخر الزماں تشریف لائیں گے۔ مگر جب سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مکہ میں مبعوث ہوئے اور ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ آکر ان پر اسلام پیش فرمایا، تو یہود کی ریاست و دولت اور غنا و نفسانیت نے پیغمبر آخر الزماں کی مخالفت پر اکسایا، جس کے نتیجہ میں جنگ خیبر وغیرہ لڑنی پڑی۔

ایک روز عبداللہ ابن سلام خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ! قومِ یہود نہایت عیار و مکار قوم ہے۔ اس لیے ان کے سامنے میرے اسلام کے اظہار سے قبل ان سے میرے متعلق پوچھا جائے، میں چھپ جاتا ہوں۔ یہودِ مدینہ بلائے گئے۔ حضرت نے دریافت فرمایا: بتائو! تم لوگوں کا حصین ابن سلام کے بارے میں کیا خیال ہے؟

''خیرنا وابن خیرنا وافضلنا وابن افضلنا''۔

ترجمہ:۔ وہ ہم میں شریف اور شریف زادہ ہیں، ہم میں بلند اور بلند باپ کا بیٹا ہے۔

اتنے میں عبداللہ بن سلام سامنے آئے اور کہا: اے میرے ہم قوم سنو! میں اقرار کرتا ہوں ''اشھد الخ''۔ یہود نے یہ سنا تو فوراً پلٹ گئے اور عبداللہ ابن سلام کو بُرا بھلا کہنے لگے اور اٹھ کر چلے گئے۔ آپ کی پھوپھی جان بھی صدقِ دل سے ایمان لائیں اور زمرۂ حق میں شامل ہوگئیں۔ (بخاری کتاب الجہاد والسیر)

جانباز خبیب

عشق کی معراج ہے۔ محبوب کے قدموں پر جان دے دینا، محبت کی آگ میں جلنے والے سچے عاشق کو اگر یہ سعادت نصیب ہوجائے تو اس کی خوش بختی کا کیا کہنا۔

جیتے جی جس پہ مَرے جان بھی اس پہ دے دی
خوب ہے عشق میں مر مر کے بھی زندہ ہونا

چاروں طرف سے نیزے تولے ہوئے جواں مردانِ قریش ایک دیوانۂ عشق کو نشانہ بنارہے ہیں۔ قہقہے چھوٹ رہے ہیں۔ مسکراہٹیں بکھر رہی ہیں۔ کیوں نہ ہو، آج ایک زبردست دشمن (حارث کے باپ کا قاتل) محصور ہرن کی طرح گرفتار ہے۔ آج محمد کے ہاتھ دوستی کا مزہ چکھائیں گے۔ دیکھیں تو عشق کی آگ کتنی تپش رکھتی ہے، سارا نشہ ہرن نہ ہوجائے تو کہنا۔ سولی کے پھندے برابر کیے ہوئے اور جوانانِ قریش ننگی تلواروں کے پہرے میں خبیب کو قید خانے سے باہر لائے۔ موت سر پر منڈلا رہی ہے، مگر خبیب پر غم و فکر کا شائبہ تک نہیں۔ بڑی لاپرواہی کے ساتھ سولی تک پہنچے۔

قریش حیران و ششدر ہیں کہ موت کی آغوش سامنے ہے، ہمارے نیزوں اور تلواروں کا ایک حملہ ابھی خبیب کے جسم کی ساخت بدل کر رکھ دے گا، خون کے فوارے چھوٹیں گے، چیخوں سے فضا لرزے گی اور جسم کے ساتھ اس کی روح بھی بے وفائی کرکے اپنی راہ لے گی۔ مگر

متانت وسنجیدگی اور اطمینان وسکون کے سارے سرمائے اس وقت خبیب کے ایک تبسم پر قربان۔

شاید اس لیے کہ مشرکین مکہ مومن کامل کی سچی قربانی کے لیے قرآنی انعامات سے ناواقف تھے۔

''وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ‌ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ''۔

ترجمہ:۔ جو لوگ راہِ حق میں مار ڈالے گئے، انھیں مردہ نہ تصور کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے حضور روزی پاتے ہیں۔

بس یہی جان ہی تو آخری سرمایۂ عشق ہے، جس کو اپنے محبوب کے قدموں میں ڈال دینے کی تڑپ میکشانِ جنون کے معراج کی آخری منزل ہے۔ یقیناً خبیب کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز ہے۔ ؎

سکندر لوٹ کر بھی خوش نہیں دولت زمانے کی

قلندر مایۂ ہستی لٹا کر رقص کرتا ہے

سولی کے تختے پر کھڑے ہوتے وقت خبیب کے پائوں میں لرزش بھی نہیں، زبان پر منت و سماجت کے کلمات بھی نہیں۔ بلکہ ایک بے قراری، ایک تڑپ امتحان گاہِ محبت سے جلد از جلد گزر جانے کی۔

خبیب: اے اہل قریش!

خبیب کی آواز پر سب ہمہ تن گوش ہوگئے۔ شاید خبیب اب ہم سے اپنی جاں بخشی کی درخواست کریں، شاید اب اسلام سے تائب ہوکر اپنے آبائی مذہب پر آنے کا اعلان کریں گے۔ سب نے بیک زبان اپنی توجہ کا اظہار کیا۔

خبیب: سنو! ابھی چند لمحہ بعد تم مجھے قتل کردو گے۔ اگر اجازت ہو تو میں اس سے پہلے وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ اپنے رب کا آخری سجدہ، سجدۂ عشق۔ ؎

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی ہے

مشرکین قریش اپنی اس چال پر بہت خوش تھے کہ محمد کے دس جلیل القدر اصحاب ہماری تلواروں کے گھاٹ اتر گئے۔ ہوا یہ کہ قبیلہ عضل و قارہ کے کچھ افراد کے ساتھ خفیہ سمجھوتہ کرنے کے بعد انھیں لوگوں میں سے ایک وفد مدینہ بھیجا گیا، اس وفد نے دربارِ نبوی میں حاضری دی اور عرض کی: حضور ہمارے قبیلے کے بہت لوگ اسلام کی دعوت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ ہمارے ساتھ مبلغین کا ایک وفد چلتا۔ سرور دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دس آدمیوں پر مشتمل ایک جماعت روانہ فرمائی، جن کے سردار حضرت عاصم ابن ثابت (حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نانا) تھے، ایک پہاڑی مقام پر پہنچتے ہی عضل و قارہ کے تمام داعیین الگ ہٹ گئے اور دوسرے ہی لمحے دو سو نوجوانوں نے حملہ کردیا۔ صحابۂ کرام اگرچہ تھوڑے تھے، مگر ہمت نہ ہاری اور ثابت قدمی سے لڑے، مگر دو سو آدمیوں کے غیر متوقع حملے کو بھلا دس آدمی کس طرح روک پاتے۔ آٹھ شہید ہوگئے اور دو گرفتار کرلیے گئے۔ خبیب ابن عدی اور زید بن دثنہ۔

ان دونوں محصورین کو سفیان ہزلی نے مکہ لے جاکر قریش کے بازار میں بیچ دیا، قریش کی قید کیا تھی، حارث کے مکان کا ایک حصہ، جس میں نہ کھانے کو روٹی اور نہ پینے کو پانی۔ البتہ ہر روز موت کی خوش خبری ضرور کان میں پہنچتی۔ دورانِ حراست ایک دن حارث کا ایک بچہ

کھیلتے کھیلتے حضرت خبیب کے پاس پہنچ گیا، اس کے ہاتھ میں ایک چھری تھی، جس سے وہ کھیل رہا تھا، گھروالوں نے قیدی کے پاس اپنے لختِ جگر کو کھیلتے دیکھا تو ان کی چیخیں نکل گئیں۔ اب خبیب ہمارے نونہال کو زندہ نہ چھوڑے گا، جسے ہم روزانہ موت کا پیغام سناتے ہیں، جس کے لیے ہمارے نیزوں پر باڑھ رکھی جارہی ہے، جس کے لیے ہماری تلواریں صیقل کی جارہی ہیں، اس کی گود میں پہنچ کر ہمارا بچہ زندہ نہیں بچ سکتا۔ ہائے اب کیا ہوگا۔ حضرت خبیب اگرچہ بھوک سے نڈھال ہیں، پیاس سے چور ہیں، ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں، مگر اخلاقِ اسلامی کی رسّی اپنے ہاتھوں سے بڑی مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں۔ آپ نے ان پریشان حالوں کو جواب دیا:

خبیب: سنو سنو! میں رحمۃ للعالمین کا غلام ہوں۔ ان کی شریعت نہیں سکھاتی کہ کم سن و بے شعور بچوں کو ظلماً قتل کیا جائے۔ میری دشمنی تم سے ہے، اس بچہ نے میرا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ اس لیے تم مطمئن رہو۔ اسے میرے ہاتھ سے کوئی آزار نہیں پہنچے گا۔

آج وہی خبیب اسی گھر میں سولی کے تختے پر کھڑے ہیں۔

اہل قریش: خبیب! آخر تم نے نماز میں اتنی جلدی کیوں کی؟

خبیب: صرف اس خیال سے کہ کہیں تم لوگ یہ نہ سمجھ لو کہ خبیب موت کے خوف سے اپنی نماز کو طول دے رہا ہے۔ سولی کے پھندے کس دیے گئے اور خبیب تصویرِ صبر و شکیب بنے رہے۔ دیکھتے دیکھتے چمچماتے نیزوں نے خبیب کے سرخ خون میں نہالیا۔ زمین پر خون کے چھینٹوں نے زندگی کا نقش بنایا۔

ایک نابکار: اے خبیب! اب تو تو ضرور سوچتا ہوگا کہ میں کسی طرح بچ جاتا اور محمد کو پھانسی ہوجاتی۔

خبیب: (اگرچہ زخموں نے جسم کو گوشت و خون سے لت پت کردیا ہے، مگر جسم کی توانائیاں مجتمع کرکے جواب دیا) اے نادان! قسم ہے وحدہٗ لاشریک کی، میری تو آرزو ہے کہ یہ ایک ایک قطرہ خون ان کے نام پر بہہ جائے، مگر میرے مقدس محبوب، محبوب رب العالمین کے تلوۂ ناز میں کانٹا بھی نہ چبھے۔ (ابن ہشام، ج۲/ص ۱۲۳)

غور کیجیے! محبت کی آخری تڑپ کیسی جاں گداز تھی، مگر وہ بھی وارفتہ ناز کے لیے جامِ شیریں بن گئی۔

آخری لمحوں میں حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان پر جو اشعار تھے، وہ ایمان کے لیے کس قدر درد انگیز اور رقت پاش ہیں۔ ملاحظہ کیجیے: ؎

فو اللہ ما ارجوا اذا مت مسلما

علیٰ ای جنب کان فی اللہ مصرعی

ترجمہ:۔ بخدا! جب میں راہِ حق میں جان دیتا ہوں تو اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ راہِ خدا میں کس پہلو پر گرتا اور جان دیتا ہوں۔

وذالك فی ذات الالہ ان یشاء

یبارك علی اوصال شلو ممزع

ترجمہ:۔ اگر خدا چاہے تو اس کی ذات سے یہ بالکل امید ہے کہ وہ پارہائے گوشت کے ہر جز کو برکت سے نواز دے۔

زندگی کی آخری ہچکیاں لیتے وقت آپ نے بارگاہِ مصطفی میں پیغام شوق پہنچانے کی دعا کی:

''اللهم بلغنا رسالته رسولك فبلغه ما يصنع بناء''۔

ترجمہ:۔ خداوند کریم تیرے رسول کا پیغام ان تک پہنچادیا، اب تو اپنے محبوب کو ہمارے احوال کی خبر کر دے۔

مستقبل کے اُفق پر
تذکرہ ام حرام بنت ملحان

قابل صد مبارک باد ہیں وہ آنکھیں، جنھوں نے جمالِ محمدی کے جلوے اپنے دامن میں سمیٹے۔ لائق احترام ہیں وہ کان، جو گفتارِ مصطفوی کی سماعت سے لذت آشنا ہوئے۔ ان دلوں کی عظمت کا کیا کہنا، جن میں محبوبِ کردگار کے طائر محبت نے بسیرا کرلیا ہو۔ اور اندازہ لگائیے ان ہستیوں کی رفعت شان کا جن پر رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود مائل بکرم ہوں۔ بھلا ان مئے نوش کی تقدیر کو کیا کہیے، جس کی ترستی ہوئی روح کو ساقی کوثر کی نگاہوں کا چھلکتا ہوا جام میسر آجائے۔ ؎

یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنالیں

انھیں فدا کارانِ محمد رسول اللہ میں ام حرام بنت ملحان رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تھیں۔ جن کا سینہ حب سرکار کا گنجینہ بنا ہوا تھا۔ آپ سید الانبیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے رشتے میں آتی تھیں۔ مدینے کی نواحی بستی قبا میں آپ کا مکان تھا۔ اللہ کے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو آپ سے بے پناہ محبت تھی۔ آپ جب قبا میں کبھی کبھی تشریف لاتے تو ام حرام کے گھر آرام فرماتے اور اس وقت ام حرام کے دل کی کلی کھل پڑتی، تمنائوں کا چمن لہلہا اٹھتا۔ اور کیوں نہ ہو ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

محبت کا یہ عالم تھا کہ آپ انتظار کرتی رہتیں، راہ دیکھتی رہتیں کہ آج سرکار تشریف لاتے ہیں، آج آرزوؤں کی گلستاں میں بہار آتی ہے۔

ایک روز یوں ہی راہ دیکھ رہی تھیں کہ سرکار تشریف لائے، ام حرام نے ماحضر پیش کیا اور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بڑے شوق سے تناول فرمایا اور کچھ دیر بعد آرام کرنے کے ارادے سے لیٹ گئے۔ نبی کی آنکھیں سوگئیں، مگر دل پر انکشاف کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایک عام انسان سوتا ہے تو عالم غفلت میں وسواسِ شیطانی کا شکار بھی ہوجاتا ہے، مگر اک نبی جب محو خواب ہوتا ہے تو عالم رؤیا میں الہاماتِ ربانی مورد بن جاتا ہے۔ سر کی آنکھیں بند ہوتی ہیں تو دل آنکھوں سے لوحِ مستقبل کا مطالعہ کیا کرتا ہے۔ ام حرام بیٹھی ہوئی سر مبارک سے جوئیں نکال رہی تھیں اور کبھی کبھی بے ساختہ آنکھوں کی بصارت روئے محبوب پر فدا بھی ہوجاتیں۔ یک بیک مازاغ البصر کی مصداق آنکھیں کھلیں اور وحی الٰہی سنانے والے ہونٹ کھلے۔ آقا و مولا نے ارشاد فرمایا: ام حرام! میں نے ابھی دیکھا کہ مسلمانوں کا ایک بہت عظیم الشان لشکر جہاد کی نیت سے نکل رہا ہے اور بحری جہازوں میں سوار ہوکر اللہ کی عظمت کا پرچم بلند کرنے کے لیے چلا جارہا ہے۔ ام حرام بولیں: سرکار! میں بھی اس لشکر میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔ آپ دعا فرمادیں کہ خداوند عالم میری تمنا بر لائے۔ آپ نے ان کے لیے دعا فرمادی اور پھر سوگئے اور چند ثانیہ بعد بے دار ہوئے تو فرمایا: ام حرام! میں نے ابھی ابھی تمہیں اس لشکر میں دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا کہ تم پہلے دستے کے ساتھ جہاز میں سوار ہورہی ہو۔

حمص کے ساحل پر مسلمانانِ شام کا ایک جم غفیر تھا، جو بحیرۂ روم کی بے قرار موجوں کی طرح انگڑائی لے رہا تھا۔ تمام کے چہرے فرطِ مسرت سے تمتمارہے تھے۔ بچہ بچہ عمدہ اور صاف ستھرے لباس میں ملبوس تھے۔ امیر و غریب ہر ایک اس شادمانی میں برابر کا حصہ دار تھا۔

زبانیں مسرت و شادمانی کے نغمے گا رہی تھیں۔ ملک شام کے گورنر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلامی تاریخ میں ایک عظیم پیمانے پر بحری جہاز بنانے کا کام شروع کیا تھا اور اسی کارخانے کے جہاز آج سلطنت روما سے ٹکر لینے کے لیے پر تول رہے تھے۔ آج انھیں کے ذریعے سے مجاہدین اسلام کے قسطنطین اعظم کی قائم کردہ سرحد میں قدم رکھنا تھا۔ لوگ جلدی جلدی اپنی نشست گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا گویا پورے شہر کی رونق سمٹ کر کنارے آگئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد تکبیر کی ضرب نے پوری فضا کو دہلا کر رکھ دیا۔ تمام بیڑوں کے لنگر باری باری اٹھا دیے گئے اور خشکیوں کی آبِ سطح پہ بھی اللہ کی عظمت کے پھریرے لہرانے لگے۔

کنارے پہ کھڑے ہوئے مسلمانوں نے بھیگی ہوئی پلکوں اور مسکراتے ہوئے رخسار کے ساتھ اپنے بھائی بند اور عزیز و اقارب کو بحیرۂ روم کے حوالے کیا۔ کچھ دور جا کے جہازوں کے بادبان کھلے اور رفتار تیز ہوگئی اور حمص کے ساحل پر مسلمانوں کے ہاتھ بے اختیار دعا کے لیے اٹھ گئے اور سب نے مل کر دعا کی کہ:

اے اسلام کو دین فطرت بنا کر مبعوث فرمانے والے خدا! اے محمد رسول اللہ کو خاتم الانبیا بنا کر بھیجنے والے پروردگار! یہ تیرے شمشیر بکف بندے جو تلواروں کی چھائوں میں فردوسِ بریں کی راہ تلاش کرتے ہیں، نغمۂ دل جن کے زبان و دل کی زینت ہے۔ شوقِ شہادت جن کا سرمایہ ہے۔ صرف تیرے دین کی سربلندی کے لیے دور دیش کی طرف روانہ ہو رہے ہیں، جہاں ان کا نگہبان و محافظ صرف تو ہے۔ بارِ الٰہا! انھیں ان کے مقاصد میں کامیاب فرما۔ اور یہ مجاہدین اسلام دشمنانِ دین کی مضبوط و مستحکم فصیلوں کو اپنے حوصلوں سے مسمار کردیں۔ ظلم و جور کے اڈوں کو تاراج کر کے امن و شانتی کے نشیمن تعمیر کریں۔ انسانیت کے دشمنوں سے مخلوقِ خدا کو چھین کر اسلامی پناہ گاہ میں لائیں۔

رب العالمین! راستے میں حائل ہونے والی ہر چٹان کے لیے ان میں فولادی عزم و استقلال عطا فرما۔ انھیں طوفان کے بالمقابل سدّ سکندری بنادے۔ ان کے مقاصد میں دنیاوی حرص و ہوس کا شائبہ بھی نہ ہو۔

خداوندا! یا تو انھیں فتح و سرخروئی کی دولت سے نواز، یا لیلائے شہادت کا آنچل ان کے سروں پہ دراز کردے۔ یہ لوگ تیرے دین کی حمایت میں بڑھیں اور کامیابیاں بڑھ کر ان کے گلے کا ہار بن جائیں۔ ؎

کرم کرم کہ تجھے سب کریم کہتے ہیں
الٰہی تجھے غفور رحیم کہتے ہیں

ادھر حمص کے ساحل پر مسلمانوں کی دعائیں ختم ہوئیں، ادھر مجاہدین اسلام کے بیڑے بحیرۂ روم کی سطح پر نقطے کی شکل اختیار کرنے لگے۔ حتیٰ کہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ اور ایک دن وہ بھی آیا کہ شام کے بازروں میں امیر معاویہ والی شام کا قاصد اعلان کر رہا تھا: مسلمانو! مبارک ہو! مبارک ہو! قبرص فتح ہوگیا۔ اللہ نے ہماری مدد کی اور غازیانِ اسلام کامیاب و کامران لوٹ رہے ہیں۔ ان کے جہاز کل شام تک حمص کے ساحل پر لنگر انداز ہوجائیں گے۔ لہٰذا شام کو ان حضرات کا شاندار استقبال کیجیے۔

سورج مغرب کی طرف جھکا اور اس کے ساتھ اسلامی جہازوں کے بادبان نظر آئے۔ پورا ماحول تکبیر کی آواز میں گم ہوگیا۔ رفتہ رفتہ تمام جہاز لنگر انداز ہوگئے۔ سب ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے اور مبارک بادیاں پیش کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ایک ضعیفہ کا پائوں پھسلا اور نحیف و کمزور جسم زمین پر آرہا۔ تھوڑی دیر بعد ایک جنازہ سپردِ لحد کیا جا رہا تھا۔

یہ کون ہیں؟ کسی نے پوچھا۔ جواب ملا:

یہ ام حرام بنت ملحان ہیں، جو شاید صرف اس دعا کی تکمیل کے لیے زندہ تھیں، جو رہبر انسانیت جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے حق میں کی تھیں۔ (زرقانی، ج۱۱/ص۶۱/ بخاری شریف، جلد۱/ کتاب الجہاد، ص۳۹۱)

اعزازِ نسب: تذکرہ مالک بن دینار رضی اللہ عنہ

آگ کے مہیب شعلے بھڑک رہے تھے۔ رنگین لپیٹیں نیچی اونچی لپک رہی تھیں۔ دور مختصر سے اس الائو کے گرد ہزار ہا انسانوں کی بھیڑ جمع تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجمع میں سے دو آدمیوں کے ہاتھ باہم بھڑکتے ہوئے الائو میں دراز ہوگئے۔ آگ تیز سے تیز ہوتی رہی۔ انگارے زور و شور سے ہنستے رہے اور وہ دونوں کمالِ تحمل سے شعلوں کی موج سے کھیلتے رہے۔ لمحہ دو لمحہ آنکھیں منتظر ہیں کہ اب شعلوں کی لہو آشام زبان ان کے گوشت پوست چاٹ کر ختم کر دے گی اور تھوڑی دیر میں دو انسانی ہاتھ جل بھن کر آتش سوزاں کے شکم کا ایندھن بن جائیں گے۔ مگر کافی دیر ہونے کے باوجود ان دونوں کے جسم تو جسم رونگٹوں پر بھی آگ کا اثر نہ ہوا، شعلے مدھم پڑتے گئے اور رفتہ رفتہ بیٹھتی ہوئی لویں صرف سرخ انگارے چھوڑ کر رخصت ہوگئیں۔ وہ دونوں ہاتھ صحیح و سالم باہر نکل آئے۔

ان میں کا ایک مسلمان تھا اور دوسرا دہریہ۔ مسلمان یعنی اپنے وقت کا جلیل القدر درویش مالک بن دینار۔

حق و باطل کے معرکہ میں اکثر ایسی منزلیں آئی ہیں، جب براہین و دلائل کی دنیا سے گزر کر اہل باطن درویشوں نے اپنی سچائی اور حقانیت کی مقدس دلیلیں دی ہیں۔ یہ بھی اسی قسم کا ایک مناظرہ تھا۔

بصرہ میں گھر گھر اس کا چرچا ہوگیا۔ مسلمان اپنے مناظر کے نہ جلنے پر یقین کامل رکھتے تھے، اس لیے کہ مالک بن دینار نے خود کہا تھا کہ اگر میں سچے دین کا پیرو ہوں گا تو آگ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔ مگر یہ کیسے ہوا کہ دہریہ کا جسم بھی صحیح و سالم شعلوں کی گود سے نکل آیا۔ پورے بصرہ نے اسی شش و پنج میں رات گزار دی۔

دوسرے روز پھر اسی مناظرے کا اعلان ہوا۔ آج بھی آگ بھڑکائی گئی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آج بھی شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ آج بھی دو ہاتھ آگ میں دراز ہوئے۔ مگر فرق یہ تھا کہ آج دونوں الگ الگ تھے۔ تھوڑی دیر میں دہریہ کا ہاتھ سلگ اٹھا، کھالیں بھن گئیں اور سفید چربی پگھلنے لگی۔ مگر مالک بن دینار کی آستین سے کپڑے کا رواں رواں ان کی صداقت کا اعلان کر رہا تھا۔

مالک بن دینار نے کل دونوں کا ہاتھ صحیح و سالم رہ جانے پر دربارِ الٰہی میں دعا کی تھی کہ بارِ الٰہا! یہ کیا ماجرا ہے کہ تو نے ایک دہریہ کے ہاتھ کو مالک بن دینار کے برابر کر دیا؟ تو غیب سے ندا آئی کہ اے بندے! تیرے معبود کی رحمت کو گوارہ نہ ہوا کہ اس کے ایک وفادار بندے کے ہاتھ سے ملا ہوا جو ہاتھ آگ کے انگاروں میں جائے، اسے آگ کی حدت (حرارت) گزند پہنچائے۔ یہ تیرے ہاتھ کی تکریم تھی، جسے کل اسے جلنے سے بچا لیا تھا۔

عشقِ الٰہی اور محبت ربانی کے بحرِ بے کراں میں غواصی کرنے والے مردانِ حق کا تذکرہ ہر دور اور ہر زمانے میں عقیدت اور چاہت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ بزرگانِ دین اور اولیائے کاملین پر جب کبھی نگاہ پڑتی، سرخیل گروہِ اصفیا، سلطان السالکین حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تصور ذہن پر ابھرتا ہے۔

آپ ان مجاہدینِ روحانی کے پیشوا ہیں، جن پاک نفوس نے رضائے مولیٰ میں اپنا سب کچھ لٹا کر فقر، گوشہ نشینی اور خلوت نیوشی کو قابل ترجیح سمجھا اور پوری زندگی اس طریق پر گزار دی۔ جسم و روح، قلب و جگر اور پوری متاعِ حیات وادیٔ ریاضت کی نذر کر دی۔ اور خدا طلبی کی راہ میں مجاہدات و مساعی کرنے والوں کے لیے سنگِ میل بن گئے۔ ان کے نزدیک ہر شے سے مقدم اور عزیز ذاتِ الٰہی تھی۔ ایک کو عزیز کر لینے کے بعد دل و دماغ کے کسی گوشہ میں غیر کو عزیز رکھنے کا خیال بھی مزاجِ عشق کے خلاف تھا۔ ؎

دل ہو کہ جان تجھ سے کیوں کر عزیز رکھیے

دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا

نام و نسب:

نام نامی: اویس ہے (جو حضرت ملا علی قاری کی تصریح کے مطابق اوس کی تصغیر ہے)

کنیت: ابو عمر۔ ملک یمن کا ایک موضع "قرن" آپ کا مولد و مسکن ہے۔ قبیلہ مراد سے تعلق رکھنے کی وجہ سے آپ کو مرادی بھی کہتے ہیں۔

آپ کے والد ماجد کا نام "عامر" اور والدہ ماجدہ کا نام "بدار" ہے۔

سلسلۂ نسب یہ ہے:

اویس بن عامر بن عبداللہ بن جراح بن بلال بن اہب بن خبث بن خرمش بن غالب بن محمد بن قریش بن مالک بن نضر بن کنانہ۔

حُلیہ:

آپ گندمی رنگ، معتدل قد و قامت، دبلے اور لاغر جسم کے انسان تھے۔ آپ کے سر اور داڑھی کے بال اکثر پریشان اور گرد آلود رہتے۔ آنکھیں سیاہ تھیں، پیشانی پر شانِ بندگی کی منور علامت تھی اور داہنے ہاتھ پر ایک دینار کے برابر سفید نشان تھا۔

فضائل:

مشکوٰۃ شریف میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ان رجلا یاتیکم من الیمن یقال له اویس لا یدع بالیمن غیر ام له قد کان به بیاض فدعا الله فاذهبه الی موضع الدینار والدراهم فمن لقیه منکم فلیستغفر لکم"۔

ترجمہ:۔ تمہارے پاس یمن کی جانب سے ایک شخص آئے گا، جسے اویس کہتے ہیں۔ یمن میں اس کا، اس کی ماں کے سوا کوئی نہ ہوگا، جس کے سبب وہ یمن چھوڑ کر نہ آئے گا۔ اس کے جسم میں سفید داغ تھا تو اس نے خدا سے دعا کی، پس خدا نے وہ داغ ختم کر دیا، مگر ایک دینار کے برابر رہ گیا تو تم لوگوں میں سے جو اس سے ملے، بخشش کی دعا کرائے۔

''وفی روایۃ: قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان خیر التابعین رجل یقال لہ اویس ولہ والدۃ وکان بہ بیاض فمروہ یستغفرلکم''۔

ترجمہ:۔ تابعین میں سب سے بہتر ایک شخص ہے، جس کا نام اویس ہے، جس کی صرف ماں ہوگی، وہ سفید داغ والا۔ تم میں سے جس شخص کا اس پر گزر ہو، اس سے دعائے مغفرت کرائے۔

تارکِ دنیا:

حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ تارکِ دنیا کے امام حضرت خواجہ اویس قرنی ہیں۔ آپ نے دنیا سے اس قدر کنارہ کشی کی، معاشی وسائل اور گزران میں اس قدر توکل اپنایا اور صبر وشکر پر اس طرح رہے کہ دنیا نے آپ کو دیوانہ سمجھ لیا۔ قرن کی آبادی سے باہر ایک گوشئہ عافیت میں چھپ کر آپ اس طرح خدا کی یاد میں مشغول رہے کہ برسوں کسی کو وہاں آپ کی موجودگی کا علم نہیں ہوا۔ عشا کے بعد آبادی میں قدم رکھتے اور رات ختم ہونے سے پہلے آبادی سے باہر پہنچ جاتے۔ راستے سے گٹھلیاں چن لیا کرتے۔ وہی ان کی غذا اور خوراک تھی، ان میں اگر کوئی ناقص کھجور ہوتی تو اسے افطار کے واسطے اٹھا رکھتے اور اگر کبھی زیادہ کھجوریں میسر آجاتیں تو افطار کے واسطے بمقدار سدّ رمق رکھ لیتے اور باقی صدقہ کر دیتے، چیتھڑے لتے جوڑ جوڑ کر گدڑی بنا لیتے اور اسی کو پہن کر گزر بسر کرتے۔ لباس جہاں سے پھٹ جاتا، وہیں دوسری ردی سے پیوند کرلیتے، راستے میں گرے کپڑے چن کر پاک کرلیتے اور بلا تکلف استعمال میں لاتے۔

اخلاق کا یہ عالم کہ لڑکے اور بڑے جب راستے سے گزرتے ہوئے، گٹھلیاں اور کپڑوں کے ٹکڑے چنتے ہوئے دیکھتے تو کنکر مارتے تھے۔ آپ ان سے کہتے چھوٹے کنکر مارو، تاکہ خون نہ بہے، خون بہے گا تو وضو ٹوٹ جائے گا اور ذکر خدا میں خلل واقع ہوگا۔ (مکتوبات شیخ شرف الدین وحیات الذاکرین)

خواجہ حسن بصری علیہ الرحمہ نے فرمایا: میں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ وہ کمبل کا کرتا پہنے ہوئے ہیں۔ اور خواجہ اویس قرنی کو دیکھا کہ اونٹوں کے اون کا بنا ہوا تہبند باندھے ہوئے ہیں، جس میں بہتیرے پیوند ہیں۔ لوگوں کے اونٹ جنگل میں لے جاکر چراتے تھے، اس سے جو کچھ مزدوری مل جاتی وہ والدہ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ آپ کا اندازِ رہائش ایسا تھا کہ جس طرف چلے جاتے، لوگ نفرت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس کے باوجود ذاتِ باری تعالیٰ سے محبت اور قلبی تعلق کا یہ حال تھا کہ حضور سرور کونین رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آپ کی ملاقات کے مشتاق تھے۔ ایک بار فرمایا:

''انی لاجد نفس الرحمن من قبل الیمن''۔

ترجمہ:۔ میں یمن کی جانب سے نسیم رحمت محسوس کرتا ہوں۔

کبھی فرمایا:

''واشوقاہ الی لقاء اخوانی''۔

ترجمہ:۔ مجھے شوق ہے اپنے بھائی کی ملاقات کا۔

حضرت خواجہ اویس قرنی کے اخفا اور پوشیدگی کا حال تو یہ ہے کہ اگر اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نہ بتاتے تو دنیا کی نگاہیں آپ کے وجودِ مسعود کی کُنہ سے نابلد رہتیں۔ یقیناً آپ الاتقیاء والاصفیاء کے امیر کارواں ہیں۔ آپ تمام عمر اپنے حق میں یہ دعا کرتے رہے کہ اے اللہ! مجھے اپنے بندوں کی نگاہ سے دور رکھ۔

''اللهم استرنی عبادك وبلادك''۔

رب تبارک وتعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی۔

کتبِ تصوف کے حوالے سے مرقوم ہے کہ ایک روز آپ کی صحبت میں آپ کے چھ احباب درویش بیٹھے تھے، ناگاہ آپ پر ایک کیفیت طاری ہوئی، آپ مغلوب الحال ہوئے اور اس عالم میں آپ کی نگاہ احباب پر پڑی تو وہ سب کے سب آپ کی صورت کے ہوگئے، ان میں کا جو درویش جس طرف گیا، لوگوں نے خیال کیا کہ خواجہ اویس قرنی جارہے ہیں۔

مجھے تو اپنے رنگ میں رنگ دے کچھ اس طرح ساقی
جو مجھ کو دیکھ لے اس کو ترا دیدار ہوجائے

ان میں اصل اویس کون ہے، یہ خدا ہی کو معلوم ہے۔ اس طرح خواجہ اویس کے اخفائے حال سیاس حدیث قدسی کا ظہور ہوگیا۔

''اولیائی تحت قبائی لا یعرفهم غیری''۔

ترجمہ:۔ میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں، انھیں میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔

آپ نے عرفانِ خداوندی کی دولتِ لازوال کو دل میں پوشیدہ رکھا اور جمالِ یار کے سوا کبھی کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ تو رب کائنات نے بھی اپنے عاشق صادق کی ذات کو دنیا کی نگاہوں سے مستور کردیا۔ وہ بھی اس طرح کہ آپ کے مزار کو بھی پوشیدہ کردیا۔ چنانچہ آپ کے مدفن کے بارے میں بھی چھ روایت ہیں، جن مقامات پر آپ کا مزار ہونے کی شہادتیں ملتی ہیں، وہ یہ ہیں:

صفین، آذر بائیجان، بندر لخا، بغداد، غزنی، نواحِ سندھ۔

(تذکرہ خواجہ اویس قرنی مرتبہ رحیم الدین دہلوی، ص۴)

تمہیں تو ہو:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں جب اہل یمن آتے تو آپ ان سے خواجہ اویس کے بارے یں دریافت کرتے اور پوچھتے تھے: کیا تم لوگوں میں اویس بن عامر نام کا کوئی شخص ہے۔ بعض روایتوں کی رو سے ایک زمانہ ایسا آیا کہ خود خواجہ اویس قرنی بارگاہِ فاروقی میں آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوال کیا: آپ ہی اویس ہیں؟

خواجہ اویس: جی ہاں۔

حضرت عمر: کیا آپ کا تعلق قبیلہ مراد سے ہے اور آپ قرن کے باشندے ہیں؟

خواجہ اویس: بے شک۔

حضرت عمر: کیا آپ کے جسم پر سفید داغ تھے، جو اب ختم ہوگئے، اب صرف ایک درہم کے برابر سفیدی باقی ہے؟

خواجہ اویس: جی ہاں۔

حضرت عمر: کیا آپ کی صرف ماں ہیں اور کوئی نہیں؟

خواجہ اویس: جی کوئی نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث بالا پڑھ کر سنائی اور خواجہ صاحب سے دعا کی درخواست کی۔

خواجہ اویس: مجھ جیسا شخص آپ کے لیے کیا دعا کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اصرار کیا تو آپ نے دعا فرمائی۔ دعا کے بعد حضرت عمر نے دریافت کیا: اب آپ کہاں جائیں گے؟

خواجہ اویس: میں کوفہ جانا چاہتا ہوں۔

حضرت عمر: اگر آپ کہیں تو میں کوفہ کے عامل کو آپ کے بارے میں کچھ ہدایتیں لکھ دوں تا کہ آرام ملے؟

خواجہ اویس: یا امیر المومنین! میرے لیے بہتر ہے کہ امت کے گم ناموں میں رہوں۔

ان کے چلے جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیشہ ان کے ملنے والوں سے ان کی احوال پرسی کرتے رہے۔

تلاش وجستجو:

ابو القاسم عبد العزیز بن جعفر خرمی نے اپنے فوائد۔ اور خطیب بن عساکر نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ ایک روز حضور سرور کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے پکارا۔ اے عمر! میں نے عرض کیا: لبیک و سعدیک یا رسول اللہ!۔ میرا اندازہ تھا، جیسے حضور مجھے کسی کام سے کہیں بھیجیں گے۔

فرمایا: اے عمر! میری امت میں ایک شخص ہوگا، جسے لوگ اویس قرنی کہیں گے، اسے برص کا مرض ہوگا، جو دعا کرنے سے ختم ہو جائے گا، سوائے سونے کے ایک دھبہ کے، جسے دیکھ کر وہ اپنے کو یاد کرے گا۔ جب تم اس سے ملنا تو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ تمہارے لیے دعا کرے۔ وہ نہایت بزرگ اور خدا کے نزدیک برگزیدہ ہے۔ وہ قبیلہ مضر اور ربیعہ کی بکریوں کے بمقدار انسانوں کی شفاعت کرے گا۔

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میں اس شخص کو زمانۂ نبوی میں تلاش کرتا رہا، مگر نہ مل سکا۔ یوں ہی دورِ صدیقی میں بھی ڈھونڈتا رہا اور یمن سے آنے والوں سے احوال پُرسی کرتا رہا کہ تم لوگوں میں کوئی ان صفات کا ہے؟ ایک بار یمن میں ایک یمنی سے یہ باتیں پوچھیں کہ کیا تم لوگوں میں کوئی ایسا ہے؟ اس نے کہا: یا امیر المومنین! وہ تو میرا چچا زاد بھائی ہے، مگر اتنا کم ترین اور بے وقعت ہے کہ آپ جیسے لوگوں کو ایسے شخص کی خیریت نہیں پوچھنی چاہیے۔ اس کی باتیں سن کر میں نے کہا: محسوس ہوتا ہے کہ تم اس کے بارے میں بدگمان ہو۔ اگر یہ سچ ہے تو تم اپنے کو تباہی میں ڈال رہے ہو۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میں نے ایک شخص کو اونٹ پر آتے دیکھا، مخدوش پالان، بوسیدہ حالت، پھٹے لباس، میں نے پوچھا: کیا آپ ہی اویس ہیں؟ انھوں نے کہا: جی میں ہی اویس ہوں۔ میں نے کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کو سلام کہا ہے۔ انھوں نے جواب دیا:

”والسلام علی رسول اللہ وعلیك یا امیر المومنین“۔

ترجمہ:۔ اور سلام ہو اللہ کے رسول پر اور آپ پر بھی اے امیر المومنین!

اس کے بعد میں نے کہا: حضور نے مجھے آپ سے دعا کے لیے حکم دیا ہے، میں اس ملاقات کے بعد ان سے کئی بار ملا۔

ابن عساکر کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما انھیں تلاش کرتے ہوئے اس جنگل میں پہنچے، جہاں آپ اونٹ چراتے اور خود عبادتِ الٰہی میں غرق رہتے۔ یہ لوگ پہنچے تو آپ کو عالم سجدہ میں دیکھا، ان حضرات کے آنے کی آہٹ ہوئی تو آپ نے نماز میں تخفیف کی۔ سلام پھیرا اور ان حضرات سے مخاطب ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نام پوچھا: تو فرمایا عبداللہ۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہر مسلمان عبداللہ ہے، مگر یہ تو بتائیے آپ کی والدہ نے آپ کا کیا نام رکھا ہے؟ انھوں نے کہا: اس سے آپ کا مقصد کیا ہے، میرا نام اویس ہے۔ ان دونوں حضرات نے حضور کا سلام پہنچایا، دعا کرائی اور حضور سرور دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خرقۂ مبارک عطا فرمایا اور پوچھا: آپ کی خواہش ہو تو کچھ پیش کیا جائے؟ خواجہ اویس نے فرمایا کہ جو شخص ہفتہ کی آرزو کرتا ہے، مہینے کی ہو جاتی ہے۔ جو مہینے کی آرزو کرتا ہے، سال کی ہوجاتی ہے۔ یعنی خواہشات کا دامن پھیلتا چلا جاتا ہے۔ پھر فرمایا: اچھا وقت کم ہے اور کام زیادہ، ان شاء اللہ عرصۂ قیامت میں پھر ملیں گے۔ یہ کہا اور جنگل میں غائب ہوگئے۔

حضرت خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہورِ عالم کتاب "تذکرۃ الاولیاء" میں حضرت خواجہ اویس قرنی کا تذکرہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد دوسرے نمبر پر امام حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے کیا ہے اور "قبلۃ التابعین، قدوۃ العارفین، آفتابِ پنہانی" وغیرہ القابات تحریر کیے ہیں۔

شیخ عطار نے اس بارے میں لکھا ہے کہ حضور کے وصال فرما جانے کے بعد حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما یمن کے قصبہ قرن میں گئے۔ ملاقات کے بعد دورانِ گفتگو جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا کہ آپ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف کیوں نہیں حاصل کیا؟ جواب میں خواجہ اویس نے فرمایا: آپ نے تو سرکار کی طویل صحبت پائی ہے۔ بتائیے حضور کے دونوں ابروئے مبارک متّصل تھے یا منفصل؟ دونوں حضرات غور کرنے لگے اور خاموش رہ گئے۔ خواجہ اویس نے پھر پوچھا: کہ بتائیں حضور سرور کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غزوۂ احد میں کون سے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور اس حادثہ فاجعہ کے بعد آپ لوگوں نے سرکار کی متابعت میں اپنے دانت کیوں نہ توڑ ڈالے، پھر آپ نے منہ کھول کر دکھایا تو آپ کے سارے دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور کہا کہ مجھے یہ علم نہیں ہوسکا تھا کہ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کون سے دندان شہید ہوئے ہیں، اس لیے میں نے اپنے سارے ہی دانت توڑ ڈالے تو مجھے قرار آیا۔ یہ سننے کے بعد لوگوں پر رقت طاری ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مقامِ ادب واقعی کچھ اور ہے۔

یہ کیفیت اسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

دورانِ گفتگو یہ بھی فرمایا:

اے عمر! تو خدا کو پہچانتا ہے تو اس کے سوا کسی اور کو نہ پہچانے تو یہی بہتر ہے۔

ان حضرات نے خواجہ اویس کو کچھ دینا چاہا تو فرمایا: مجھے حاجت نہیں اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو درہم نکالے اور کہا: میں نے شتربانی سے یہ حاصل کیے ہیں۔ اگر کوئی مجھے بتادے کہ اس کے خرچ ہونے کے بعد تک بھی میں زندہ رہوں گا تو مزید لینے میں مجھے کوئی عار نہیں اور رخصت ہو کر جنگل میں بڑھ گئے۔

صحبتے با اہل دل:

ایک بزرگ حزم بن حبان نے آپ کو کوفہ میں دریائے فرات کے کنارے وضو کرتے ہوئے دیکھا۔ ضعف پیری، جسمانی کمزوری کے باوجود کثرتِ ریاضت کے کے آثار دیکھ کر رو پڑے۔ خواجہ اویس کی نظر ان پر پڑی تو فرمایا: حزم بن حیان! اللہ تمہیں حیات عطا فرمائے۔ یہاں کیسے آئے؟ حزم نے کہا: آپ سے تو میری پہلی ملاقات ہے، مجھے پہچان کیسے لیا اور آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟

فرمایا: مجھے اس نے بتایا، کائنات کی کوئی شی جس کے علم سے باہر نہیں۔ پھر فرمایا: اے حزم! میری روح تمہاری روح کو خوب پہچانتی ہے، کیوں کہ مومنوں کی روحیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہوتیں، انھیں باہم واقفیت ہوتی ہے۔ حزم ابن حبان نے کچھ سننے کی فرمائش کی تو قرآن مجید کی یہ آیتیں رقت انگیز انداز میں تلاوت کیں:

''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ''۔

ترجمہ:۔ میں نے جن وانس کو محض عبادت کے ل یے پیدا کیا۔

''وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَا لَاعِبِیْنَ''۔

ترجمہ:۔ آسمان و زمین اور ان میں جو کچھ ہے، انہیں ہم نے تماشہ کے لیے نہیں بنایا۔

وَمَا خَلَقْنٰہُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَہُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ''۔

ترجمہ:۔ ہم نے اسے نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ اور ان میں کے بہتیرے نہیں جانتے۔

ان آیات کی تلاوت کے بعد ایک چیخ ماری، حزم چونک گئے اور سمجھے کہ شاید عقل مختل ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد نصیحت کرنے لگے۔

''موت کو نیند کے وقت اپنے بالیں پر سمجھو اور بے داری میں سامنے، کسی گناہ کو حقیر اور معمولی نہ سمجھو''۔

حزم بن حبان نے ان سے اپنی اقامت کے بارے میں مشورہ لیا کہ کہاں ٹھکانہ بنائوں؟ تو کہا: شام چلے جائو۔ پھر ابن حبان نے سوال کیا: وہاں گزر بسر کی کیا صورت ہوگی؟

فرمایا: ان دلوں پر افسوس ہے، جو شک میں مبتلا ہیں۔ پھر نصیحت کی:

''اے ابن حبان! آدم و حوا، نوح و موسیٰ، داؤد و زکریا علیہم السلام دنیا سے رخصت ہوگئے۔ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پردہ فرما گئے۔ ابوبکر و عمر بھی وفات پا گئے اور سنو کہ تم اور سارا عالم''۔

ابن حبان نے سنا تو جواب دیا: حضرت! امیر المومنین عمر تو ابھی حیات ہیں۔ فرمایا: عالم الغیب والشہادت نے مجھے ان کے وصال کی خبر دی ہے۔

حزم بن حبان سے زیادہ تر باتیں خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں کرتے رہے۔ ان کی اطاعت اور فرماں برداری کی ترغیب دی اور موت کی باتیں کرنے لگے۔ پھر اٹھے نماز پڑھی، دعا مانگی، رخصت کرنے کے لیے مصافحہ کیا اور بولے: اب نہ تو مجھے دیکھے اور نہ میں تجھے دیکھوں گا۔ تم میرے لیے دعا کرنا، میں تمہارے لیے دعا کرتا رہوں گا۔ حزم بن حبان کچھ دیر اور ساتھ رہنا چاہتے تھے، مگر جبراً رخصت کر دیا۔

ابن حبان فرماتے ہیں کہ میں انھیں مڑ مڑ کر دیکھتا رہا، یہاں تک کہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

مقصودِ زندگی:

ربیع نامی ایک بزرگ کی نسبت تذکرۃ الاولیاء میں تحریر ہے کہ وہ خواجہ اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غائبانہ شیدا تھے۔ جستجو میں نکلے اور تلاش بسیار کے بعد بالآخر ان تک جا پہنچے۔ انھیں اس حال میں پایا کہ ویرانے میں فجر کی نماز ادا کر رہے ہیں۔ ربیع کچھ دور ہی انتظار میں ٹھہرے رہے کہ نماز ختم کر کے فرصت لیں تو قریب جا کر ملاقات کا شرف حاصل کروں۔ نماز سے فارغ ہوئے تو تسبیح میں مشغول ہو گئے۔ تسبیح اس وقت تک پڑھتے رہے، جب تک ظہر کی نماز کے لیے کھڑے نہ ہوئے۔ یوں ہی ظہر کے بعد بھی۔ حتیٰ کہ تین شبانہ روز متواتر نماز و تسبیح کرتے رہے۔ اس دوران نہ انھوں نے کچھ کھایا نہ ہی آرام کیا۔ چوتھی رات آئی تو چند ثانیہ کے لیے آنکھ لگ گئی، تھوڑی دیر بعد چونک کر بے دار ہو گئے اور رو رو کر یوں مناجات کرنے لگے:

یا اللہ! میں بہت سونے والی آنکھ اور بہت کھانے والے پیٹ سے پناہ مانگتا ہوں۔

جناب ربیع نے یہ کیفیت دیکھی تو اسی کو اپنے لیے بہت سمجھا اور انھیں تکلیف میں ڈالنے کے بجائے واپس لوٹ آئے۔

حجابِ معرفت:

ایک شخص تیس سال سے کفن پہن کر ایک قبر میں بیٹھا یادِ الٰہی میں مصروف تھا۔ شب و روز آہ و زاری، نالہ و شیون کے سوا کوئی کام نہیں، جسم سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا۔ آپ کو خبر ہوئی تو آپ اس کے پاس گئے اور کہا: اے شخص! قبر اور کفن کے ذریعہ تو خدا کا مقرب بندہ بنا ہے، لیکن یہی دونوں چیزیں تیرے لیے حجاب ہیں۔ اتنا سننے کے ساتھ ہی اسے جیسے ہوش آ گیا اور فوراً اس کے دل میں نورِ معرفت جگمگانے لگا۔

اندازہ لگائیے! جب قبر اور کفن حق تعالیٰ کی معرفت کے لیے حجاب بن سکتی ہیں تو خالص دنیا اور یہ لوازماتِ دنیا، بھلا یہ چیزیں کس قدر حائل ہوں گی۔

اللھم احفظنا من کل بلاء الدنیا وعذاب الآخرۃ۔

قناعت:

خواجہ اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک عابد کو نصیحت کی کہ اگر تیری عبادت اتنی ہو جائے کہ زمین و آسمان کی پہنائیاں بھر جائیں، پھر بھی اگر تیرا رب تعالیٰ پر یقین کامل نہیں ہو گا تو یہ ساری عبادات و ریاضات ناقابل قبول ہیں۔ فرمایا: یقین یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا غیر کی

رغبت کا شائبہ بھی دل میں نہ ہو۔ اور تجھے جو کچھ حاصل ہے اسی پر قناعت کر اور بس۔

اقوالِ زریں:

حضرت خواجہ قرنی کی پوری زندگی مسلمانوں کے لیے نمونۂ عبرت ہے۔ اور آپ کے فرمودات، سعادتِ دنیوی و نجاتِ اخروی کا توشہ ہیں۔ فرماتے ہیں:

طلبت الرفعة فوجدته فی التواضع وطلبت الریاسة فوجدته فی النصیحة وطلبت المروة فوجدته فی الصدق وطلبت الفخر فوجدته فی الفقر وطلبت النسب فوجدته فی التقوی وطلبت الشرف فوجدته فی القناعة وطلبت الراحة فوجدته فی الزهد۔

ترجمہ:۔ میں نے بلندی طلب کی تو اسے تواضع میں پایا۔ رفعت و ریاست طلب کی تو اسے نصیحت میں پایا۔ مروت طلب کی تو اسے سچائی میں پایا۔ فخر طلب کیا تو اسے فقر میں پایا۔ نسب طلب کیا تو اسے تقویٰ اور پرہیز گاری میں پایا۔ شرافت طلب کی تو اسے قناعت میں پایا۔ راحت طلب کی تو اسے زہد و عبادت میں پایا۔

☆ کسی نے آپ کی خیریت پوچھی تو فرمایا: وہ شخص کیسا ہوگا، جو صبح کو اٹھا اور اسے خبر نہیں کہ شام تک کیا ہوگا۔

☆ جب تک دنیا والے دشمن نہ ہو جائیں تقویٰ کا حصول نہیں ہوتا۔

☆ من عرف الله لا یخفی علیه شیء۔

ترجمہ:۔ جس نے خدا کو پہچان لیا اس پر کچھ پوشیدہ نہیں۔

اس لیے کہ نورِ معرفت عارف کے دل میں اس طرح رہتا ہے، جیسے آفتاب آسمان پر۔ تو جس طرح سورج نکلنے سے زمین کی سب چیزیں دکھائی دیتی ہیں، اسی طرح نورِ معرفت سے آسمان اور اور عرش تک کی سب اشیا عارف پر ہویدا ہو جاتی ہیں۔

☆ ایسے دلوں پر افسوس ہے، جو خود شک میں ملوث ہیں اور رزق نہ پہچانے کا الزام خدا پر لگاتے ہیں۔

☆ رات رکوع کے لیے ہے۔ اسی لیے میں رات کو سبحان ربی الاعلیٰ نہیں کہہ پاتا۔

☆ جو شخص تین باتوں کو پسند کرتا ہے، دوزخ اس کے قریب ہے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، مال داروں سے مصاحبت۔

☆ نماز کا خشوع یہ ہے کہ اگر نمازی کے پہلو میں تیر لگے تو اسے خبر نہ ہو۔

☆ رزق سے بے خبر رہو اور خود کو عبادتِ الٰہیہ کے لیے فارغ رکھو۔

☆ دلوں کی نگرانی رکھو کہ غیر اللہ کا اندیشہ جاگزیں نہ ہو جائے۔

☆ ایک کی طرف منہ کرو تو اس طرح کہ کسی دوسرے کی طرف منہ کرنے کی حاجت نہ ہو۔

سلسلۂ ارادت:

سلاسل صوفیا میں مستور الحاصل صوفیوں کا ایک گروہ ہے، جو اپنی نسبت خواجہ اویس قرنی کی طرف کرتا ہے اور خود کو طریقۂ اویسیہ کا پیرو بتاتا ہے۔

شیخ محقق علیہ الرحمہ نے سیر نامہ میں فرمایا ہے کہ حضرت شاہ عبد اللہ معشوق اللہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے طریقہ کی بنیاد کن چیزوں پر ہے ؟ فرمایا: سات چیزوں پر۔ اول: اطاعت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ دوم: خلوت وانجمن۔ سوم: خموشی در تکلم۔ چہارم: نظر بر قدم۔ پنجم: ہوش در دم۔ ششم: زہر نوشی۔ ہفتم: پردہ پوشی۔

اب ہم ان تمام کی مختصراً توضیح مناسب سمجھتے ہیں۔ ویسے تو ان اصطلاحاتِ تصوف کا حقیقی مقصد اسی راہ کے رہ نوردوں ہی کو معلوم، مگر ظاہری مراد کی طرف کچھ اشارے مرقوم ہیں۔

اطاعت رسول:

رحمت خداوندی کے حصول کا واحد وسیلہ اور واسطہ ہے، جس پر آیاتِ قرآنی شاہد عدل ہیں۔

''قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ''۔

ترجمہ:۔ اے نبی! آپ مسلمانوں سے فرما دیجیے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری اطاعت کرو خدا تمہیں محبوب بنا لے گا۔

''وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهُ''۔

ترجمہ:۔ اور جس نے رسول کی پیروی کی، اس نے اللہ کی فرماں برداری کی۔

''اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ''۔

ترجمہ:۔ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو صاحب امر ہو۔

حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

الشریعة اقوالی والطریقة افعالی والحقیقة احوالی۔

ترجمہ:۔ شریعت میری باتیں ہیں، طریقت میرے کام ہیں اور حقیقت میرا حال ہے۔

گویا آپ کے اقوال و افعال کی کما حقہ متابعت ہی شریعت اور طریقت ہے۔ قرآن وحدیث کی تصریحات کے مطابق رب تعالیٰ کی خوش نودی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت وپیروی پر موقوف ہے۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

خلوت در انجمن:

دنیا اور لوازماتِ دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی توجہ اور قلبی رجحان کو علائق دنیا سے بے نیاز کر کے صرف ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف راغب رکھنا، گویا دنیائے صد رنگ، آفات ومصائب کی انجمن میں رہتے ہوئے پیشانی دل اپنے قبلۂ اصلی سے منحرف نہ ہو۔

خموشی در تکلم:

زبان، فضول گوئی اور بلا وجہ باتوں سے مجتنب رہے اور دل کی زبان پر ذکر حبیب ہر لحظہ جاری و ساری ہو۔ دنیا کی باتیں صرف امر عارضی کے طور پر ہوں، جن سے اصلی تکلم یعنی قلب کا جریان متاثر نہ ہونے پائے۔

شاہ غلام علی ''نفحات'' میں لکھتے ہیں:

''اذا سکت اللسان عن فضول الکلام نطق القلب مع اللہ سبحانہ''۔

ترجمہ:۔ جب زبان فضول باتوں سے خاموش رہتی ہے تو دل ذکر خدا کا ذاکر ہوتا ہے۔

نظر بر قدم:

خدا کے سوا کسی کو چاہت کی نظر سے نہ دیکھنا یا راہِ طریقت میں قدم کو باطل سمت جانے سے محفوظ رکھنا، تاکہ راہِ مستقیم سے منحرف نہ ہو، یا شیخ کے قدم اور نشانِ قدم پر نگاہ رکھنا اور اس کی پیروی میں رہنا۔

ہوش در دم:

اپنے ایک ایک سانس کا محاسبہ کرنا، تاکہ کوئی سانس یادِ الٰہی سے غافل نہ گزرے۔ کیوں کہ غفلت ہی ضیاع کی بنیاد ہے۔ گویا: ؎

جو ترے ذکر تری یاد سے معمور نہ ہو
وہ مری صبح نہیں ہے، وہ میری شام نہیں ہے

زہر نوشی:

صبر و تحمل، شکیبائی و بُردباری، حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمہ نے فرمایا: صبر داروئے تلخ کی طرح ہے، جس کے فوائد بے شمار ہیں۔ ایک صبر وہ ہے، جو اطاعت کی ادائیگی کے سلسلہ میں پیش آمدہ دشواریوں پر کیا جائے۔ دوم فضولیاتِ دنیا پر۔ سوم مصائب پر۔ چہارم بلائوں پر، جو ان تمام بلائوں پر صابر ہوتا ہے، وہ آخرت کی نعمتوں اور برکتوں سے سرفراز ہوگا۔

پردہ پوشی:

کسی کے عیوب و نقائص پر نظر نہ رکھنا، یہ ہے کہ اگر کوئی چیز نظر آجائے تو چھپانے کی کوشش کرنا اور گنہگاروں کی نجات کے لیے کوشش کرنا۔

آپ نے جن چار شخصوں کو شرفِ بیعت بخشا وہ یہ ہیں:

(۱) خواجہ موسیٰ بن یزید راعی۔

(۲) خواجہ حسام الدین یمنی۔

(۳) خواجہ احمد خراسانی۔

(۴) خواجہ صدرالدین مفتی خراسانی۔

ان میں سے خواجہ احمد کو آپ نے اپنا عصا عطا فرمایا تھا۔

وفات:

آپ کی وفات کے بارے میں جو مختلف اقوال ہیں، اُن میں سے چند یہ ہیں:

ایک روایت یہ ہے کہ آپ نے آذربائیجان کا سفر کیا اور دورانِ سفر دست کا شکار ہوکر وفات پا گئے۔ اس وقت آپ کے پاس دو پُرانے کپڑے تھے، انھیں کا کفن دے کر دفن کیا گیا اور دفن کے بعد آپ کی قبر بھی پوشیدہ ہوگئی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ ۳۷ھ میں صفین میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محاربہ کے وقت نقارۂ جنگ کی آواز سن کر رونما ہوئے اور آپ ہی کی حمایت میں لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔ ؎

دل ہو کہ جان تجھ سے کیوں کر عزیز رکھے
دل ہے سو چیز تیری، جاں ہے سو مال تیرا

بارگاہِ مصطفی میں ہندوستان کا تحفہ اور ایک وفد

ہجرت کے بعد جب قرب و جوار کا ماحول رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مناسب ہونے لگا تو اسلام کی تبلیغ کے راستے کھلے اور سردارانِ عرب سے متجاوز ہوکر دین حنیف کی خوشبوئے روحانی اکنافِ عالم میں پھیل گئی، جس سے ہمارا ہندوستان بھی محروم نہ رہا۔ اگرچہ یہ اہم حقیقت عوامی نگاہ سے پوشیدہ ہے، مگر تاریخ و حدیث کے ذخائر میں غواصی کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی ضیاباریوں کے ابتدائی دور ہی میں یہ خطۂ ہند بھی پیغامِ رسالت سے آشنا ہوچکا تھا۔ چنانچہ مستدرک ج۴/ص۳۵/ پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

ہندوستان کے راجہ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں زنجبیل (سونٹھ) کا ایک گٹھر بھیجا، آپ نے صحابہ کو اس کا ایک ایک ٹکڑا کھلا دیا، ایک ٹکڑا مجھے بھی کھلایا اور خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی تناول فرمایا۔ سونٹھ چوں کہ خالص ہندوستانی چیز ہے، اس لیے یہاں کے راجہ مہاراجہ، امرا و سلاطین دوست ممالک کے رؤسا و حکام کی خدمت میں بطورِ تحفہ بھیجا کرتے تھے۔ غالبًا یہ پہلا تحفہ تھا، جو سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ہمارے ملک سے پہنچا۔

اسی طرح چوتھی صدی ہجری کا مشہور جہاز راں سیاح بزرگ دین شہریار ناخدا رامہر مخزمی نے اپنی کتاب میں جس جگہ یہاں کے ساحلی مقامات کے حالات درج کیے ہیں، اسی مقام پر ہندوستانی جوگیوں اور سنیاسیوں کی جانب سے بارگاہِ نبوی میں ایک وفد کی روانگی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

سراندیپ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ظہور کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے ایک آدمی کو مدینہ بھیجا اور حکم دیا کہ آپ کے پاس جاکر آپ کے حالات کی اور دینی دعوت کی تحقیق کرے۔ (عجائب الہند، ص۱۵۷)

سیاح نے آگے چل کر تفصیلات بیان کیا ہے کہ یہ نمائندہ بحری راستہ سے روانہ ہوا، مگر مکران کے پاس پہنچ کر اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ایک خادم بھی تھا، جسے بعد میں طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ خادم ایک مدت بعد مدینہ پہنچا، مگر اس وقت سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وصال ہوچکا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور بھی ختم ہوچکا تھا اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسند خلافت پر رونق افروز تھے۔ اس خادم نے وہاں کے حالات اور خلیفۃ المسلمین کی زندگی کا گہرا جائزہ لیا اور واپس آیا اور یہاں آکر خلیفۂ ثانی کی شانِ جلالت اور ان کے پیوند لگے کپڑوں کا حال بیان کیا اور آپ کی تواضع اور محبت کا بھی ذکر بڑے موثر انداز میں کیا، جس سے اہل سراندیپ نے بے حد اثر قبول کیا۔ سیاح نے آگے چل کر تبصرہ کیا ہے کہ اہل سراندیپ کی تواضع کا سبب وہی باتیں ہیں، جن کو اس خادم نے بیان کیا۔ (عجائب)

تاریخ و حدیث کے اس مختصر اقتباس کی اہمیت اور زیادہ بے نقاب ہوجائے گی، اگر ڈاکٹر اقبال کے اس شعر کو پیش نظر رکھا جائے۔ جس میں شاعر اپنے وطن کی ٹھنڈی ہوا کے ذکر کو جسے زبانِ رسالت نے فرمایا تھا، باعث صد افتخار تصور کرتے ہوئے بیان کرتا ہے: ؂

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

(المستدرک، ج ۴/ ص ۳۵، مطبوعہ حیدرآباد۔ عجائب الہند، ص ۱۵۷/ مطبوعہ لندن)

سیدنا عمر بن عبدالعزیز

مطلع بنو امیہ کا وہ تابناک اور درخشندہ ستارہ جسے دنیا عمر بن عبدالعزیز کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ۶۱ھ میں مدینہ منورہ کی وادی میں پیدا ہوئے۔ قدرت نے اسے امارت کی مسند پر بٹھا کر خلافت راشدہ کی تاریخ دہرانے کا فیصلہ کرلیا تھا، جن کی زندگی اسوۂ نبی کا پرتو جمال تھی، جس کا تیور جلات فاروقی کا آئینہ دار اور جس کا علم وسلم سیرتِ عثمانی کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ ۲۵/ رجب ۱۰۱ھ بروز چہار شنبہ جب وہ اس دارِ فانی سے عالم بقا کی طرف سدھارا تو ایک کائنات حزن و ملال کو اپنے پیچھے اشک فشاں چھوڑ گیا۔

جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھا اور زندگی کی آخری ہچکیاں لے رہا تھا تو رفیقۂ حیات بی بی فاطمہ یہ سوچ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں کہ دیر سے آرام نصیب نہیں ہوا ہے، اب شاید آنکھ لگ جائے۔ مبادا میرے رہنے سے آرام میں خلل ہو۔ دوسرے کمرے میں گئیں تو بار بار یہ آواز ان کے سماع سے ہم کنار ہوتی رہی:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ

(القصص:۸۳)

ترجمہ:۔ یہ عاقبت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لیے بنایا ہے، جو زمین میں نہ بلندی چاہتے ہیں نہ فساد اور عاقبت کی بھلائی صرف متقیوں کے لیے ہے۔

رفتہ رفتہ آواز مدھم ہوتی گئی اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ تیمار داری کے لیے جو خادم مقرر تھا، قریب پہنچا تو بے اختیار چیخ پڑا۔ مگر وہ سلسلہ جو روح کو جسم کے ساتھ تھا کب کا منقطع ہو چکا تھا۔ اور عالم لاہوت کا طائر جس کی شام و سحر فلاحِ امتِ محمدی کی تدبیروں میں بسر ہوا کرتی تھی، گلزارِ جنت کی رنگینیوں میں پہنچ چکا تھا۔

آپ کی وفات کے بعد لوگوں نے سنا کہ عبدالملک ابن عمیر اس نفس قدس کو یوں مخاطب کر رہے تھے کہ اے مسلمانوں کے امیر! تم پر خدا کی رحمتیں برستی رہیں۔ یقینا تو پاک دامن تھا۔ تو حق کے معاملے میں فیاض اور بخیلی کی صفت میں بخیل تھا۔ تیری خفگی غضب شرعی تھی۔ تو عیب جوئی و تہمت طرازی سے منزہ اور پاک تھا۔ بے شک تو غیبت سے کوسوں دور تھا۔ یہی نہیں کہ ان کے غم میں سوگوار صرف اسلامی معاشرہ یا مسلمانوں کا ماحول تھا۔ بلکہ مغرب میں افریقہ اور اندلس سے لے کر کابل، سندھ اور چین تک۔ ارم و قسطنطنیہ سے لے کر جزیرۂ قبرص تک۔ الغرض مغرب سے مشرق اور شمال سے جنوب تک کی آبادی خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم بلا تفریق مذہب وملت ہر ایک نے اس غم میں شرکت کی۔ روم کے عیسائی شہنشاہ کو محمد ابن معبد نے غمگین و پژمردہ دیکھ کر حال پوچھا تو وہ بولا کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ایک مرد صالح سے دنیا خالی ہوگئی۔ میرے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اگر اگر اس دور میں کوئی مردوں کو زندہ کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا تو وہ یقینا عمر ابن عبدالعزیز کی شخصیت تھی۔ مجھے اس تنگ حال راہب کی گوشہ نشینی پر تعجب نہیں، جس کی زندگی کا کوئی کار آمد وسیلہ ہی نہ ہو۔ لیکن قابل تعجب تو وہ شخص ہے، جس کے پائوں کے نیچے دولت و ثروت کا انبار بھی ہے اور لعل و جواہر کے ذخیرے بھی، مگر زر و مال کی تابانی اسے اپنی جانب متوجہ کرنے سے قاصر رہ گئی۔ اور وہ تخت شاہی پر بیٹھ کر بھی درویشانہ گدڑی سے بے نیاز نہ ہوا۔ دنیا اس کی نظروں کے سامنے بہ ہزار ناز و ادا رقص کرتی رہی، مگر وہ خشیت ایزدی کے نشے میں سرشار ہی رہا۔ عمر ابن عبدالعزیز کی موت ایک شہنشاہ کی موت نہ تھی، جس پر رعیت

آہ و نالہ کرتی۔ بلکہ ایک ایسے انسانِ عظیم کی وفات تھی، جس کا دامن اقدار انسانی کے موتیوں سے لبریز تھا۔ جس کی زندگی کے ہر ہر شعبے میں سنت رسول رچی بسی ہوئی تھی۔ اور جس نے عام معاشرے کو بھی اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

وہ تو ایک ایسا خدا ترس بندہ تھا، جو بستر پر استراحت کے لیے جاتا تو سننے والے درد بھری آواز میں قرآن کی یہ آیتیں سنتے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ ، اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤی اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا بَیَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ۔

(الاعراف:۵۴۔۹۷)

ترجمہ:۔ تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا الخ، کیا اہل قریہ اس سے بے خوف ہوگئے کہ ہمارا عذاب ان پر آئے اور وہ سوئے ہوئے ہوں۔

جو دن میں تو عوامی لباس پہن کر دنیا کے سامنے آجاتا تھا، مگر رات کو پھٹے ہوئے کمبل کے ٹکڑے اپنے جسم پر ڈال کر تنہائی میں اپنے پروردگار سے تضرع وابتہال کیا کرتا تھا۔ جب اس کے سامنے احوالِ قیامت کا ذکر ہوتا تو آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا دامن کو اس طرح بھگا جاتی، جیسے بارش کے موسم میں ابر نیساں زمین کو تر کر جاتا ہے۔ جس کا دل خوفِ خدا کا ٹھکانہ اور خشیت ایزدی کا آشیانہ تھا۔ واقعی زمانے سے ایک ایسی شخصیت نے منہ موڑا تھا، جس کی محفل میں مغنیوں اور مطربوں کی شہنائیوں کے بجائے فقہا و محدثین کی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ جو چنگ و رباب کی تانوں سے مانوس ہونے کے بجائے قال اللہ اور قال الرسول سے اپنے قلب کو گرمی عطا کیا کرتا تھا۔

تاریخ الخلفا میں ہے کہ دیگر امرا کے درباروں میں تو بزمِ طاؤس ورباب منعقد کی جاتی تھی، رنگ و سرور کا اہتمام ہوتا تھا۔ لیکن عمر ابن عبدالعزیز کے یہاں خدا ترس علمائے کرام جمع ہوکر موت اور قیامت کا ذکر کرتے تھے۔ اور لوگ کچھ اس طرح بلک بلک کر روتے تھے گویا محفل میں کسی عزیز کا جنازہ پڑا ہوا ہو۔

کیا اس میں بھی کوئی کلام ہے کہ اس محب رسول کا سینہ محبت رسول کا مدینہ تھا۔ اس نے ہر اس کانٹے کو جس کے بارے میں سنا کہ یہ اس جھاڑی کا ہے جو گزر گاہِ محبوب میں واقع ہے، اپنے دامن عقیدت و محبت میں جگہ دی۔ آثارِ نبوی کے جمع کرنے کے لیے جس نے اپنے خزانے کو بے دریغ خرچ کیا۔ اس درد مند ملت اسلامی ہمدردی کا کیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جس کی خلافت کے بعد میں حکام کو یہ حکم تھا کہ ڈاک وغیرہ میں استعمال ہونے والے گھوڑوں کے منہ میں لگائی جانے والی لگامیں وزنی اور تکلیف دِہ نہ ہوں۔

عامل مصر حبان کے پاس تحریر فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک ایک ہزار ہزار کے رطل کے وزنی سامان لادے جاتے ہیں۔ آئندہ کسی اونٹ پر بھی چھ سو رطل سے زیادہ وزن نہ لادا جائے۔ (بقول حافظ جلال الدین مصری)

عمر ابن عبدالعزیز پہلی صدی کا وہ رجل عظیم تھا، جس کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے کہ جب نظامِ تمدن درہم برہم ہوجائے گا اور اسلامی قدروں کی پامالی کا بھیانک طوفان اٹھے گا تو اس جنگل کی آگ کو بجھانے کے لیے، اس سیلابِ بلا کو روکنے کے لیے قدرت کسی مصلح کا انتخاب فرمائے گی، جو زمانے کے پراگندہ ماحول کو پاکیزہ معاشرہ میں تبدیل کردے گا، جسے مجدد کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔

اس حقیقت سے روگردانی نہیں کی جاسکتی کہ اس عظیم انسان نے مذہب وسیاست، اخلاق و تمدن ہر ایک پر احسانات کے وہ غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں، جو خود ہی دنیا تک اپنی تابندگی سے اقوامِ عالم کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

فنا کے بعد بھی باقی ہے شانِ رہبری تیری
خدا کی رحمتیں ہوں اے امیر کارواں تجھ پر

(سیرتِ عمر ابن عبدالعزیز، تاریخ الخلفاء، سیرتِ ابن عبدالحکیم)

عمر ابن عبدالعزیز کے تعمیری کارنامے:

قوموں کے عروج و زوال میں مہینے اور سال منٹوں اور سکنڈوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ کسی قوم کی تعمیر کا مطلب یہ ہے کہ اکثر افرادِ قوم کو مغضوبین کی راہ سے ہٹا کر صراطِ مستقیم کا سالک بنا دیا جائے۔ اگر غور کیا جائے تو یہی ایک کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے سلیمان ابن عبدالملک کے بعد خلافت کی باگ ڈور سنبھالی اور آناً فاناً پورے نظامِ حکومت کا ڈھانچہ بدل کر رکھ دیا۔ آپ کی خلافت صرف دو سال پانچ ماہ رہی۔ مگر اتنے ہی قلیل عرصہ میں ذہن و فکر کی اصلاح کا وہ اہم کارنامہ سرانجام پایا، جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس دور کے اہل شعور کا کا بیان ہے کہ عمر ابن عبدالعزیز نے قلوبِ انسانی کو خدا ترسی سے اس طرح آشنا کر دیا کہ ہم لوگ ولید کے دور میں جب اکٹھا ہوتے تو عمارتوں کی طرزِ تعمیر پر گفتگو کرتے، اس لیے کہ ولید اسی کا دلدادہ تھا۔ اور سلیمان چوں کہ انواع و اقسام کے کھانوں کا شائق تھا، اس لیے ہماری مجلسیں باورچی خانہ کے ذکر سے خالی نہ ہوتیں۔ مگر عمر ابن عبدالعزیز کے دور میں جہاں چند مسلمان جمع ہوتے تو طاعت و ریاضت، عبادات و نوافل و مستحبات ہی ذکر رہتا۔ سچ ہے: العوام علی دین ملو کہم۔

بنو امیہ کے دور میں مسلمانوں کا قلبی اور عملی رجحان منہاج نبوت کی حقیقی تابانیوں سے بہت کچھ عاری ہو رہا تھا۔ حکما میں نہ صدیق اکبر جیسا دینی شوق اور استحکام تھا، نہ فاروقِ اعظم جیسی سادگی اور تصلب نہ عثمانِ غنی جیسی بے نفسی و پاکبازی تھی، نہ علی مرتضیٰ جیسی کسرِ نفسی اور جلالت حق۔ لیکن چوں کہ جلالت و نبوت کی لمعانیوں کو ابھی ماضی قریب کے جھروکوں سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے تمام تر خستہ حالی کے باوجود سینوں میں تڑپ، دلوں میں گداز تو باقی ہی تھا۔ ؎

آشکارا ہے مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکارِ حیات

خداوند عالم نے انھیں عمر ابن عبدالعزیز جیسی شخصیت عطا کی تو معاشرے کا بھٹکتا ذہن پھر اپنے مرکز حقیقی کی جانب مبذول ہو گیا۔ آپ نے تخت خلافت پہ بیٹھتے ہی ان تمام خرابیوں کو فضلاتِ جسدی کی طرح خارج کر دیا، جن کی وجہ سے خلافتِ اسلامیہ اور دین و مذہب پر کچھ بھی عدمِ توازن کا شائبہ تھا۔ خدا ناترس اور ظالم حکام کو معزول کر کے متقی اور پرہیزگار، مخلص فی الدین حکام کا تقرر فرمایا۔ آپ نے اولاً ذاتی طور پر بموقع تخت نشینی ملنے والے نذرانوں اور زیب و زینت، تزک و احتشام کے تمام لوازم کو جو بنو امیہ کے دور میں رائج تھے، بیت المال میں داخل کر دیا۔ اپنی نشست گاہ کو جو قیصر و کسریٰ کے درباروں جیسا رنگ اختیار کر چکا تھا، سنت کے مطابق سادگی دے دی۔ خود لباس میں اتنی قلت کی کہ کرتا سوکھنے کے انتظار میں جمعہ مؤخر ہو جاتا۔

بنوامیہ کے امرانے جس خزانے کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اندھا دھند خرچ کرنے کا دستور بنالیا تھا، آپ اس بیت المال کے مشک کو سونگھنا بھی اپنے لیے روا نہ رکھتے تھے۔ یہ حزم واحتیاط اور ذمہ داری کا احساس صرف اپنی ذات ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ آپ نے مکمل نظامِ حیات کی روح ہی تبدیل کر کے رکھ دی۔ اگر غور کیا جائے تو ان تمام ترمیمات کا مبدأ ہمیں ایک جملہ کی شکل میں مل سکتا ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کی کتاب الخراج، ص:۵۷ر میں مذکور ہے:

محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا میں بھی ہادی بنا کر بھیجے گئے، تحصیل دار بنا کر نہیں۔ گویا آپ کی خلافت کا مقصد محاصل وخراج کر کے ان کے جائز مقامات پر خرچ ہی کرنا نہ تھا، بلکہ ملکی مصالح اور منافع سے بہت بلند ہو کر آپ نے ہدایت الی الدین اور ایمان واخلاق کی تعمیر کو اپنا مطمح عمل رکھا ہے۔ جس کے نتیجے میں ذمی، مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی کثیر تعداد دائرۂ اسلام میں داخل ہوئی۔ اور جب جزیہ کی رقم بہت کم ہوگئی تو بعض مشیروں نے اس کی جانب توجہ دلائی۔ اس پہ آپ نے بڑا درشن جواب دیا: یہ تو بعثت مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عین مقصد ہے۔ مجھے بڑی مسرت ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہوجائیں اور جزیہ کی رقم ختم ہوجانے پر ہم لوگ کھیتی کر کے اور ہل چلا کے اپنا اپنا پیٹ بھریں۔ (مناقب عمر ابن عبدالعزیز، ص ۶۴، طبع یورپ)

آپ نے مملکت میں ایسی ایسی اصلاحات کیں، جن کے اثرات دور رَس تھے۔ پوری حکومت کے لیے یکساں پیمانہ مقرر فرمایا۔ حکام بنی امیہ نے اپنی حکومت کا خاصا حصہ چراگاہ اور شکار گاہ وغیرہ کے نام پر گھیر لیا تھا۔ آپ نے وہ سب غریب عوام پہ تقسیم کر دیا۔ بیگار کو قانوناً منع کیا۔ سلطنت کے حاکموں اور عاملوں کے لیے تجارت کا دروازہ بند کر دیا۔ عہدے داروں کو تحفہ لینا ممنوع قرار دے دیا۔ جس سے رشوت ستانی کا دروازہ بند ہو گیا۔ حاکموں کو ہدایت دی کہ لوگوں کو خود تک پہنچنے کے مواقع دیں۔ حج کے موقع پر اعلان فرماتے کہ جو کسی ظالم کی اطلاع دے گا یا کوئی نیک مشورہ دے گا، اسے مناسب انعام دیا جائے گا۔ یہ آپ کی اخلاصی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ آپ کے دورِ صدائے اسلام ہندوستان جیسے کفرستان میں پہنچی۔ اور سات راجاؤں نے اسلام قبول کیا۔ (فتوح البلدان۔ ۱۲)

اس کے علاوہ بلادِ مغرب اور ماوراء النہر خراسان میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ اسی فقیر صفت خلیفہ کی انتھک جدوجہد اور متواتر کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ تھوڑے روز پہلے جو عوام پریشانی اور تکلیف کا شکار تھے، خوش حال ہو گئے۔

ایک قریبی کیفیت نگار لکھتا ہے کہ عمر ابن عبدالعزیز کے دور میں خوش حالی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ لوگ زکوٰۃ وغیرہ کی کثیر رقمیں لاتے تاکہ انھیں مستحقین میں تقسیم کر دیا جائے، تو حق دار کا ملنا مشکل ہو جاتا اور مجبوراً واپس کرنا پڑتا۔

الغرض مختصر وقت میں آپ نے اصلاح وتعمیر کے وہ کارہائے نمایاں کیے، جن کو دیکھ کر ''خلافۃ علی منہاج النبوۃ'' کی یاد تازہ ہوگئی۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میں نے دیکھا
پھر اس کے بعد ستاروں میں روشنی نہ رہی

غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

قادر مطلق کے کرم کا ابر نیساں جو گیلان کی پاک سرزمین سے ابھرا اور پوری دنیا پر قادریت کی نوری بارش برسا گیا۔ جو آفتابِ رسالت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے نقوشِ قدم پر رحمت عالم کے فیض سے غوث الاعظم ہوا۔ اور جس نے غوثیت کبریٰ کی وسیع چادر میں پوری دنیا کو سمیٹ لیا۔ بدعت و ضلالت کی تاریکی چھنٹی اور ایمان وایقان کا مہر تاباں جگمگایا اور سر تاج الاولیا، غوث الثقلین، قطب الدارین بن کر قیامت تک کے لیے ولایت و روحانیت کا منبع و مخزن بن گیا۔

ضیائے شمس غوثیت سے نگہِ دہر خیرہ ہے
کرے چار آنکھ، کس کی ہے یہ جرات غوث الاعظم سے
یہ بابُ الشیخ ہے، یہ بابِ عرفانِ الٰہی ہے
جہاں میں بٹتی ہے جنس کرامت غوث الاعظم سے

(بدر)

آپ کا لقب محی الدین، کنیت ابو محمد اور اسم گرامی عبدالقادر ہے۔ آپ کی ولادت ۴۷۰ھ بمطابق ۱۰۹۲ء کو ہوئی۔ آپ نجیب الطرفین سید ہیں۔ اپنے والد ماجد حضرت ابوصالح موسیٰ جنگی دوست کی جانب سے گیارہویں پشت میں سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔ اور اپنی والدہ ماجدہ بی بی ام الخیر سیدہ فاطمہ کی طرف سے چودھویں پشت میں حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مل کر آپ کا سلسلۂ نسب حسنی و حسینی انوار و برکات کا مجمع البحرین ہو جاتا ہے۔

والدہ ماجدہ مشہور عارف وقت حضرت عبد اللہ صومعی کی پارسا صاحبزادی تھیں، جنھوں نے رشتۂ ازدواج میں آنے سے قبل اپنے والد کے سوا کسی غیر مرد کا چہرہ تک نہیں دیکھا تھا۔ عبادت و ریاضت، تقویٰ اور پرہیزگاری میں یکتا اور عرفانِ ربانی کے حصول میں بے مثال تھیں۔ یوں ہی آپ کے والد ماجد بھی راہِ حق کے ایسے شناور اور احکامِ الٰہیہ کے ایسے پابند تھے کہ غلطی سے ایک سیب کھانے کے بعد اس کے مالک کا حق ادا کرنے کے لیے عمر کا ایک حصہ لگا دیا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے اس سخت امتحان سے کامیاب و کامران ہو کر نکلنے والا ہی تو برگزیدۂ خدا کہلاتا ہے۔

سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر ابھی پانچ سال کی تھی کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ ماجدہ نے سوت کات کر گھر کی کفالت کی۔ ابتدائی تعلیم گیلان ہی میں پائی، پانچ سال میں حفظ کر لیا، چودہ سال میں مقامی علما سے علومِ متداولہ مکمل کر لیے، مگر ہنوز تشنگی تھی۔ ۴۸۸ھ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ نے والدہ ماجدہ سے مزید حصولِ علم کے لیے بغداد کا سفر کرنے کی اجازت طلب کی۔ عارفہ ماں نے مامتا بھرے آنسوؤں کے ساتھ اپنے نونہال کو دعاؤں کا توشہ دے کر رخصت کیا اور یہ بھی فرما دیا کہ بیٹا! اس دنیا میں اب تو مجھ سے نہ مل سکے گا۔

اسی سفر کے دوران ڈاکوؤں نے آپ کے قافلہ پر حملہ کیا اور بالآخر آپ کے دست حق پرست پر تائب ہو کر احمد نامی ڈاکوؤں کے سردار اور اس کے چالیس ساتھیوں نے سرکار غوثیت مآب کی معصوم دعاؤں کے طفیل ولایت کے مقام تک رسائی حاصل کی۔

بغداد اس زمانے میں علوم وفنون کا مرکزِ اعظم تھا۔ دنیا بھر کے ماہرین علوم اور عرفائے روزگار بغداد عروس البلاد کو اپنے جواہر علم سے مزین کر رہے تھے۔ آپ نے بغداد پہنچ کر حضرت ابو سعید مخزومی حنبلی سے علم فقہ، حضرت ابوالنالب وغیرہ سے علم حدیث اور ابوزکریا تبریزی سے علم ادب کی تکمیل فرمائی۔ آپ کے شیخ و مرشد ابو سعید مخزومی نے آپ کی پیشانی مبارک میں معرفت و سعادت کا آفتاب چمکتے دیکھ لیا تھا، اس لیے دل سے پیار کرتے تھے اور کلی اعتقاد فرماتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے ۳۳؍ سال تک کارِ تدریس انجام دیا اور دنیا بھر سے آنے والے تشنگانِ علوم اسلامیہ کو سیراب کیا۔ آپ کی عمر کا ایک حصہ عراق کے خرابات اور ویرانوں میں یادِ حق کرتے اور مجاہدات فرماتے ہوئے گزرا۔ ان دنوں آپ بھوک پیاس اور انسانی روابط سے بالکل بے نیاز تھے۔ آپ نے محض خداوند تعالیٰ کو خوش کرنے اور اس کی رضا مندی پانے کے لیے ما سوا اللہ کو خیرباد کر رکھا تھا۔ اس عالم میں آپ کو خدائے تعالیٰ ہی کھلاتا تھا تو کھاتے تھے اور وہی پلاتا تھا تو پیتے تھے۔ خود فرماتے ہیں:

”عراق کے جنگلوں اور ویرانوں کی ۲۵؍ سال تک میں اس طرح خاک چھانتا رہا کہ نہ میں کسی کو جانتا تھا نہ کوئی مجھے جانتا تھا، چالیس سال تک نمازِ فجر عشا کے وضو ادا کرتا رہا اور پندرہ سال تک ایک شب میں نماز کے اندر پورا قرآن مجید پڑھ کر مکمل کرتا رہا“۔

جذب و مستی کے اس امتحانی دور کے بعد آپ پر ایسا دور بھی آیا، جس میں آپ نے احیائے دین کے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے آپ نہایت خوش خلق، مہربان، شفیق، بردبار اور حسن اخلاق کا پیکر تھے۔ آپ کا مہمان خانہ نہایت وسیع و عریض تھا، جہاں دور دراز سے حاجت مندوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اور آپ اپنے مہمانوں کے ساتھ نہایت عزت سے پیش آتے۔ خلق خدا پر شفقت کا برتاؤ کرتے۔ آپ نے تمام عمر اپنی ذات کے لیے کسی پر کبھی غصہ نہیں کیا۔ البتہ دین و شرع کے خلاف ایک بات بھی آپ دیکھ کر خاموش نہیں رہتے تھے۔ اس زمانے کے علما، صلحا، ماہرین فنون کی طرح بادشاہ اور امرا بھی آپ سے بے پناہ عقیدت و محبت رکھتے تھے اور آپ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ مگر آپ کبھی امرا اور سلاطین کے پاس نہیں جاتے تھے اور نہ ہی ان کا کوئی ہدیہ قبول کرتے تھے۔ وقت کے حاکموں کو ان کی کسی کوتاہی پر کبھی معاف نہیں کرتے تھے، بلکہ برملا ٹوک دیتے اور نصیحت فرماتے تھے۔

”ایک بار خلیفۃ المستنجد باللہ نے اشرفیوں کی تھیلی آپ کو نذر کی، آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے بہت اصرار کیا تو ایک توڑ اپنے ہاتھ میں رکھ کر مسلا تو اس میں سے خون نکل پڑا، آپ نے خَلیفہ کو پُر جلال نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا: لوگوں کا خون چوستے ہوئے تمہیں خدا سے شرم نہیں آتی۔ یہی خود کھاتے ہو اور جمع کرکے میرے پاس بھی لاتے ہو۔ یہ حالت دیکھ کر خَلیفہ پر لرزہ طاری ہو گیا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور وہ غش کھا کر گر پڑا“۔

آپ کی مجالس نہایت پُرسکون اور بارعب ہوتی تھی، تمام لوگ اس طرح دُم سادھے ہوئے باادب بیٹھتے گویا ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوں۔ جیسے سرکار سید الاولین والآخرین حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی موجودگی میں صحابہ کی مجالس کا حال کتب احادیث میں وارد ہے۔

اپنے زمانے کے بڑے بڑے اُمرا اور بادشاہوں کو بھی آپ کی مجلس میں مجالِ دم زدن نہیں تھی۔ ایک طرف جلال و جبروت کی یہ کیفیت۔ دوسری جانب الطافِ خسروانہ اور جود و نوال کا یہ اندازِ مساویانہ کہ ہر دکھ درد کا مارا آپ کی بزم میں پہنچ کر سکون و طمانیت پا لیتا۔ دل کا چین اور

روح کی سیرابی حاصل کرلیتا۔ کوئی بھی غمزدہ رنج والم کا مارا ایسا نہیں ہوتا، جو بخشش وعطا کے قادری ابر کرم سے پیاسا واپس جائے۔ ہر شخص ایسا محسوس کرتا گویا سب سے زیادہ نگاہِ لطف وکرم مجھ پر ہی ہے۔

سطحِ عالم پر ایک سے ایک شعلہ بیان مقرر اور فصیح اللسان خطیب گزرے ہیں۔ ان میں سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ۵۲۱ھ میں آپ نے پہلا خطبہ دیا۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم عالی کے مطابق اور سیدنا مولائے کائنات علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے حسب ایما آپ کے خطبات شروع ہوئے تو مذہبی تاریخ خطابت میں ایک نیا باب کھول گئے۔ آپ کی زبانِ غوثیت سے ادا ہونے والے معمولی جملے بھی قلوب میں ترازو ہونے والے نشتر ثابت ہوتے۔ بزمِ خطابت سے ہاؤ ہو کے نعرہائے مستانہ برآمد ہوتے۔ آپ کے خطبات کا شہرہ جب اور بڑھا تو آپ نے شہر بغداد کے باہر عید گاہ کا میدان اپنے لیے خطبہ گاہ کے طور پر منتخب فرمایا، جہاں کبھی کبھی ستر ہزار انسانی سامعین جمع ہوتے، رجال الغیب اور اجنہ کی تعداد ان کے ماسوا، خدا ہی جانے کتنی ہوتی ہوگی۔

آپ نے خود فرمایا ہے کہ:

”ستر ہزار افراد میری مجلس وعظ میں شریک ہوا کرتے تھے“۔

حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ آپ کی مجالس تقریر کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کلام میں وہ تاثیر تھی کہ آیاتِ وعید کی تفسیر فرماتے تو تمام سننے والے لرز جاتے، چہرے فق پڑ جاتے، گریہ وزاری سے اہل محفل پر بے ہوشی طاری ہوجاتی اور جب رحمت الٰہی کی توجیہ وتشریح کرتے تو لوگوں کے دل غنچوں کی طرح کھل جاتے، حاضرین کی یہ کیفیت ہوتی کہ گویا بادۂ شوق وذوق سے سرمست ہورہے ہیں۔ کتنے مجلس ہی میں جانِ جاں آفریں کو سپرد کر دیتے، ان کے جنازے اٹھائے جاتے تھے“۔

چار سو مستند علما اور متدین اربابِ قلم آپ کے خطبات کو قلم بند کرنے کے لیے مجلس میں موجود رہتے تھے۔

شیخ عمر کیسانی علیہ الرحمہ کہتے ہیں:

”کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی جب یہود ونصاریٰ اسلام نہ قبول کرتے ہوں اور مسلمان اپنے عیبوں سے اور برائیوں سے توبہ نہ کرتے ہوں“۔

جناب شیخ مؤفق الدین ابن قدامہ کا قول ہے:

”میں نے کسی کو آپ سے زیادہ دین کے باعث تعظیم پاتے نہیں دیکھا۔ بادشاہ، امرا اور اربابِ دولت آپ کی بزم میں باادب حاضری دیا کرتے“۔

آپ نے اپنے وعظ میں ہر اس طبقہ کی اصلاح پر زور دیا، جسے غلط روی میں مبتلا پایا۔ بادشاہ، سلاطین، امرا، اہل ثروت، غربا، مساکین، درباری علما، جاہل صوفیا اور عامۃ الناس کے بے راہ رو طبقے، آپ نے اپنے موعظت کے ابر رحمت سے سب کو طاہر وطیب بنانے کی کوشش فرمائی ہے۔ ایک خطبہ میں دنیادار علما، بے علم صوفیا سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”رمضان کے مہینے میں تم اپنے نفسوں کو پانی سے دور رکھتے ہو اور جب افطار کا وقت آتا ہے تو مسلمانوں کے خون سے افطار کرتے ہو اور ان پر ظلم کرکے جو مال سمیٹا ہے، اسے کھاتے ہو“۔

دیکھو! ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے دست مبارک سے سائل کو دیا کرتے تھے، اپنی اونٹنی کو چارہ ڈالتے، اس کا دودھ دوہتے، اپنا کرتا سی لیا کرتے۔ تم ان کی متابعت کا دعویٰ کیسے کرتے ہو کہ قول و فعل میں ان کی مخالفت کرتے رہتے ہو۔

اے مولویو! اے فقیہو! اے زاہدو! اے عابدو! اے صوفیو! تم میں کوئی ایسا نہیں جسے توبہ کی ضرورت نہ ہو۔ ہمارے پاس تمہاری موت وحیات کی ساری خبریں ہیں۔ سچی محبت جس میں کبھی تبدیلی نہیں آسکتی، محض رب تعالیٰ کی محبت ہے۔

اے دعویٰ کرنے والو! اے کاذبو! میں تمہاری ہوس کا قائل نہیں۔ اہل دل کی صحبت اختیار کرو، تاکہ تم کو بھی کیف دل میسر آئے۔ لیکن تمہارے پاس تو دل ہے ہی نہیں، تم تو سراپا نفس، طمع، ہوا و ہوس ہو۔

اے عالمو! اور زاہدو! بادشاہوں اور حکمرانوں کے لیے تم کب تک منافقت میں مبتلا رہو گے، تاکہ ان سے مال و دولت اور شہوات و لذات حاصل کرتے رہو۔ تم اور اکثر اس زمانہ کے بادشاہ اللہ کے مال اور بندوں کے حقوق کے معاملے میں ظالم ہیں۔ اور خیانت کرنے والے۔

یا الٰہی! منافقوں کی شوکت توڑ دے اور ان کو ذلیل کر، یا ان کو توبہ کی توفیق دے اور ظالموں کا خاتمہ فرما۔ روئے زمین کو ان سے پاک کر، یا ان کی اصلاح فرما۔

اعلائے کلمۃ الحق میں آپ کبھی کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ سلاطین اور بادشاہوں کو بھی برملا ڈانٹ دیا کرتے تھے۔ خَلیفہ نے ایک بار یحییٰ بن سعید کو شہر کا قاضی مقرر کر دیا، جو نہایت ظالم تھا۔ لوگوں نے سیدنا غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شکایت کی۔ خَلیفہ مقتضی لامر اللہ آپ کی مجلس وعظ میں شریک تھا، آپ نے اس کو اس کام پر ملامت کی اور فرمایا:

"تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے کو حاکم مقرر کیا ہے، جو اظلم الظالمین ہے۔ کل روزِ قیامت ارحم الراحمین پروردگار کو کیا منہ دکھاؤ گے"۔

خَلیفہ کانپ اٹھا اور اس قاضی کو برطرف کر کے دوسرے شخص کو اس کی جگہ عہدۂ قضا پر بٹھایا۔

علومِ ظاہری و باطنی میں درجۂ کمال حاصل ہونے کے باعث اس دور کے اعاظم فن آپ کے سامنے طفل مکتب بن کر آیا کرتے تھے۔

آپ نے دورانِ وعظ ایک روز احکامِ الٰہیہ کے متابعت میں ارشاد فرمایا:

"میرا قدم ہر ولی کی گردن پر ہے"۔

آپ کا یہ ارشاد اس دور کے روئے زمین کے تمام مقتدر اولیاء اللہ نے سنا اور اطاعت میں اپنے سروں کو جھکا دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں تین سو تیرہ اولیائے کبار نے آپ کے اس اعلان پر لبیک کہا۔ خراسان کے جنگل میں سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی سنجری نے جواباً عرض کیا:

"نہیں اے آقا! آپ کا قدم ہماری گردن پر نہیں، بلکہ سر اور آنکھوں پر ہے"۔

شیخ علی بن ابی نصر الہیئتی اس ارشاد کے وقت مجلس میں موجود تھے، اٹھے اور آپ کے منبر پر پہنچ کر آپ کا قدم اپنی گردن پر رکھ لیا اور آپ کے دامن کے نیچے آگئے۔ ان کی اقتدا میں تمام حاضرین نے اپنی گردنیں خم کر دیں۔

مراسب سے بڑا اعزاز ان کے در کی نسبت ہے

آپ کے سوانحی ذخیروں کے تتبع سے پتہ چلتا ہے کہ پچاس سال کی عمر کے بعد، مجاہدات و ریاضات کے پُر مشقت ایام سے فراغت پاکر آپ نے عائلی زندگی پر توجہ فرمائی اور مختلف اوقات میں چار نکاح کیے۔ جن سے آپ کے گھر بیس لڑکے اور انتیس لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ پاک باز بیبیاں اور سبھی اولادیں انوار و معرفت کے کان سے برآمد شدہ جگمگاتے ہیرے تھے، جن سے دنیا بھر میں ''فیضانِ قادریت'' کی جلوہ باری ہوئی۔

آپ کے ایک صاحبزادے شیخ عبدالجبار اپنی والدہ ماجدہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''میری والدہ جب کسی تاریک مکان میں قدم رکھتیں تو شمع کی طرح روشنی پیدا ہوجاتی''۔

فرزندانِ قادری کی ان چاروں ماٶں کے نام یہ ہیں:

(۱)سیدہ مدینہ (۲)سیدہ صادقہ (۳)سیدہ مومنہ (۴)سیدہ محبوبہ۔

آپ کے فرزندانِ باوقار میں سے چند مشہور صاحبزادگان کے نام یہ ہیں:

(۱)شیخ سیف الدین عبدالوہاب (۲)شیخ تاج الدین عبدالرزاق

(۳)شیخ شرف الدین عیسیٰ (۴)شیخ ابواسحاق ابراہیم

(۵)شیخ ابوبکر عبدالعزیز (۶)شیخ ابوزکریا یحییٰ

(۷)شیخ عبدالجبار (۸)شیخ ابونصر موسیٰ

(۹)شیخ ابوالفضل محمد (۱۰)شیخ عبداللہ

اول الذکر سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ آپ کے بیٹوں کی طرح پوتوں اور نواسوں میں بھی علم و معرفت اور زہد وورع کے آفتاب و ماہتاب ہوئے ہیں۔

حضرت سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یادگاران کی پُرنور نسل کے ساتھ ساتھ آپ کی تصنیفات بھی ہیں، جن میں غنیۃ الطالبین، فتوح الغیب، خطبات کا مجموعہ فتح ربانی، مکتوبات قطب صمدانی، المواہب الرحمانیہ، بشائر الخیرات، الفیوضات الربانیہ، مجموعہ قصائد، قصیدۂ غوثیہ، چہل کاف، جلاء الخاطر فی الباطن والظاہر، الیواقیت والحکم، درود کبریت احمر وغیرہ ہیں۔

سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال جمادی الاخریٰ ۵۶۰ھ/ ۱۱۶۴ء بغداد شریف میں ہوا۔ باب الشیخ آج بھی ساری دنیا کے عارفین و عاشقین کا قبلۂ نگاہ ہے۔ جہاں ولایت و سیادت، تقویٰ و پارسائی کا شہنشاہ زیر زمین مسند آرائے سریر غوثیت عظمیٰ ہے(قدست اسرارہم)

آپ کے فرمودات یوں تو سبھی موتیوں سے تولنے کے قابل ہیں، مگر یہاں ہم ان میں سے انتخاب کر کے چند انمول نگینے نذر قارئین کرتے ہیں:

☆...جس طرح تیرا نفس احکامِ الٰہیہ سے منکر ہے، اسی طرح تو نفس کا منکر بن۔

☆... مومن جس قدر بوڑھا ہوتا ہے، اس کا ایمان مضبوط ہوتا ہے۔

☆... کوئی عالم اگر زاہد نہیں ہے تو اپنے زمانے کے لوگوں پر عذاب ہے۔

☆... جو اپنے نفس کا معلم نہیں ہو سکتا، کسی دوسرے کو وہ کچھ کیا سکھا سکتا ہے۔

☆... خالق کے ساتھ ادب کا دعویٰ غلط ہے، جب تک تو مخلوق کے ساتھ باادب نہ ثابت ہو جائے۔

☆... زندگی کا دروازہ جب تک کھلا ہے غنیمت جانو، نہ جانے کب بند ہو جائے۔ اور نیکی کے کاموں پر جب تک قدرت ہے غنیمت جانو، معلوم نہیں کب چھن جائے۔

☆... کسی کی دشمنی اور کینہ کے ساتھ خبردار! تیری ایک رات بھی نہیں گزرنی چاہیے۔

☆... ہنسنے والوں کے ساتھ ہنسنا ضروری نہیں، مگر رونے والوں کے ساتھ رویا ضرور کرو۔

☆... خدا کی اہم مخلوق تین ہیں: فرشتہ، شیطان اور انسان۔ فرشتہ تو خیر ہی خیر ہے۔ اور شیطان شر ہی شر۔ انسان میں خیر کی بھی صلاحیت ہے، شر کی بھی، جس انسان پر خیر غالب ہو فرشتوں سے مل جاتا ہے، اور جس پر شر غالب ہو شیطانوں سے۔

☆... مومن اپنے اہل و عیال کو خدا کے بھروسے چھوڑتا ہے۔ اور منافق مال و دولت کے بھروسے پر۔

☆... اپنی مصیبتیں لوگوں سے چھپاؤ، قربِ حق نصیب ہوگا۔

☆... بلند آواز سے اگر تو اللہ تعالیٰ کا نام بھی لیتا ہے تو اس کی بھی باز پُرس ہوگی کہ اخلاص سے لیا ہے یا ریا سے۔

☆... بہترین کام لوگوں کو دینا ہے، نہ کہ لوگوں سے لینا۔

☆... خدا کا سچا طالب تو نہیں ہو سکتا، جب تک تو اپنی خوراک میں اپنے پڑوسی کو خود کو ترجیح نہیں دیتا۔

☆... میانہ روی نصف روزی ہے۔ اور حسن اخلاق نصف دین۔

☆... مخلوق کی طرف منہ کرنا بعینہٖ رب تعالیٰ کی طرف پشت کرنا ہے۔

☆... تیرا عمل تیرے عقائد کی دلیل ہے۔ اور تیرا ظاہر تیرے باطن کا آئینہ۔

☆... اپنی دولت کو شریک خدا نہ سمجھو کہ اس پر بھروسہ کر بیٹھو۔

☆... اے آدم کی اولاد! خدا سے اتنی تو شرم کر جتنی شرم اپنے کسی دین دار پڑوسی سے کرتا ہے۔

☆... جب فرشتے تصویر والے گھر میں نہیں داخل ہوتے تو رب تعالیٰ تیرے اس دل میں کیوں کر داخل ہو، جس میں خواہشات کے سیکڑوں بت ہیں۔

☆... جہاں تک ہو سکے لقمہ کی اصلاح کر کہ عمل صالح کی بنیاد یہی ہے۔

☆... موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کی دوا ہے۔

☆... تکبر کرنے سے لوگ تجھے بڑا نہیں سمجھیں گے، بلکہ تو بڑا "تواضع" سے ہوگا۔

☆... رحمت کو لے کر کیا کرے گا، رحم کو لے۔ کہ ہر متقی شخص آلِ محمد ہے۔

☆... تجھ جیسے ہزاروں کو دنیا نے موٹا تازہ کیا اور پھر اسے نگل گئی۔

☆... تو نفس کی تمنا پوری کرنے میں مصروف ہے اور وہ تجھے برباد کرنے میں مصروف ہے۔

☆... بے ادب خالق اور مخلوق دونوں کا مغضوب و معتوب ہوتا ہے۔

☆... بدگمانی تمام فائدوں کے راستے بند کر دیتی ہے۔

سرکار بغداد

عقیدت و محبت کے گلہائے صد رنگ نچھاور اس تاجدار بغداد پر، جس نے اپنی یکہ و تنہا شخصیت سے شرق و غرب کو مسخر کر لیا۔ جو اکیلا ہزار ہا کشف و کرامت کے ساتھ علوم و فنون، مجاہدات و ریاضات، عبادات و نوافل، بادیہ نشینی و جہاں گردی، خلق و کرم، عفت و عفاف، انکسار و تواضع، ایثار و اخلاص، فقر و فاقہ، درس و تدریس، وعظ و تلقین، قیادت و رہنمائی، شفقت و مروت، طاعت و بندگی، ذکر و شغل، مراقبہ و مجاہدہ جیسی مستحسن خصوصیات کا حامل تھا۔ ظاہر و باطن کا وہ نیر تاباں سید غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۲۹ر شعبان ا۷۴ھ کو اس خاک دانِ عالم میں تشریف لایا۔ اور اولیائے عالم کی قیادت و امامت کے منصب پر متمکّن ہو گیا۔

سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات طیبہ کو مجملاً یوں سمیٹا جا سکتا ہے:

۴۸۸ھ ۱۸ر سال کی عمر میں اپنے وطن گیلان سے حصولِ علم کے لیے بغداد کا سفر کیا اور تمام علوم اسلامیہ استادانِ فن اور ماہرین سے حاصل کیے۔ ابوالوفا ابن عقیل، محمد ابن الحسن باقلانی اور ابوزکریا تبریزی آپ کے اساتذہ میں ہیں۔ طریقت و سلوک کی تعلیم شیخ ابوالخیر حماد ابن مسلم الدباس سے حاصل کی اور قاضی ابوسعید مخرمی سے اجازتِ بیعت حاصل کی۔ عرصۂ دراز تک بیابانوں، ویرانوں میں یادِ حق میں مست و سرشار رہے۔ ارشاد و تبلیغ کی جانب متوجہ ہوئے تو پورا بغداد آپ کی تقریر کا فریفتہ و شیدا بن گیا۔ اور رفتہ رفتہ سارے عالم اسلام میں آپ کے مواعظِ حسنہ کا شہرہ ہو گیا۔ ؎

آں ترک عجم چوں زمئے حسن و طرب کرد
بر پشت سمند آمدہ صید عرب کرد
چو کاکل ترکانہ بر انداخت بمستی
غارت گری کوفہ و بغداد حلب کرد

چالیس سال تک تبلیغ و ارشاد اور وعظ و تذکیر کا سلسلہ جاری رہا۔ وسعت علم کا یہ عالم کہ ابن جوزی جیسے علامہ کو ان کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا، نہیں بلکہ تمام علمائے وقت نے آپ کی علمی عظمت کا لوہا مانا اور اکتسابِ علم کے لیے دامن پھیلایا۔ ؎

جنس علم و فیض در بازار و انبارہا
عالماں و فاضلاں حاضر بجاں چوں مشتری

درس و تدریس اور فتاویٰ کا سلسلہ بھی پوری شوکت کے ساتھ قائم رہا اور تشنگانِ علوم نے خوب خوب سیری حاصل کی اور دنیا کے ہر حصہ میں آپ سے عقیدت و شیفتگی رکھنے والوں میں ہر ایک کسی نہ کسی طرح آپ کے خوانِ کرم کا ریزہ چیں اور بارگاہِ غوثیت کا فیض یافتہ ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ آج کی متمدن دنیا ہزار پروپیگنڈے اور اشتہار کے باوجود اپنے کسی مشن کو اتنا فروغ نہ دے سکی اور کسی تحریک سے انسانوں کو اتنی والہانہ محبت اور تعلق پیدا نہ کرا سکی، جو سیدنا غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عقیدت مندوں میں پائی جاتی ہے۔

شہر بغداد کی تاریخ میں ربیع الثانی ۵۶۱ھ کا وہ دن یومِ الم تھا، جب آپ نے دنیا سے پردہ فرمایا۔ روحانیت کے اس نیر تاباں کو غروب ہوئے عرصہ گزرا، مگر دنیا آج تک غوث الثقلین، قطب الکونین، سیدالاوتاد، قطب الافراد، صاحب الارشاد، سلطان الہند، محبوبِ سبحانی، مقبولِ یزدانی کے القاب سے یاد کرتی ہے۔ اور لاکھوں قلوب میں اب بھی ان کی عقیدت کے دیپ روشن ہیں۔ ؎

بعد وفات تربت ما در زمیں مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

کرشمۂ نگاہ تذکرۂ بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ

بصرہ، صرف آج ہی نہیں عروجِ اسلام کے زمانہ ہی سے ایک معروف شہر ہے۔ اور اس شہر کے محدثین و فقہا اور عارفوں نے اس کی شہرت کو اور چار چاند لگائے۔ مشہورِ زمانہ تابعی حضرت حسن بصری سے تو زمانہ واقف ہے۔ علومِ ظاہر کے علاوہ عرفان و حقیقت کے آفتاب تھے۔ دور دور سے طالبانِ علوم آپ کی درس گاہ میں زانوئے تلمذتہہ کرنے آتے۔ بصرہ کا تو بچہ بچہ حسن بصری کی عظمت کا معترف تھا۔ حدیث و فقہ میں مسلم زہد و تقویٰ میں یکتا، شریعت و حقیقت کے مرکز کا دوسرا نام تھا ''امام حسن بصری''۔

شراب خانے میں میخواروں کا مجمع یک بیک سٹپٹا گیا۔ حسن بصری، حسن بصری۔ ارے بھئی کیا بات ہے؟ سب ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ دوسرے لمحہ شیخ حسن بصری شراب خانے کے اندر پہنچ چکے تھے۔ سب ایک دوسرے کے پیچھے منہ چھپانے کی کوشش میں سرگرداں تھے اور ساتھ ہی ساتھ متعجّب بھی کہ آخر کیا ماجرا ہے؟ آج شیخ وقت مے خانے میں آن پڑے۔ تھوڑی دیر کے لیے رند و ساقی سب کے سب حیران و ششدر رہ گئے۔ یہ قال اللہ و قال الرسول کی بزم کا امام، الا اللہ، حق ہؤ کی محفل کا تاجدار۔ ہم خراباتیوں میں کیسے آن پڑا۔ ہو نہ ہو کوئی عظیم معاملہ ہے۔

آپ نے اندر پہنچ کر پہلے ہر طرف طائرانہ نظر دوڑائی اور کچھ نہ سمجھ کر سوال کیا: بشر حافی کہاں ہیں؟ سب نے لپک کر ایک بدمست کی طرف اشارہ کیا۔ بشر حافی شراب کے نشہ میں چور چاروں خانے چت پڑے تھے، ہوش و حواس مختل، قوتِ فکر و تدبر ندارد۔ آپ نے بڑھ کر سہارا دیا اور بشر حافی نے آنکھیں کھولیں اور امام کے سہارے ام الخبائث کے بطن سے باہر آگئے۔ ہوش میں آنے کے بعد آپ متحیرانہ انداز میں ادھر نگاہیں دوڑانے لگے تو حسن بصری کا دربار عالموں، فقیہوں اور محدثوں کی بارگاہ، صوفیوں اور عارفوں کی بزم اور میں نابکار۔ یا خدا! میری بدمستی نے مجھے کہاں تک لاکر رسوا کر دیا۔

لوگوں نے پوچھا: بشر! آخر تم نے وہ کون سا نیک کام کیا کہ امام المسلمین تمہیں شراب خانے سے لینے آگئے۔ بشر نے بلک کر کہا: اے پاک باطنو! میں سدا کا بدعمل، جس کی پوری زندگی نذرِ خرابات ہوگئی، دنیا میں کوئی نیک کام ہو نہ سکا جسے میں قابل قدر سمجھوں، مگر ہاں کل ایک عجیب واقعہ ہوا، جب میں شراب خانے کا رُخ کر رہا تھا، کاغذ کا ایک ٹکڑا راہ میں پڑا ہوا ملا، جس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا تھا، میری نگاہ جو پڑی تو میں نے اٹھا لیا۔ ایمانی غیرت نے للکارا، عقیدت سے آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا، گھر لاکر عطر میں بسایا اور اپنی کلاہ میں سی لیا۔ اس وقت میرے کانوں میں غیب سے آواز آئی:

''یا بشر حافی رفعت اسمی فرفعناك وطيبت اسمی فطيبناك''۔

ترجمہ:۔ اے بشر حافی تو نے میرے نام کی تکریم کی تو میں نے تجھے مکرم کر دیا اور تو نے میرے نام کو پاکیزہ کیا تو میں نے تجھے پاکیزہ کر دیا۔

تاریخ تصوف شاہد ہے کہ اس مشہورِ زمانہ شرابی کو رحمت کبریا نے اس طرح پاک کیا کہ سیکڑوں اور ہزاروں مشائخ و صوفیا کا امام و مقتدا بنا دیا۔

سچ ہے: ''رحمت حق بہانہ می جوید''۔

فیلسوفِ اسلام

آوازۂ حق!۔۔۔۔ ایک ایسی شمع، جسے ہر دور میں ہوا کے مختلف جھونکوں سے ٹکرانا پڑا، مگر اس کی لَو میں ارتعاش تک نہ آیا۔ ایک ایسی کشتی، جسے ہر زمانہ میں طوفان کے تند و تیز دھاروں سے دو چار ہونا پڑا، مگر وہ نہایت سکون سے سوئے منزل رواں دواں رہی۔ ایک ایسا پھول، جسے ہر موسم میں گل چیں کی حریص نگاہوں سے تاکا، مگر وہ اس کی دست برد سے آزاد رہا۔ ایک ایسا آفتاب، جسے ابتدائے آفرینش سے کفر والحاد اور شرک و لادینیت کی دبیز بدلیوں سے ڈھانپ لینے کی کوشش کی، مگر وہ الحاد کی دھجیاں بکھیر کر ہر زمانے میں بے نقاب ہوتا رہا۔ جس کی شعاعیں آج بھی وادیٔ ایمان ویقین پر پھوار بن کر برستی ہے۔

امام غزالی کا شمار زمانہ کے ان گنے چنے افراد میں ہوتا ہے، جنھیں دنیا مجدد کے نام سے یاد کرتی ہے۔ جس کے بارے میں شہنشاہِ انبیا تاجدار رسل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ان اللہ یبعث لہٰذہ الامۃ علی رأس کل مأۃ سنۃ من یجدد لہا دینہا۔ (رواہ ابوداؤد)

پانچویں صدی ہجری کا زمانہ اپنی آغوش میں ایسے بے شمار حادثات کو لے کر رونما ہوا، جس سے خطرہ اس بات کا تھا کہ اسلامی فلسفۂ حیات کو نکتہ چینی کا شکار ہونا پڑے گا۔ مذہبی قدریں پامال ہوجائیں گی۔ اور ملت کا شیرازہ منتشر ہوجائے گا۔ اب تک مسلمانوں کے سروں سے خلافت اسلامیہ کی مرکزی زبوں حالی کا جو طوفان گزر چکا تھا، اس کا تصور ہر احساس مند دل کو تڑپا رہا تھا۔ بنو امیہ اور بنو عباس کی آویزشیں سرد پڑ چکی تھیں۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا کردارِ زریں صرف اوراق کی زینت بن کر رہ گیا تھا۔

سلجوقی خاندان کے چشم و چراغ ملک شاہ نے زمامِ حکومت سنبھال رکھی تھی۔ اور وحدانیت کی علم بردار قوم اپنے مرکز کو توڑ کر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہوچکی تھی۔ باہمی اتحاد و اتفاق نے افتراق و انتشار کی شکل اختیار کرلی تھی اور ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن کے ماننے والے آپس کی ناچاقیوں کا شکار ہوکر انتشار کے گڑھے میں گر چکے تھے۔ اندرونی طور پر رفض و خروج کا فتنہ اہل اسلام کے لیے کوئی نیا نہ تھا، مگر اس وقت معتزلہ کی جدید شرانگیزیوں نے مسلمانوں کا ناطقہ بند کردیا تھا۔ اس کے علاوہ فرقۂ مرجیہ اور باطنیہ وغیرہ بھی جنم لے چکے تھے۔ یہ تھے داخلی فتنے جو اندر سے شجر اسلام کی بیخ کنی پر آمادہ تھے۔ اس کے علاوہ کشمکش کے اسی زمانے میں یونانی فلسفہ بڑی تیزی سے مسلمانوں کے معاشرہ پر مسلط ہورہا تھا، جس کی بنا پر طرح طرح کے بے بنیاد خیالات و توہمات مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہورہے تھے۔ مثلاً عالَم کا ازلی ہونا، ذاتِ پاک الٰہی کا بسیط محض ہونا، حشر الاجساد کا انکار وغیرہ مسائل موضوعِ بحث قرار پائے اور اسلام دشمن طبقوں نے ان کی اعتقادی رسہ کشی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا چاہا۔ ایسے پُر ہول وقت میں حجۃ الاسلام امام غزالی رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی کشتی اعتقاد کا ناخدا بن کر جو یونانی فلسفہ کی تیز موجوں کا نشانہ بن رہی تھی، ساحل تک پہنچا دیا۔ حال یہ تھا کہ اہل جبر و قدر اور فتنہ معتزلہ نے موسم ذہنی کو ابر آلود کر دیا تھا۔ قدرت نے آپ کو وہ کمال عطا فرمایا کہ:

اولاً آپ نے نہایت عمیق نظر سے یونانی تخیل پاروں کو ملاحظہ فرمایا۔ پھر اس کے بنیادی اصولوں کی اس طرح دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں کہ جانشینانِ ارسطو دیکھتے رہ گئے۔ یونان کے فلسفہ کے تار و پود بکھر گئے اور وہ مہیب طوفان، جس نے عالم اسلام کو سراسیمہ کرنا چاہا تھا، کافور

ہو گیا۔

محض یہی کہ امام نے فلسفۂ یونان کی آلودگیوں سے اسلام کو محفوظ رکھا، بلکہ معتزلہ اور باطنیہ وغیرہ کا وہ فتنہ جس نے چمن زارِ اسلام کی بہاروں کو غارت کردینے کا عزم کرلیا تھا، یکسر ختم کردیا۔ جس کے لیے علمائے اہل سنت کا ایک گروہ علامہ ابوالحسن اشعری کی قیادت میں برسر کار تھا۔

امام غزالی صرف یہی نہیں کہ بہت بڑے فلسفی اور اور عظیم المرتبت عالم دین تھے، بلکہ تمام علومِ اسلامیہ میں منصب امامت پر فائز ہونے کے علاوہ آپ راہِ سلوک کے عظیم شہسوار بھی تھے۔ امام کے مجمع البحرین ہونے کا اعتراف صاحب فضل المقال علامہ ارشد نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"انہ لم یلتزم مذھبا من المذاھب فی کتبہ بل ھو مع الاشعرۃ اشعری ومع الصوفیۃ صوفی ومع الفلاسفۃ فیلسوف"۔

اس کا واضح ترین اقرار امام نے اپنی معروف کتاب "جواہر القرآن" کی طویل عبارت میں کیا ہے۔

ایک مجدد کا کارنامہ صرف یہ نہیں کہ وہ مخالفین کے اعتراضات سے اسلام کو بچائے، بلکہ مذکورہ بالا صفات کے ساتھ ساتھ مجدد ایسے اصول مرتب کرتا ہے، جو اس کے اپنے زمانہ کے ماحول کو مدنظر رکھ کر تیار کیے جائیں۔ اور ایسے قوانین کا نفاذ عمل میں لاتا ہے، جو ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کو قائم رکھ سکے۔ ایسا معاشرہ ترتیب دیتا ہے، جس میں عوامی ذہن ماحول کی کثافتوں سے محفوظ و مامون رہیں۔

امام غزالی نے ایک ایسے فلسفہ کی بنیاد رکھی، جو تمام ذہنی خرافات کا قلع قمع کرکے اسلام کی صداقت کو بے نقاب کردے۔ اور تمام اسلامی معتقدات سے اعتراضات کے غبار کو صاف کردے۔

آپ نے ان معتقدات کی توثیق کی غرض سے وہ تحقیق فرمائی کہ اپنے تو اپنے غیروں کو بھی مجال انگشت نمائی نہ ہو۔ آپ نے ایسا نظامِ تعلیم مرتب کیا، جس کے ذریعہ متعلم مذہبی تعلیم میں پختہ ہونے کے ساتھ ہی علومِ نقلیہ اور ضروریاتِ وقت کے تمام علوم سے آسودہ ہوجائے۔

آپ کا یہ نظامِ تعلیم ایسا مقبول ہوا کہ تمام بلادِ اسلامیہ نے اسے بلاحیل وحجت اپنا لیا۔ اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ موجودہ درسِ نظامیہ کی ترتیب بھی انھیں کے بنائے ہوئے نقوش کا پرتَو ہے۔

الغرض! پروردگارِ عالم نے امام غزالی کو پانچویں صدی میں اس وقت ملت اسلامیہ کے کارواں کی حفاظت وصیانت پر مقرر کیا، جب وہ ہر چہار جانب سے لٹیروں کے نرغہ میں آچکا تھا۔

اے امام! جب جب اسلام پر بُرے دن آئیں گے اور آفتابِ حق کو ابتلا و آزمائش کی گھٹائیں چھالیں گی۔ جب جب عقائد اسلام میں رخنہ اندازی ہوگی۔ جب جب صفاتِ باری تعالیٰ کی عظمتوں کو پامال کیا جائے گا۔ جب جب منصب رسالت کو موضوعِ توہین بنایا جائے گا۔ منہاجِ نبوت کے طلب گار تجھے یاد کریں گے۔ ؎

خدا کی رحمتیں ہوں اے امیر کارواں تجھ پر

حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ والرضوان اور اشاعت اسلام

خواجہ خواجگان حضور معین الدین حسن چشتی سنجری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کفرستانِ ہند میں اسلام کی شمع فروزاں کرنے والے ہیں۔ آپ سے پہلے اس خطہ میں تبلیغ اسلام کے لیے تشریف لانے والے صوفیا میں شیخ اسماعیل محدث، شیخ صفی الدین گزرانی، شیخ حسین زنجانی، شیخ علی ہجویری اور سلسلۂ چشت کے بزرگ خواجہ ابو محمد ابن ابی احمد چشتی کے اسمائے گرامی آئے ہیں۔ مگر اس علاقے کی روحانی سیادت خواجہ اجمیر کے لیے مقدر تھی۔

نام نامی اسم گرامی: معین الدین حسن۔ مولد: سجستان۔ والد ماجد کا نام: غیاث الدین۔ نسبت مبارک: حسینی سید۔

بارہ سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ترکہ میں ایک باغ ملا، اسی کی نگہ داشت کے دوران ابراہیم قلندر نامی ایک بزرگ کا پس خورہ منہ میں پڑا اور دل نورِ الٰہی سے منور ہو گیا، دنیا کی محبت مردہ پڑ گئی۔ راہِ حق میں نکل پڑے۔ سمرقند میں کلام اللہ حفظ کیا اور دینی علوم حاصل کیے۔ عراق کا رُخ کیا، جس کے ایک قصبہ ہارون میں ایک خدا رسیدہ بزرگ ان کے حصہ کی نعمت سرمدی لیے منتظر تھے۔ حضرت شیخ المشائخ خواجہ عثمان ہارونی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شرفِ بیعت پایا۔ مرشد کامل نے اپنے سلسلہ میں داخل فرمانے کے بعد چہرۂ مبارک آسمان کی طرف اٹھایا اور مرید صادق کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

"ترا بخدا رسانیدم و مقبول حضرت اوست گردانیدیم"۔

ترجمہ:۔ میں نے تجھے خدا تک پہنچا دیا اور حق تعالیٰ کا مقبول بنا دیا۔

حضرت خواجہ اجمیری کا سلسلۂ طریقت چودہ واسطوں کے بعد سیدنا مولائے کائنات علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم سے جا ملتا ہے۔ حضرت سلطان الہند غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی پیر و مرشد کی خدمت میں کم و بیش بیس سال رہے۔ مرشد کامل نے گوہر شب تاب کی تراش خراش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ روحانیت کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کرایا۔ خود اپنے ہمراہ اکنافِ عالم کے اولیاء اللہ اور شناورانِ راہِ طریقت سے ملاقاتیں کرائیں۔ تا آں کہ رحمۃ للعالمین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ واہل محبت کی بارگاہِ رحمت میں لے کر حاضر ہوئے۔ دربار رسول میں مرشد کامل نے مرید فاضل کو پیش کیا تو آقاؤں کے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مرقد مبارک سے آواز آئی:

"معین الدین مجھے پیارا ہے، میں نے اسے قبول کیا اور اپنا بنایا"۔

حضرت خواجہ عثمان ہارونی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے اس یگانۂ روزگار مرید پر ناز تھا، بے حد پیار فرماتے تھے۔ آپ کا فرمان ہے:

"معین الدین خدا کا پیارا ہے اور مجھے اپنے اس مرید پر فخر ہے"۔

سیر و سیاحت:

دس سال تک آپ نے اپنے پیر و مرشد کے ساتھ اکنافِ عالم کی سیر کی۔ پیر و مرشد سے رخصت ہونے کے بعد بھی آپ نے سیر و سیاحت کا سلسلہ جاری رکھا، جن علاقوں کو آپ نے دورانِ سیاحت دیکھا، ان میں کے چند نام یہ ہیں:

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد شریف، جبل ہمدان، تبریز، مہنہ، خرقان، اسعد آباد، ہری، سبزوار، حصار، بلخ، غزنین، اصفہان، کرمان، بخارا، ملتان۔

بغداد شریف میں آپ نے سرکار غوث الثقلین قطب الدارین محی الدین الشیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحبت میں ستاون روز گزار کر ان سے فیوض و برکات لیے (اور سیر العارفین کی روایت کے مطابق آپ حضور غوث پاک کی خدمتِ عالیہ میں پانچ ماہ رہے) اسی طرح سمجان میں شیخ نجم الدین کبریٰ اور بغداد ہی میں حضرت شیخ ضیاء الدین پیر ومرشد حضرت شہاب الدین سہروردی، تبریز میں شیخ ابو سعید تبریزی، اصفہان میں شیخ محمود اصفہانی، بلخ میں شیخ احمد خضرویہ، غزنین میں نظام الدین ابوالموید کے مرشد شیخ عبدالواحد غزنوی کی مجالس میں رہے اور ان تمام سے روحانی وعرفانی برکات کے خزانے سمیٹے۔ آپ نے اولیاء اللہ کے مزارات پر پہنچ کر مراقبے کیے، جن میں ہمدان میں مزار شیخ ابو یوسف ہمدانی، خرقان میں شیخ ابوالحسن خرقانی، ہرات میں شیخ عبداللہ انصاری اور ملتان میں شیخ علی ہجویری قدست اسرارہم کے مزارات پر چلہ کیا اور وہاں سے رخصت ہوتے وقت یہ شعر پڑھا: ؎

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نورِ خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

اشاعت اسلام:

ملک ہند میں اپنا تبلیغی مشن شروع کرنے سے پہلے پانچ سال تک ملتان میں رہ کر ہندوستان کی زبان سیکھی۔ حضرت خواجہ اجمیر جب حاضر بارگاہِ رسالت ہوئے تو سید الاولین والآخرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں ہندوستان جانے کی بشارت عطا فرمائی۔ دلیل العارفین میں اجمیر کے غالباً سفر روحانی کی جانب اشارہ ملتا ہے کہ ایک مجلس میں فقرا و مریدین کے سامنے آپ عارف کی صفتوں پر تقریر فرما رہے تھے، اسی اثنا میں اشک بار ہو گئے اور فرمایا: میں اس مقام کا سفر کرتا ہوں جو میرا مدفن ہے۔ اس کے بعد سب کو رخصت کر دیا، صرف خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔

بہر حال صحیح ترین اور مشہور روایت ہے کہ راجہ رائے پتھورا کے زمانے میں آپ اجمیر تشریف لائے۔ راجہ کے مقربین کو اپنے علاقے میں مسلمان درویشوں کا آنا ناگوار ہوا اور انھوں نے نت نئے حیلوں بہانوں اور اپنی شرارتوں سے انھیں تنگ کرنا شروع کر دیا، تاکہ یہ لوگ واپس چلے جائیں۔ مگر اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوئے۔ ہندو جوگیوں اور جادوگروں کو ان کے پیچھے لگا دیا، جن سے خواجہ صاحب کے بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ ان معرکوں کی حیثیت گویا اسلام اور کفر کے مقابلے کی تھی۔ قدرتِ خداوندی کو اس سرزمین پر اسلام کو فروغ بخشنا منظور تھا، اس لیے اپنے برگزیدہ بندوں کو مبلغ اسلام نہیں بلکہ چلتا پھرتا اسلام بنا کر یہاں بھیج دیا تھا۔ تمام ہندو جوگیوں اور جادوگروں کو خواجہ صاحب کے مقابلے میں کھلی ہوئی شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندو مذہبی رہنمائوں کا سردار جوگی جے پال نہ صرف یہ کہ آپ کے مقابلے میں ہار گیا بلکہ اعترافِ شکست کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہوا۔ آپ نے اس کا نام عبداللہ رکھا اور اسے روحانی تعلیمات دے کر اپنی خلافت سے نوازا۔

حضرت خواجہ صاحب کی عظمتوں کے نئے نئے واقعات اجمیر کی سرزمین پر دیکھ دیکھ کر پتھورا رائے کے لشکریوں میں سے لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ راجہ اور اس کے ہم مذہب ایسے لوگوں کو اذیت دیتے تو وہ لوگ آپ کی خدمت میں استغاثہ لاتے۔ راجہ نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر اپنے اور اپنی حکومت کے لیے خطرہ کا احساس کیا اور آپ کو اجمیر بدر کرنے کا حکم دیا۔ آپ کو جب یہ خبر ملی تو آپ نے فرمایا:

''میں نے اسے خود نکال دیا اور دوسروں کے حوالے کر دیا''۔

چنانچہ پتھورا رائے کی اس گستاخی کے بعد ہی۔ ایک دن کی بات ہے خراسان کے بادشاہ شہاب الدین غوری نے خواب دیکھا، خواجہ غریب نواز سامنے کھڑے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ تمہیں ملک ہند کی بادشاہی دینے والا ہے، تم اس کی جانب قدم بڑھائو۔ سلطان نے فوراً حملہ کی تیاری کی اور آپ کے فرمان کے بموجب فاتح و کامران ہوئے اور وارث النبی کے فیضانِ روحانی سے یہ خطہ غلغلۂ اسلام سے گونج اٹھا۔

دلیل العارفین کی دسویں مجلس میں ہم جس مکاشفہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت کی ہندوستان تشریف آوری پر لوگ اس کثرت سے داخل اسلام ہوئے کہ جس کا شمار نہیں۔ حضرت خواجۂ خواجگان کی برکت سے ہندوستان میں مشرف بہ اسلام ہونے والوں کے بارے میں مصنف خزینۃ الاصفیا کا بیان ہے:

ہزار در ہزار از اصغار و کبار بخدمت آں محبوب کردگار حاضر شدہ مشرف اسلام وارداتِ آں حضرت شدند''۔

ترجمہ:۔ ہزارہا ہزار چھوٹے بڑے اس محبوبِ خدا (خواجہ صاحب) کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اسلام قبول کرتے اور حضرت کے مرید ہوتے۔

عظمت اخلاق:

سرکار غریب نواز، مدنی تاجدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حقیقی نائب تھے۔ آپ کے اخلاق و کردار کی عظمت اور بنی نوعِ انسان کی سچی بہی خواہ کے جذبات نے بھی لوگوں پر اثر کیا۔ روحانی کمالات میں یدطولیٰ کے ساتھ ساتھ خون کے پیاسوں کے ساتھ بھی عفو و درگزر اور عطا وبخشش آپ کی فطرت میں شامل تھا۔

ایک بار ایک شخص کسی کا آلۂ کار بن کر آپ کے قتل کے ارادے سے آیا۔ خنجر اس کی آستین میں تھا، حضرت کو اس کے ارادے سے واقفیت ہوگئی۔ آپ کے باطنی نور نے اس کی بدنیتی آپ پر ظاہر کردی۔ پھر جب وہ آیا تو آپ نے اس کو بہت پیار سے بٹھایا اور نہایت ملائمت سے کہا کہ جو ارادہ کرکے آئے ہو، اسے پورا کرو۔ وہ کانپ اٹھا اور چھری سامنے رکھ کر معافی کا خواستگار ہوا اور کہا میں حاضر ہوں، آپ مجھے میری نیت بد کی سزا دیجیے۔ خواجہ غریب نے فرمایا: فقیروں کا شیوہ بدلہ لینا نہیں ہے، بلکہ ہم لوگوں سے تو کوئی بدی بھی کرتا ہے تو ہم اس سے نیکی سے پیش آتے ہیں۔ آپ نے اس کے حق میں دعا کے لیے دست مبارک اٹھایا اور آپ کی توجہ سے وہ مقرب بارگاہِ حق ہوگیا۔ اسے ۴۵ر بار حج کی توفیق ملی اور اسی زمین مقدس پر انتقال پاکر دفن ہوا۔

آپ پڑوسی مسلمانوں کے جنازے میں شرکت فرماتے اور دفن کے بعد سب لوگ چلے جاتے تو دیر تک دعائے خیر فرماتے رہتے۔

دلیل العارفین میں ہے کہ ایک بار آپ حسب معمول ایک قبر پر کھڑے تھے کہ چہرۂ مبارک کا رنگ متغیّر ہوگیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد معمول پر آیا۔ حضرت خواجہ قطب الدین حالات دیکھ رہے تھے، وجہ پوچھی تو فرمایا: قبر میں عذاب کے فرشتے آئے تھے، لیکن پھر رب تعالیٰ کی رحمت ہوئی اور قبر سے عذاب دور ہوگیا۔

تاثیر نظر:

سلطان الہند غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہندوستان میں نائب مصطفی بن کر تشریف لائے۔ ان کے اخلاق و کردار کا ہر گوشہ سنت محمدی کا آئینہ تھا۔ زبان کیا تھی کلمۂ توحید کی شمشیر براں۔ اور نگاہ کیا تھی محبوبِ حقیقی کی جلوہ گاہ۔

ایک بار کی بات ہے۔ آپ ایک باغ میں حوض کے کنارے فروکش تھے۔ علاقے کا تند خو حکمراں، یادگار محمد نامی ادھر آ نکلا۔ اجنبی صورت دیکھ کر ذہن میں کچھ تنفر لیے بڑھا۔ خواجہ غریب نواز نے اسے ایک نظر دیکھا تو مغلوب الحال ہوگیا۔ ہوش و حواس گم ہوگئے۔ آپ نے پانی کے چھینٹے دیے، ہوش میں آیا تو اپنے اہل و عیال اور دوست واحباب سمیت حضرت خواجہ کا گرویدہ ہوگیا اور اپنی ساری دولت نذر کو لایا۔ آپ نے ایک پیسہ بھی نہیں لیا اور فرمایا: ظلم وستم سے حاصل کیا ہوا مال اس کے مالکوں کو دے دو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پھر آپ کی صحبت میں رہ کر باطنی علوم کی تکمیل کر کے آپ کی خلافت سے سرفراز ہوا۔

دلوں پر حکمرانی:

حضرت خواجہ غریب نواز سیر وسیاحت کے زمانے میں بھی اکثر روزہ سے رہا کرتے۔ تیر، کمان اور چقماق ساتھ رکھتے، شکار کرتے اور گوشت بھون کر افطار فرماتے۔ حکیم ضیاء الدین نامی ایک شخص بلخ کی آبادی میں درویشوں اور فقرا کے کمالاتِ روحانی کا منکر تھا۔ اتفاق سے اس کی ملاقات خواجہ غریب نواز سے ہوگئی۔ آپ کلنگ کا شکار کر کے گوشت بھون رہے تھے۔ حضرت غریب نواز پر اس کے باطنی مرض کا انکشاف ہوا۔ آپ نے بھنے ہوئے گوشت کا بھنا ہوا ایک ٹکڑا انھیں دیا، انھوں نے وہ کھایا، کھانا تھا کہ ان کی حالت متغیّر ہوگئی۔ دل کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا ہوگیا۔ بے خودی کی کیفیت کچھ کم ہوئی تو حضرت کے قدموں پر گر کر زندگی بھر کے غلامی اختیار کرلی اور مرید ہوگئے۔ نہایت مشہور طبیب تھے۔ فن طب کی تمام کتابیں دریا برد کردیں اور درویش خدا مست کی نگاہوں کے شکار ہوکر عمر بھر راہِ طریقت میں بادیہ پیمائی کرتے رہے۔

حضرت خواجہ غریب نواز، عطائے رسول سے بہرہ ور تھے۔ انھیں خود محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا نائب اور اپنے روحانی کمالات کا مظہر بنا کر ملک ہند میں مقرر فرمایا تھا۔ اسی لیے ان کے دم قدم سے اس سرزمین کفر پر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا جتنا عظیم الشان کام ہوا۔ لشکر و سپاہ اور تخت و تاج والوں سے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوا۔ حضور خواجہ غریب نواز کے ذریعہ ہندوستان میں کتنے لوگوں نے کن کن ذرائع سے اور آپ کے کن کن کمالات و خصائص سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا۔ گویا تاریخ و سوانح کے صفحات پر ان کے واضح نشانات نہیں ملتے، تاہم یہ باور کرنا ہوگا کہ ہندوستان جیسی کفرستان کی دھرتی پر توحید کی علم برداری کی خدمات شہنشاہِ چشت خواجہ غریب نواز، آپ کے خلفا اور اہل ارادت درویشوں نے انجام دی ہیں۔ آپ ہی کا فیضان ہے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش نامی دو الگ الگ ریاستیں وجود میں آنے کے بعد موجودہ ہندوستان میں کم از کم بارہ کروڑ مسلمان موجود ہیں، جن کی رگوں میں توحید کا لہو گردش کر رہا ہے۔

سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا ہے کہ خود رائے پتھورا کی فوج میں سے لوگ آپ ہاتھ پر مسلمان ہوئے، عوام کا اندازہ بھی اسی سے لگایا جاسکتا ہے۔ آپ کی تبلیغ کا عمومی اثر پورے ملک پر ہوا، مگر اجمیر، راجستھان اور دہلی و اطراف میں آپ سے بلاواسطہ لوگوں نے اسلام کی دولت پائی اور دوسرے خطوں میں آپ کے خلفا و مریدین نے اسلام و انسانیت کی انمٹ خدمات انجام دیں، جن کا ذکر آرہا ہے۔

پروفیسر ڈبلیو آرنلڈ کی کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' کے ترجمہ ''دعوتِ اسلام'' میں ہے:

''یہاں اجمیر پہنچنے کے بعد جس کو پہلے پہل آپ نے مسلمان کیا، وہ راجہ کا ایک جوگی گورو تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے مریدوں کی ایک کثیر تعداد ان کے گرد جمع ہوگئی، جنھوں نے ان کی تعلیم و تلقین سے بت پرستی چھوڑ کر اسلام اختیار کرلیا۔ اب ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت سے آپ کی شہرت سب طرف پھیل گئی اور آپ کا شہرہ سن کر بہت سے ہندو لوگ اجمیر میں آئے اور آپ کی ترغیب سے مسلمان ہوگئے۔ روایت ہے کہ جب آپ اجمیر جاتے ہوئے راستہ میں دہلی کے اندر ٹھہرے تھے تو وہاں آپ نے سات سو ہندوؤں کو مسلمان کیا تھا''۔

خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ عرفان و حقیقت کی اس شمع فروزاں کا گزر جہاں جہاں سے ہوتا لوگ پروانہ وار نثار ہوتے اور ناقابل انکار حقائق کھلی آنکھوں سے دیکھ کر کلمۂ توحید کے اسیر ہوجاتے۔ ان کی تبلیغ کی اصل روح رضائے الٰہی اور انسانی برادری کی بے لاگ اور بے لوث محبت تھی۔ وہ بنی آدم کو خود ساختہ بکھیڑوں سے نجات دلا کر اس کے خالق تک پہنچانے کا درد رکھتے تھے۔ ؎

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز کا وصال ۶۲۷ھ میں ہوا۔ آپ کے بعد آپ کے جلیل القدر خلفا اور اہل ارادت نے ملک کے طول و عرض میں اشاعت اسلام کی بساط بچھائی۔

سیر الاقطاب کے اندر حضرت کے خلفا کی تعداد تیرہ بتائی گئی ہے۔ مگر مصنف خزینۃ الاصفیاء کے بیان کے مطابق حضرت کے اکیس خلفا ہیں، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (دہلی) (۲) خواجہ فخر الدین فرزند ارجمند حضرت خواجہ صاحب (سروار شریف) (۳) شیخ حمید الدین سوالی (ناگور شریف) (۴) شیخ وجیہ الدین (ہرات) (۵) خواجہ برہان الدین عرف بدو (اجمیر شریف) (۶) شیخ احمد (اجمیر شریف) (۷) شیخ محسن۔ (۸) خواجہ سلیمان غازی۔ (۹) شیخ شمس الدین۔ (۱۰) خواجہ حسن خیاط۔ (۱۱) عبد اللہ (جس کا نام پہلے جوگی جے پال تھا) (اجمیر شریف) (۱۲) شیخ صدر الدین کرمانی۔ (۱۳) بی بی حافظہ جمال صبیہ سعیدہ حضرت خواجہ (اجمیر شریف) (۱۴) شیخ محمد ترک نارنولی (دہلی) (۱۵) شیخ علی سنجری۔ (۱۶) خواجہ یادگار علی سبزواری۔ (۱۷) خواجہ عبد اللہ بیابانی۔ (۱۸) شیخ منا۔ (۱۹) شیخ وحید۔ (۲۰) شیخ مسعود غازی (واضح رہے کہ یہ حضرت سالار غازی بہرائچی کے علاوہ ہیں) (اجمیر شریف)

حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ کے بعد آپ کے جن خلفائے نامدار کے ذریعہ اکنافِ ہند میں اشاعت اسلام اور دین حنیف کی تبلیغ کے نمایاں کام سرانجام پائے۔ ان میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ حمید الدین ناگوری کے اسمائے مبارکہ بدر منیر کی طرح درخشاں و تاباں ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ دور خطۂ ہند میں مسلم سلاطین کے قیامِ اقتدار کا دور تھا۔ شمشیر و سناں کے سائے میں مسلم سلاطین ایک

طرف یہاں کے قدیم سیاسی نظام کی اصلاح کر رہے تھے۔ دوسری طرف مشائخ سلاسل بالخصوص حضرت خواجہ غریب نواز اور ان کے خلفا دلوں کی سرزمین میں اپنے اخلاق و کردار اور خدمت خلق کے ذریعہ اسلامی تعلیم کی شجر کاری کر رہے تھے۔ ان کی بہی خواہی اور جذبۂ ہمدردی نے قلوب کی تسخیر فرمائی اور لوگ جوق در جوق اسلام کے دامن میں آتے گئے۔(اسلامیانِ ہند اور عصر حاضر کا ایک ورق)

حضرت معروف کرخی رضی اللّٰہ عنہ

کہو: خدا تین میں کا ایک ہے۔

نہیں نہیں اور نہیں۔ میں ایسا کبھی نہیں کہہ سکتا۔ خدا تو واحد و یکتا، دوئی سے پاک ہے۔

شائیں۔ شائیں۔ قمچی کی شڑاٹے دار ضرب سے لڑکے کی پیٹھ لہو لہان ہو رہی ہے۔ کلیسائی استاذ کا چہرہ غصہ میں لال بھبھوکا ہو رہا ہے۔ منہ سے باتوں کی جگہ جھاگ اُبل رہے ہیں۔ لڑکے کو تادیبًا آئے دن انھیں قمچیوں اور دوسری سزائوں سے دوچار ہونا پڑتا۔ کئی بار اس نے سوچا بھی کہ استاذ کے بتانے کے مطابق وہی بات اپنی زبان سے کہہ کر روز کی زد و کوب سے رہائی پالے۔ مگر اندر سے کوئی شی اسے روک دیتی۔ بالآخر لڑکا بھاگ کھڑا ہوا۔ ایسے مدرسہ، ایسے استاذ اور خود اپنے گھر سے دور، جہاں اس کے کان اس آواز سے کبھی دوچار نہ ہوں کہ ”خدا تین میں کا ایک ہے“۔ جہاں توحید کے نغمے اُبلتے ہوں۔ خدائے واحد کے گیت گائے جاتے ہوں۔ جہاں شرک و اوہام کا دور دور تک پتہ نہ ہو۔ خدا کی راہ کا یہ متلاشی، کمسن لڑکا، چوں کہ اپنے سینے میں جذبۂ صادق کی تڑپ رکھتا تھا۔ اس لیے خدائے لم یزل نے اسے سکون طمانیت کے گہوارہ تک پہنچا دیا۔

بغداد معلی کی سرزمین پر سید السادات امام الاولیاء نور دیدۂ امام حسین سیدنا علی بن موسیٰ رضا قدست اسرارہم کی روحانیت وولایت کا آفتاب نصف النہار پر جگمگا رہا تھا۔ لڑکا چلتے چلتے اس درِ دولت تک پہنچ گیا، جہاں خدا رسی کے فاصلہ مٹ گئے ہیں۔ محلہ کرخ کا مسیحی نژاد، امام موسیٰ رضا کے غلاموں میں شامل ہوگیا۔ سید السادات کی صحبت کیمیا اثر نے اس مس خام کو کندن بنانے میں دیر نہ کی۔ اس کی جبین سعادت پر موحد ہونے کے آثار تو پہلے ہی ظاہر ہو چکے تھے۔ امام عالی مقام نے وحدانیت کی مئے ناب کا جام جب اپنے ہاتھوں سے پلایا تو وہ مست الست بن گیا۔ ؎

توحید تو جب ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اور تاریخ اولیائے اسلام میں اسے ابو محفوظ معروف الکرخی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور گروہِ اولیا میں سیدنا معروف کرخی کا وہ مقام ہے، جہاں عام نگاہوں کی تو کُجا بڑے بڑوں کی رسائی مشکل ہے۔ آپ کی نگاہ حقیقت آشنا، آپ کے عزائم حجاباتِ مجاز کو چاک کرنے والے اور آپ کا دامن عمل ان گنت آفتاب و ماہتاب سے مزین ہے۔

حضرت داتا گنج بخش ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری تصوف کی مایہ ناز کتاب ”کشف المحجوب“ میں ان کا ذکر کتاب کے گیارہویں باب تبع تابعین کے زمرے میں کرتے ہیں۔ اس باب میں حضرت حبیب عجمی، حضرت مالک بن دینار، حضرت ابو حبیب بن سلیم راعی، حضرت ابو حازم مدنی، حضرت محمد بن واسع، حضرت ابو حنیفہ النعمان، حضرت عبد اللہ بن المبارک، حضرت فضیل بن عیاض، حضرت ذوالنون المصری،

حضرت ابراہیم ادہم، حضرت بشر حافی، حضرت بایزید بسطامی، حضرت عبداللہ بن حارث، حضرت داؤد طائی، حضرت سری سقطی، حضرت ابو علی شقیق بن ابراہیم ازوی، حضرت ابو سلیمان عبدالرحمن بن عطیہ دارانی علیہم الرحمۃ والرضوان کے بعد حضرت خواجہ معروف کرخی کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"آپ کا ذکر اس سے پہلے چاہیے تھا، لیکن میں نے یہ ترتیب دو بزرگوں کے اتباع میں مناسب سمجھی۔ حضرت شیخ ابراہیم سلمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں اسی ترتیب پر اذکار مشائخ بیان فرمائے اور استاذ ابو القاسم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب میں اسی ترتیب سے بیان فرمایا"۔

حضرت داتا صاحب آگے لکھتے ہیں:

والدین کو دعوتِ اسلام:

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سری سقطی کے استاذ تھے۔ اور حضرت داؤد طائی کے مرید خاص۔ آپ کے ابتدائی احوال میں مذکور ہے کہ گھر سے گم شدگی کے بعد آپ کے والدین نہایت پریشان ہوئے۔ بالخصوص ماں کی حالت ناقابل دید تھی۔ کچھ روز تک کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ دونوں نے ارادہ کیا کہ بیٹا اگر واپس آجائے تو اب ہم اسے کسی بات پر مجبور نہیں کریں گے۔ بلکہ خود اس کی خوش نودی پر عمل کریں گے۔

ادھر حضرت امام موسیٰ رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لینے اور روحانی انعامات کی دولت سمیٹ لینے کے بعد ایک بار معروف کرخی کو خیال آیا کہ کیوں نہ گھر چل کر ماں باپ کو بھی اس دین حق کی دعوت دی جائے۔ ادھر اولاد کی فرقت سے والدین کے قلب وذہن کی زمین اس شجر رحمت کی کاشت کے لیے تیار ہی تھی۔ معروف کرخی اپنے گھر پہنچے۔ ماں باپ کو اپنے قبولِ اسلام کا حال بتایا اور انھیں بھی خدائے واحد کی طرف بلایا۔ ان دونوں نے بھی بلا حیل وحجت کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔

صفاتِ درویشی:

حضرت خواجہ معروف کرخی ان درویشانِ امت میں ہیں، جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اطاعت خدا کی نذر تھا۔ دنیا سے اجتناب اور رب کائنات سے ہمہ وقت وابستگی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ حیاتِ مستعار کی کسی ساعت کو یادِ حق کے سوا گزارنا ان پر نہایت شاق ہوتا۔

ایک بار کچھ لوگ آپ کی خدمت میں ملاقات کے لیے آئے اور باتوں میں دیر تک بیٹھ رہے۔ مہمان نوازی کے خیال سے آپ نے کچھ دیر صبر کیا۔ وہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تو بالآخر آپ نے فرمایا:

"کیا آپ لوگ مجلس برخواست نہیں کرنا چاہتے، آفتاب تو اپنی مقررہ رفتار ہی سے مائل بہ سفر ہے"۔

ایک مرتبہ آپ کے تلمیذ رشید حضرت سری سقطی علیہ الرحمہ نے پوچھا: رب تعالیٰ کی کامل اطاعت کے لیے کیا ضروری ہے؟ فرمایا:

"دنیا کی محبت دل سے نکالنا لازم ہے، اگر اس سے دل فارغ نہیں تو لذتِ سجدہ ریزی نصیب نہیں ہو سکتی"۔

آپ نے فرمایا:

"دنیا کا لفظ "دنایت" سے نکلا ہے، اس کا مطلب ہے "خواری، لذت اور کمینگی۔ اس سے سمجھ لو کہ دنیا کیا شئے ہے"۔

آپ فانی فی اللہ اور باقی باللہ تھے۔ دل کا آئینہ اتنا صاف وشفاف تھا کہ قبولِ حق میں سنا ہوا ایک ایک جملہ پوری زندگی کے لیے قلب پر مرتسم ہوجاتا تھا۔ ایک بار کوفہ کے بازار سے گزرے، وہاں اس دور کے مشہور خطیب ابن سماک تقریر کر رہے تھے۔

"جو رب تعالیٰ سے روگردانی کرتا ہے، رب تعالیٰ بھی اس سے اعراض فرمالیتا ہے۔ اور جو اس کی طرف دل سے رجوع کرتا ہے، خداوند قدوس بھی اس کی طرف التفاتِ کامل فرماتا ہے۔ کبھی کبھی خدا کو یاد کرنے والے کو خدا بھی اس کے مطابق یاد کرتا ہے"۔

اس تقریر کا خواجہ معروف کرخی کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ اور انھوں نے عہد کرلیا کہ اپنے آقا حضرت علی بن موسیٰ رضا کی خدمت کے سوا کسی کام میں خود کو مشغول نہیں کروں گا۔ اور ہمہ وقت اپنی توجہ رب کائنات جل و علا کی طرف رکھوں گا۔ واپس آکر سیدنا علی ابن موسیٰ رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا:

"نصیحت کے طالب ہو تو اتنی ہی بات تمہارے لیے کافی ہے"۔

ایک بار دریائے دجلہ کے کنارے مشغولِ عبادت تھے۔ وضو کی حاجت ہوئی، آپ نے فوراً تیمم کرلیا (پھر وضو کے لیے اٹھے) لوگوں نے دریافت کیا: حضرت! تیمم کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی؟ فرمایا:

"انسان کی زندگی پانی کے بلبلہ کی طرح ناپائیدار ہے، جو اُبھرتا ہے، پھر ٹوٹ جاتا ہے۔ میں نے سوچا دجلہ تک پہنچتے پہنچتے زندگی وفا کرے نہ کرے، اس لیے پاک مٹی سے تیمم کرلیا، تاکہ موت آئے تو تیمم کی حالت میں آئے"۔

خیر خواہی:

دریائے دجلہ کا کنارہ آپ کو بہت پسند تھا، وہیں یادِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ ایک بار وہیں تشریف فرما تھے کہ نوجوانوں کی ایک ٹولی کشتی میں سوار گزری، ان کے ہاتھوں میں چنگ و رباب کے نغمے اُبل رہے تھے اور شراب خانہ خراب کے جام پر جام منڈھ رہے تھے۔ حضرت کی خدمت میں حاضر باش مصاحبین نے اس منظر کو دیکھ کر بھنویں سکوڑیں اور کہنے لگے: حضرت! کیسے نافرمان لوگ ہیں، پانی میں بھی خدا کی نافرمانی کرتے نہیں ڈرتے۔ آپ بددعا کردیجیے، یہ غارت ہوجائیں۔ آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

"مالک و مولا! ان کو جنت کی بہاروں میں بھی سامانِ عیش و نشاط کا حق دار بنا۔ جس طرح دنیا میں آج یہ شاداں و فرحاں ہیں"۔

حاضرین کہنے لگے: سرکار! ہم نے تو دعائے بد کرنے کو کہا تھا۔ فرمایا: آخرت میں سامانِ عیش و عشرت ملنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ہدایت یاب ہوجائیں اور خدا کی خوش نودی کے کام کریں۔ رب غفور اگر انھیں معاف کرکے توفیق خیر دے دے تو آپ لوگوں کا اس سے کیا خسارہ؟ (اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانوں کی وہ ٹولی آپ کے ہاتھ پر توبہ کرکے نیک بن گئی)

یہ ہے آقا و مولا حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شانِ رؤفی و رحیمی کہ ان کے غلاموں میں ظہور کہ رسول رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امت کے حق میں غلامانِ رسول بھی باعث رحمت و رافت ہوجاتے ہیں۔

دجلہ کے کنارے مصلے پر قرآن مجید رکھ کر آپ وضو کرنے کے لیے گئے۔ اتنے میں ایک عورت آئی اور مصلّٰی اور قرآن مجید لے کر چلتی بنی۔ آپ لوٹ کر آئے تو دیکھا، وہ لیے جارہی ہے۔ اس کے قریب پہنچے اور نگاہیں جھکائے ہوئے کہا: مادرِ مہربان! کیا تمہارا کوئی لڑکا قرآن پاک بھی پڑھتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ فرمایا: تو برائے کرم! قرآن مجید مجھے دیتی جائیو، میں اسے پڑھا کروں گا۔

اس عورت کو چوری کی عادت تھی۔ آپ کے اس برتائو نے اس پر بڑا اثر کیا اور وہ اس فعل سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو گئی۔

دست گیری:

ایک فلاکت زدہ ہاشمی سید کے گھر بچہ کی ولادت ہوئی اور گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی کہ وہ زچہ و بچہ کے لیے کچھ انتظام کر سکے۔ بیوی کو بھوک سے بے حال دیکھ کر وہ طلب نقد میں گھر سے نکل پڑا، کئی پڑوسیوں اور بقالوں کے دروازے کھٹکھٹائے، مگر کہیں مراد بر نہ آئی، جہاں گیا جواب نفی میں پا کر اس کا دل اور ٹوٹ گیا۔ اسی عالم تفکر میں چلتے چلتے دریائے دجلہ کے ساحل پہ پہنچا اور بلا ارادہ ایک کشتی میں جا بیٹھا۔ ملاح نے پوچھا: کہاں لے چلوں؟ تو کوئی جواب دینے کے بجائے اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے پھر پوچھا تو کہا: معلوم نہیں مجھے کہاں جانا چاہیے۔ اور پھر ملاح کو اپنی رودادِ الم کہہ سنائی۔

ملاح نے کہا: تسلی رکھو، خدا مسبب الاسباب ہے، میں لے چلتا ہوں اور اسے اصحاب الشاج کے محلہ میں لے جاکر اتار دیا اور کچھ بتا کر رخصت ہوا۔ نوجوان ہاشمی اس کی بتائی ہوئی مسجد میں داخل ہوا، وضو کیا اور حضرت خواجہ معروف کرخی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ وہ نماز میں تھے، سلام و دعا کے بعد متوجہ ہوئے، اس نے سلام عرض کیا اور اپنا حال کہہ سنایا۔ آپ پھر نماز میں مشغول ہو گئے، اس اثنا میں بارش شروع ہو گئی۔ جوان ہاشمی اس سے اور گھبرایا کہ تاریک شب میں کیچڑ سے گزر کر گھر تک کیسے پہنچوں گا۔ کچھ ہی لمحہ بعد مسجد کے دروازہ پر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔

ایک شخص حضرت خواجہ کی خدمت میں آن پہنچا۔ آپ نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ وہ گویا ہوا: فلاں شخص نے مجھے آپ کی خدمت بابرکت میں بھیجا ہے۔ سلام کہا ہے، ابھی ابھی وہ سو رہے تھے کہ انھوں نے رب تعالیٰ کی طرف سے کچھ خوشی پائی ہے۔ اس کے شکرانے میں یہ پانچ سو دینار کی تھیلی نذر کی ہے، تاکہ آپ کے ذریعہ حق داروں کو مل جائے۔

حضرت خواجہ معروف نے فرمایا: تم یہ تھیلی اپنے ہی ہاتھ سے انھیں دے دو۔ جوان ہاشمی اس عالم بے چارگی میں حضرت خواجہ معروف کی عنایت و مہربانی اور تصرف و کرامت کے گن گاتا ہوا خوشی خوشی گھر پہنچا اور تنگ دستی و فلاکت، غربت و عسرت سے نکل کر خوش حال زندگی گزارنے لگا۔

اسی طرح ایک پریشان حال آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: حضور والا! میرے گھر ایک بچہ کی ولادت ہوئی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس بچہ کو آپ کے نورانی چہرہ کی زیارت نصیب ہو، تاکہ وہ میرے لیے دارین میں باعث برکت ثابت ہو۔ آپ نے اسے ایک وظیفہ بتایا کہ اسے پڑھو۔ اس نے سو بار پڑھ لیا تو آپ نے پھر پڑھنے کو کہا، اس طرح اس نے پانچ سو بار پڑھ لیے۔ اتنی دیر میں خلیفہ ہارون رشید کی ملکہ زبیدہ خاتون کا فرستادہ خواجہ معروف کی خدمت میں باریاب ہوا اور با ادب پانچ سو درہم کی تھیلی نذر کی، تاکہ آپ اسے مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ حضرت نے وہ تھیلی شخص مذکور کو دے دی اور فرمایا: اگر تم وظیفہ اور پڑھتے تو درہم بھی زیادہ پاتے۔

ایک بار آپ کے خاندان میں کوئی تقریب تھی۔ آپ کے بھائی بند سب اسی میں مصروف تھے۔ ان لوگوں کی آٹے کی دوکان تھی، جس پر انھیں بیٹھا دیا تھا۔ حاجت مندوں نے دوکان پر خواجہ معروف کرخی کو بیٹھے دیکھا تو بھیڑ لگ گئی، آپ نے سب کو ان کے مانگنے کے مطابق دیا۔ حتی کہ دوکان کا سارا آٹا ختم ہو گیا۔ بھائی شام کو دوکان پہنچے تو خالی دوکان دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ کیوں کہ انھیں خواجہ کی سخاوت اور

آٹا تقسیم کرنے کی خبر مل گئی تھی۔ آپ نے تیور بگڑنے سے پہلے ہی کہا: پہلے اپنے صندوق کا جائزہ لے لو۔ دیکھا گیا تو صندوق دینار و درہم سے لبریز تھا۔

عید کا دن تھا اور عروس البلاد بغداد کے گلی کوچوں میں چہل پہل ہو رہی تھی۔ امرا و شرفا لباسِ فاخرہ اور دعوتوں میں مشغول تھے۔ مشہور بزرگ حضرت سری سقطی خواجہ معروف کرخی کی تلاش میں نکلے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ باغ میں کھجوریں چن رہے ہیں، اخروٹ اور بادام کے مغز دامن میں جمع کر رہے ہیں۔ انھوں نے دریافت کیا: حضور! آپ آج یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمایا: سری! آج عید کا دن ہے، سارا شہر خوشیوں میں مگن ہے۔ آج میری نظر ایک بچے پر پڑی جو رو رہا تھا، میں نے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میں یتیم ہوں۔ میرے باپ ماں ہوتے تو آج عید کی خوشیاں میرے حصے میں بھی آتیں۔ یہ سن کر میں لرز گیا، یہ سب میں اسی کے لیے چن رہا ہوں۔

سری سقطی فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: آپ رہنے دیں، میں اس کام کو سرانجام دیتا ہوں اور بچہ کو اپنے ساتھ گھر لایا، نہلا دھلا کر اچھے لباس پہنائے، کھلا پلا کر کچھ اخروٹ بھی کھیلنے کے لیے اسے دے دیے۔ اس کام کے کرنے سے میں نے خود میں ایک نورانیت محسوس کی اور میری حالت میں بہت ترقی ہوئی۔

حضرت الشیخ خواجہ معروف کرخی قدست اسرارہم کے بارے میں علامہ ابن جوزی نے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔

علامہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں جہاں آپ کے حالات تحریر فرمائے ہیں، وہاں آپ کی کرامتوں کا مستقل ایک باب قائم کیا ہے۔ اسی طرح تاریخ ابن خلکان، صفۃ الصفوۃ اور حلیۃ الاولیاء وغیرہ کتب میں آپ کے کرامت مآب حالات تفصیل سے مذکور ہیں۔ یہاں ہم حضرت کی چند کرامتیں تحریر کرتے ہیں:

خلیل الصیاد نامی ایک شخص کا بیٹا گھر سے چلا گیا۔ ماں باپ دونوں بہت پریشان ہوئے۔ خلیل روتے ہوئے حضرت خواجہ کی خدمت میں آیا، دکھڑا سنایا۔ آپ نے دست دعا بلند فرمایا اور کہا:

”خداوندا! اس میں شک و شبہ نہیں کہ آسمان تیرا ہے، زمین تیری ہے اور ان میں جو کچھ ہے، سب کا تو ہی خالق و مالک ہے، تو اس لڑکے کو یہاں پہنچا دے“۔

خلیل حضرت کی مجلس سے اٹھ کر بغداد کے باب الشام تک آیا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کا بیٹا سامنے سے آ رہا ہے۔ حالاں کہ وہ اس سے بچھڑ کر ”انبار“ پہنچ چکا تھا۔

لوگ حضرت خواجہ معروف کی خدمت میں حاضر تھے، اس دن آپ کے چہرے پر ایک زخم کا نشان تھا۔ ایک شخص نے دریافت کیا تو آپ نے بات ٹالنے کے لیے کہا: اس قسم کے سوالات سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا۔ وہ بضد ہوگیا تو آپ نے نہایت جبر کی حالت میں بتایا کہ میں شب گزشتہ حرم پاک میں تھا، بیر زمزم کے پاس پانی پینے پہنچا تو وہیں پاؤں پھسل گیا اور چہرہ دروازہ سے ٹکرا کر زخمی ہوگیا۔

اخفائے حال:

آپ اپنے احوال کا بے حد اخفا فرماتے تھے۔ صائم النہار اور قائم اللیل تھے۔ مگر کوئی دعوت دے دیتا تو روزہ توڑ کر کھانا کھا لیا کرتے تھے۔ جب آپ کے آخری ایام تھے، ایک شخص نے آپ کے اوراد و اعمال معلوم کرنا چاہے اور شب میں آپ کے حال کی جستجو کی تو دیکھا کہ

آپ بے قراری میں سجدہ کرتے ہیں اور رو رو کر مناجات اس طرح کرتے ہیں کہ آنسوؤں کی جھڑی رکنے کا نام نہیں لیتی۔ اسی حال میں صبح ہوگئی۔

اسی طرح ایک شخص نے مرض الموت میں آپ کے روزوں کی کیفیت دریافت کی تو جواب دیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام ایسے روزہ رکھتے۔ پھر سائل نے اپنے سوال کو دہرایا تو جواباً کہنے لگے: حضرت داؤد علیہ السلام کے روزوں کی یہ حالت تھی۔ اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روزہ کی شان یہ تھی۔

پوچھنے والے نے عرض کیا: حضرت! میں تو آپ کے روزہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ تو فرمایا: میں اپنے روزے کے بارے میں کیا بتاؤں، میں ہمیشہ روزے ہی سے رہتا تھا۔ البتہ کوئی مسلمان بھائی دعوت دیتا تو کھالیتا اور روزہ کا ذکر نہیں کرتا تھا۔

انوکھا میوہ:

جو بندگانِ خدا محض رضائے مولا کے لیے وادیٔ ریاضت میں قدم رکھتے ہیں، انھیں رب کائنات کی رحمت سے روحانیت کے اعلیٰ لذائذ اسی دنیا میں میسر آجاتے ہیں۔

محمد بن منصور طوسی نامی ایک عابد کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے روزے شروع کیے اور دل میں یہ بات ٹھانی کہ جب تک طیب و پاکیزہ ترین کھانے کی شی، جس میں کسی قسم کا ریب اور شک نہ ہو، میسر نہیں ہوگی، افطار نہیں کروں گا۔ اس طرح تین روز گزر گئے اور مجھے افطار کی نوبت نہیں آئی۔ جب چوتھا دن آیا تو دل میں بات آئی کہ کسی بندۂ حق کے پاس چلوں اور اس کے پاس سے جو کچھ ملے، اس سے افطار کروں۔ میں خواجہ معروف کرخی کے پاس پہنچ گیا۔ آپ نمازِ مغرب پڑھ کر نکلے تو مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اپنے بھائی کے پاس جا اور جو ملے کھالے۔ میں رنجیدہ ہوا اور عذر پیش کیا۔ انھوں نے یہی بات تین بار دہرائی۔ میں عذر خواہی کرتا رہا۔ پھر انھوں نے مجھے اپنے ساتھ بلایا۔ میرا ضعف و نقاہت سے بُرا حال تھا، ان کے کہنے پر میں ان کے بائیں جانب بیٹھ گیا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آستین میں داخل کیا، مجھے اس میں سے ایک پھل دستیاب ہوا، جس پر دانت کے نشان تھے۔ میں نے اسے کھایا تو اس کی لذت عجیب و غریب تھی۔ میں نے آج تک دنیا میں ایسا لذیذ میوہ نہیں کھایا۔ اس کی برکت یہ ہوئی کہ میں پیاس سے بے نیاز ہو گیا۔

قبولیت دعا:

حضرت خواجہ معروف کرخی بغداد کی گلیوں سے گزر رہے تھے، ایک جگہ انھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا کہ کسی کو پھانسی دی جارہی ہے۔ جلاد نے اس کی گردن میں رسّی کھینچی اور وہ اس عالم سے دوسرے عالم میں چلا گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت خواجہ معروف بہت مضطرب ہوئے اور بارگاہِ رب العالمین میں دست دعا دراز کیا:

”رب العالمین! اس نے دنیا میں اپنے کیے کی سزا پائی ہے، تو اسے اب اپنی رحمت سے معاف فرمادے، تیری مغفرت و بخشش بے انتہا ہے“۔

اہل بغداد نے اس روز ایک غیبی آواز سنی کہ جو شخص اس سزا یافتہ مسلمان کے جنازے میں شریک ہوگا، آخرت میں درجۂ عظیم پائے گا۔ پھر کیا تھا، ہر چہار جانب سے نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ اس کی لاش کو عزت سے نہلا دھلا کر کفن پہنایا گیا اور

جنازہ کی نماز کے بعد تدفین عمل میں آئی۔

اس واقعہ سے لوگ سخت حیران تھے کہ ایک مجرم شخص جسے قانونِ اسلامی کے مطابق سزا دی گئی، اتنی عزت و توقیر کا حامل کیسے ہوگیا۔ اسی رات کسی صاحب باطن بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت کا میدان ہے اور وہ سزا یافتہ شخص لباسِ فاخرہ میں ملبوس بڑی عزت کی جگہ کھڑا ہے۔ سوال ہوا کہ یہ درجہ تمہیں کیسے ملا؟

جواب دیا: یہ تمام انعامات و اکرامات خواجہ معروف کرخی کی دعائوں کا صدقہ ہے۔

لوگوں نے ایک بار دیکھا کہ حضرت خواجہ معروف کرخی کچھ تناول فرما رہے ہیں اور آپ کے چہرے بشرے سے مسرت کی کرنیں پھوٹی پڑ رہی ہیں۔ بہت ہی خوش دکھائی دیتے ہیں۔ خوشی کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمانے لگے:

''خدا کا مہمان ہوں اور میزبان مہمان کو جو کچھ کھلاتا پلاتا ہے، اس پر خوشی تو ہونی ہی چاہیے۔ مجھے بھی جو کچھ اس مالک حقیقی سے نصیب ہوتا ہے، اس پر خوش رہتا ہوں۔ اسی طرح اگر تم لوگ بھی خدا پر توکل کرو تو بندوں سے تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے اور جو کچھ اس سے ملے اسی پر شاد کام رہو''۔

رب تعالیٰ کی خشیت اور اس کی محبت آپ کے رگ و پے میں بسی ہوئی تھی۔ خوف کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اذان دینے کھڑے ہوئے، تشہد پر پہنچے تو سر اور داڑھی کے سب بال کھڑے ہوگئے۔ آپ کی زندگی فقر سے عبادت ہے۔ دنیا سے بے رغبتی کا یہ عالم کہ وقت اخیر لوگوں نے وصیت چاہی۔ فرمایا:

''میں مر جائوں تو میری قمیص بھی صدقہ کر دینا۔ کیوں کہ دنیا سے میں اسی حال میں جانا چاہتا ہوں، جس برہنگی میں یہاں آیا تھا''۔

آپ ولایت و معرفت کا وہ خورشید روشن ہیں، جن کے علم و فضل اور دیگر کمالات کو اوصافِ بالا نے چھپا دیا۔ علم معرفت اور خدا شناسی سے بڑا دنیا میں کون سا علم ہوسکتا ہے۔ تاہم آپ کی شانِ علم کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت یحییٰ بن معین و امام احمد بن حنبل (رحمہا اللہ) جیسے اکابر آپ کے پاس آکر فیض علم لیا کرتے تھے اور لکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام احمد بن حنبل کی مجلس میں کہا کہ ''معروف کرخی کوئی خاص علم نہیں رکھتے''۔

امام احمد یہ سن کر جلال میں آگئے اور فرمایا: ''خبردار خاموش! حضرت معروف جن حقائق سے آشنا ہیں، کیا علم کا مقصد اس کے سوا کچھ اور ہے''۔

امام احمد کے صاحبزادے نے ایک بار ان سے پوچھا کہ کیا حضرت معروف عالم ہیں؟ انھوں نے جواب دیا:

''یہی نہیں، بلکہ ان کے پاس تو علم کی جڑ موجود ہے''۔

آپ کی عظمت شان دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی اور دیدۂ بینا رکھنے والے اس گوہر شب تاب کو پہچانتے تھے۔ ایک بار سفیان بن عیینہ کے پاس بغداد سے ایک قافلہ آیا۔ آپ نے قافلے والوں سے دریافت کیا: تمہارے عالم اجل کا کیا حال ہے؟ قافلے والوں نے پوچھا: وہ کون؟ حضرت سفیان بولے: ابو محفوظہ معروف۔ بغداد والوں نے کہا: وہ خیریت سے ہیں۔ حضرت سفیان نے پھر کہا:

''جب تک وہ بغداد میں ہیں، بغداد کے لوگ بھی خیریت سے رہیں گے''۔

حضرت خواجہ معروف کا انتقال ۲۰۰ھ میں ہوا۔ بغداد معلی میں مزار پُر انوار مرجع خلائق ہے۔ آپ کی قبر کو مسلم بزرگوں نے "آزمودہ تریاق" قرار دیا ہے۔ بایں ہمہ عظمت وکمال حضرت خواجہ معروف ایک بار کہیں جا رہے تھے۔ ایک سقہ آواز دے رہا تھا۔ جو کوئی یہ پانی پئے رب تعالیٰ اسے بخش دے۔ آپ روزے سے تھے، مگر آگے بڑھے اور پانی پی لیا۔ بعد وفات کسی نے آپ کو خواب میں دیکھا، پوچھا: رب تعالی نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ فرمایا: سقہ کی دعا اور میرے حسن نیت پر بخش دیا۔

آپ کے مرید خاص حضرت خواجہ سری سقطی علیہ الرحمہ نے بعد وفات خواب میں دیکھا کہ عرش کے نیچے بے ہوش پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر متعجّب ہوئے۔ ہاتف کی آواز آئی: "معروف میرے دیدار کا تمنائی ہے، جب تک اسے مقصود نہیں ملے گا، ہوش میں نہیں آئے گا"۔

اقوالِ زریں:

حضرت ابو محفوظہ معروف بن فیروز کرخی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقوال وفرمودات آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ یہاں چند لکھے جاتے ہیں:

☆... گناہ والوں سے میل ملاپ، گناہ پر راضی ہونا ہے۔ اور گناہ سے راضی ہونا گناہ کرنے کے مانند ہے۔

☆... حصولِ ثواب کے لیے عمل خیر کرنے والا تاجر اور خوفِ نار سے کرنے والا غلام ہے۔ آزاد مرد وہ ہے، جو محض رضائے حق کے ل یے نیکی کرے۔

☆... علم نر ہے اور عمل مادہ۔ دین و دنیا کے تمام کام ان کے ملنے سے ہیں۔

☆... کسی بزرگ سے کسی گناہ کا سرزد ہونا، اس گناہ کو کارِ ثواب نہیں بناتا۔

☆... طالب حق عورت کا مرشد اس کا شوہر ہے، اگرچہ شوہر خود طالب نہ ہو۔

☆... درویشی یہ ہے کہ کسی شی کی طمع نہ کرے اور بے مانگے ملے تو منع نہ کرے اور جو کچھ آجائے اسے جمع نہ کرے۔

☆... مصائب دنیا کا علاج خلق سے دوری اور خُلق سے نزدیکی ہے۔

☆... بخیل مسلمان شیطان کا پیارا ہوتا ہے۔ اور گنہگار سخی کو شیطان ناپسند کرتا ہے۔

☆... تواضع اسے کہتے ہیں کہ جس چھوٹے بڑے عالم یا جاہل مومن یا کافر سے ملے، اسے خود سے بہتر جانے۔

☆... شرکِ ظاہر بتوں کی پوجا ہے اور شرکِ باطن مخلوق پر بھروسہ رکھنا۔

☆... ویران نہ ہونے والی بنیاد عدل ہے۔ شیریں انجامِ تلخی صبر ہے۔ تلخ انجام شیریں شہوت ہے۔ لا علاج بیماری حماقت ہے اور قابل فرار بلا ع یش ہے۔

☆... محبت سیکھنے اور بتانے کی شی نہیں۔

☆... آنکھ سب کی طرف سے بند کر خصوصًا بُری چیز کبھی نہ دیکھ۔

☆... اللہ تعالیٰ جل وعلا جب کسی بندے کی بھلائی چاہتا ہے تو اس پر حسن عمل کے دروازے کھول دیتا ہے۔

☆... جس طرح بُرائی سننا تمہیں پسند نہیں، اسی طرح اپنی تعریف وستائش سے بھی پرہیز کر۔

☆... ایسی گفتگو جس میں کسی کا فائدہ نہ ہو، ضلالت وگمراہی کی علامت ہے۔

☆... دولت کا بھوکا کبھی سچی راحت نہیں پاسکتا۔

☆... عمل کے بغیر آرزوئے جنت گناہ۔ ادائے سنت کے بغیر امید شفاعت فریب۔ فرماں برداری کے بغیر امید رحمت محض جہالت اور حماقت ہے۔

(مآخذ تاریخ ابن خلکان، ج۲/ ص ۱۴۔ تاریخ خطیب بغدادی، ج۳/ ص ۱۹۹/ تا ۲۰۸۔ صفۃ الصفوۃ، ج۲/ ص ۱۷۹/ تا ۱۸۳۔ کشف المحجوب، ص ۲۴۸)

کوزہ: تذکرۂ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ

نیا کوزہ۔ سوندھی سوندھی خوشبو۔ ٹھنڈا پانی۔ موسم گرما۔ تپش، لو۔ حضرت سری سقطی کے ذہن میں ان تمام نے مل کر ایک خواہش کی شکل اختیار کرلی۔ کاش کسی نئے کوزے سے ٹھنڈا پانی پیتا، ٹھنڈا پانی، نئے کوزے کا۔

یہ ایک آرزو تھی، جو اشتیاق کی شکل اختیار کرگئی۔ آپ نے نمازِ عصر ادا کی۔ سلام و دعا کے بعد پھر اسی تمنا نے سر اُبھارا۔ مگر کوئی انجانا محتسب بھی ہے، جو زبان کھولنے کی اجازت نہیں دے رہا ہے۔ مغرب کی نماز بھی ختم ہوگئی، مگر آپ کا ذہن ایک اندرونی خواہش کا استیصال نہ کرسکا۔ آخر صاحبزادی کو آواز دے ہی دی۔ بیٹی نئے کوزے کا ٹھنڈا پانی پلاؤ۔ صاحبزادی نے نئے کوزے کا انتظام کیا اور دھوکر صاف پانی سے لبریز کرکے والد گرامی کے حجرے میں رکھ آئیں، تاکہ ٹھنڈا ہوجائے۔ حسب معمول آپ نے سنن ونوافل کے بعد اوراد ووظائف میں مشغول ہوگئے۔ تسبیح کے دانے گردش میں ہیں، زبان پر تسبیح وتہلیل رواں ہے، مگر دل میں بار بار ایک لطیف سی خلش ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے کوزے کی جانب متوجہ کررہی ہے۔ بار بار اس تصور سے ذہن کو پھیر رہے ہیں اور حقیقی شیرینی حیات جو ذکر الٰہی کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے، اس کی جانب دل ودماغ کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں، مگر دریچہ التفات ہے کہ اسی جانب کھلا ہوا ہے۔

اسی عالم کشمکش میں حضرت سری سقطی پر نیند کا غلبہ ہوا۔ دفعتًہ ایک خوبرو دوشیزہ جگمگاتے ہوئے، بیش قیمت لباس زیب تن کیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ آپ نے دیکھا کہ اس ماہ وش کے انگ انگ سے رعنائی نشاط کی شراب ناب کے چشمے پھوٹے پڑ رہے ہیں۔ مخمور اور رسیلی آنکھیں الفت و یاس کے دو آتشہ بلوریں جام چھلکا رہی ہیں۔ پرخم اور دراز کے نفیس مشاطہ فطرت کے شانۂ تخلیق کے پُرکشش نغمے سنا رہی ہیں۔ اور اس کا دمکتا ہوا رخسار جس پر نزاکت و ملامت بل بل جا رہی ہے، بھینی بھینی سرور انگیز خوشبو سے ماحول میں ایک لطیف جھرجھری سی دوڑ گئی۔ الغرض پورا حجرہ ایک پیکرِ حسن کے جلوؤں میں نہا گیا۔

حضرت سری سقطی حیرت و استعجاب کی تصویر بنے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اے خالق کائنات کی حسین ترین مخلوق! کیا میں جان سکتا ہوں کہ قدرت نے تجھے کس خوش نصیب انسان کے لیے بنایا ہے؟ ایک اندازِ دل ربائی سے محو خرام دیکھ کر آپ نے کس سے پوچھا۔ جواب میں اس کے لب ہائے گہربار کھلے اور ایک نقرئی آواز کانوں پر ساون برسا گئی۔ میں اس شخص کے لیے تو یقیناً نہیں جو کوزے کا ٹھنڈا پانی پیتا ہے۔ ایک لمحہ بعد (گھڑا ٹوٹنے کی) اک آواز بھی ہوئی، جس نے حضرت سری کی آنکھیں کھول دیں۔

حجرے میں پانی نشیبی سمتوں کو مختلف لکیروں کی شکل میں بہہ رہا تھا اور حضرت سری سقطی کے ذہن کو جو ابھی ایک نورانی انجمن سے آیا تھا، اندھیرے میں چمکتی ہوئی لکیروں سے دور تصورات کی اس رنگین وادی میں پہنچا دیا۔ جس کے ابدی حسن کی بھیک لے کر خورشید و قمر ضیا بخش

کائنات بنے ہوئے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد حضرت سری سقطی اپنے پروردگار کے حضور شرم و ندامت کی پیشانی جھکائے ہوئے تھے اور آنکھوں سے بہنے والے اشک ہائے انفعال مصلّٰی کا خشک حصہ بھی بھگو رہے تھے۔ زبان پر تھا: ؎

الٰہی تجھ کو غفور رحیم کہتے ہیں

خواجہ فریدالدین عطار

آپ کا نام محمد ہے۔ لقب فریدالدین۔ اور عطار سے شہرت ملی۔

آپ کے والد کا نام ابراہیم ہے، جن کی کنیت ابوبکر ہے۔ جد امجد کا م نام مصطفیٰ اور پردادا شعبان کے نام سے موسوم ہیں۔

نیشا پور کے موضع ''کدکن'' میں ۶/ شعبان ۵۱۳ھ کو آپ کی ولادت ہوئی۔ وہ زمانہ سلطان سنجر ابن ملک شاہ کا تھا۔ آپ شریعت اور طریقت میں یکتا تھے۔ آپ کا ظاہر وباطن اسلام کے انوار سے مجلی تھا۔ آپ کی زندگی کے اکثر واردات اشعار میں مندرج ہیں۔ خود آپ کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے اشعار کی تعداد سوا دو لاکھ سے زیادہ ہے۔ یہ تمام اشعار، پند و نصائح، اسرارِ معرفت، نکاتِ دینی و شرعی پر موقوف ہیں۔ نثر میں بھی آپ نے کثیر تصنیفات چھوڑی ہیں، بعض محققین نے جن کی تعداد ایک سو چودہ بتائی ہیں۔ نظم کی کتابیں، نثر سے زیادہ ہیں۔ آپ کی تصانیف میں یوں تو اکثر کو مقبولیت نصیب ہوئی، مگر ان میں سے بعض کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔

مثلاً تذکرۃ الاولیاء، مفتاح المفتوح، لسان الغیب، کنت کنزا مخفیا، حیدر نامہ، شرح القلوب، اخوان الصفا، حقائق الجواہر، جواہر الذات، اسرار مشہود وغیرہ۔

سیروسیاحت:

آپ کو سیر وسیاحت کا بہت زیادہ شوق تھا۔ جس کا ذکر اپنے اشعار میں بھی کرتے ہیں۔

چار اقلیم جہاں گردیدہ ام

دامن بلب دگر بوسیدہ ام

اس سے اور اسی قسم کے متعدّد اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں گردی و جہاں بینی سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ اور حصولِ فیوض و برکات کے لیے اہل اللہ سے ملاقات اور عبرت پذیری کے لیے آثار مقابر کی زیارت، آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ بزرگوں کے آستانوں کی حاضری سے بالخصوص آپ کو گہری شیفتگی تھی۔ ان بزرگوں میں بارہ اماموں کا ذکر آپ کے اشعار پر بہت غالب ہیں۔

چہ من در خراساں چوں دفیں شد

ہمہ ملک خراساں انگبیں شد

مختلف انداز وطرق سے ان بزرگوں کی عقیدت آپ کی تحریر میں جھلکتی ہے۔

شہر شاپورم تولد گاہ بود

در حرم گاہ رضا ام راہ بود

اہل بیت پاک اور سادات کرام کی اِنھیں عقیدت کیشیوں کے باعث، اس دور کے بعض علما نے آپ پر رفض کے فتوے بھی دیئے اور سلاطین کے درباروں تک شکایتیں پہنچائیں۔ مگر ان تمام محاذ آرائیوں کے باوجود آپ کی اپنی روِش میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ لسان الغیب

کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مقامات مقدسہ کے علاوہ، مصر و شام ودمشق، کوفہ، رے، خراسان اور مقامات بعیدہ میں دریائے جیحون کو عبور کرکے ہندوستان، ترکستان، چین تک کا سفر کیا۔

اس طویل سفر کی تکمیل کرکے اپنے وطن نیشاپور پہونچے۔ آپ نے ۲۹/ سال کا زمانہ مقام شاذیاخ میں گزارا۔ یہی زمانہ آپ کی تصنیف و تالیف کا ہے۔ شاذیاخ میں آپ کے والد کے زمانہ سے آپ کی عطر کی ایک بہت بڑی دوکان تھی جو ہمیشہ سجی سجائی رہتی تھی۔ دوکان شہر میں اپنی مثال آپ تھی۔ جسے دیکھنے کے لیے لوگ شائق رہتے تھے۔ والد کے بعد ان کی جگہ دوکان پر آپ بیٹھنے لگے۔ انھیں وقتوں میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جس نے آپ کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

عالم بے ثبات:

آپ کی آراستہ پیراستہ دوکان کے سامنے ایک فقیر نمودار ہوا۔ وہ دوکان کے بالکل نزدیک آیا۔ اور گھور گھور کر ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا پھر یکایک اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ شیخ نے دیکھا تو وجہ پوچھی۔ اس پر درویش نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہا: خواجہ! میں تو اس بازارِ دنیا سے بہت آسانی سے جاسکتا ہوں۔ مگر آپ یہ ساز و سامان لے کر کیسے گزریں گے ؟

آپ نے کہا: جس طرح تم جاؤ گے، ویسے ہی میں بھی چلا جاؤں گا۔

درویش نے کہا: میں تو اس طرح چلا جاؤں گا۔ یہ کہتے ہوئے اپنا خرقہ اتار کر سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ چند ثانیہ بعد شیخ نے اسے جھنجھوڑا تو اس درویش کی روح قفس جسمانی سے پرواز کرچکی تھی۔

یہ عبرت انگیز واقعہ دیکھ کر شیخ کی نگاہوں میں دنیا بے وقعت ہوگئی۔ آپ نے دوکان کا سارا ساز و سامان راہ خدا میں لٹا دیا۔ اور بازار عالم کی تجارت چھوڑ کر راہ عشق میں خود کو بیچ ڈالا۔ اور اس زمانہ کے عارف شیخ رکن الدین اکاف کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے ہاتھ پر توبہ کی۔ صوفی المشرب ہونے کی وجہ سے آپ کی زندگی پر شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی عقیدت کا رنگ واضح ہے۔

شیخ کی شہادت کی تاریخ مورخین میں کوئی نہ لکھ سکا۔ ہاں اتنا ضرور بیان کیا جاتا ہے کہ فتنہ مغل اور فتنہ خوارزم کے درمیان آپ کی شہادت ہوئی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لقب مبارک پر موسوم کتاب ''مظہر العجائب'' تصنیف کی تو اس وقت کے بعض علما نے آپ پر رفض کا فتویٰ دیا اور آپ کو واجب القتل قرار دیا۔

جو کچھ ملاوہ:

آپ کی تصوفانہ تحریر و اشعار سے آپ کا روحانی مقام اہل اسلام نے پہچانا۔

اپنی کتاب ''اشتر نامہ'' میں آپ نے سید کونین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت کا حال بڑے والہانہ پیرائے میں تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو میں خواب میں دیکھا۔ وارفتہ عشق ہوکر آپ کی جانب دوڑ پڑا آپ نے کمال شفقت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنا لعاب دہن مبارک میرے منہ میں ڈالا۔ اور فرمایا: اے عطار تم میری حضوری کے لائق ہو۔ اللہ رب العزت نے تمہارے

رگ و پے میں اپنے اسرار ودیعت فرمائے ہیں۔ اب میں یہ خزانہ تمہیں سونپتا ہوں۔ سرکار نے یہ فرمایا اور روپوش ہوگئے۔ مجھے جو کچھ بھی ملا، اسی لعاب پاک کا اثر ہے"۔

شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کو خرقہ سلطان العاشقین حضرت مجد الدین بغدادی قدس سرہ سے ملا۔ عہد طفولیت سے قطب عالم حضرت قطب الدین حیدر کی صحبت پائی تھی۔ حضرت زادہ کے رہنے والے تھے۔ شیخ عطار کے والد انھیں کے مرید تھے۔ ابدال وقت اور مجذوب مطلق تھے۔ شیخ عطار کی زندگی پر آپ کا اثر ابتدا سے تھا۔ حیدر نامہ کی تصنیف اسی فیض صحبت کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ متعدّد قصائد بھی قطب عالم سے گہری عقیدت کا ثبوت ہے۔

انکشافِ حال:

شہادت کے وقت تک شیخ عطار کے بارے میں نیشاپور اور نواح کے مسلمان آپ کی روحانی عظمت و برتری سے کما حقہ واقف نہیں تھے۔ مگر آپ کی شہادت کے بعد ہی قاضی القضاۃ یحیٰی ابن سعد کے لڑکے کا انتقال ہوا خاندان کے کچھ لوگوں نے اظہار خیال کیا کہ متوفی صاحبزادہ کو شیخ کے قدموں میں دفن کیا جائے۔ قاضی صاحب نے منظور نہیں کیا۔ او کہا کہ میں اپنے لڑکے کو ایک بوڑھے افسانہ گو واعظ کے پائتیں کیوں دفن کرنے لگا۔ اسی بحث وتمحیص میں رات ہوگئی اور جنازہ دوسرے روز کے لیے ٹال دیا گیا ہے۔ اسی شب قاضی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ شیخ عطار کے روضہ پر بہت سے اقطاب اہل اللہ جمع ہیں ہزاروں شمعیں روشن ہیں۔ اور تمام حاضرین مشائخ نہایت ادب سے شیخ کے مزار پر مراقب ہیں قاضی نے دیکھا کہ ان کا لڑکا ایک طرف کھڑا رو رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے۔ افسوس میرے باپ نے بڑی غلطی کی کہ اہل اللہ کے قرب سے مجھے محروم رکھا۔ قاضی صبح بیدار ہوتے ہی شیخ کے اقربا کے سامنے معافی کا طالب ہوا اور نہایت منت سماجت کر کے حضرت کے مقبرہ میں دفن کر دیا۔

اس واقعہ نے قاضی پر بہت اثر ڈالا۔ اور اس کے ساتھ حضرت شیخ عطار کی روحانی عظمت کا ڈنکا پٹنے لگا اسی دور میں قاضی یحیٰ بن سعد نے آپ کے روضہ کا گنبد تعمیر کرایا۔

آپ کا مدفن شہر شاذیاخ کے باہر محلہ بازار گاں میں ہے۔ قاضی صاحب کی بنائی ہوئی عمارت کو ابتداء زمانہ نے کھنڈر میں تبدیل کر دیا تھا تو بعد میں نظام الدین امیر علی شیر نے جو آپ سے بیحد عقیدت رکھتا تھا۔ نہایت عالی شان گنبد بنوایا۔ ارد گرد کے باغوں کا اہتمام کیا۔

بازارِ عالم کا یہ عطار بازیگاہِ الفت میں اپنی روحانی عطر بیزیوں کے ساتھ نمایاں ہے کیوں نہ ہو جس کے منہ میں محبوب خدا صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کا لعاب دہن مبارک پڑجائے۔ جسے قطب عالم حیدر جیسا معلم روحانی اپنی تربیت میں رکھے۔ جس کے ہاتھوں میں شیخ رکن الدین اکاف کا دامن ہو۔ جو شیخ نجم الدین کبریٰ (دادا پیر) کا منظور نظر ہو۔ اس کی عظمت شان کا کیا کہنا۔

پاک پروردگار! اُن کی قبر پر رحمت ورافت کے پاکیزہ پھول برسائے، جس کی حمد پاک اس نے اس طرح بھی بیان کی ہے۔ ؎

حمد پاک از جان پاک آں پاک آرا

کو خلافت دار مشت خاک را

مخدوم احمد عبدالحق ردولوی قدست اسرارہ

حضرت شیخ مخدوم احمد کے آبائے کرام بلخ میں آباد تھے۔ نسبی لحاظ سے شیخ کا سلسلۂ پدری امیرالمومنین سیدنا عمر فاروق بن الخطاب تک پہنچتا ہے۔

چنگیزی دور کی خون ریزی میں جب بلخ کے شرفا پر عرصۂ حیات تنگ ہوا تو حضرت شیخ کے دادا جان نے اپنا کنبہ ہمراہ لے کر بلخ سے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس وقت ہندوستان میں سلطان علاء الدین خلجی حکمراں تھا۔ سلطان علما، فقرا سے دلی محبت رکھتا تھا۔ اس نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا، اور صوبہ اودھ میں ان کی رہائش کا بندوبست کیا۔

جد امجد شیخ نصیر الدین محمد چراغ دہلی سے ارادت رکھتے تھے۔ حضرت شیخ کی ولادت ردولی میں ۷۲۹ھ یا ۷۳۰ھ میں ہوئی۔ والدین نے احمد نام رکھا۔ آپ کے والد گرامی کا نام عمر تھا۔ شیخ کے بڑے بھائی جن کا اسم شریف تقی الدین تھا، جید عالم دین تھے، دہلی میں قیام کرتے تھے۔

حضرت شیخ احمد بحر توحید کے غواص ہیں۔ دنیائے تصوف میں آپ قطب عالم، شیخ العالم اور مخدوم کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ آپ مادر زاد ولی اللہ اور روحانیت کے ماہتاب ہیں۔ بچپن میں ایک بار دایہ کی گود سے اڑ کر غائب ہوگئے تھوڑی دیر بعد پھر گود میں آمد ہوئے۔ (شاہ مبین فاروقی منظر و شخصیت و سیرت ص ۴۱)

ابھی عمر شریف سات سال کی تھی مگر آپ نماز تہجد کے پابند تھے۔ گھر والوں سے چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ والدہ ماجدہ بھی تہجد گزار خاتون تھیں۔ مگر انھیں اپنے اس کم سن بچے کا یوں مشقت اٹھانا بار ہوتا تھا اس لیے منع کرتیں۔ آپ پر والدہ کی بات ناگوار گزرتی۔ (شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار "اردو" ص ۳۸۴)

حضرت شیخ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مگر آپ کا دھیان درسی کتب کی جانب نہیں تھا۔ ایک استاذِ صَرف کے پاس بیٹھائے گئے، انھوں نے میزان الصرف کا درس دینا شروع کیا۔ استاذ نے ضرب یضرب ضربًا یاد کرنے کو کہا۔ آپ نے استاذ سے عرض کیا "حق کی راہ میں زدن اور زدہ شدن کی کیا حاجت؟"

شیخ تقی الدین اس کیفیت کو دیکھ کر فکر مند ہوئے۔ اس وقت آپ سن بلوغ کو پہنچ چکے تھے۔ شیخ تقی الدین نے سوچا کہ کیوں نہ ان کا نکاح کرادیا جائے، شاید اس کے بعد دنیاوی امور اور علمی مشغولیات سے دلچسپی لینے لگیں۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر کہ میں شادی کا اہل نہیں، اس سے انکار کردیا۔ (شیخ عبدالحق محدث دہلوی "اردو" ص ۳۸۵) اور دہلی نکل پڑے۔

مرشد کامل کی تلاش:

اس وقت شیخ احمد تلاش حق میں بیقرار تھے۔ دہلی سے روانگی کے بعد سب سے پہلے حضرت شیخ نور قطب عالم کی خدمت حاضر ہوئے انھیں ہری گھاس پیش کی، اور عرض کیا "بابا صفاست" شیخ مسکرائے اور جواب دیا، "بابا عزت است" وہاں سے بہار کی جانب روانہ ہوئے، وہاں شیخ علاء الدین علیہ الرحمہ سے ملاقات کی، اور ایک دوسرے فقیر سے، جنھیں لوگ "نیم لنگوٹھی" کہتے تھے، ان کی صحبت اختیار کی۔ اس

کے بعد آپ میں کچھ قرار آیا اور تلاش مقصود کی جانب ذوق شوق میں مزید مہمیز لگی۔ مگر وہاں بھی زیادہ روز نہ رہ سکے اور اودھ کا رخ کیا اور شیخ فتح اللہ اودھی کے آستانے پر پہنچے۔ مگر وہاں بھی دولت طمانیت سے سرفرازی نہیں ہوئی، دل میں ٹھانی:

"احمد اب تک زندوں سے تو مقصود بدن آیا چل اب مردوں کی صحبت اختیار کر شاید کچھ بوئے محبت آئے"۔

اس خیال سے اودھ کے بیابانوں ویرانوں اور قبرستانوں میں گھوتے پھرتے رہے۔ اور ایک قبرستان میں اپنے لیے اپنے ہی ہاتھوں سے قبر کھودی اور چھ ماہ تک اس میں یاہادی یاہادی کا ذکر کرتے رہے، اسی دوران آپ کو پانی پت جانے کی بشارت ملی، جہاں اس عہد کے عظیم ولی اللہ شیخ جلال الدین کبیر الاولیا آپ کے حصے کی نعمت لیے منتظر تھے۔

(شیخ الہدیہ، سیدالاقطاب "فارسی" ص۲۱۶)

آستانۂ مرشد پر:

محبت الٰہی کی راہ ہر کام سے زیادہ کٹھن اور دشوار ہے۔ اس کی صعوبتیں عیاں گو اور مصائب روح فرسا ہیں۔ مرشدین روحانی سچے ارادت مندوں کے جذبات کا امتحان بھی لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب مرید کو اپنے مقصود میں سچا پاتے ہیں تو اس کے حسب ظرف نعمت سرمدی سے نوازتے ہیں۔ حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیا نے اپنی خانقاہ کے خدام سے انواع واقسام کے کھانے پکا کر دسترخوان آراستہ کرایا۔ اور چند عمدہ نسل کے گھوڑے زین کسوا کر خانقاہ کے باہر کھڑے کرا دیئے۔ اور پھر سب لوگ کسی آنے والے کا انتظار کرنے لگے۔ شیخ احمد شیخ کبیر الاولیاء کی خانقاہ کے پاس پہنچے، تو آراستہ پیراستہ گھوڑے دیکھ کر انھیں تکدر پیدا ہوا۔ اور جب انھوں نے خانقاہ کے اندر قدم رکھا تو انواع واقسام کے لذیذ کھانوں سے مزین دسترخوان نظر پڑا۔ یہ سب دیکھ کر انھوں نے خیال کیا کہ فقر و درویشی کو ان دنیاوی آرائش و زیبائش سے کیا سروکار؟ اور جو شخص اس کروفر سے زندگی گزارتا ہو، اسے معرفت سے کیا تعلق ہوگا؟ وہاں سے فوراً نکل پڑے اور چاہا کہ جلد از جلد پانی پت کی سرحد سے دور چلے جائیں۔ دن بھر چلتے رہے، شام ہوگئی، کسی سے پوچھا: اس جگہ کا کیا نام ہے؟۔ جواب ملا: پانی پت۔ آپ متعجّب ہوئے۔ رات بسر کرنے کے بعد صبح تڑکے ہی پھر جادہ پیما ہوئے۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ راستہ بھول جانے کا شبہ ہوا۔ دیکھا کہ ایک شخص سوکھے درخت پر بیٹھا ہوا ہے اس کے سر پر ٹوپی ہے۔ آپ نے اس سے راستہ پوچھا۔ اس نے کہا:

"راستہ شیخ جلال الدین کبیر الاولیا کے دروازے سے ہو کر گیا ہے اور اگر میرے کہے کا یقین نہ آئے تو دیکھو وہ دو آدمی آرہے ہیں ان سے پوچھ لو"۔

آپ نے ان دونوں آدمیوں سے دریافت کیا تو انھوں نے بھی وہی بات کہی۔ اس واقعہ سے آپ نے سمجھ لیا کہ میرے حق میں خداوند قدوس کا یہی حکم ہے کہ حضرت کبیر الاولیا کی بیعت کروں۔ چنانچہ خانقاہ شریف کی طرف چل پڑے۔ راستہ میں سوچا اگر حضرت کبیر الاولیا اپنی کلاہ مبارک، اپنے مرشد کے مزار شریف سے مس کر کے مجھے بیٹھائیں۔ اور مجھے نان و حلوہ عنایت کریں تو کیا خوب ہو۔

بیعت و خلافت:

خانقاہ شریف میں داخل ہوئے تو لوگوں نے بتایا کہ حضرت اپنے مرشد شمس الدین ترک کے مزار پر گئے ہوئے ہیں جو تھوڑی ہی دور پر ہے۔ آپ وہاں پہنچ کر قدم بوس ہوئے۔ حضرت کبیر الاولیا علیہ الرحمہ نے اپنی ٹوپی شریف سر سے اتار کر اپنے مرشد کے مزار شریف سے

مس کر کے انھیں پہنائی۔ اس دوران ایک شخص حضرت کے پاس نان اور حلوہ لیے ہوئے آیا۔ حضرت نے وہ بھی آپ کو دیا اور فرمایا ''یہ تھی تمہاری خواہش'' (شیخ الہدیہ بن شیخ عبدالرحیم چشتی، سیر الاقطاب ص۲۱۷)

اس کے بعد آپ نے حضرت کبیر الاولیا کے دست مبارک میں اپنا ہاتھ دے کر ان کی بیعت کی اور حضرت کی صحبت اختیار کرلی۔ اخبارالاخیار میں ہے کہ یہ ظن ہوکر خانقاہ سے واپس جانے کا واقعہ بیعت کے بعد کا ہے۔ اور سوکھے درخت پر آپ خود جا بیٹھے تھے اور راستہ دریافت کرنے پر دو آدمیوں نے کہا کہ راستہ تو شیخ کبیر الاولیا کے دروازے سے ہوکر گیا ہے۔ یہ سن کر آپ پھر حضرت کی خدمت میں واپس آگئے۔ کچھ دنوں بعد حضرت کبیر الاولیا علیہ الرحمہ نے اپنی خلافت سے نوازا، اور حرقہ مبارک عطا کیا۔ اور فرمایا ''میں نے خداوند ذوالجلال سے دعا کی ہے کہ ہمارا سلسلہ تم سے جاری ہو، تمہارے نور معرفت سے عالم روشن ہو، جس کا اثر قیامت تک باقی رہے، اور غلغلہ کبھی کم نہ ہو۔ (شیخ اہدیہ بن شیخ عبدالرحیم چشتی، سیر الاقطاب ص۲۱۸)

آپ بحر توحید میں مستغرق تھے، بارگاہ رب کریم سے آپ کو عبدالحق کا خطاب عطا ہوا، اور آپ کو احمد عبدالحق ''کہا جانے لگا۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں ''حضرت پیر دستگیر نے بارگاہ الٰہی سے عبدالحق کا معزز خطاب پایا۔ اور سیدالاولین والآخرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی میں انتہائی مساعی کیں۔ چونکہ ان کو عبدہ و رسولہ کہا گیا تھا، اس لیے ان کو عبدالحق کا لقب ملا''۔

(شیخ عبدالقدوس گنگوہی۔ انوارالعیون فی اسرارالمکنون ص۵ / بحوالہ دستگیر بیکساں ص۴۶)

خرقہ اور خلافت ملنے کے بعد آپ پانی پت سے اپنے وطن ردولی تشریف لائے اور یاد الٰہی میں مشغول ہوئے۔

اوصافِ حمیدہ:

حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی کی ذات مبارکہ میں قدیم اولیائے کرام کی خوبیاں اور کمالات موجود تھے۔ شریعت مطہرہ کی کامل پابندی، نماز باجماعت کا التزام، ہر نماز کے لیے مسجد جانا، آپ کا معمول تھا۔ آپ بچپن سے ہی تہجد کے پابند تھے۔ اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ شب بیداری کے لیے اٹھ جاتے تھے۔ آگے چل کر آپ کا یہ معمول بن گیا کہ شب پچھلے پہر جامع مسجد ردولی پہونچ جاتے اور خود اپنے ہاتھوں سے مسجد کی صفائی کرتے، جھاڑو لگاتے، قوانین شرعیہ کا احترام کرتے۔ ایک بار سفر پنجاب کے دوران آپ کی زبان سے شطحیات نکل گئے خیال آیا تو اس کے کفارے میں ہفتوں دریائے سندھ کے پانی میں شام سے صبح تک کھڑے رہتے۔ اور زبان پر یہ ورد ہوتا: ''دین محمد قائم دائم''۔

(مولانا عبدالمصطفیٰ صدیقی، دستگیر بیکساں ''ص۱۸/ مطبوعہ بزم رضائے مخدوم ردولی شریف بارہ بنکی)

جلوۂ حق:

عظمت وکرامت، ترک و تجرید، حضرت کا خاصہ تھا۔ اکثر عرفان الٰہی میں مستغرق رہتے۔ سیف لسان تھے جو فرما دیتے تھے، وہی ہوجاتا۔ ابتدائی دور میں شیخ تقی الدین نے آپ کو اہم حکم مہری شیخ نے لے کر زمین میں دفن کردی انھوں نے دوبارہ مہر طلب کی تو کہا کون سی مہر؟ شیخ تقی الدین نے اپنی اہلیہ سے کہا میں انھیں کیا پڑھا سکتا ہوں یہ تو ایسے علم میں مستغرق ہیں، جس کے مقابلے میں ہمارے علم کی کوئی رواہ ہی نہیں۔ (مولانا عبدالمصطفیٰ صدیقی دستگیر بیکساں)

تقریباً پچاس سال تک نماز پنجگانہ کے لیے مسجد آتے جاتے رہے، مگر مسجد کا راستہ نہیں جانتے تھے۔ اہل ارادت میں سے کوئی حق حق حق کہتا ہوا آگے آگے چلتا تھا۔ اس آواز کے سہارے آپ راستہ طے فرماتے تھے۔ اکثر اسی میں گم رہتے جب کوئی حاجت ہوتی تو لوگ حضرت کے کان میں تین بار حق حق حق پکارتے تو اس وقت ہوش میں آجاتے۔ گویا آپ نے خود کو ذات حق میں اس طرح فنا کردیا تھا کہ ذات حق کے سوا آپ کا کوئی مقصود نہیں تھا۔ آپ کی شخصیت پر اسم پاک ''حق'' کا غایت درجہ غلبہ اور فیضان تھا۔ آپ نے جب نکاح فرمایا تو گھر جو بھی بچہ تولد ہوتا تین بار حق حق حق کہہ کر دم توڑ دیتا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ جو خود بھی پارسا تھیں اس غم میں نڈھال رہتیں۔ ایک بار اس بات کی وجہ سے حضرت کے سامنے رونے لگیں کہ میرا کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا۔ آپ نے اہلیہ صاحبہ کی دلداری فرمائی اور کہا: ''اچھا فکر نہ کرو اب جو بچہ ہوگا، انشاء اللہ زندہ رہے گا''۔ اس واقعہ کو شیخ عبدالقدوس گنگوہی علیہ الرحمہ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''(اپنی اہلیہ محترمہ کی گریہ وزاری پر) حضرت شیخ العالم فرماتے ہیں، رنج وفکر نہ کرو، ایک لڑکا ہے انشاء اللہ تعالیٰ دوں گا۔ ابھی وہ پختہ کار نہیں ہے۔ اسے سفر میں لیجاؤں گا۔ اس کی داشت پرواخت کرکے۔ اسے پختہ کار بناکر لاؤں گا۔ اور اس شرط پر تمہارے سپرد کروں گا کہ اس کو کچھ نہ کہنا۔ ہمیشہ اس کی دل جوئی کرنا۔ جو وہ کہے اس کی سننا، اس کی تعمیل کرنا حضرت شیخ العالم کی اہلیہ نے یہ تمام شرطیں منظور کیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد حضرت شیخ العالم کے گھر میں ایک فرزند تولد ہوا۔ شیخ عارف احمد نام رکھا گیا''۔

(شیخ عبدالقدوس گنگوہی صدیقی، انوار العیون فی اسرار المکنون ص ۴۰/ بحوالہ و دستگیر بیکساں ص ۲۰،۱۹)

کرامت:

حضرت المخدم قدس سرہ، جود وسخا میں بھی یکتا تھے۔ غرب پروری، مساکین نوازی آپ کا وصف تھا۔

انوارالعیون میں ہے کہ آپ کے اکثر مریدین کے انتقال کے وقت ان کی زبان پر اسم پاک حق جاری ہوتا تھا۔ اسی طرح خانقاہ میں غیب سے حق حق کی آواز آتی تھی۔

(اخبار الاخیار ص ۴،۷)

جو بھی مہمان آتا، اس کی خاطرداری کا اہتمام فرماتے۔ اہل ارادت و محبت کی طرف سے نذر و نذرانے آتے، جن میں سے کبھی قبول فرماتے۔ اور کبھی واپس فرمادیتے۔ جو آتا، یتیموں، بیواؤں اور مفلس، فقرا میں تقسیم کرادیتے۔ آپ کے جود و نوال کا دسترخوان عام تھا۔

ایک بار آپ نے ایک دیگ کھانا پکوایا اور اسے راستے میں رکھ دیا۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ اس میں سے لے اور کھائے۔ چنانچہ تین شبانہ روز ہزاروں افراد اس سے لے کر کھانا کھاتے رہے۔ مگر دیگ ختم نہیں ہوئی۔ تین روز بعد آپ نے حکم دیا کہ دیگ کو اٹھا لیا جائے۔ (ڈاکٹر ظہورالحسن شارب، خم خانہ تصوف، ش ۱۹۷/ مطبوعہ صابری دارالکتب لاہور)

فرمایا: رزاق مطلق خدا ہے۔ وہی دینے والا اور جاننے والا ہے۔ عبدالحق! تو اب اس معاملہ کو ختم کر اور دیگ کو دیگ دان سے اتار اور طالبان فقر کے لیے حق کے نعرے کا اضافہ کر اور دیگ کو زمین پر پھینک دے۔ (اخبارالاخیار ص ۴۰۸)

تربیت مرید:

آپ کی خدمت میں جو لوگ بیعت کے لیے آتے آپ انھیں ان کے لحاظ سے ان کی نفسانی خواہشات توڑنے اور عجز و انکساری اپنانے کا عملی سبق دیتے اس کے بعد اسے کلاہ ارادت پہناتے تھے۔ عام طور پر لوگوں کو حکم دیتے کہ خانقاہ شریف کے لیے آٹھ روز تک پانی بھر کر لائیں۔ اور لکڑیاں جمع کریں۔ مرید کرنے سے پہلے فرماتے کہ حوض سے گھڑا بھر کر سر پر رکھ لائیں۔ میاں سالار نامی ایک معزز شخص کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مرید ہونے کے لیے حاضر ہوئے۔ خانقاہ کے مریدین مٹی کا گارا بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ میاں سالار کے جسم پر قیمتی ستھرا لباس تھا۔ حضرت نے حکم دیا تم بھی ان میں گھر جاؤ۔ میاں سالار نے تعمیل حکم کی۔ تھوڑی دیر بعد حضرت نے انھیں داخل سلسلہ کیا۔

(مولانا عبدالمصطفیٰ صدیقی، دستگیر بیکساں ص ۲۴)

بعض اہل ارادت کو رموز طریقت عملی طور پر سمجھاتے۔ انھیں لوگوں میں مخلص شاہ نامی شخص بھی رہتے تھے۔ ابتداءً ان کا یہ حال تھا کہ صبح و شام حاضر دربار رہتے مگر حضرت تھے کہ کبھی ان پر نگاہ توجہ نہیں فرماتے تھے۔ اسی طرح چھ ماہ گزر گئے ایک روز گھر لوٹتے ہوئے مخلص شاہ کے ذہن میں بدظنی نے سر ابھارا کہ بھلا یہ کیسے بزرگ ہیں بات بھی کرنا گوارہ نہیں کرتے۔ ابھی اپنے گھر میں پہنچے ہی تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ حضرت ہیں۔

حضرت المخدوم: مخلص شاہ تمہیں مجھ سے شکایت ہے کہ التفات نہیں کرتے۔ تو سنو اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادی سے فارغ ہونے کے بعد میرے پاس آنا۔

مخلص شاہ نے تعمیل حکم کی اور پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے زمین میں گڈھا گھود کر اس میں ایک کنکڑ ڈالا اور مخلص شاہ سے کہا کنکر کو ڈھونڈ کر نکالو۔ انھوں نے نکال دیا۔ اس کے بعد آپ نے کچھ مٹی لے کر گڈھے کے پانی میں ملا دی اور کہا اب مٹی کو الگ نکالو۔ مخلص شاہ نے عرض کیا۔ حضور مٹی تو پانی میں حل ہوگئی اسے کیسے نکالوں؟

فرمایا: مخلص شاہ! اگر تلاشِ حق کے لیے مقصود کے سمندر میں پہنچنا چاہتے ہو تو اس مٹی کے مانند ہو جاؤ جس نے اپنا وجود پانی میں گم کر دیا۔ تم بھی ذات حق میں اپنے نام و نشان کو فنا کر کے اس بقا سے باقی ہو جاؤ اگر یہ کر سکتے ہو تو آکر میری خانقاہ میں رہو۔ ورنہ چلے جاؤ۔ یہ کام مردوں کے ہیں نامردوں کے نہیں۔

جناب مخلص شاہ واقعی اسم بامسمیٰ تھے۔ انھوں نے حضرت کے ارشاد کے بموجب کوشش کی اور حضرت کی خلافت سے سرفراز ہوئے۔

(مولانا عبدالمصطفیٰ صدیقی۔ دسرگیر بیکساں ص ۲۴)

حضرت المخدوم اپنے ارادت میں اس بات کو راسخ فرماتے تھے کہ مرید کو مرشد کے حضور ''مرد بدسرت عنسال'' کی طرح ہونا چاہیے۔ جو اس معاملے میں جتنا راسخ ہوگا اسے اتنا ہی فیضان ہوگا۔ حضرت کے ایک مرید کا نام شیخ بختیار تھا۔ آپ نے انھیں حکم دیا کہ خانقاہ کے احاطہ میں ایک کنواں کھودو۔ انھوں نے کھود ڈالا۔ کام پورا ہوگیا۔ پھر فرمایا خانقا کے باہر سے مٹی لالا کر اب اس کنویں کو پاٹ ڈالو۔ اور کنویں سے نکلی ہوئی مٹی سے میرے لیے ایک چبوترہ تیار کرو۔ انھوں نے بلا تامل حضرت کے حکم پر عمل کیا۔ اور نہ چوں و چرا کیا۔ نہ سوال و جواب۔ شیخ بختیار اپنی

ارادت میں نہایت پختہ تھے۔ اس کا یہ اثر تھا کہ بالکل ان پڑھ ہونے کے باوجود دقیق عملی مسائل پلک جھپکتے حل کر دیتے تھے۔ اور بہت سے دانشمندان سے اپنے مشکل معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ (مولانا عبد المصطفیٰ۔ دستگیر بیکساں ص ۲۶)

اپنے شیخ کے خلافت و خلعت پانے کے بعد حضرت المخدوم جب اپنے وطن ردولی تشریف لائے تو باوجود اس کے کہ ردولی حضرت کا آبائی وطن تھا۔ ایک روحانی حکمراں کی حیثیت سے پہلے شیخ صلاح کے مزار پر حاضر ہو کر قیام کی اجازت طلب کی اور خواہش کی کہ اگر حضرت صلاح کی طرف سے مجھے ایک مصلیٰ اور ایک صراحی مل جائے تو میں اسے اجازت پر محمول کروں گا۔ چنانچہ فاتحہ اور درود خوانی کے بعد حضرت المخدوم نے جب مزار پر مراقبہ کیا تو قبر سے آواز آئی کہ جاؤ تالاب سے مصلیٰ اور صراحی لے لو۔ حضرت نے تالاب میں ہاتھ ڈالا پہلے صراحی اور دوبارہ چارپائی کا جھلنگہ پایا۔ اور بتا گیا کہ یہی مصلیٰ ہے۔ (مولانا عبد المصطفیٰ۔ دستگیر بیکساں ص ۲۸)

علوئے مرتبت:

حضرت المخدوم کا روحانیت، تصوف اور معرفت میں کتنا بلند مقام تھا، اس کو عرفائے حق سے سمجھا جاسکتا ہے۔ محقق علی الاطلاق حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی ضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

”شیخ احمد عبد الحق قدس سرہ مرید شیخ جلاں پانی پتی است، درویش صاحب تصرف مظہر خوارق و عادات و سکر و حالت و فقر و تجرید بود، جذبہ قوی داشت و نظر مؤثر و تصرفے غالب، مولد او ردولی است و مرقد او نیز درانجاست“۔

(شیخ عبالحق محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار ص ۱۸۲)

شیخ احمد عبد الحق قدسرہ شیخ جلال پانی پتی کے مرید ہیں آپ صاحب تصرف فقیر ہیں۔ آپ صاحب خوارق و کرامات تھے۔ ذوق و شوق، سکر و حال فقر و تجرید والے تھے۔ قوی جذب، مؤثر نظر اور غالب تصرف رکھتے تھے۔ ان کا مقام پیدائش ردولی ہے۔ اور وہیں ان کا مزار بھی ہے۔

شیخ الہدیہ بن شیخ عبد الرحیم چشتی۔ سیر الاقطاب میں فرماتے ہیں:

”اس فقیر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حضرت شیخ العالم احمد عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند فرزندوں اور مریدوں میں ایسے صاحب عظمت و کرامت موجود ہیں کہ اگر وہ تیر رفتہ کو اشارہ دے دیں تو واپس آجائے۔ اور اگر پہاڑ کو حکم دیں تو اپنی جگہ سے جنبش کھا جائے۔ زمانہ سابق میں جو بزرگ گزر چکے ہیں، مثلاً ان کے صاحبزادے شیخ عارف اور ان کے پوتے شیخ محمد اور شیخ محمد کے مرید و خلیفہ شیخ عبد القدوس گنگوہی سے سارا زمانہ واقف ہے“۔ (شیخ الہدیہ بن شیخ عبد الرحیم چشتی، سیر الاقطاب ص ۲۱۸)

تیر جستہ باز گرداند ز راہ:

حضرت المخدوم کے مرید و خَلیفہ، مخلص شاہ ایک روز حاضر دربار ہوئے اور عرض کیا: حضور عالی! میرا لباس بوسیدہ ہو چکا ہے میں چاہتا ہوں کہ نیا لباس پہنوں اور اس دار فانی سے کوچ کر جاؤں۔ حضرت نے فرمایا: کچھ روز انتظار کر لو۔ انھوں نے دوسرے اور تیسرے روز بھی یہی درخواست کی۔ مگر ہر بار وہی جواب ملا۔ مخلص شاہ گھر آئے اور اپنے فرزندوں کو سمجھایا کہ میرے بیٹو! اب میں اس دنیا سے رحلت کر رہا ہوں۔ تم لوگ میرے مرنے کی اطلاع میرے پیر و مرشد کو نہ دینا۔ اور جس قدر ممکن ہو مجھے جلد دفن کر دینا، ورنہ وہ مجھے جانے نہیں دیں گے۔

یہ کہہ کر مخلص شاہ نے چار پائی پر لیٹ کر سر سے پاؤں تک چادر تان لی۔ چند لمحے بعد ان کے لڑکوں نے دیکھا تو وہ جان بحق ہو چکے تھے۔ مخلص شاہ کے ایک فرزند کا نام بہرام تھا وہ اپنے والد کی بات کو آزمانا چاہتا تھا۔ چنانچہ خانقاہ شریف جاکر حضرت کو مخلص شاہ کے انتقال کی خبر دی۔ حضرت تشریف لائے اور جنازے سے چادر ہٹاکر زور زور سے مخلص مخلص پکارا۔ آواز سن کر اور بھی بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ حضرت المخدوم مخلص شاہ کے کان میں اس وقت تک آواز دیتے رہے تاآنکہ ان کی روح جسم میں واپس نہ آگئی۔ اور وہ اٹھ بیٹھے۔ اور حضرت کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اس وقت مخلص شاہ کی یہ کیفیت تھی کہ زبان سے کچھ نہ بولتے تھے بس سینے پر ہاتھ مارتے تھے۔ حضرت المخدوم خانقاہ شریف تشریف لے گئے، مخلص شاہ نے پھر اپنے فرزند بہرام کو بھیجا کہ جاؤ اور میرے لیے آخرت کے سفر کی اجازت مانگ لاؤ۔ حضرت نے فرمایا: مخلص سے کہو، چند دن رک جاؤ، ہم تم ساتھ چلیں گے۔ پھر کہلایا کہ حضور اب یہاں رکنا میرے امکان میں نہیں ہے۔ فرمایا بہرام مخلص سے جاکر پوچھو کہ کہاں جاؤ گے تاکہ میں بھی وہیں آؤں۔ مخلص شاہ نے عرض کیا حضور مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ اب مجھے صرف جانے کی اجازت چاہئے۔ فرمایا! بہرام اپنے باپ سے پوچھو کسی شئ کی حاجت ہو تو دی جائے۔ مخلص شاہ نے عرض کیا۔ سرکار کے طفیل مجھے ہر مراد مل چکی ہے۔ اب صرف اجازت رحلت درکار ہے۔ حضرت نے اجازت مرحمت فرمائی۔ اور مخلص شاہ نے پھر از خود اپنے جسم کو چادر سے لپیٹا اور واصل بحق ہو گئے۔ اور حضرت مخدوم کے عطا کردہ خرقہ کے ساتھ مدفون ہوئے۔

(شیخ عبدالقدوس گنگوہی، انوار العیون فی اسرار المکنون بحوالہ دستگیر بیکساں ص ۴۵، ۱۴)

چہ خوشتر آنکہ دریں دور ناہموار
دوست ہر درست رسد یار بہ یار

فرمودات:

نظامی گنجوی ناقص تھا، جس نے یہ شعر کہا: ؎

صحبت نیکاں ز جہاں دور گشت
خوان عسل خانہ زنبور گشت

کیوں کہ حضور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت مبارکہ جس طرح صحابہ کرام کو حاصل تھی۔ ارباب جمال اور محبوبان ذوالجلال کو ویسی ہی اب بھی حاصل ہے۔

فرمایا: منصور بچہ تھا، طاقت ضبط نہیں رکھتا تھا، اسرار کو فاش کر دیا۔ کچھ ایسے مردان حق ہیں جو سمندر پی جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔

حضرت المخدوم کا توشہ:

محبانِ اولیاء اللہ اور مسلمانانِ ہند میں صدیوں سے حضرت المخدوم احمد عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کا توشہ شریف نہایت مشہور و معروف چلا آیا ہے۔ اس کی دین اسلام میں اصل نذر و نیاز اور ایصال ثواب ہے، جس سے کسی بھی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ حضرت مخدوم ردولوی علیہ الرحمہ کے توشہ کے بارے میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رقم طراز ہیں:

”حضرت کے ایک مرید تھے، جن کا نام شیخ بختیار جونپوری تھا۔ وہ تجارت کے سلسلہ میں اکثر باہر کا سفر کرے تھے۔ ان کی اہلیہ کا یہ طریقہ تھا کہ جب شوہر کی خیریت بہت دنوں معلوم نہ ہوپاتی تو وہ ایک سفید روٹی پکاکر اس پر ایک دانگ گھی اور ایک دانگ شکر ڈال کر، حضرت کی خدمت میں پیش کرتیں، اور اپنے شوہر کا حال دریافت کرتیں، اور حضرت ان کا حال بیان فرماتے۔ حضرت شیخ العالم نے اس کا نام توشہ رکھا تھا“۔ (شیخ عبدالقدوس گنگوہی، انوارالعیون فی اسرارالمکنون ص ۳۵)

شیخ عبدالرحمن مرأۃ الاسرار میں لکھتے ہیں:

”حضرت شیخ العالم اجودھیا کے اندر چھ ماہ کا چلہ کیا تو میعاد پوری ہونے پر قبر خود بخود شق ہوگئی۔ اس وقت مریدین آپ کی خدمت میں پکی ہوئی روٹیوں پر گھی اور شکر چھڑک کر لائے۔ آپ نے اس میں سے قدرے چکھا اور بقیہ حاضرین میں تقسیم فرمادیا“۔ (شیخ عبدالرحمن چشتی، مرأۃ الاسرار بحوالہ دستگیر بیکساں ص ۸۲، ۳۸، ۲۷)

حضرت شیخ الہدیہ چشتی کے بیان کے مطابق:

”توشہ گیہوں کی روٹی، گھی اور شکر سے عبارت ہے۔ اس کے پکانے کا طریقہ یہ ہے کہ سواسیر گیہوں کا آٹا لے کر پاک صاف ہوکر روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ ان پر پاؤ سیر گھی اوپر سے ڈالا جائے پھر پاؤ سیر شکر چھڑکی جائے۔ اور شیخ العالم کی روح پر فتوح کو ایصال ثواب کیا جائے۔ اس کے علاوہ حلوہ تربناکر بھی فاتحہ کیا جاسکتا ہے“۔

(شیخ الہدیہ سیرالاقطاب بحوالہ دستگیر بیکساں ص ۳۶،۳۵)

حضرت کا توشہ حصول مقصد کے لیے تریاق کا اثر رکھتا ہے۔ گرفتاران بلا اور مصیبت زدگان کے لیے نہایت مجرب ہے۔ انوارالعیون میں ہے کہ مزید حیات، اور ترقی درجات کا ذریعہ ہے۔

(شیخ عبدالقدوس گنگوہی، انوار العیون، ص ۸۲)

بہتر ہے کہ توشہ شریف حصول مقصد سے پہلے دیا جائے۔ حضرت شیخ العالم کا طریقہ تھا کہ توشہ شریف اپنی خانقاہ کے مریدوں کے علاوہ کسی کو نہیں دیتے تھے۔ حضرت شیخ عارف علیہ الرحمہ نے بعد میں اجازت عطا فرمائی کہ توشہ صاحب سجادہ، اور اولاد شیخ حضرت کے مریدوں کے علاوہ خوش عقیدہ متقی اور عابد مسلمانوں کو بھی کھلایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح حضرت کے نام کا وظیفہ بھی حصول مقاصد کے لیے مجرب ہے، اور ہندوستان میں نجدیت، وہابیت کے آغاز سے قبل تک عام مسلمانوں میں مروج تھا۔ اور بحمدہ تعالیٰ آج بھی مسلمانان اہل سنت اور خصوصًا سلسلہ چشتیہ احمدیہ میں چلا آرہا ہے۔ اور اہل حاجت کے لیے حصول مقاصد کا ذریعہ ہے۔

(شیخ الہدیہ، سیرالاقطاب)

اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ باوضو ایک نشست میں حصول مراد تک روز آنہ، تین سو ساٹھ مرتبہ ورد کرے۔

”اغثنی وامددنی یا شیخ احمد عبدالحق“

سطور بالا میں گزر چکا ہے کہ آپ نے نکاح فرمایا، اس کے بعد جو بچہ پیدا ہوتا حق، حق، حق کہہ کر فوت ہوجاتا۔

شیخ محقق پہلے صاحبزادے کی ولایت کا واقعہ اس طرح لکھتے ہیں:

''منقول ہے کہ آپ کے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام عزیز رکھا گیا۔ پیدائش کے وقت ہی سے اس بچے کی زبان سے حق، حق کی صدائیں بلند ہتی تھیں۔ اس کے بعد اس بچے کی بہت سی کرامات کا ظہور ہوا۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں اس کی بڑی شہرت ہوگئی۔ ایک دفعہ آپ نے لوگوں کا یہ شور وغیرہ سنا تو فرمایا کہ ہمارے گھر کے متعلق لوگوں کا ایسی ایسی باتیں کرنا مجھے پسند نہیں۔ اس کے گھر سے نکل کر قبرستان میں گئے اور ایک جگہ پر کھڑے ہوکر فرمایا عزیز کی قبر یہاں ہوگی۔ چنانچہ اس کے دو، تین روز بعد لڑکے کا انتقال ہوگیا''۔

(شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبارالاخیار اردو، ص ۴،۶۔ مطبوعہ نور پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۰ء)

اسی طرح جو لڑکا پیدا ہوتا حق، حق، حق کا نعرہ لگاکر فوت ہوجاتا۔ پھر جب حضرت کی اہلیہ صاحبہ بہت روئیں تو حضرت کی دعا سے حضرت شیخ عارف پیدا ہوئے، جو حضرت المخدوم کے جانشیں ہوئے۔

وصال:

حضرت المخدوم کا وصال ۱۵/ جمادی الثانی ۸۳۸ھ بعہد سلطان ابراہیم شرقی ہوا۔ ''دستگیر بیکساں'' تاریخ وفات ہے۔ اب بھی ۱۳/ ۱۴/ ۱۵/ جمادی الثانی کو ہر سال ردولی شریف آستانہ عالیہ پر عرس مبارک ہوتا ہے۔ اور دور دور سے اہل عقیدت و ارادت حاضری کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ اور سرکار مخدوم العالم، قطب العالم، شیخ احمد عبدالحق علیہ الرحمۃ والرضوان کے فیض روحانی سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

شیوخ چشتیہ میں ذات تیری فرد کامل ہے
تو غواص معارف ہے تو ذات حق سے واصل ہے
ردولی کی زمین تابندہ ہے مخدوم عالم سے
یہ وہ مٹی ہے جس میں ''ذکر حق'' کا نور شامل ہے
وہ عبد حق جو حق میں غرق حق کے ساتھ زندہ تھا
وہ مخدوم جہاں اس سر زمیں کا ماہ کامل ہے
بھلا وہ حضرت مخدوم کی عظمت کو کیا سمجھے
فیوضِ اولیاء اللہ سے جو قلب غافل ہے
دلوں میں ذکر حق کی کاشت فرمائی ہے حضرت نے
دیار ہند کی مٹی میں ان کا خون شامل ہے
جِلا دو بدؔر کے دل کو اغثنی شیخ عبدالحق
عطائے حق سے آساں ہے تمہیں جو اس کی مشکل ہے

حضرت قطب صاحب اور اشاعت اسلام

قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ، ماوراء النہر کی اوس نامی بستی میں پیدا ہوئے۔ (سیر الاقطاب ص ۱۴۲)
نسبی لحاظ سے حسینی سید تھے۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں داغِ یتیمی سے دوچار ہوئے۔ والدہ ماجدہ نے تعلیم قرآنی کے لیے مدرسہ بھیجا تو حضرت خضر علیہ السلام کی رہنمائی نصیب ہوئی۔ ان کے ہمراہ ابوحفص نامی بزرگ معلم کے پاس پہنچے۔
(خیر المجالس ص ۱۸)

حضرت ابوحفص نے اس مس خام کو کندن بنانے میں دریغ نہ کیا۔ تعلیم ظاہری کے ساتھ ساتھ باطنی اصلاحات پر بھی متوجہ کیا۔ اور ریاضت و مجاہدہ کرا کے راہ سلوک پر لگا دیا۔ عمر نے ترقی کی تو بغداد شریف کا سفر کیا۔ جہاں ایک مسجد کے اندر حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی کی زیارت ہوئی اور ۱۸/۱۹ سال کی عمر میں بیعت ہو گئے۔ اس وقت مجلس میں شہاب الدین سہروردی، شیخ احمد کرمانی، شیخ برہان الدین چشتی، شیخ محمد اصفہانی موجود تھے۔ (سیر الاقطاب ص ۱۴۵)
شرف بیعت حاصل کرنے کے بعد، آپ نے گھر لوٹ کر نکاح بھی کیا مگر چند روز کے بعد زوجہ کو طلاق دے دی۔ سیاحت میں نکل پڑے اولیاء واصفیا کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ عجائباتِ عالم کا مشاہدہ کیا۔ پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری کے اشتیاق میں ہندوستان کی طرف چلے، ملتان میں حضرت شیخ زکریا ملتانی علیہ الرحمۃ باحیات تھے۔ (سیر الاولیا ص ۵۰)
ان کے مہمان ہوئے۔ انھوں نے نہایت شفقت و محبت کا سلوک کیا۔ حاکم ملتان قباچہ آپ کا بے حد معتقد ہو گیا۔ اس نے ملتان میں قیام کرنے کی درخواست کی۔ (سیر الاولیا ص ۵۰)
آپ نے فرمایا یہ حضرت بہاء الدین زکریا کی روحانی راجدھانی ہے۔ یہ شہر الٰہی کی پناہ میں رہے گا۔
ملتان سے دہلی آئے سلطان شمس الدین التمش کا زمانہ تھا۔ سلطان فقیر دوست اور پارسا انسان تھا۔ مع ارکان دولت شہر سے باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا۔ اور شاہی محل میں قیام کی پیش کش کی۔ مگر آپ نے شہر سے باہر ہی ایک جگہ قیام فرمایا۔ سلطان ہفتہ میں دوبار حاضر دربار ہوتا اس طرح شاہی ذمہ داریوں کے بہت سے کام کے لیے وقت نہ ملتا۔ حضرت خواجہ قطب الدین صاحب علیہ الرحمۃ نے اس کا احساس فرما کر شہر میں ملک اعزالدین کی مسجد میں اقامت اختیار کر لی۔
دہلی پہنچ کر پیر مرشد سے شوق لقا اور بڑھا۔ آپ نے اپنے آقائے نعمت کے حضور عریضہ روانہ کیا۔ اپنے مرید فرید کا خط پا کر خواجہ غریب نواز بنفس نفیس اجمیر شریف سے چل کر دہلی تشریف لائے۔ ہند کے روحانی تاجدار کی دہلی میں تشریف آوری کا کیا سماں رہا ہو گا۔ ناقابل تصور ہے وہ گھڑی، جب اولیائے ہند کا شہنشاہ ہزاروں مشتاقوں کی بھیڑ میں دہلی میں وارد ہوا ہو گا۔
راویوں کے بیان کے مطابق دہلی اور اطراف دہلی کے تمام اہل فضل و کمال، صلحا اور صوفیا اور علما و مشائخ حتیٰ کہ بادشاہ اور اس اعوان وارکان نے حضور غریب نواز کے دیدار اور آپ کی زیارت سے خود کو شاد کام کیا۔ عالموں میں صرف شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نہ آسکے تو حضور غریب نواز اُن کی ملاقات کو تشریف لے گئے۔ شیخ الاسلام نے عرض کی، خواجہ قطب صاحب کی وجہ سے میری عزت و توقیر معرض خطرے میں ہے۔ حضور غریب نواز نے ان کی دلداری کے لیے قطب صاحب کو اجمیر لے جانا طے کر لیا۔ یہ فیصلہ سن کر بادشاہ التمش اور

عاشقانِ دہلی بے تحاشا پھوٹ پڑے۔ قطب صاحب سے اہل دہلی کو ایسی عقیدت و محبت تھی کہ وہ جہاں قدم رکھ دیتے وہاں کی مٹی لوگ اپنی آنکھوں سے لگاتے۔ آپ کی اجمیر روانگی کا حال سن کر شہر دہلی میں واویلا مچ گیا۔ خلق خدا دیوانہ وار قطب صاحب پر فدا ہو رہی تھی۔ یہ غایت محبت دیکھ کر غریب نواز نے، قطب صاحب کو دہلی ہی میں رہنے کا حکم دیا۔ (سیر الاولیا ص ۵۵،۵۴)

حضور غریب نواز کے وصال سے کچھ پہلے اجمیر حاضر ہوئے اور پیر مرشد کی صحبت اور سجادہ خلافت سے بہرور ہو کر دہلی آ گئے تھے۔ روانگی کے بیس روز بعد حضور غریب نواز اللہ کے پیارے ہوئے۔ آخری رخصتی اور فرمان خلافت کے ساتھ ساتھ قطب صاحب کو حضور غریب نواز نے اپنے دست مبارک سے اپنی کلاہ پہنائی اور شیخ عثمان ہارونی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عصا عنایت فرمایا۔ اپنا مصحف تلاوت اور سجادہ بخشا اور فرمایا یہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امانت خواجگان چشت سے ہوتی ہوئی مجھے ملی تھی۔ میں نے تمہیں سونپی۔ اس کا حق اسی طرح ادا کرنا جیسے مشائخ نے کیا تاکہ قیامت کے دن مجھے مشائخ کے روبرو شرمسار نہ ہونا پڑے۔ اس نعمت کے ملنے پر خواجہ قطب صاحب نے دو رکعت نماز شکر ادا کی۔ حضور غریب نواز نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ جاؤ خدا کے سپرد کیا اور منزل پہنچایا۔ اس کے بعد چند اور نصائح فرما کر روانہ کیا۔

میدانِ عمل:

پھر دہلی پہنچ کر آپ نے اپنی درسگاہ تصف و فقر آراستہ کی۔ اور یہ ایسی عظیم الشان درسگاہ تھی کہ جس کے طلبہ میں وقت کا بادشاہ التمش اس کے وزراء اور صاحبین و مصاحبین سے لے کر عوام الناس تک ہوئے تھے۔ حضرت قطب صاحب دارالسلطنت میں رہ کر اپنی روحانی عظمت اور فقر و استغنا کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کی روح لوگوں میں منتقل فرماتے رہے۔ فقر کا یہ عالم کہ کئی کئی روز تک قطب صاحب کے اہل خانہ کو فاقہ کی نوبت آجاتی۔ ایسے میں آپ کی اہلیہ محترمہ پڑوس سے قرض لے کر خورد نوش کا انتظام کرتیں۔ پڑوس کی بیوی نے ایک دن بی بی صاحبہ کو طعنہ دیا اور کہا میں قرض نہ دو تو تمہارے گھر والے بھوکوں مرجائیں گے۔ بات آپ کے کانوں تک پہنچی تو فرمایا میرے حجرے میں جو طاق ہے، اس میں بسم اللہ شریف پڑھ کر ہاتھ ڈالا کرو اور جس قدر ضرورت ہو کاک (روٹی) مطلوب ہو نکال لیا کرو اور بچوں کو کھلا دیا کرو۔ (سیر الاولیا ص ۴۸)

خواجہ صاحب کے اسم گرام کے ساتھ کاکی کا لفظ اسی مناسبت سے لگا ہوا ہے۔ آپ کے پاس تاعمر اتنا پیسہ کبھی جمع نہ ہوا جس پر زکوٰۃ واجب ہو۔ دوسری طرف جود و عطا اور سخاوت کا یہ حال کہ خانقاہ میں لنگر تقسیم ہوتا۔ اور جو کچھ ہوتا اٹھا کر نہ رکھا جاتا بلکہ فقرا کو دے دیا جاتا تھا۔ کبھی کچھ نہ ہوتا تو آپ فرماتے پانی ہی کا دور چلا دو۔

اہل دنیا کا منت کش احسان ہونا درویش کی شان نہیں۔ شاہی ملازمین میں ایک حاجب اختیار الدین نامی تھا۔ ایک بار حاضر دربار ہوا تو کوئی گاؤں بطور نذر پیش کرنا چاہا۔ آپ نے اسے نزدیک بٹھایا۔ اور مصلیٰ کا کونے اٹھا کر فرمایا اس میں دیکھو۔ اور فرمایا آئندہ درویشوں سے ایسی گستاخی نہ کرنا۔ اختیار الدین کا بیان ہے کہ میں نے حضرت کے مصلیٰ کے نیچے خداوندی خزانوں کے دریا موجیں مارتے ہوئے دیکھے۔

(روضۃ الاقطاب ص ۲۶)

اسی طرح ایک بار بادشاہ التمش نے سونے، چاندی کے کچھ نذرانے بھجوائے تو یہ کہہ کر لوٹادیا ”میں تو اسے دوست سمجھتا تھا مگر وہ دشمن نکلا۔ مال و دولت خدا کے دوستوں کو نہیں دشمنوں کو محبوب ہوتے ہیں“۔ (روضۃ الاقطاب ص ۲۶)

حب رسول ایمان وایقان کی جان ہے اس لیے اللہ کا ہر ولی حب رسول میں سرشار ہوتا ہے۔ جو نبی کی محبت میں دلفگار ہوتا ہے۔ وہی بحر مراد سے پار ہوتا ہے۔ روز آنہ آپ بارگاہ رسول میں تین ہزار بار درود پاک کا نذرانہ بھیجتے۔ قرآن مجید شب و روز میں دوبار ختم کرتے۔ آخر عمر میں حفظ قرآن فرمایا تھا۔ استراحت بہت کم فرماتے تھے، ہمہ وقت عبادت و ریاضت میں غرق رہتے۔ تلاوت کے دوران سینہ پر ہاتھ مارتے اور بے ہوش ہوجاتے۔ جب مشاہدہ کی آیت تلاوت کرتے تو مسکرا پڑتے۔ پھر عالم تحیّر میں گم ہوجاتے اخیر عمر میں نیند سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ مجلس سماع سے قلبی لگاؤ تھا۔ ایک بار ایک مجلس سماع میں ایک شعر پر ایسے مغلوب الحال ہوئے کہ سات شبانہ روز بے ہوش رہے۔ صرف نماز کے وقت ہی آنکھ کھل جاتی نماز پوری ہوتے ہی پھر حال کا غلبہ ہوجاتا۔ اسی طرح کی ایک محفل سماع میں شیخ احمد جام کا یہ شعر۔

کشتگان خنجر تسلیم را

ہر زماں از غیب جان دیگر است

پڑھا گیا تو آپ پر وجد طاری ہوا۔ اور آپ ماہی بے آب کی طرح تڑپ نے لگے۔ چار دن اور چار راتیں اس عالم میں گزاریں صرف وقت نماز افاقہ ہوتا۔ پھر وہی بے قراری بے چینی سے تڑپنا اور بے ہوش ہوجانا۔ بالآخر اسی عالم میں خنجر تسلیم کے اس مقتول نے اسی عالم میں اپنی جان جاں آفریں کو سپرد کی۔ (فوائد الفوائد ص ۱۴)

صوفیا اور عرفا حق اسی کے لیے آپ کو ”شہید محبت“ کے لقب سے یاد کرتے ہیں آپ کی تاریخ وصال ۱۴/ ربیع الاول ۶۳۳ھ ہے۔ آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے جس نے کبھی حرام کاری نہ کی ہو، عصر کی سنتیں نہ ترک کی ہوں، اور نماز باجماعت تکبیر اولیٰ سے شریک ہوا ہو، یہ شرطیں سلطان شمس الدین التمش میں موجود تھیں اسی لئے انھوں نے نماز پڑھائی۔ دنیائے صوفیا میں حضرت قطب صاحب کو قطب الاقطاب، قطب الاسلام، ملک المشائخ، سلطان الطریقت، رئیس السالکین، سراج اولیا، تاج الاصفیا کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز اجمیری علیہ الرحمہ جس شجر رحمت کو لے کر ہندوستان تشریف لائے تھے۔ حضرت قطب صاحب علیہ الرحمۃ اس کی آبیاری اور داشت و پرداخت میں عمر بھر مشغول رہے۔ ان کے دم قدم کی برکت سے ہندوستان میں تبلیغ و اشاعت اسلام کے لیے ایسے ایسے مبلغین اور صاحبان دعوت رونما ہوئے جنھوں نے ہندوستان کے اطراف و جوانب میں جاکر نہ صرف اپنی اپنی خانقاہیں قائم کیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس سرزمین پر اشاعت اسلام کی جو عمارت سجنے والی تھی ان پاک نفوس نے اسکی بنیادوں میں ذکر جلی اور خَفی کے ذریعہ ایسے ستون قائم کردیئے جن پر مستقبل میں اسلامی حیات کی تعمیر کا کام آسان ہوسکے۔

اشاعت اسلام کی قندیلیں:

جنھوں نے چراغ چشتیاں کے ذریعہ اپنے اپنے مقامات پر اشاعت دین اور دعوت اسلام کے نمایاں کام سرانجام دیئے۔

شیخ فریدالدین گنج شکر پاکپٹن، شیخ بدرالدین غزنوی دہلی، شیخ برہان الدین بلخی، شیخ ضیاء الدین رومی، سلطان شمس الدین التمش، شیخ باباسنجری بحر دریا دہلی، مولانا فخرالدین حلوائی، شیخ احمد تمامی، شیخ حسین، شیخ فیروز، شیخ بدرالدین موتاب، شیخ خضر قلندر، شیخ نجم الدین قلندر، خواجہ پیرو، شیخ سعدالدین، شیخ محمود بہاری، مولانا محمد جاجزی، سلطان نصر الدین غازی، مولانا شیخ برہان الدین حلوائی، مولانا خضر مبین، مولانا سید، شیخ صوفی بدہنی، شیخ جلال الدین، ابوالقاسم تبریزی، شیخ نظام الدین ابوالمؤید، شیخ تاج الدین منور اوشی، حضرت خواجہ صاحب کے خلفاء میں سے شیخ فریدالدین گنج شکر آپ کے جانشین ہوئے۔

ویسے تو قطب صاحب کے سبھی خلفا اپنے فضل وکمال میں فلک روحانیت کے انجم تاباں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر مذکورہ دونوں بزرگوں کی تبلیغ دین، اور اشاعت اسلام پر بہت بسیط کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ ان چشتی درویشوں نے اپنے اپنے حلقوں میں اپنی سادی اور بے تکلفی زندگی کے ذریعہ اسلام کو متعارف کرایا۔ ڈاکٹر عزیز احمد لکھتے ہیں:

"قصبوں اور دیہاتوں میں صوفی اپنے مسلم مریدوں کے اندرنی دائرے اور غیر مسلم خصوصاً نیچی ذات کے ہند مداحین کے بیرونی دائرے میں ایک محور کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ غیر مسلم مداحین صوفیوں کی روحانیت اور بلند انسانی اقدار سے بڑا اچھا تاثر لیتے تھے۔ چنانچہ بیرونی دائرہ بالواسطہ طور پر آہستہ آہستہ اسلام میں مدغم ہوجاتا تھا"۔

(بابافریدالدین گنج شکر۔ مؤلفہ قاسمی ترجمہ طاہر اسدی مطبوعہ لاہور ص ۳۲)

اخلاص کا درجہ اسلام میں

اسلام تمام اعمال ظاہری اور باطنی امور میں اخلاص کا قدردان ہے۔ خدائے تعالیٰ کے حضور میں بندہ کا وہی عمل قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا جس میں کوئی دنیاوی غرض نہ ہو۔ بے غرض ہی کا دوسرا نام اخلاص ہے۔ قرآن مجید میں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ

(البینۃ:۵)

ترجمہ:۔ اور ان لوگوں کو تو یہی حکم ہوا کہ اخلاص عمل کے ساتھ اللہ کی بندگی کریں یکسو ہو کر اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ اور یہی سچا دین ہے۔

اور اگر کسی کار خیر میں للّٰہیت کے بجائے ریا و نمائش اور دکھاوے کی نیت شامل ہو کہ لوگوں میں عزت و وقار قائم ہو اور لوگ دیندار سمجھیں اس غرض کے شامل حال ادا کی جانے والی عبادات و ریاضات اخروی مفاد اور اجر آخرت کے لحاظ سے ہلکی ہو جاتی ہے۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ

(آل عمران:۱۴۵)

ترجمہ:۔ اور جو دنیا کا انعام چاہے ہم اس میں سے اسے دیں۔ اور جو آخرت کا انعام چاہے ہم اس میں اسے دیں اور قریب ہے کہ ہم شکر گزاروں کو صلہ عطا کریں۔

عبادت و ریاضت اور نیک کاموں میں دکھاوا اللہ تعالیٰ کو ناپسندیدہ ہے۔ اسے شرک فی العمل کہا گیا ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قال اللہ تعالیٰ انا اغنی الشرکاء عن الشرك من عمل عملاً اشرك فیه معی غیری فانا منه بریٔ ھو للذی عمل به"۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں دوسرے شرکا کے مقابلہ میں شرک سے زیادہ بے نیاز ہوں۔ جس شخص نے کوئی نیک کام کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی کو شریک کیا تو میرا اس کے عمل سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں اس کے عمل سے بیزار ہوں۔ وہ عمل تو اس دوسرے کا حصہ ہے جس کو میرے ساتھ اس نے شریک بنایا۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)

اعمال حسنہ اور بھلائی کے کام صرف نیتوں کی تبدیلی سے کس طرح بے اثر اور اکارت ہو جاتے ہیں اور کن عوارض کے لگ جانے سے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنا وزن کھو دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت مبارکہ ان عوارض سے مسلمانوں کو متنبہ کر رہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (بقرہ:۲۶۴)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان جتا کر اور ستا کر برباد نہ کرو۔ جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے، جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

اخلاص عمل کے باب میں سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی زبان زد خاص و عام ہے:

''انما الاعمال بالنیات''۔(صحیحین عن عمر بن الخطاب)

ترجمہ:۔ انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔

عمل چاہے جتنا ہی اہم ہو حتیٰ کہ نماز، حج، جہاد اور ہجرت کی عبادتیں روحانی وایمانی خیر برکت سے ہر وقت بہرور ہوتی ہے۔ جب وہ خلوص سے کی جائے۔ اگر ان میں حسن نیت شامل نہ ہو تو وہ بھی دائرہ مقبولیت سے خارج ہوجاتی ہے۔ حدیث بالا کے متّصل ہی حسن نیت کی مزید تشریح یوں وارد ہوئی ہے۔

''کہ ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو، یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس شخص کی ہجرت اسی طرف ہے جس کی غرض سے اس نے ہجرت کی''۔

(صحیح بخاری ج ا/ باب ماجاء ان العمل بالنیہ ۔ ۱۲)

مالی عبادات میں زکوٰۃ، صدقہ و خیرات اور قربانی میں انسان، حیوانی جان اور مال، خدا کے نام پر خرچ کرتا ہے۔ لیکن کیا کوئی مال خدا تک پہنچتا ہے، یا قربانی کا گوشت اور خون خدا کی بارگاہ میں لے جاتا ہے۔ صدقات و خیرات یا قربانی کی حقیقت اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ انسان اپنا مال اپنے ہمنشیں انسانوں پر خرچ کرتا ہے اور قربانی کرتا ہے تو اس کا گوشت خود کھاتا ہے اور دوسرے لوگوں میں تقسیم کرتا ہے۔

تو صدقات و خیرات ہوں یا قربانی ان تمام کی ادائیگی میں خالصاً لوجہ اللہ صرف نیت اور ارادہ ہی تو ہے۔ مال اس نیت سے خرچ ہو کہ خدا تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ قربانی بایں خلوص ہو کہ رب تعالیٰ کی رضا مقصود خاطر رہے۔ اگر اس نیت اور ارادہ میں خدانخواستہ کسی قسم کا نقص وارد ہوگیا تو پھر وہ صدقہ در اصل صدقہ نہ رہا۔ اور قربانی حقیقتاً قربانی نہ ہوئی۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآئُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔

(الحج:۳۷)

ترجمہ:۔ اللہ کو ہرگز نہ ان کے گوشت پہنچتے ہیں نہ ان کے خون۔ ہاں تمہاری پرہیزگاری اس تک باریاب ہوتی ہے۔

ہماری نیتوں کا حسن و قبح پروردگار عالم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ ہر ڈھکے اور چھپے اور ظاہر و پوشیدہ کو یکساں ملاحظہ فرمارہا ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ۔

(آل عمران:۲۹)

ترجمہ:۔ تم فرمادو کہ تم اپنے جی کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ اللہ کو تو سب معلوم ہے۔

صرف ظاہری صورت کی خوبی اللہ کے نزدیک کسی قدر و قیمت میں نہیں، بلکہ شکستہ دلی خلوص و سچائی اور قلب و ذہن کی پاکیزگی خدا کی بارگاہ میں مقبول ہے۔ اور اخلاص کے ساتھ تھوڑا سا عمل بھی فضل و کرم والے مالک بے نیاز کے حضور میں قابل قدر ہے۔

''ان اللہ لاینظر الیٰ اجسامکم ولا الیٰ صورکم ولکن ینظر الیٰ قلوبکم واعمالکم''۔

(مسلم عن ابی ہریرۃ ۔ ۱۲)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور جسموں کو نہیں دیکھتا وہ تو تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ عبادت میں کس قدر اہم ہے، مگر اس میں بھی نیتوں کے لحاظ سے درجات کا ترتب ہوتا ہے۔ کمی واقع ہوجاتی ہے۔ صحیحین میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص اپنی شجاعت اور بہادری کے جوہر دکھانے کی غرض سے جنگ کرتا ہے۔ دوسرا اپنی حمیت جتانے کے واسطے۔ اور تیسرا ریاکاری کے تحت۔ ان میں جہاد فی سبیل اللہ کس کا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی غرض سے لڑتا ہو۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کررہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جب دو مسلمان تلواریں میان سے نکال کر ایک دوسرے پر وار کرتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم کے مستحق ہیں"۔

راوی حدیث حضرت ابوبکرہ ثقفی بیان کرتے ہیں:

"میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! قاتل تو جہنم کا حقدار ہے۔ مگر مقتول کس لیے؟ سرکار نے فرمایا: اس لیے کہ یہ بھی تو اپنے مقابل کو قتل کرنا چاہتا تھا"۔

(بخاری عن ابی بکرہ)

یہ محض فضل الٰہی اور حسن نیت کی برکت ہے کہ بندہ صرف کسی نیکی کا ارادہ ہی کرتا ہے تو رب تعالیٰ اسے ایک نیکی عطا فرماتا ہے۔ اور جب اس نیک کام پر عمل کرگزرتا ہے تو اخلاص عمل اور حسن نیت کے لحاظ سے دس سے سات گنے یا اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرماتا ہے۔ حدیث قدسی ہے:

"ان الله كتب الحسنات والسئيات ثم بين ذالك فمن هم بحسنة فلم يعلمها كتب الله تبارك و تعالىٰ عنده حسنة كاملة وان هم بها فعملها كتبها الله عشر حسنات الىٰ سبع مأة ضعف الىٰ اضعاف كثيرة وان هم بسئية فلم يعملها كتبها الله تعالى عنده حسنة كاملة وان هم لها فعملها كتبها الله تعالى سئية واحدة"۔ (بخاری، مسلم عن ابن عباس)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے نیکیوں اور برائیوں کو مقرر فرمادیا ہے اور انھیں واضح کردیا ہے۔ تو جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے لیکن ابھی تک نہ کرسکا تو اس کے نامہ اعمال میں مکمل نیکی لکھنے کا حکم فرماتا ہے۔ اگر ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل بھی کرلیتا ہے تو اس کے نامہ اعمال میں دس نیکیوں سے لے کر سات سو بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ نیکیوں کا اندراج ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی برائی کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس کو کرتا نہیں ہے تو اس کے نامہ اعمال میں مکمل نیکی لکھتے ہیں۔ اگر ارادہ کے بعد اس کو کرگزرتا ہے تو اس کے نامہ اعمال میں ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

لہٰذا جن خوش نصیبوں کو نیک اعمال کی توفیق ملتی ہیں۔ انہیں چاہئے۔ کہ شیطانی دروازوں میں سے ہر ایک پو پہرہ بٹھاکر اپنے ہر کام کو خالص خدائی خوشنودی کے لیے کریں۔ نام نمود کے لیے، شہرت و ناموری کے لیے، یا کسی مخصوص جماعت یا فرد کی پشت پناہی ہی کے لیے نہ کریں۔ (الا یہ کہ مذہب و مسلک حق کی حمایت مقصود ہو) ہر کام میں خدا کی رضا، اس کے دین کی پابندی، سنت خیرالبشر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

کا پاس ہونا چاہئے۔ قوانین اسلام کے خلوص سے کیا جانے والا مختصر عمل بھی میزان عدل میں بڑا وزن رکھتا ہے۔ کیونکہ اس قلیل جنس کی غرض اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے اور خلوص کار خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ اور بقول عارفے: ؎

رحمت حق بہانہ می جوید
رحمت حق بہانمی جوید

باب سوم: اسلامیات

اسلام، انسانیت کے لیے گہوارۂ امن

اسلام، دین فطرت ہے۔ کسی انسانی ذہن و دماغ کی پیداوار نہیں، جو انقلابات زمانہ اور حادثات روزگار سے پسپا ہوکر دفن ہوجائے۔ بلکہ انقلابات و انتشارات اور اختلال امن و عافیت میں انسانیت اور فلاح انسانیت کا سچا پیغام بربن کر آیا ہے۔ لامقصود الا اللہ۔ خدا کے سوا کوئی مقصود نہیں۔ وہی اسلام کا مقصود ہے اور منزلِ آخر ہے۔ اس کا واحد منشا یہ ہے کہ مخلوق خدا اپنے خالق ومالک کو پہچانے اور در بدر جبیں سائی سے باز آکر مالک حقیقی کی بارگاہ قدس میں اپنے کو پیش کردے۔ ہر کام کی کوئی غرض و غایت ہوتی ہے۔ تو انسانی زندگی کی بھی کوئی غرض ہوگی وہ کیا ہے؟

انسان اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے خالق ومالک کا عرفان حاصل کرلے۔

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی۔

ترجمہ:۔ اپنے رب تک پہنچنا ہی تیرا حاصل حیات ہے۔

رب تبارک و تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہی ہمارے سفر حیات کی انتہا اور غایت ہے۔ تو جس راہ پر چل کر یہ منزل ہمیں حاصل ہوسکتی ہے، اس کا نام اسلام ہے۔

دنیا اور کائنات بنانے والے رب نے ہی انسان کے لیے اس راستے کا تعین فرمایا ہے۔ یہ راستہ کسی انسانی طاقت و قوت کا مرہون منت نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیائے کرام انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے تشریف لائے وہ سب اسی اسلام کی تبلیغ فرماتے رہے۔ ہر ایک نے اپنے زمانہ ار ماحول میں توحید کا نغمہ سرمدی گایا۔ ایک خدا کی بات بتائی۔ بھٹکی ہوئی دنیا کو رب سے ملایا۔ سب کا پیغام یہی ایک تھا کہ عبادت کے لائق ذات صرف خدائے واحد کی ہے۔ کوئی اور ایسا نہیں جس کی پرستش کی جائے۔ ہر نبی دعوت توحید کے ساتھ اپنی نبوت یا رسالت کا کلمہ پڑھواتا رہا۔

☆...... حضرت آدم علیہ السلام کی دعوت تھی:

لا الہ الا اللہ آدم صفی اللہ

☆...... حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت تھی:

لا الہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ

☆...... حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت تھی:

لا الہ الا اللہ ابراھیم خلیل اللہ

☆...... حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعوت تھی:

لا الہ الا اللہ اسماعیل ذبیح اللہ

☆...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت تھی:

لا الہ الا اللہ   عیسیٰ روح اللہ

☆......اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہے:

لا الہ الا اللہ   محمد رسول اللہ

علیہم الصلوٰۃ والتسلیم

گویا ہر ایک آنے والا الگ ماحول میں ایک ہی دعوت توحید لے کر آیا۔ ایک ہی روح پیغام ہے۔ جو ہر ایک کے پیغام میں دوڑ رہی ہے۔ سب کے سب ایک ہی دعوت، ایک ہی تحریک لے کر رونما ہوئے۔ قرآن عظیم ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامِ۔

ترجمہ:۔ بے شک دین تو خدا کے نزدیک بس اسلام ہی ہے۔

دور ماسبق میں آنے والے انبیائے کرام علیہم السلام مخصوص مقامات اور متعیّن اوقات تک اپنے اپنے فرائض منصبی ادا فرماتے رہے اور خدا کا پیغام دنیا کو دیتے رہے۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی وقت میں کئی انبیائے کرام اس روئے زمین پر فریضہ تبلیغ دین انجام دیتے رہے۔

سب سے آخر میں پروردگار عالم نے سرور انبیا تاجدارِ رسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تمام انبیا کا خاتم بناکر مبعوث فرمایا۔ آپ کی بعثت کے ساتھ ہی پچھلی تمام شرائع منسوخ اور احکامات کالعدم قرار دے کر ایک عالمگیر نظام محکم کا نفاذ ہوا۔ اور آپ کے وجودِ مقدس نے فہرست انبیا و رسل پر خاتمیت کی مہر ثبت کردی۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا

(الاحزاب:۴۰)

ترجمہ:۔ محمد تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں۔ ہاں اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں میں پچھلے اور اللہ سب کو جانتا ہے۔

پوری کائنات کے تنہا رسول کی حیثیت سے سرور دوعالم حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رونما ہوئے وہ ایک ہادی تھے اور پوری کائنات ان سے ہدایت یاب۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ۔

ترجمہ:۔ نہیں بھیجا ہم نے تمھیں مگر تمام لوگوں کے لیے۔

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔

ترجمہ:۔ میں تم تمام لوگوں کا رسول ہوں۔

ملک و وطن، رنگ و نسل کی تمام فصیلیں منہدم کرکے اسلامی اخوت کی یک رنگی سارے عالم پر لانے کے لیے آخری پیغمبر کی بعثت ہوئی۔ تاریکیوں کے بھیانک ماحول میں جبل بوقبیس سے جس نور کی چمک ظاہر ہوئی۔ اس سے کوہ و دمن و دشت صحرا شعب و قریہ ہر ایک منور ہوگیا۔

"طلع البدر علینا من ثنیات الوداع"۔

اس کے بارے قرآن مقدس نے یہ پیغام دیا:

قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِیۡنٌ۔

ترجمہ:۔ تمہارے پاس خدا کی طرف سے ایک نور (محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) آیا اور روشن کتاب۔

اس رسول گرامی و قار کے دست مبارک میں ایک آسمانی صحیفہ بھی ہے۔ ہدایت و نجات کی ضمانت خدارسی کا وسیلہ و ذریعہ، مکمل قانون حیات۔

نکل کر حرا سے سوئے قوم آیا

اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

رہتی دنیا تک کی انسانیت کے لیے محکم "اصول حیات" کی دستاویز بن کر قرآن عظیم آگیا۔ اور دین کامل ہوگیا۔

اَلۡیَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِیۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا۔

ترجمہ:۔ آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین مکمل کردیا اور تم سے دین اسلام کے ساتھ راضی ہوگیا۔

اس مکمل دین کے نزول کے بعد اس سے ماقبل کے سارے قوانین منسوخ ہوگئے۔ اب اگر قابل عمل ہے تو صرف قوانین الٰہیہ کا وہی لائحہ عمل جو حضور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ہے۔

اسلام کا امتیازی تشخص:

اسلام صرف چند عبادتوں اور دعاؤں کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ ایک مستقل اور مستحکم "نظام حیات" کا نام ہے۔ جو مسجد سے میدان تک اور گھر سے باہر تک فرد سے جماعت تک، حاکم سے محکوم تک کے تمام روابط و تعلقات کے لیے باضابطہ قانون رکھتا ہے۔

اسلام جہاں حاکم کو عدل و انصاف کا قلمدان عطا کرتا ہے وہیں ایک مظلوم و بیکس کو طلب حق کی جرأت و حوصلہ مندی بھی بخشتا ہے۔ اسلام اپنی قلمو میں جہاں انسان کو آداب عبادت سے روسناش کراتا ہے۔ وہیں صنعت و حرفت وغیرہ انداز معیشت اور تہذیب و تمدن بھی عطا کرتا ہے۔

الغرض! زندگی اور مراحل زندگی کی گوناگونی اور عدم یکسانیت کے جتنے رخ ہیں۔ ان تمام کے لیے اگر راہ عمل موجود ہے تو صرف اسلام کے پاس۔ دنیا میں بسنے والی متعدّد قوموں کے پاس بھی زندگی گزارنے کے اپنے اپنے اصول موجود ہیں۔ مگر یہ بات اب عالم آشکار ہوچکی ہے کہ آج تک جتنے اخلاقی نظام منصہ شہود پر آئے، کوئی پوری انسانی دنیا کے لیے جسم و روح دونوں طرح کی تسکین کا ذریعہ فراہم نہ کرسکا۔ اس کے پس پردہ جو خاص عوامل کارفرما ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ سارے قوانین زندگی انسانوں کے خود اپنے وضع کردہ ہیں، جن کو انسانی عقل کی تراش نے تیار کیا تھا۔ جس طرح انسان کی عقل اور علم محدود اور ناقص، اسی اس کی بنائی ہوئی چیزیں ناپیدار اور نامکمل۔ بھلائی انسانی ذہن و دماغ اور دل ان سے کہاں تک اطمینان حاصل کرپاتا۔ چند قدم چلے اور بس تھک ہار کر بیٹھ رہے۔ یہودیت اور عیسائیت کا آسمانی ذخیرہ ترمیم و تنسیخ کے باعث موجودہ زمانہ میں صرف اس لائق ہے کہ آثار قدیمہ کے طور پر محفوظ رکھا جائے۔

اہل مغرب نے یہ سمجھا کہ دنیاوی عیش و آرام اور حصول لذت کے سارے ذخیرے حاصل کرلیے جائیں تو سکون و اطمینان حاصل ہوجائے گا۔ مگر شبنم کے قطروں سے پیاس کہاں بجھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مادی ترقی نے انسانی زندگی کو عیش و آرام کے نقطہ عروج پر پہنچادیا۔ ایک طرف اس راہ سے انسان بلند ہوتا گیا۔ دوسری طرف روحانی فقدان نے اسے اندر سے کھوکھلا کردیا۔ سارے وسائل عیش و طرب میسر آنے کے باوجود ایک احساس تھا جو کانٹا بن کچوکے لگا تا رہا۔ وہ تھا روح کی پیاس کا احسا، دل کی بے قراری کا احساس، روحانیت کی پامالی کا احساس۔ اور یہ ایسا مرض لاعلاج تھا جس سے مغرب کے سارے شفاخانے خالی ہیں۔

رسول عربی کے دامن میں:

مگر الحمد للہ رسول عربی کے دامن میں وہ دولت لازوال موجود ہے۔ اسلام روح کی پیاس بجھانے والوں کے لیے دل کا قرار ڈھونڈنے والوں کے لیے اور اندرونی کرب و بے چینی کو سکون و اطمینان سے تبدیل کرنے کا نسخہ کیمیا عطا فرماتا ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

ترجمہ:۔ خبر دار ہوجاؤ دل کا چین صرف یاد خدا میں ہے۔

طمانیت قلب کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عبادات تو عبادات ہیں ہی۔ اس دین نے معاملات کو بھی عبادت کا مقام دیا ہے۔ سلطنت و حکومت وصنعت و حرفت و تجارت و حصول معاش کاروبار دنیا سب اس طرح منظم ہیں کہ سب بجائے خود عبادت ہیں۔

چونکہ عبادت و ریاضت کا مقصد خداوند عالم کی رضا جوئی ہے اور شریعت محمدیہ نے انسانی حقوق کے بحالی اور باہمی تعلقات کی استواری نیز کاوبار دنیا کے لیے مکمل قوانین مرتب کئے ہیں تو ظاہر بات ہے جب کوئی یہ سمجھ کر اس پر عامل ہوگا تو قدم قدم پر اسے یہ احساس ضرور ہوگا کہ وہ اگر چہ دنیا کا کام کررہا ہے۔ مگر خدائی مرضی اور الٰہی احکام کے تحت کررہا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ کتنی مسرت ہوگی، ایسی تجارت میں اور کس قدر خوشی ہوگی ایسے کاروبار میں جسے صرف اپنی غرض اور اپنی منفعت کے لیے نہیں بلکہ خدائے تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کیا جائے۔ اس عظیم احساس مسرت کا فیضان ہے کہ سچا مسلمان گھر کی چہار دیواری میں بیوی بچوں کے ساتھ، عدالت کی کرسی پر ظالم و مظلوم کا فیصلہ دیتے وقت، کارخانے میں ملازمت کرتے وقت، ہر جگہ اپنے کام کو انجام دے کر جہاں امور دنیا اور حقوق العبادت کی ادائیگی کرتا ہے وہیں اطاعت الٰہیہ کا عامل ہونے کے احساس سے روحانی طور پر مطمئن بھی ہوتا ہے۔

اسلام، امتیازِ نسل و وطن کا دشمن:

آج کشاکش روز گار میں ایک قوم دوسری قوم کو رنگ اور نسل کی بنیاد پر برا سمجھتی ہے۔ ایک طرف کچھ لوگ کالے اور گورے کو مابہ الامتیاز شئ تصور کرتے ہیں۔ اور کہیں ملک اور وطن کی دیواروں کو درمیان میں حد فاصل کے طور پر حائل کردیا گیا ہے۔ زبان و بیان کے مسائل بھی ایک کو دوسرے کا دشمن بنارہے ہیں۔ ایسی کشمکش اور کھینچا تانی کے عالم میں صرف دین اسلام قوت و اتحاد کا سرچشمہ، امن و اطمینان کا داعی اور انسانی زندگی کو اس کے حقیقی مقصد تک پہنچانے کا راستہ ہے۔

اسلام کی تعلیمات یہ ہیں:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔

ترجمہ:۔ بے شک تم میں سب سے بزرگ وہ ہے جو خدا کے نزدیک سب سے متقی ہے۔

حضور رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے زندہ جاوید خطبہ میں ارشاد فرمایا:

''لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی ابیض ولا لابیض علی اسود کلھم من اٰدم و اٰدم من تراب''

ترجمہ:۔ کوئی برتری نہیں عربی کو عجمی پر نہ عجمی کو عربی پر، نہ گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر، سب آدم کی اولاد ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے ہیں۔

روحانی سکون تقسیم کرنے والی جماعت:

اسلام کی دعوت کو جن لوگوں نے قبول کیا۔ پھر وہ خود اپنے ایمانی نور کو دنیا میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں ہیں کہ انہیں سے شریعت حقہ کی روشنی دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچتی ہے۔ موجود دور میں بھی مسلم زعما اور علمائے ربانیین کی ذمہ داری ہے کہ اس مسئلہ پر غور کریں کہ ہمارے مذہب کی اساسی قدروں کی رو سے آج تو ہماری ذمہ داریاں بہت اہم ہیں۔ قرآن عظیم فرماتا ہے:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ۔ (آل عمران:۱۱۰)

ترجمہ:۔ تم ایک بہترین امت ہو جو تمام انسانوں کے لیے ظاہر کی گئی۔ حکم دیتے ہو نیکی اور روکتے ہو برائی سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔

یہ آیت مبارکہ ہماری ایمانی ذمہ داریوں کو بتا رہی ہے کہ مسلمان قوم قوت پاتی ہے تو دنیا میں خدا کے نام کا بول بالا ہوتا ہے۔ دین حق کی اشاعت ہوتی ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج:۴۱)

ترجمہ:۔ وہ لوگ جنہیں اگر ہم زمین میں قوت بخشتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور معروف کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔

وہ لوگ انسانی معاشرہ میں برائیوں کو ختم کرنے کے لیے دین اسلام کا عملی نمونہ ہوتے ہیں۔ انہی کے دم قدم سے دنیا میں امن و عافیت، صلح و مروت، چین و سکون، راحت و اطمینان اور حق و انصاف پھلتا پھولتا ہے۔

امن عالم کی ضمانت ہے ہمارا اسلام

شرفِ انسانیت

اللہ تعالیٰ کی سب سے معزز مخلوق انسان ہے۔ زمین و آسمان، چاند سورج کی تخلیق کے بعد انسان کی تخلیق کا مقصود ہوئی رب تعالیٰ نے فرشتوں میں ان کا ذکر فرمایا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔

ترجمہ:۔ اور جب فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

فرشتوں نے اس جگہ اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری و عبادت گزاری کا حوالہ دیا، اور مادہ و روح کی آمیزش سے عالم میں وجود میں آنے والی اس نئی مخلوق کے شر و فساد کو خلافت کے عدم استحقاق کی دلیل کے طور پر پیش کیا:

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔ (بقرۃ:۳۰)

ترجمہ:۔ فرشتوں نے کہا کیا ایسے کو نائب خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزی کرے گا، اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور پاکی بیان کرتے ہیں۔

باوجودیکہ فرشتے ہر طرح سے احکام الٰہی کے مطیع و منقاد اور تسبیح و تہلیل میں ہمہ دم مصروف رہنے والے تھے، جن کی فطرت یہ ہے کہ:

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔ (تحریم:۶)

ترجمہ:۔ احکام خداوندی کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم ہوتا ہے۔

دوسری جگہ ان کا وطیرہ یہ بتایا گیا ہے:

یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ۔

(الانبیاء:۲۰)

ترجمہ:۔ رات اور دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔

زمین و آسمان میں ان کے تصرفات اس طرح جاری و ساری کہ ہوا چلانا پانی برسانا سردی و گرمی جاری کرنا حتی کہ شکم مادر میں ایک قطرۂ آب کو انسانی و حیوانی شکل و صورت دینا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا ہر کام انھیں کے ذریعہ عمل میں آتا ہے۔ "فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا" کے وہی مصداق ہیں۔ مگر خلافت الٰہیہ کا حق دار کوئی اور ہی ہے، جو اپنے اندر حیوانی داعیات رکھنے کے باوجود ملکوتی صفات پہ کاربند ہونے کی صلاحیت رکھے۔ جس میں نفسانی عناصر کی موجودگی ہو، مگر خیر کی قوت اس پہ غالب ہو۔ آدم، جسے امتحان گاہ ہستی کی سب سے ہونہار مخلوق تسلیم کیا گیا، اس کے سامنے زندگی کے دو بالکل متضاد و مختلف راستے کھول دیئے جائیں گے۔ ایک اطاعت و انابت، تقویٰ و پرہیزگاری۔ دوسرا شر و فساد، بغاوت و عدوان۔

ان دو مختلف راہوں کے درمیان اس کے ہاتھوں میں علم تدبیر اور عزم و ارادہ کی تعدیل ہوگئی، اگر وہ اندرونی اور بیرونی تمام فاسد و داعیات (منکرات) کو مسترد کر کے اوامر کی ادائیگی کر لے جائے گا، تو کامیاب و کامراں ہوگا۔ گویا شر و فساد کی خصلت، اگر چہ بنیادی طور پر اس

کے خمیر میں موجود ہے۔ مگر اس منفی پہلو سے کہیں اہم وہ مثبت پہلو ہے کہ وہ اپنے علم و شعور کے ذریعہ منہیات سے اجتناب کی صلاحیت بھی رکھے گا، اس کے علم و ایقان میں ابلیسی منصوبوں کو خاک میں ملانے کی اہلیت ہوگی۔ یہ اور اسی قسم کی گوناگوں خوبیوں کے مجوعے کا نام انسان ہوگا، فرشتے جس سے ابھی لاعلم ہیں، رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کی حکمتیں اسی وقت تفصیلاً بیان نہ فرمایا، بلکہ نہایت مختصراً جواب سے خاموش کیا:

قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ

(بقرۃ، آیت: ۳۰)

ترجمہ:۔ فرمایا بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

فرشتے اگرچہ جذبہ اطاعت میں سرشار تھے، مگر آدم کو ان پر فوقیت عطا فرمائی، اور اس فوقیت و برتری کے اظہار کے لیے علم و معرفت اور بصیرت عطا کی، اپنی تحمید و تسبیح کے علاوہ تمام اسماء کے نام بھی سیکھا دیئے، جس کا اظہار:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا۔

(بقرۃ، آیت: ۳۱)

ترجمہ:۔ اور سکھا دیئے آدم کو سبھی اشیا کے نام۔

سے کیا۔ لفظ ''کُلَّھَا'' اس بات کی دلیل ہے کہ حیاتِ انسانی سے واسطہ رکھنے والی دنیا کی تمام چیزوں کے علوم سے حضرت آدم علیہ السلام کو سرفراز فرمایا۔

قاضی ناصرالدین عبداللہ ابن عمر بیضاوی (م ۶۸۵ھ) فرماتے ہیں:

''والھمہ معرفتہ ذوات الاشیاء و خواصھا و اسمائھا و صول العلوم و قوانین الساعات و کیفیۃ آلاتھا''۔

(تفسیر بیضاوی: ۶۱)

ترجمہ:۔ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اشیا کی قسم، ان کی خصوصیات، ان کے نام سے واقف کردیا۔ تمام علموں کے اصول، صفتوں کے قوانین اور ان کے آلات کی کیفیت کا علم عطا کردیا۔

اس آرائش و زیبائش کے بعد لاہوت و ناسوت کے اس رازداں کو قدسیوں کی بزم میں اپنی قدر و حکمت ظاہر فرمانے کے لیے لاکھڑا کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام پر انعاماتِ خداوندی کا انداز تو ملاحظہ کیجیے، کہ انھیں خود علم سے نوازا، خود ہی ان کے بارے میں فرشتوں سے سوال کیا، فرشتوں نے اطاعت شعاری کے طور پر معذرت ظاہر کی، اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا علم محدود ہے۔ ہمیں ان اسما سے قطعًا واقفیت نہیں۔ قرآن مجید کی زبان سے سنیے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ فَقَالَ اَنْبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ

(بقرہ۔ آیت: ۳۱،۳۲)

ترجمہ:۔ اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیا کے نام سکھائے پھر تمام اشیا کو ملائکہ پر پیش کرکے فرمایا، سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ فرشتے بولے، پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں، مگر جیسا تو نے سکھایا، بیشک تو ہی علم و حکمت والا ہے۔

فرشتوں نے خلافت الٰہیہ کے لیے جن اساس کو بطور ثبوت پیش کیا تھا، اس امتحانی سوال کے بعد ان کے اعتراف لاعلمی نے گویا خود ہی اپنی معذوری ظاہر کردی ان کے خیال میں صرف تسبیح و تقدیس ہی خلافت کا حقدار ہونے کے لیے کافی تھی۔ مگر اب ظاہر ہوا کہ علم و معرفت آدم کی سب سے کلیدی خصوصیت ہے، جو اسے روئے زمین پہ خداوند قدوس کی خلافت کا مستحق بناتی ہے، جس سوال کے جواب میں فرشتے ساکت رہ گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے وہ جواب دے دیا:

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ

(بقرہ، آیت: ۳۳)

ترجمہ:۔ فرمایا: اے آدم بتادے انھیں سب اشیا کے نام، جب انھوں نے فرشتوں کو سب نام بتادیئے تو (اللہ تعالیٰ) نے فرمایا میں نہیں کہتا تھا کہ، میں زمین و آسمان کی سب پوشیدہ چیزیں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

مزید تکریم انسانی اس طرح فرمائی کہ آدم علیہ السلام کی مسجود ملائکہ بنایا، اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کبر و نخوت میں مبتلا ہوکر ''اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى'' پکار اٹھے۔ بلکہ یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس عظمت و بڑائی کے باوجود تمہیں روئے زمین پہ رب تعالیٰ کی ربوبیت کا درس دینا ہے، خلیفۃ فی الارض ہونے کی حیثیت سے زمین پر صلح و مروت اور امن و چین قائم کرنا ہے۔

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

خَلیفہ کا لغوی معنی اور شرعی مفہوم:

خَلیفہ لغوی اعتبار سے وہ ہے، جو اپنے سے پہلے کا نائب اور وارث ہو۔

امام ابو محمد قرطبی فرماتے ہیں:

''خلیفة یکون بمعنیٰ فاعل ای یخلف من کان قبله من الملائکة فی الارض او من کان قبله من غیر الملائکة علی ماروی''۔

(تفسیر قرطبی، ج:۲:ص:۲۶۴)

ترجمہ:۔ خَلیفہ بمعنی فاعل ہے، وہ جو اپنے سے پہلے کا نائب ہو۔ یعنی زمین پر فرشتوں کی پاکی اور مخلوق کا۔ جیسا کہ مروی ہے۔

زبیدی نے فرا کے حوالے سے لکھا ہے:

''قال الفراء فی قوله تعالیٰ: وجعلنٰکم خلائف الارض ای جعل امة محمد صلی الله تعالیٰ علیه وسلم خلائف کل الامم''۔

ترجمہ:۔ فرانے کہا خدا کے فرمان اور ہم نے تم کو زمین میں نائب بنایا کے بارے میں کہ امت محمدیہ کو ساری امتوں کا خَلیفہ بنایا۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

''قیل خلائف فی الارض بخلف بعضکم بعضاً''۔

(تاج العروس خلیفہ مادہ)

ترجمہ:۔ کہا گیا کہ زمین میں خلافت کا معنٰی یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کے وارث اور خَلیفہ ہوتے رہوگے۔

ان ہی لغوی تصریحات کی روشنی میں علمائے محتاطین نے انسان کو خَلیفہ الٰہی کہنے کی مخالفت ہے۔ اس لیے کہ وارث اس کا ہوتا ہے، جو فانی اور عاجز ہو۔ مگر ذاتِ الٰہی، حی و قیوم اور متصرف ہے۔ اس لیے اس کا وارث کہنا صحیح نہیں۔ مگر اس لحاظ سے کہ انسان کو عزم و ارادہ اور علم و اسرار کی جو دولت عطا فرمائی گئی ہے، اس سے وہ روئے زمین پہ خدا کی ربوبیت کا اعلان کرے۔ اس کی شریعت کو نافذ کرے، اسے خَلیفہ کہنا غلط نہیں۔ بلکہ رب تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اس لقب سے خود سرفراز فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

هُوَالَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتٰكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(الانعام آیت:۱۶۶)

ترجمہ:۔ (پروردگار) وہی ہے جس نے زمین میں تمہیں خَلیفہ بنایا اور تم میں ایک دوسرے پہ درجوں بلندی دی، تاکہ تمہیں اس چیز میں آزمائے جو تمہیں عطا کی، بیشک تمہارے رب کو عطا کرتے دیر نہیں لگتی، اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کے عدوان سے عاجز ہوکر کشتی تیار کی، اور طوفان میں اپنے کلمہ خوانوں کو کشتی پر سوار کرلیا۔ بقیہ تمام سرکشوں کو طوفان نے ملیامیٹ کردیا۔ کشتی پر صرف وہی لوگ سوار ہوئے تھے، جو ایمان والے تھے۔ انھیں خداوندعالم نے ''خلائف'' کے لفظ سے یاد فرمایا ہے، جو خَلیفہ کی جمع ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓىِٕفَ۔

(یونس، آیت:۷۲)

ترجمہ:۔ جو اُن کے ساتھ کشتی میں تھے ہم نے انھیں خَلیفہ بنایا۔

امت محمدیہ کے لیے دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

هُوَالَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ۔

(فاطر، آیت:۳۹)

ترجمہ:۔ (رب) وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں خَلیفہ (نائب) بنایا جو کفر کرے اس کا کفر پہ لوٹے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی خلافت کا بیان قرآن عظیم نے ان الفاظ میں کیا ہے:

يَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔

ترجمہ:۔ اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خَلیفہ (نائب) بنایا تولوگوں میں سچا حکم کرو۔

زبیدی نے آیت بالا کی روشنی میں خلفائے اسلام اور ائمہ کے لیے خَلیفہ الٰہی کہنے اور لکھنے کی اجازت دی ہے:

''جازت ان يقال الائمة خلفاء الله في ارضه بقوله عزوجل يا داؤد انا جعلناك الخ''۔

(تاج العروس مادہ)

ترجمہ:۔ ائمہ کرام کو خلیفۃ اللہ فی الارض کہنا جائز ہے اس کی دلیل خدا کا قول ''یَادَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنَاکَ، الخ''۔

مذکورہ بالا تحریر سے یہ بات واضح ہوگئی کی خدا کی بندگی اس کی اطاعت و انابت اور اس کی ربوبیت کا اعلان اس کی معرفت کے راستوں کی تبلیغ و اشاعت اور بَھٹکی ہوئی انسانیت کی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی یہی تمام خصوصیات ہیں، جو انسان کو خلافت و نیابت الٰہیہ کا مستحق بناتی ہیں۔ اب ہم اسی فریضہ دعوت دین سے موجودہ زمانہ کی ملت اسلامیہ سے امت محمدیہ کا جائزہ لیں گے۔ کہ جس رب کائنات نے اسے خیر امت کا لقب مرحمت فرمایا، تو اس پر اس ضمن میں کیا فرائض عائد کیے ہیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آوازِ حق کے لیے سارا زمانہ گوش بر آواز ہے، دعوت اسلام، دعوت فلاح، (دعوتِ نجات) (دعوتِ امن) (اور دعوتِ انسانیت) کے لیے ایک اہم متواتر اور مستقل تقاضا ہے۔ جو روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالم افکار

خیر امت:

تمام انبیا علیہم السلام، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین جناب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک روئے زمین پر اللہ کے خَلیفہ کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اور اوپر کی تحریر نے بتادیا کہ یہ تمغہ خلافت انھیں قوانین الٰہیہ اور احکامِ ربانیہ کی نیابت کے صلہ میں عطا ہوا اور رب العزت نے اپنے سارے نبیوں کو اسی فریضۂ منصبی کی ادائیگی کے لیے مبعوث فرمایا، ہر ایک نے اپنے اپنے دائرہ عمل اور احاطہ تبلیغ میں پوری سعی و جانفشانی سے یہ فریضہ نبوت انجام دیا۔ اسی سلسلہ رسالت کی آخری کڑی بن کر سید الرسل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مبعوث ہوئے آپ خاتم النبیین ہیں۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔

ترجمہ:۔ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہاں اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں میں پچھلے،

دنیا میں انبیا و رسول کی آمد کا سلسلہ بند ہوگیا۔ اب کوئی نیا نبی خدا کا پیغام لے کر نہ آئے گا۔ خاتم النبیین پر ختم الادیان ہوگیا۔ اب انسانی زندگی کے لیے ضابطۂ حیات اور قوانین محکم کی تکمیل ہوچکی اب ساری دنیا کے لیے کسی اصول ناقص پر عمل کرنا جائز نہیں۔ مکمل دستورِ زندگی کی حیثیت سے اسلام رونما ہوچکا۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

(بنی اسرائیل آیت:۸۱)

ترجمہ:۔ اور فرماؤ کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا بیشک باطل کو مٹنا ہی تھا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدۃ آیت: ۳)

ترجمہ:۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین (کی حیثیت سے) پسند کیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خاتم الانبیا، ان پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید خاتم الکتب دعوت محمدی پر لبیک کہنے والی قوم مسلمان خاتم الامم صبح قیامت تک دنیا میں پیدا ہونے والے انسانوں کے لیے ہدایت کے چشمۂ صافی سے روشناس کرانا، اب اس امت کی ذمہ داری ہے، چونکہ رہنمائی و ہدایت کی امین اب صرف امت محمدیہ ہے، اس لیے اپنے فریضہ کو ادا کرتے ہوئے ضلالت و گمرائی کے ماحول میں حقانیت کی قندیل سے اجالا کر دے، اور گم کردہ راہوں کو صراط مستقیم کا مالک بنادے، یہ رب تعالیٰ کے عائد کردہ وہ سب سے اہم ڈیوٹی ہے، جو امت مسلمہ پر ڈالی گئی ہے، اگر اس کو ادا کرنے کا احساس زندہ ہے اور یہ فریضہ انجام پذیر ہو رہا ہے تو قوم "خیر امت" کے لقب کی حقدار ہے، اور اسے فراموش کرنے کی صورت میں ذلت و نکبت اور عتاب و عذاب کی مستوجب جس طرح دنیا میں اور دوسری قومیں اس اہم ذمہ داری کو بھول جانے کے نتیجہ میں معتوب ہوئیں، یہ بھی اپنے انجام کا انتظار کریں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔

(آل عمران آیت:۱۱)

ترجمہ:۔ تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کئے گئے ہو نیکی کا حکم کرتے ہوئے برائی سے روکتے ہوئے اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

ایمان کی دولت سے سرفراز ہونے کے بعد اہل ایمان کو دعوت حق کے لیے دو اصول کی تعلیم دی گئی ہے، جس کے ذریعہ وہ دین فطرت کو دنیا والوں میں عام کریں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ظاہر نظر میں یہ دو بہت ہلکے پھلکے جملے ہیں۔ مگر ان کے منطوق و مفہوم پہ نظر کیجیے تو انسانی دائرۂ عمل کی عملی، علمی، تمدنی، اقتصادی، ثقافتی، معاشی، سماجی، اخلاقی، انفرادی، اجتماعی سب شاخیں اپنے تمام برگ و بار کے ساتھ اس دو جملہ میں محصور ہیں۔ کسی وقت کہیں کا کوئی عمل اس سے خارج نہیں ہوسکتا، خیر امت اسے کامل نظام حیات کی حیثیت سے اہل دنیا کے سامنے پیش کرے، انسانیت کا نجات دہندہ، دین آدم کی کشتی کا ناخدا ہونے کی لحاظ سے بہکے ہوئے لوگوں کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرے وہ بھی اس اصول اور ضابطہ سے کہ اہل باطل کی تمام تر رکاوٹیں، مزاحمتیں، ان کے عمل پیہم کی گرد بن کر اڑ جائیں اور خود کو منشائے خداوندی اور مرضی رسالت کا اہل ثابت کریں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

''سمعت رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم یقول لا یزال من امتی امة قائمة بامر الله لا یضرھم من خذلھم ولا من خالفھم حتی یاتی امر الله وھم علیٰ ذلك''۔ (صحیحین)

ترجمہ:۔ (حضرت معاویہ نے کہا) میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ میری امت میں برابر ایک ایسا گروہ موجود رہے گا جو اللہ کے دین کی مخالفت کرے گا، یہ دین کے محافظ لوگ اپنی اسی حالت پر قائم رہیں گے۔

اقامت دین کا فریضہ انجام دینے کے لیے مال و دولت کی پشت پناہی حکومت و سیاست کا سہارا اور اقتدار او اختیار کی زمام ہاتھ میں ہونا ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ عزیمت و تنگدستی، فلاکت و مسکنت میں ہوتے ہوئے بھی استحکام شریعت کا کام انجام دیا جاسکتا ہے۔ بدعت و تحریف کی ساری آمیزش چاہے وہ کسی غلط نظریہ سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہوگئی۔ اسے زخم کے کسی بد گوشت کی طرح جسم سے جدا کیا جاسکتا ہے، مغربیت و اشتراکیت کے فاسد رجحانات کا اثر قبول کر کے دین خالص میں آمیختہ و فاسد کو ختم کرسکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ خود داعی کے اندر و دانش کے ساتھ اقامت دین کی جملہ شرائط پر موجود ہوں۔

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

ایسا نہیں کہ کوئی معین گروہ خاص جماعت ایسی ہے، جس پہ اس کا انحصار ہو، اور وہ نہ انجام دے تو رک جائے۔ بلکہ اگر کسی دور میں کسی جماعت نے یہ سعادت حاصل کی اور اس کے بعد وہ معذور ہوگئی تو اس کام کے لیے رب تعالیٰ کسی دوسرے گروہ کو منتخب فرمائے گا۔ جو ظاہراً اس کام کے لیے اجنبی ہوگا، معذوریوں اور مجبوریوں کی ساری بندشیں ختم کردے گا، اور اس نامانوس اور اجنبی فرد و جماعت سے دعوت حق کا فریضہ انجام پذیر ہوگا۔ ارشادِ نبوی ہے:

''قال رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ان الدین بدأ غریباً سیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء ھم یصلحون ما افسد الناس من بعدی من سنتی''۔ (مشکوٰۃ شریف، عمر بن عوف)

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا دین اسلام اپنے آغاز میں لوگوں کے لیے اجنبی تھا، عنقریب پہلے کی طرح پھر اجنبی ہوجائے گا تو اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہو اور یہ وہ لوگ ہیں جو میرے بعد طریقوں کی جسے لوگوں نے بگاڑ ہوگا، اصلاح کریں گے۔

قرآن عظیم میں رب تعالیٰ نے یہ فریضہ انجام دینے والوں کو کامیاب و کامراں بتایا ہے، اور اس اہم ضرورت پر زور دیا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(آل عمران آیت ۱۰۴)

ترجمہ:۔ چاہیے کہ تم لوگوں میں ایک گروہ ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے اور اچھائیوں کا حکم دے برائیوں سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

یہ دعوتِ حق در اصل انھیں نبوی تعلیمات کی تبلیغ ہے، جو دین اسلام کا منشا اور شریعت کا مقصد ہے، شر و فساد و فسق و بغاوت شرک و عدوان کی اس دنیا میں نت نئے حالات جنم لیتے رہتے ہیں، اور باطل خوش رنگ لبادہوں میں سامنے آتا رہتا ہے جس کے لیے لازم ہے کہ تبلیغ و ارشاد اور اقامت دین کے وسائل وہی اپنائے جو دین کے اخلاقی قدروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفاسد انسداد میں کاری ہوں، جس طرح انبیائے کرام علیہم السلام نے مخاطب کی استعداد ذہنی کے لحاظ سے انداز خطاب اپنایا اور کلام فرمایا۔ اسی طرح واعیان حق کو بھی سنت نبوی کی پیروی اپنے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے کرنی چاہئے اس اہم الفرائض میں جو اصول و ضوابط نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ ہیں انبیائے کرام کی مقدس سیرتیں۔ (انشاءاللہ ہم آئندہ اس پہ کلام کریں گے) یہاں صرف اتنا باور کرادیں کہ یہ فریضہ دعوت خیر امت ہونے کی حیثیت سے امت محمدیہ پہ عائد ہے، کیونکہ مسلمان ہی افراط و تفری کے درمیان سیدھے راستے کا راہرو اور رہبر بھی ہے، ایمان کی تابناکیوں سے روشن ہے، اور روشن گر بھی، ہدایت یاب ہے اور ہدایت بخش بھی مرد مومن۔؟

قدرت کے مقاصد کے عیار اس کے ارادے

دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

وہ خود ''قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ'' سے اکتساب نور کرتا ہے۔ اور اس ذات سے دنیا منور ہوتی ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

(البقرہ آیت: ۱۴۳)

ترجمہ:۔ اور اسی طرح بنایا ہم نے تمہیں وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت تاکہ لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دو اور رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دیں۔

وقت کا تقاضہ:

آج بھی وقت کی یہ اہم ضرورت دنیا کے گوشہ گوشہ سے چیخ رہی ہے کہ وارثان انبیا میں سے فعال اور متحرک علم و عمل کی پیکر شخصیتیں اپنے فریضۂ منصبی کا احساس کرکے آمادہ کار ہوں، اور تشنہ ہدایت دنیا کو دین قیم کا سبق پڑھائیں، کیونکہ ہر چہار جانب سے مادیت کی گرم بازاری نے انسانی دل و دماغ کو اپنی سطح سے بہت نیچے ڈھکیل دیا ہے، فسطائیت اشتراکیت اور لادینیت کی دوسرے بے شمار تحریکوں نے روحانی چین اور قلبی سکون غارت کردیا ہے، دنیا بھر کا علم و دانش رکھنے والا طبقہ بڑے کرب و بے چینی سے کسی ایسے نظام حیات کا طلب گار ہے، جو ظاہری چین و سکون امن و شانتی کے ساتھ ہی باطنی قرار و طمانیت کا ضامن ہو۔ تدبیر صدیقی، استقلال فاروقی، غیرت عثمانی، شجاعت مرتضوی کے وارثو! اٹھو اور دنیا کو دعوت اسلام سے روشناس کردو۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم سارے زمانہ کے لیے اتحاد و امن، مساوات و اخوت کا پیغام ہے۔

فرق جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے ضربِ کلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے

تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم

(اقبال)

قانون الٰہی اور انسانی فطرت

خدائے قادر وقیوم نے پوری کائنات کو پیدا کیا، دنیا اور اس کے ماسوا لاتعداد اشیاء کو تخلیق فرمایا اور انسان کو تمام سے اشرف و اعلیٰ بیانا۔ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ (بنی اسرائیل آیت:۷۰)

ترجمہ:۔ اور بیشک ہم نے انسان کو فضیلت دی۔

مقام فکر و تدبر ہے کہ بساط فلک کو مہ نجوم سے آراستہ کیا اور روئے زمین کو مخلوقات مختلفہ سے سجایا جن میں کی ہر مخلوق اپنی جگہ نہایت قیمتی اور اہم ہے۔ ہر چیز اپنے موقع و محل پر لاجواب اور بے بدل ہے۔ خود انسان جو خلاصہ کائنات ہے اللہ تعالیٰ کی قدر کاملہ کا مظہر اتم ہے۔ اور اس کی حکمت وعظمت کا کامل نمونہ ہے۔

ذرا پیکر انسانی کی ساخت پر غور کیجئے۔ موئے سر سے ناخن پا تک ہر عضو اپنی جگہ اس حکیم مطلق اور نقاش ازل کی حمد کر رہا ہے۔ لاتعداد سجدے کو نچھاور اس کے حضور جس کی کہنہ تک پہنچنے کے لیے نگاہیں حیران، عقل مختل اور قلب وجگر ششدر ہیں۔ بقول حضرت سعدی:

دریں ورطہ کشتی فرد شد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

صرف اشرف الاعضا سر پر ہی توجہ دیجئے۔ یہ گول مٹول ہانڈی، اگر بالوں سیحالی ہوتی تو محض یہ نہیں کہ دواوین شعراء میں زلف شبگوں کا تذکرہ نہ ہوتا بلکہ پورا بشری جثہ کسی اور ہی ہیئت کا حامل ہوتا۔ لب و رخسار کی ساری ملاحتیں اور دلربائیاں چہرے اور سر پر اگے ہوے ان بالوں کی مرہون منت ہیں۔ اس مقام پر خواص اعضاء اور ان کی حکمتیں شمار کرانا مقصود نہیں۔ محض اس خالق بے نیاز کی حکمتوں کے پوشیدہ اور ظاہر گنجینوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جوں صرف انسانی جسم کے اندر موجود ہیں۔ سماعت، بصارت اور احساس کے الگ الگ محکمے جو حکومت جسمیہ میں اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں، سب سے سب بجائے خود ایک ایک رونگٹا، جلد کی سلوٹیں اور اعضا کے پیچ وخم لاتعداد حکمتوں پر مبنی ہیں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگری
کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا ایں جاست

انسان کو خدا کی جانب سے اور تمام مخلوقات پر فضیلت ملی۔ اسے شرافت کا منصب عطا ہوا۔ اور انسان کو خلافت ارضی کا وارث قرار دینا تھا اس لیے تخلیق بھی بطور احسن فرمائی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ (سورۃ تین آیت:۴)

ترجمہ:۔ بے شک ہم نے انسان کی بہت عمدہ طریقہ پر تخلیق کی۔

تو واقعی! ؎

خلاق دو جہاں کی ہے تخلیق بے مثال

یہ کلیہ محتاج تائید نہیں کہ کسی شئ کا بنانے والا اس شئ کی حقیقت کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہے۔ فقہ و شریعت کے جزئیات کو علما مشینی معاملات کو انجینئر، امراض و ادویہ ڈاکٹر حکیم اوروں کی نسبت زیادہ جانتے ہیں۔ اس لیے کہ فقیہ عالم، انجینئر، ڈاکٹر، صناع میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے فن میں محنت و مشقت کے بعد کمال حاصل کیا ہے۔ اگر کوئی شخص انجینئر سے امراض جسمانی اور دواؤں کے بارے میں سوال کرے۔ اور کسی ڈاکٹر سے مشینی باریکیوں پر کلام کرے۔ کسی صناع سے فقہ کے مسائل اور اصول و فروع سمجھنا چاہے تو وہ کما حقہ کہاں بتا سکیں گے؟

بلا تمثیل و تشبیہ! اللہ تعالیٰ نے انسان اور جمیع مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔ وہ جسم کے اندرونی اعضاء سے ظاہری خوارج تک ہر ایک خاصیت او رعمل و حرکت سے بخوبی باقف ہے۔ ظاہری و باطن کے سارے مکالبات اور روشیں سب اس کے لیے آئینہ ہیں جس رب نے سب انسانوں کو بنایا۔ اسی نے زندگی گزارنے کا طریقہ بھی بتایا۔ جسم کے کارخانہ میں آنکھ، کان، ناک، ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ کو ایک نظام کے تحت اپنے اپنے دائرہ میں مصروف عمل رکھنے والے منتظم حقیقی نے انسان کے زندگی گزارنے کے قانون خود ہی نازل فرمایا۔ تاکہ انسان اس پر عمل پیرا ہوکر نظام کائنات کی غرض و غایت کو سمجھ سکے۔ اور اپنے مقصد حیات کو پورا کر سکے۔ تو انسان اگر یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ خود بخود عالم وجود میں آگیا۔ بلکہ اس کا کوئی پیدا کرنے والا خالق و مالک ہے تو اصول زندگی کے سلسلہ میں یہ فیصلہ بھی کسی دلیل کا محتاج نہیں کہ خالق زندگی کا قانون ہی در اصل حقیقی قانون زندگی ہے جس کے مقابل انسانوں کے خود ساختہ قانون کی کوئی حیثیت نہیں۔

فطرت انسانی کتنی کمزور ہے اور کتنی مضبوط؟ اس سے خالق انسانیت خوب واقف ہے۔ اس لیے کسی کا یہ کہنا کہ شرعی اور اسلامی احکام سخت اور ناقابل عمل ہیں صحیح نہیں خود فرمان ربی ہے:

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔

ترجمہ:۔ خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔

مقصد حیات انسانی:

انسان اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کے جھرمٹ میں پرورش پاکر دنیا میں عیش و آرام یا غم و کلفت کے چند ایام گزارنے کے لیے نہیں آیا۔ بلکہ اس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کی معرفت حاصل کرے اور اس کی عبادت و بندگی کرے۔ انسان و جنات کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ اور یہ کس غرض سے پیدا ہوئے۔ قرآن عظیم نے صاف صاف بیان فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔

ترجمہ:۔ میں انسانوں اور جنوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے تاکہ عبادت کریں۔

آیت مبارکہ نے انسان کی زندگی کا مقصد اور غرض و غایت مقرر فرمادیا۔ کہ خدا نے صرف اسی لیے تخلیق انسانی فرمائی کہ وہ خدا کا فرمانبردار بن کر اس کا عبادت گزار بن کر اور اطاعت شعار بن کر رہے۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم چند دعاؤں اور وظائف و اعمال مخصوصہ تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس پورے نظام حیات کا محیط ہے۔ جو قانون فطرت کے دائرے میں ہے۔ ظاہر و باطن کے سارے افکار و اعمال کو نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ رسول مکرم حضرت محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا متبع بنادیا جائے۔

خدائی قانون کی پابندی:

ایمان والوں کو ہر ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کے قانون کی پیروی لازم ہے۔ زندگی کے ہر دوراہے پر پہنچ کر رہنمائی انسانیت کی مشعل سنت سے استفادہ کرنا ہے۔ اس مقدس رسول کے اسوہ حسنہ کو اپنا کر آگے بڑھنے کے سوا چارہ نہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا O (النساء آیت:٦٥)

ترجمہ:۔ آپ کے پروردگار کی قسم! یہ لوگ سچے مومنین نہیں ہوسکتے۔ جب تک اپنے آپس کے تمام اختلافات میں آپ ہی کو فیصل نہ مان لیں۔ پھر آپ جو کچھ فیصلہ فرمائیں اس پر اپنے دلوں میں کچھ تنگی بھی نہ محسوس کریں بلکہ نہایت خوشی سے تسلیم کریں۔

عقل و شعور کی ساری صلاحیتیوں کے ساتھ اطاعت ربانی میں لگ جانے والا انسان ہی اپنی زندگی کا سچا قدرداں اور مقصد شناس ہے۔ خدائی قوانین کی پابندی سے آزاد ہوکر زندہ رہنے والے عارضی لذتوں اور عیش کوشیوں کی غفلت میں چور ہیں۔ اپنے خالق اور مالک سے بغاوت کرکے اور ایک خدا کے سجدے سے سرکشی کرنے والی پیشانیوں کو در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ اور انجام کار وہ اپنے دامن میں حسرت و یاس کے سوا کچھ سمیٹ نہیں پاتیں۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ایک خدا کو معبود برحق تسلیم کرنے والا جب جذبہ عبودیت سے سرشار ہوکر اس کی بارگاہ ناز میں عجز و انکساری سے حاضری دیتا ہے۔ تو در اصل اس ادائے تسلیم و رضا کے ذریعہ وہ خود کو ساری کائنات سے بلند و بالا۔ ارفع و اعلیٰ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ اور بجا طور پر اس منصب کا حق دار بن جاتا ہے، جو خدا نے اسے ودیعت فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل آیت:۷)

ترجمہ:۔ اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی بخشی اور اسے خشکی و تری میں (چلنے کے لیے) سواریاں عطا کیں اور صاف ستھری چیزوں کی روزی دی اور اسے مخلوقات میں بہتوں پر فضیلت بخشی۔

پاکیزہ زندگی:

اس دنیائے تگ و تاز میں انسان کے اعمال ہی اس کی آخرت کا توشہ ہیں۔ ذرہ ذرہ نیکی اور قطرہ قطرہ بھلائی۔ اس کی اگلی زندگی کا عظیم سرمایہ ہے۔ اس دنیا میں مسلمان جو کچھ بھلائی کرے گا۔ اس کا پروردگار اسے لافانی اور غیر مختتم صلہ عطا فرمائے گا۔ مرد، عورت ہر ایک کا اپنا عمل اور اپنی نیکیاں ہی اس کے لیے سود مند ہوں گی۔ جن نیکیوں کی جزا بنا کر اللہ اپنی رحمت سے انہیں جنت کی پاکیزہ زندگی عطا کرے گا۔

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل:۹۷)

ترجمہ:۔ مرد اور عورت میں سے جس نے اچھا کام کیا اگر وہ مومن ہے تو ہم اسے ایک ستھری زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہتر اعمال کا اجر دیں گے جنہیں وہ کرتے تھے۔

کسی کا کوئی عمل خیر برباد نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات تو رب تعالیٰ کا دریائے کرم ایک نیکی کے بدلے ستر گنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرماتا ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ۔

(آل عمران ۱۹۵)

ترجمہ:۔ تو ان کی دعا سن لی ان کے رب نے کہ میں تم میں کام کرنے والے کی محنت اکارت نہیں کرتا۔ مرد ہو یا عورت تم آپس میں ایک ہو۔

اسلامی معاشرہ اور اس کے مطالبات:

اسلام جس معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اس میں خدا ترسی کے ساتھ حقوق انسانی کی ادائیگی کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ اور مسلمان مرد و عورت کو کئی پاکیزہ صفات سے مزین ہونا چاہیے وہ سارے آداب بالتفصیل سکھاتا ہے۔ جن تعلیمات کا اجمال یہ ہے کہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق کو بھی فراموش نہ کیا جائے۔ عبادت الٰہیہ، ادائیگی حقوق، صدق و دیانت، صبر و شکر، عفت و عفت و پاکبازی یہ ہیں وہ شفاف نہر جن میں غفران و رحمت کے دھارے چلتے ہیں۔

افراد کی زندگیوں کو اسی سانچے میں ڈھال کر ایک پر امن ماحول کی تشکیل ہی کا نام ہے اسلام معاشرہ ان افراد کی پاکیزگی کا قرآنی معیار ملاحظہ فرمائیں۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقَاتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصَّآئِمَاتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًاO (الاحزاب۔ آیت:۳۵)

ترجمہ:۔ بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے اور ایمان والیاں فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر والے اور صبر والیاں اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں اور خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی پارسائی نگاہ رکھنے والے اور نگاہ رکھنے والیاں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں ہاں سب کے لیے اللہ نے بخشش اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

صلاح و تقویٰ، اسلامی زندگی کا معیار ہے۔ سیرت و اخلاق وہ کسوٹی ہے جس پر انسان کو تولا جاتا ہے۔ آئین اسلام انہیں کی روشنی میں عزت و ذلت اور ثواب و عتاب کی وضاحت فرماتا ہے۔ خدا کے حضور جو شخص جس قدر حسن عمل اور اخلاص کا توشہ لیکر حاضر ہوگا۔ اتنا

کامیاب اور سرخرو ہوگا۔

طہارت فکر و عمل:

آلودگیوں سے دور اور اعمال بد کثافتوں سے نفور ہو کر انسان جن پسندیدہ ذرائع سے خدا کا تقرب حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن عظیم کی اصطلاح میں اس کی اصلیت اور روح کو "تقویٰ" اور تزکیہ کہتے ہیں، تزکیہ کے لفظی معنیٰ ہیں صاف کرنا نکھارنا اور میل دور کرنا۔ شریعت میں اس لفظ کو جو مفہوم حاصل ہے وہ یہ ہے کہ نفس انسانی کے آئینہ کو ہر باطنی کثافت اور گندگی سے صاف ستھرا کر کے اس پر اعمال حسنہ سے نکھار پیدا کر دیا جائے۔

اسی کا دوسرا سرخ معصیت اور طغیان ہے یعنی سرکشی اور قانون قدرت کی خلافت ورزی کی کیچڑ میں پھنس کر اپنے خدا سے دور ہونا اور قرآنی فیصلہ کی رو سے یہی تباہی و بربادی ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔ (والشمس آیت:۱۰،۹)

ترجمہ:۔ بیشک مراد کو پہنچا جس سے نفس کو ستھرا کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔

دوسری جگہ سورہ اعلیٰ میں ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى۔ (اعلیٰ آیت:۱۵،۱۴،۸۷)

ترجمہ:۔ بیشک مراد ہو پہنچا جو ستھرا ہوا اور اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھی۔

صاف ستھری خدا بھاتی زندگی وہی ہے جو خدائی اصول کے سانچہ میں ڈھل کر سامنے آئے۔

ایمان وتقویٰ:

خدا کے نزدیک وہ ایمان والے کامیاب ہیں جو اخلاص وانقیاد سے خدا کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں اور اپنی زندگی میں وقار و تمکنت، فیاضی و سخاوت، طہارت و عفت، ایفائے عہد اور خدمت خلق کو جگہ دیتے ہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ O وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ O وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ O وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ O

ترجمہ:۔ بیشک مراد کو پہنچے۔ ایمان والے جو اپنی نماز میں گڑگڑاتے ہیں۔ اور وہ جو کسی بیہودہ بات کی طرف التفات نہیں کرتے اور وہ کہ زکوۃ دینے کا کام کرتے ہیں اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

تمام اعمال میں اعتدال اسی وقت قائم ہوتا ہے جب دل میں خدا کی سچی محبت اس کے وعدوں پر امید اور وعیدوں کا خوف لاحق ہو، خدا کے خوف ہی کے باعث مسلمان خشوع وخضوع سے نماز میں مشغول ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے اعضا ساکن ہوتے ہیں۔ ہر جانب سے توجہ ہٹا کر صرف خدا کی طرف دھیان لگاتا ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ نماز میں خشوع کا مطلب ہی یہ ہے کہ دل لگا ہو اور دنیا سے توجہ ہٹی ہو۔ اور نظر جائے نماز سے متجاوز نہ ہو، گوشہ چشم سے کسی جانب التفات نہ کرے اور کوئی عبث کام نہ کرے۔ اور کوئی کپڑا شانوں پر اس

طرح نہ لٹکائے ہو جس کے دونوں سرے آگے کو لٹکتے ہوں کیوں کہ یہ مخل خشوع ہے۔ اور آسمان کی جانب بھی نگاہ نہ اٹھائے۔ (کنزالایمان ص ۴۹۴)

ایمان تو قلب و زبان سے خدا کی ذات و صفات اور فرامین کو تسلیم کرنے کا نام ہے۔ اس قلبی کیفیت یقین کا اظہار یقیناً عمل سے ہوتا ہے۔ عبادتیں بھی اسی وقت قابل قبول ہے جب طلب رضائے الٰہی کی عطر بیزی ہو۔ ایمان و تقویٰ والوں کے اوصاف قرآن عظیم یوں بیان فرماتا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ

(البقرہ آیت ۲۵، ۱۷۷)

ترجمہ:۔ کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو ہاں اصل نیکی یہ کہ ایمان لائے اللہ و قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر۔ اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے۔ رشتہ داروں اور عزیزوں اور مسکینوں اور راہ گیروں اور سائلوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دے اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں۔ اور صبر والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت۔ یہی ہیں جنھوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں۔

آیات بالا سے ایمان اور اعمال صالحہ کی اہم دفعات بیان فرمادیں۔

اب ایمان و تقویٰ کے مذکورہ محاسن سے آراستہ ہونے کے بعد انسانوں کو اپنے ماحول اور معاشرہ میں منبع خیر بننا ہوگا۔ کیونکہ اسلام یہ نہیں سکھاتا کہ مسلمان کا تعلق صرف مسجد سے ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے گھر اور مسلمانوں کے سوسائٹی سے ہونا بھی ضروری ہے۔ حقوق اللہ کی ادائیگی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ اسی خدا نے ماں باپ کی خدمت بیوی کے حقوق، ہمسایہ اور اہم قرابت کی غمگساری کا بھی حکم فرمایا ہے۔ اسی طرح سماجی زندگی میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ذمہ داریوں کی تکمیل ضروری ہے۔

پسندیدہ صفات:

انفرادی طور سے پہلے اپنا چال چلن، عادات و اطوار اور تعلقات کے طور پر طریق میں احکام شرعیہ کی رعایت نہایت ضروری ہے۔ سورہ فرقان میں بندگان خدا کی پسندیدہ صفات کا تفصیلی ذکر آیا ہے:

"اور رحمٰن کے وہ بندے زمین پر آہستہ چلتے ہیں (اطمینان و وقار کے ساتھ متواضعانہ شان سے نہ کہ متکبرانہ طریقے پر جوتے کھٹکھٹاتے پاؤں زور سے مارتے، اتراتے، کہ یہ متکبرین کا طریقہ ہے اور شرع نے اس کو منع فرمایا) اور جب جاہل ان سے بات کرتے ہیں (اور کوئی ناگوارہ کلمہ یا بیہودہ خلاف ادب و تہذیب کلمہ سے نکالتے ہیں) تو کہتے ہیں بس سلام۔ اور جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے لیے سجدے اور قیام میں (یعنی نماز اور عبادت میں شب بیداری کرتے ہیں اور رات اپنے رب کی عبادت میں گزارتے ہیں اور اللہ اپنے کرم سے تھوڑی عبادت والوں

کو بھی شب بیداری کا ثواب عطا فرماتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ جس کسی نے بعد نماز عشا دو رکعت یا زیادہ نفل پڑھے وہ شب بیداری کرنے والوں میں داخل ہے۔مسلم شریف میں عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جس نے عشا کی نماز باجماعت ادا کی اس نے نصف شب قیام کا ثواب پایا۔ اور جس نے فجر بھی باجماعت ادا کی وہ تمام شب عبادت کرنے والوں کے مثل ہے، اور جو عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہم سے پھیر دے جہنم کا عذاب۔ بیشک اس کا گلے کا غل ہے (یعنی جدا نہ ہونے والا) اس آیت کریمہ میں ان بندوں کی شب بیداری اور عبادت کا ذکر فرمانے کے بعد ان کی اس دعا کا بیان کیا،اس سے یہ اظہار مقصود ہے کہ وہ باوجود کثرت عبادت کے اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہیں۔ اور اس کے حضور تضرع کرتے ہیں) بیشک وہ بہت ہی بری ٹھہرنے کی جگہ ہے اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں حد سے بڑھیں نہ تنگی کریں (اسراف معصیت میں خرچ کرنے کو کہتے ہیں ایک بزرگ نے کہا اسراف میں بھلائی نہیں، دوسرے نے کہا نیکی میں اسراف نہیں۔ اور تنگی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق میں کمی کرے یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا۔ حدیث شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی کو منع کیا اس نے اقتار کیا یعنی تنگی کی اور جس نے ناحق میں خرچ کیا اس نے اسراف کیا۔ یہاں ان بندوں کے خرچ کرنے کا حال بیان کیا گیا ہے جو اسراف و اقتار کے دونوں مذموم طریقوں سے بچتے رہیں) اور ان دونوں کے بیچ اعتدال پر رہیں"۔

راہِ اعتدال:

(عبدالملک ابن مروان نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنی بیٹی بیاہتے وقت خرچ کا حال دریافت کیا تو حضرت عمر ابن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نیکی دو بدیوں کے درمیان ہے اس سے مراد یہ کہ خرچ میں اعتدال نیکی ہے اور وہ اسراف و افقار کے درمیان ہے۔ جو دونوں بدیاں ہیں اس سے عبدالملک نے پہچان لیا کہ وہ اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ مفسرین کا قول یہ ہے کہ ان آیات میں جن کا ذکر ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصحاب کبار ہیں۔ جو نہ لذت و تنعم کے لیے کھاتے ہیں نہ خوبصورتی اور زینت کے لیے پہنتے ہیں۔ بھوک روکنا، ستر چھپانا، سردی گرمی کی تکلیف سے بچنا ان کا مقصد تھا) اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پوجتے (شرک سے بری اور بیزار ہیں) اور اس جان کو جس کی اللہ نے حرمت رکھی ناحق نہیں مارتے اور بدکاری نہیں کرتے اور جو یہ کام کرے سزا پائے گا۔ بڑھایا جائے گا اس پر عذاب قیامت کے دن (یعنی وہ شرک کے عذاب میں بھی گرفتار ہوگا۔ اور ان معاصی کا عذاب اس پر اور زیادہ کیا جائے گا) اور ایمان لائے اور اچھا کام کرے تو وہ اللہ کی طرف رجوع لایا۔ جیسے حق ہے اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے (اور جھوٹوں کی مجلس سے علیحدہ رہتے ہیں، اور ان میں مخالطت نہیں کرتے) اور جب بیہودہ لوگوں کے پاس سے گزرتے ہیں، اپنی عزت سنبھالے گزر جاتے ہیں) اور وہ کہ جب انھیں ان کے رب کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے (کہ نہ سوچیں نہ سمجھیں بلکہ بگوش ہوش سنتے ہیں۔ اور بچشم بصیرت دیکھتے ہیں اور اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اور نفع اٹھاتے ہیں) اور وہ جو عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں دے ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی ہمیں بیبیاں اور اولاد نیک اور

صالح متقی عطا کر کہ ان کے حسن عمل اور ان کی اطاعت خدا اور رسول دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی اور دل خوش ہوں) اور ہمیں پرہیزگار کا پیشوا بنا۔

(الفرقان ۲۵، ۶۳ تا ۷۸ مع تفسیر خزائن العرفان کنزالایمان ص ۵۲۹)

عظمت صحابہ

کسی امر واقعی کا اقرار نہ کرنا صدق و دیانت کے خلاف ہے۔ اظہر من الشمس حقیقت کا انکار تو سراسر جرم و عدوان ہے۔ دربار الٰہی سے بیشمار انعام و عطا پانے والے رسول کی عظمت شان کا قضیہ بھی موجودہ ماحول میں مسلمانوں کے لیے مابہ النزاع ہے۔ معظم رسول کی عظمت تو ان کے افعال و کردار کے ایک ایک موڑ سے نمایاں ہے۔ اور اس قدر روشن بھی کہ کسی صاحب نظر کا منکر ہونا ناممکن ہے۔ مثال مشہور ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے مگر میں آپ کو برگ رسالت کے زیر سایہ سانس لینے والے مسافروں کی خوش بختی کا حال سناؤں کہ ہزاروں سال کا عابد و زاہد اور شب زندہ دار مرد آگاہ بھی کسی صحابیِ رسول کی گرد شوکت کو نہیں پہونچ سکتا۔ ان اونچی پیشانی والوں کے بھی متعدّد درجے ہیں۔ ان کے کچھ السابقون الاولون ایسے بھی ہیں، جن کے بارے میں زبان رسالت کا انتباہ ہے۔

''لا تسبوا اصحابی فلو ان احدکم انفق مثل احد ذھباً مابلغ حد احدھم ولا نصفہ''۔ (بخاری و مسلم)

ترجمہ:۔ میرے اصحاب کو برا نہ کہو کیونکہ اگر تم میں کا کوئی راہ حق میں کوہ احد کے برابر سونا خرچ کردے پھر بھی ان کے ایک نصف کے مقابل نہ ہوگا۔

اصحاب کرام خود صاحب شرع اور ھبط وحی نہیں ہے۔ لیکن ایمان کی نگاہ سے محبوب خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے رخ زیبا کی ایک جھلک دیکھ لینے کے باعث خود ان کی شخصیتیں شریعت کا معیار اور دین پاک کسوٹی بن گئی ہیں۔ ان کی دوستی خدا اور رسول کی محبت کا باعث اور ان کی دشمنی شریعت سے بغاوت تصور کی جاتی ہے۔ جیسا کہ علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفا میں مالک ابن انس کی روایت نقل کی ہے:

''من ابغض الصحابۃ و سبھم فلیس لہ فی فئی المسلمین حق''۔

ترجمہ:۔ جس نے صحابہ سے بغض رکھا اسلامی جمہوریہ میں ایسے شخص کی کوئی گنجائش نہیں۔

شرح مسلم کی شرح میں ہے کہ صحابہ کو برا کہنا حرام، جمہور کا مذہب ہے کہ صحابہ کا بدگو قابل تعزیر مجرم ہے۔ بعض مالکیہ نے لکھا ہے کہ صحابہ کو برا کہنے والے کو قتل کیا جائے۔ علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے شخص کو گناہِ کبیرہ کا مرتکب گردانا ہے۔ شیخ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرقہ امامیہ کو جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا منکر ہے۔ کافر قرار دیا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

''الرافض اذا کان یسب الشھیدین و یلعنھما العیاذ باللہ فھو کافر و این کان یفضل علیاً کرم اللہ وجھہ علی ابی بکر لا یکون کافراً لکنہ مبتدع ولو قذف عائشۃ بالزنا کفر باللہ''۔

(فتاویٰ عالمگیری)

ترجمہ:۔ رافضی اگر شیخین کو گالی دیتا ہے اور لعنت کرتا ہے تو کافر ہے اور اگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر فضیلت دیتا ہے تو کافر نہیں بلکہ بدعتی ہے اور اگر ام المومنین عائشہ رض۔ی اللہ تعالیٰ عنہا پر زنا کی تہمت لگاتا ہے تو کافر ہے۔

ظاہر نظر میں حضرات شیخین کی شخصیت کو کفر و اسلام کا معیار نہیں بننا چاہیے تھا۔ اور ان کی خلافت کے حق تسلیم کرنے پر صاحب حق اور نہ تسلیم پر ناحق ہونا بدیہی نہیں۔ مگر پوری ملت اسلامیہ کا مذہبی ذخیرہ اس امر پر شاہد ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے بارے میں اعتقاد کو بھی دین صادق کا معیار بنایا گیا ہے کہ جو خلافت شیخین کو حق سمجھے وہ مسلمان، اور نہ تسلیم کرے اور ان حضرات کے علاوہ کسی اور کو مسند خلافت کا حقدار بتائے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ سبب یہ ہے کہ ان حضرات کی روحانی گردیدگی نے انہیں اس منزل پہ پہونچا دیا کہ خود قول شارع ان کے حق میں مؤید و فیصل بن گیا۔ جن کی روشنی میں فقہا نے احکام نافذ کیے۔

''من انکر امامة ابی بکر الصدیق فھو کافر علی قول بعضھم قال بعضھم فھو مبتدع ولیس بکافر والصحیح انه کافر کذالك من انکر خلافة عمر فی اصح الاقوال''۔

ترجمہ:۔ جو شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت کا انکار کرے وہ کافر ہے اور بعض نے کہا بدعتی ہے کافر نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ وہ کافر ہے۔ یونہی جو خلافت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انکار کرے وہ بھی کافر ہے۔

درمیان میں کچھ دیگر تفصیلوں کے بعد ان منکرین کا حکم مرقوم ہے:

''ھٰؤلاء القوم خارجون عن ملة الاسلام واحکامه احکام المرتدین''۔ (عالمگیری)

ترجمہ:۔ یہ قوم ملت اسلامیہ سے خارج ہے اور اس کا حکم مرتدین کا حکم ہے۔

شیخین کو شارع نہیں کہا جاسکتا۔ مگر لغض ہے اس کی عظمت والے نبی کا جس کے فیض صحبت نے ان کو اتنا اونچا اٹھا دیا کہ ان کی موافقت و مخالفت دینداری یا اسلام دشمنی کی دلیل بن گئی اگر ان کی امامت و خلافت کو حق سمجھتے ہوں تو خیر، ورنہ ایسے لوگوں کے ساتھ مرتدین و مغضوبین جیسا سلوک کیا جائے۔ دیات در اصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے اس منبع انوار سے اکتساب فیض کرنے میں اپنے کو اس قدر گم کر دیا۔ اور اساسِ شریعت اور عظمت مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے حیات کا ایسا گرانمایہ جوہر سمجھ کر اپنایا کہ خود شارع نے اپنی زبان فیض ترجمان سے انکو شریعت کا معیار اور دین کی کسوٹی قرار دے دیا۔ اور خود فرمان رسول ان کی خلافت پر دال ہو گیا۔

''اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر''۔ (ترمذی مجتبائی)

ترجمہ:۔ میرے بعد ان دونوں کا اتباع کرو ابوبکر اور عمر۔

''علیکم بسنتی وسنة خلفاء الراشدین المھدیین''۔ (ابوداؤد)

غور طلب امر یہ ہے کہ حلقہ غلامی پہننے والوں کا جب یہ حال ہے تو کیا شان ہوگی اس ذات والا کی جو زبان ہلائے تو کلام الٰہی کا اظہار ہو۔ جس کی خاموشی زبان قدرت کا سکوت۔ جس کے خادم سید الملائکہ، جس کی سواری براق و رفرف، جس کی رفتار و گفتار قانون شریعت، جو

سب نبیوں کا نبی، سارے رسولوں کا رسول، اور سب سے بڑھ کر جسے رب السمٰوٰت والارض نے محبوبیت کبریٰ کا تاج پہنایا۔ اس ذات عالی شریعت اسلامیہ کے لیے کتنا عظیم معیار ہوگی۔ اسے تو دین حنیف کے سچے پیروں سے پوچھئے:

''لوقال لشعرہ علیہ السلام شعیر یکفر''۔(عالمگیری)

ترجمہ:۔ اگر کوئی شخص نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بال مبارک کو ''بلوا'' کہہ دے تو کافر ہو جائے۔

آپ کا اسم پاک لکھنے کے بعد اگر کسی نے درود لکھنے میں تخفیف کی تو اس کا یہ فعل کفر کی سرحد کو چھو جاتا ہے۔ حضرت علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ حاشیہ درالمختار میں فتاویٰ تتار خانیہ سے نقل فرماتے ہیں:

''من کتب علیہ السلام بالھمزۃ والمیم یکفر لانہ تخفیف الانبیا و تخفیف الانبیا کفرہ''۔

ترجمہ:۔ جس نے علیہ السلام کو تخفیفاً (ع م) لکھ دیا تو اس نے کفر کیا۔

آج کل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جگہ صلعم کا لکھنے رواج عام ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں محسوس کی جاتی۔ صرف یہی نہیں، مزاج اتنا تبدیل ہو چکا ہے کہ ''قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ، الخ'' کی آڑ لے کر خود کو انبیا علیہم السلام کے ہم پلہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

موجودہ دور میں عظمت انبیا کو پامال کرنا ہی توحید کا اثبات سمجھا جاتا ہے عوامی رجحان کو اپنی جانب منعطف کرانے کے لیے دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ انبیا و رسل اگر ہم جیسے نہ تھے تو ہم لوگوں میں رہ کر راہ نجات کی ہدایت ان کے حق میں فعل کمال کیسے بن گیا؟

حالانکہ اس نظریہ کو تسلیم کیا جائے تو براہ راست عظمت انبیا پر ضرب آتی ہے کہ ہم گنہگاروں اور عصیاں شعاروں کے لیے معصوم ذاتوں کے انتخاب کی کیا ضرورت تھی۔ (العیاذ باللہ) حالانکہ نبیوں کے معصوم ہونے پر سب متفق ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ عظمت رسالت کی لامتناہی حقیقتوں سے انکار کیا جائے کہ جس مالک و قادر نے انہیں معصوم بنایا۔ اسی نے بیشمار فضیلتوں کا تاج بھی پہنایا۔

کوتاہ اندیشی، ضد اور ہٹ دھرمی کی تمام عینکیں اتار کر اگر آج بھی قرآن و حدیث اور فقہی تصریحات پر غور کیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ دلوں میں عظمت رسول کا وہی اعتقاد قائم نہ ہو۔ جو سلف صالحین میں تھا۔ اور فی الحقیقت اسی میں ہماری اور ساری انسانیت کی فلاح ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اعتکاف اسلام میں

اعتکاف مسلمانوں کی ایک روح پرور عبادت کا نام ہے۔ شرائع ماسبق میں بھی یہ عبادت موجود تھی۔ گوشۂ عافیت میں چھپ کر اپنے خالق و مالک کی یاد سے روحانیت کو ترقی دینے اور نفسانیت کو زیر کرنے کے لیے یہ عبادت نسخۂ کیمیا ہے۔

اعتکاف کی تعریف:

علامہ امام راغب الاصفہانی اعتکاف کی تعریف میں فرماتے ہیں:

"هو الاحتباس في المسجد على سبيل القربة"۔

ترجمہ:۔ اعتکاف عبادت کی نیت سے مسجد میں ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔

اعتکاف اور کتاب اللّٰہ:

اعتکاف کا مادہ عکف ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ۹/ نو مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ سورۂ بقرۃ، آیت نمبر ۱۲۵/ میں ہے:

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ (البقرۃ:۱۲۵)

ترجمہ:۔ اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو تاکید کی کہ میرا گھر خوب صاف ستھرا رکھنا طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔

اسی سورہ، آیت نمبر ۱۸۷/ میں اعتکاف کے احترام کی تعلیم دی گئی ہے اور اس عالم میں مباشرت سے باز رہنے کا حکم آیا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ یہ اللہ کی حد ہے، اسے توڑنے کی گستاخی نہ کرنا۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ۔ (البقرۃ:۱۸۷)

ترجمہ:۔ اور نہ مباشرت کرو ان سے جب کہ تم اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں۔

سورۂ اعراف آیت نمبر ۱۳۸/ میں بنی اسرائیل کا واقعہ بیان ہوا ہے، جب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ دریا میں راستہ پاکر صحیح و سالم پار اتر گئے۔ تو انھوں نے وہاں ایک قوم کو دیکھا جو اپنے بتوں کے آگے آسن جمائے ہوئے (معتکف) تھی۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ۔
(الاعراف:۱۳۸)

اسی طرح سورۂ طہٰ کی آیت نمبر ۹۱/ میں سامری کے گرسالے پر آسن جمائے ہوئے بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ (طہٰ ۹۱)

جو موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر تشریف لے جانے کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کے نافرمان ہوکر بچھڑے کی پوجا کرنے لگے تھے۔ اور اسی سورہ کی آیت نمبر ۹۷/ میں سامری کے آسن مارنے کو موسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے فضول، موجب عذاب اور کھلا شرک بتایا ہے اور اسی کے سبب اسے دنیا اور آخرت کے عذاب کی خبر سنائی۔ (طہٰ ۹۷)

سورۂ انبیاء آیت نمبر ۵۲/ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذکر ہوا ہے، جب انھوں نے بت تراش آذر اور قوم سے فرمایا: یہ مورتیں کیا ہیں، جن کے آگے تم آسن مارے ہوئے ہو؟

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۔ (انبیاء:۵۲)

یہی بیان سورۃ الشعراء آیت نمبر ۶۹/ سے شروع ہوا ہے۔ سیدنا خلیل اللہ کے پوچھنے پر آذر اور دوسرے لوگوں نے جواب دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں، پھر ان کے آگے آسن مارے رہتے ہیں۔

نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ۔ (الشعراء:۷۱)

سورۂ حج آیت نمبر ۲۵؍ میں مسجد حرام کی عمومیت اور تمام مسلمانانِ عالم کے لیے اس میں ایک سا حق ہونا بتایا گیا ہے، خواہ وہاں کے رہنے والے ہوں، یا پردیسی۔

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِالْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ۔ (الحج:۲۵)

سورۂ فتح آیت نمبر ۲۵؍ میں مشرکین مکہ کی سرکشی اور خود سری کا ذکر ہے کہ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مسجد حرام میں آنے اور قربانی کے جانور مقامِ ذبح تک لانے سے روکا۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ۔ (فتح:۲۵)

اعتکاف اور احادیث مبارکہ:

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے:

''ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یعتکف العشر الاواخر من رمضان حتی توفاہ اللہ ثم اعتکف ازواجہ من بعدہ''۔ (بخاری، ج:۱/ص:۲۷۱)

ترجمہ:۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ آپ خدا کو پیارے ہوگئے، پھر آپ کے بعد آپ کی بیبیاں اعتکاف کرتیں۔

ابوداؤد ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتی ہیں:

''السنة علی المعتکف ان لا یعود مریضا ولا یشھد جنازۃ ولا یمس امرأۃ ولا یباشرھا ولا یخرج لحاجة الا لما لابد منه ولا اعتکاف الا لصوم ولا اعتکاف الا فی مسجد جامع''۔ (ابوداؤد، ج:۱/ص:۳۴۲)

ترجمہ:۔ سنت رسول سے ثابت ہے کہ معتکف نہ مریض کی عیادت کو جائے، نہ جنازہ میں حاضر ہو، نہ عورت کو ہاتھ لگائے، نہ اس سے مباشرت کرے، نہ کسی کام کے لیے نکلے، مگر اس کام کے لیے جاسکتا ہے جو نہایت ضروری ہے اور اعتکاف بغیر روزے کے نہیں اور اعتکاف جماعت والی مسجد میں کرے۔

صحابہ یا صحابیات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے جب کوئی یہ فرمائے کہ ''سنت'' یہ ہے تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت شدہ ہے۔ اس کا حکم حدیث مرفوع کا حکم ہوتا ہے۔ لہٰذا ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب فرمایا کہ اعتکاف کے معاملہ میں سنت یہ یہ ہے تو پتہ چلا کہ اس عبادت کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد یا طرزِ عمل سے یہی چیزیں مشروع ہیں۔

سیدنا عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

''کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعتکف العشر الاواخر من رمضان''۔

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کرتے تھے۔

ترمذی و ابوداؤد حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

''کان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یعتکف فی العشر الاواخر من رمضان ولم یعتکف عاما فلما کان العام المقبل اعتکف عشرین''۔ (ترمذی وابوداؤد)

ترجمہ:۔ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور ایک سال اعتکاف نہیں فرمایا تو دوسرے سال بیس دن اعتکاف فرمایا۔

سنن نسائی اور سنن ابو داؤد میں حضرت ابی بن کعب کی روایت میں ہے کہ ایک سال سفر درپیش ہوجانے کے باعث حضور نے اعتکاف نہیں کیا تو دوسرے سال بیس دن اعتکاف فرمایا۔

حضرت سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں:

''ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کان اذا اعتکف طرح لہ فراشہ او یوضع لہ سریرہ وراء اسطوانۃ التوبۃ، رواہ ابن ماجۃ''۔

(نیل الاوطار، ج:۴، ص:۱۴۸)

ترجمہ:۔ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب اعتکاف کرتے تھے تو آپ کے لیے بستر بچھا دیا جاتا تھا یا ستونِ توبہ کے پیچھے آپ کا تخت ڈال دیا جاتا تھا۔

دیلمی مسند فردوس میں حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بسند ضعیف راوی ہیں:

''من اعتکف ایمانا واحتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ''۔

(کنز العمال، ج:۴، ص:۳۱۲)

ترجمہ:۔ جس نے ایمان و احتساب کے ساتھ اعتکاف کیا، اس کے پچھلے گناہ معاف ہوئے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ظاہر مذہب حنفیہ میں اعتکاف سنت مؤکدہ ہے، اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمیشہ اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس دنیا سے تشریف لے گئے''۔ (اشعۃ اللمعات، ج۲، ص ۱۱۸)

معتکف کیا کرے:

''لا یتکلم الا بخیر ویلازم التلاوۃ والحدیث والعلم وتدریسہ وسیر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم والانبیاء علیہم السلام واخبار الصالحین کذا فی الفتح القدیر''۔ (فتاویٰ الہندیہ، طبع مصر، ج:۱، ص:۱۹۸)

ترجمہ:۔ بات کرے تو بھلی بات کرے۔ تلاوتِ قرآن، حدیث اور علم میں مشغول رہے۔ درس دے، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور انبیا علیہم السلام کی سیرت پڑھے، نیز صالحین کی زندگیوں کا مطالعہ کرے۔

سیرتِ رسول اکرم اور اعتکاف:

مسلمانانِ عالم کے لیے یہی از بس ہے کہ رسول خاتم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اعتکاف کا خود اہتمام فرمایا ہے۔ قرآن مجید نازل ہونے سے پہلے بھی آپ کو خدا کی یاد کرنے کے لیے گوشہ نشینی نہایت محبوب تھی۔ ذکر و فکر کے لیے دنیا سے یک سو ہو بیٹھنا، آپ کو بہت پسند تھا۔ آپ کئی کئی ماہ تک غارِ حرا میں خلوت گزیں ہو کر یادِ الٰہی سے لذت یاب ہوا کرتے تھے۔ دراصل روحانی سر بلندی اور باخدا ہونے کے لیے دنیا کے عوائق سے یک گونہ منقطع ہونا ضروری ہے۔ اور اعتکاف اس کی مسنون مثال ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم غارِ حرا میں معتکف تھے، اسی دوران آپ پر پہلی وحی کا نزول ہوا اور حضرت سیدنا جبرئیل علیہ السلام سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیات لے کر آئے۔

بیہقی اور ابن اسحاق کی روایات کے حوالے سے فتح الباری میں ہے کہ پہلے وحی نازل ہوئی تو وہ رمضان المبارک کا مہینہ اور اس کا آخری عشرہ تھا اور شب قدر تھی۔ اعتکاف کے لیے رمضان المبارک اور اس کا آخری عشرہ اس مناسبت سے بھی مسلمانوں کے لیے منتخب ہوا۔

روح کی تربیت اور آلائش حیات سے اس کو پاکیزہ کرنے کا مبارک ترین موسم رحمت رمضان المبارک ہے۔ روزہ کے ذریعہ رب تعالیٰ ہمارے گندے اعمال ناموں کو صفائی اور نظافت عطا فرماتا ہے۔ بہیمی صفات کو مغلوب کر کے روح کی ملکوتیت کو اجاگر فرماتا ہے۔ نفسانی مجاہدہ کا یہ کورس تو سال بھر میں ایک ماہ رب قدیر کی طرف سے ہر مسلمان کے لیے لازم اور ضروری ہے۔

روزہ انسان کو خوراک، غذا اور جماع کی لذت اندوزی سے باز رکھ کر روح کو جلا بخشنے کا بہترین قدرتی نظام ہے۔ اس اہم عبادت نے اہل ایمان کو حیوانی خصائل کو ملکوتی بندھن میں رکھنے کی نہایت نفیس اسکیم عطا کی۔ اس کے بعد بندے کی روحانی ترقی تو روزہ کی تربیت اور تزکیہ کے بعد مقصد تک لے جاتی ہے۔ اور خدا رسی کے قریب لاتی ہے۔ وہ ہے گوشہ نشینی کی وہ عبادت جسے اعتکاف کہتے ہیں۔

اعتکاف رب تعالیٰ کے اخص الخواص بندوں کی عبادت ہے۔ ہر مسجد میں بستی کا ایک مسلمان بھی معتکف ہو جاتا ہے تو سب کی ذمہ داریاں ساقط ہو جاتی ہیں۔ اور اگر کوئی اعتکاف نہ بیٹھے تو سب ماخوذ ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ چند خاص لوگوں کے باعث عام لوگوں پر بھی رب تعالیٰ کرم فرماتا ہے۔ اس اہم عبادت کے لیے وقت کا اہم ترین حصہ بھی خاص کیا گیا ہے۔ اس طرح عبادت گزاری کا کیف دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر سال رمضان المبارک میں اعتکاف تو فرماتے ہی تھے، جس سال آپ کا وصال ہونے والا تھا، اس سال کے رمضان میں آپ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ گویا حضورِ لقائے ربانی اور رفیق اعلیٰ سے وصال کے اشتیاق میں دنیا سے انقطاع کو زیادہ پسند فرما رہے تھے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی کیمیائے سعادت میں لکھتے ہیں:

"حضور کی سنتوں میں سے مسجد میں اعتکاف کرنا بھی ہے۔ خصوصاً (رمضان کی) آخری دس راتوں میں کہ لیلۃ القدر انھیں راتوں میں ہوتی ہے۔ اور رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان دس راتوں کے دوران سونا ترک کر دیتے تھے اور عبادت کے لیے کمر بستہ ہو جاتے تھے۔ آپ اور آپ کے اہل عبادت سے دم بھر آرام نہ کرتے تھے۔ اور لیلۃ القدر رمضان شریف کی اکیسویں، تیئیسویں، پچیسویں یا ستائیسویں راتوں

میں سے ایک رات ہوتی ہے۔ اور زیادہ تر امکان ستائیسویں رات کا ہے۔ تاہم بہتر یہی ہے کہ اعتکاف ان دس راتوں کے دوران مسلسل جاری رہے"۔

(کیمیائے سعادت، للغزالی، ص۹۶)

ناکردہ نیکیوں کا ثواب:

یہ رب تعالیٰ کا کتنا عظیم احسان و کرم ہے کہ کچھ عبادتیں جو بندہ نہیں کرتا، بعض عبادات ایسی بھی ہیں، جن کی مشغولیت ناکردہ عبادات و حسنات کے ثواب بھی سمیٹ لاتی ہیں۔ انھیں عبادات میں ایک عبادت اعتکاف بھی ہے۔

معتکف، بیماروں کی عیادت و خدمت، بیوی بچوں کی داشت و پرداخت، غربا، یتامیٰ اور حاجت مندوں کی حاجت روائی، جنازہ کی شرکت وغیرہ ثواب سے لبریز کاموں کو نہیں کرپاتا۔ مگر ان سب نیک کاموں سے دور رہ کر بھی گوشۂ مسجد میں اس کی محبوسی خداوند تعالیٰ کو ایسی پسند ہے کہ ان سب کاموں کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں درج فرماتا ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معتکف کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"ہو یعتکف الذنوب ویجری لہ من الحسنات کحامل الحسنات کلہا"۔

(رواہ ابن ماجۃ)

ترجمہ:۔ وہ گناہوں سے بچا رہتا ہے اور اس کا نیکیوں کا حساب ساری نیکیاں کرنے والے کی طرح جاری رہتا ہے۔

احتیاط:

اور اعتکاف کے احکام بیان فرمانے کے بعد رب تعالیٰ فرماتا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ (البقرۃ:۱۸۷)

ترجمہ:۔ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ جانا۔

احکاماتِ الٰہیہ اور فرامین خداوندی کی خلاف ورزی دین و دنیا دونوں عالم کے لیے تباہ کن اور مہلک ہیں۔ رب تعالیٰ نے حلال و حرام صاف صاف بیان کردیے ہیں اور اپنے پیارے رسول سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دین داری اور بے دینی، اسلام و ایمان اور کفر و شرک، عبادات و اوامر اور بغاوت و نواہی کو کھول کھول کر واضح فرمادیا ہے۔ اب جن کاموں میں لگنے کا حکم دیا ہے، ان سے مناسبت و موافقت کو بھی پسند کیا ہے اور جن باتوں سے باز رہنے کو فرمایا، اس کی نزدیکی کو بھی معیوب گردانا ہے۔ کیوں کہ جس مقام سے معصیت کی حد شروع ہوتی ہے، اس کے آخری کناروں پر گھومتے رہنے والا حدوں کو توڑ بھی سکتا ہے۔ اس لیے آیت بالا میں مناہی میں صرف جا گرنے سے نہیں روکا گیا، بلکہ اس کی نزدیکی اور قربت سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔ اس کی تشریح اس فرمانِ رسول سے ہوتی ہے، جس میں آپ نے ارشاد فرمایا:

"لکل ملك حمی ان حمی الله محارمة فمن یرتع حول الحمی یوشك ان یقع فیه"۔

ترجمہ:۔ ہر بادشاہ کی ایک حمیٰ (مخصوص چراگاہ) ہوتی ہے اور اللہ کی حمیٰ اس کے محرمات ہیں تو جو حمیٰ کے گرد ہی چرتا رہے گا، ہوسکتا ہے حمیٰ میں جا پڑے۔

اعتکاف ہو یا روزہ یا اور دوسری عبادتیں، ان میں کی آخری سرحد جہاں سے معصیت کے ڈانڈے ملتے ہیں، وہاں تک پہنچنا کیا ضروری ہے؟ بلکہ ان باریک سرحدی خطوط سے دور دور ہی رہنا نفس پر قابو اور عبادات میں کامل انہماک کے لیے مفید ہوتا ہے۔

اعتکاف کے فضائل:

ارشاد رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے:

''من اعتكف يوما ابتغاء وجه الله عزوجل جعل الله بينه وبين النار ثلاثة خنادق ابعد مما بين الخافتين''۔

(کنزالعمال، ج:۴ر ص:۳۱۲)

ترجمہ:۔ جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے واسطے ایک روز اعتکاف کرے، اللہ تعالیٰ اس شخص اور جہنم کے درمیان تین خندقوں کا فاصلہ بنادے گا، جن کا فاصلہ زمین و آسمان سے بھی زیادہ ہوگا۔

حضرت سیدنا حسین ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک روایت ہے۔ رسول اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''من اعتكف عشرا في رمضان كان كحجتين وعمرتين''۔

ترجمہ:۔ رمضان المبارک میں دس دن اعتکاف کرنے والے کا عمل دو حج اور دو عمرے جیسا ہے۔

گویا جتنا اجر و ثواب دو حج اور دو عمرے ادا کرنے والا رب تعالیٰ کی طرف سے پاتا ہے، رمضان کے عشرۂ اخیرہ کا اعتکاف کرنے والا اتنے ثواب سے نوازا جاتا ہے۔

اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مسجد شریف (المسجد النبوی) میں ایک ستون ہے، جس کا نام حدیث کی کتابوں میں ''اسطوانة التوبة'' آیا ہے اور اس کو اسطوانة ابو لبابة'' بھی کہتے ہیں۔ ہر سال رمضان المبارک کے آخری دس دنوں میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب اعتکاف فرماتے تو آپ کا بستر شریف یا مبارک چارپائی اسی ستون کے پاس بچھائی جاتی۔

ابن ماجہ نے سیدنا عبداللہ ابن عمر کا واقعہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے مسجد شریف میں حضور کے اعتکاف کی جگہ اپنے شاگرد حضرت نافع کو دکھائی۔

(نیل الاوطار، ج۴ر ص۲۶۶)

معتکف کا سر دھلوانا:

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب اعتکاف میں ہوتے تو اپنا سر مبارک (مسجد میں ہوتے ہوئے، مسجد کے باہر) میری طرف جھکا دیتے اور میں آپ کے سر مبارک میں کنگھی کر دیتی تھی اور آپ گھر میں قضائے حاجت کے سوا کسی اور ضرورت سے تشریف نہیں لاتے تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ اسی طرح آپ سر بھی دھلوالیا کرتے تھے۔ ایک اور روایت سے واضح ہوتا ہے کہ سر دھلواتے وقت حضور اقدس اور ام المومنین (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے درمیان دروازے کی چوکھٹ حد فاصل ہوتی تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ خدمات انجام دیتے وقت بعض دفعہ ام المومنین حیض کی حالت میں بھی ہوتیں۔ (مصنف ابن شیبہ، ج۳/ص ۹۴)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ معتکف مسجد کی طہارت و نظافت کا لحاظ رکھتے ہوئے کنگھی کرسکتا ہے، سر دھو سکتا ہے، ان کاموں میں دوسرے کی مدد بھی لے سکتا ہے۔ اس کا یہ حکم کوئی خارج مسجد رہ کر بھی انجام دے سکتا ہے۔ اپنی بیوی سے بھی یہ خدمت لے سکتا ہے، اگرچہ وہ حیض کے عالم میں ہو۔ اور معتکف کے جسم کا کوئی حصہ باہر نکل جانے سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔

معتکف اور عیادت:

معتکف کسی کی بیمار پُرسی کے ارادے سے نہیں نکل سکتا، مگر قضائے حاجت یا نماز جمعہ کے لیے آتے جاتے، راستے سے الگ جاکر مریض کے پاس ٹھہرے بغیر اگر کسی کی مزاج پُرسی یا عیادت کرے تو یہ جائز ہے۔ ام المومنین فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اعتکاف کی حالت میں کسی مریض کے قریب سے گزرتے تو راستہ سے ہٹے اور ٹھہرے بغیر، چلتے چلتے اس کا حال دریافت فرمایا کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

اسی طرح اگر کوئی معتکف کے پاس دریافتِ حال، دینی مسائل پوچھنے، یا کوئی ضروری شئے دریافت کرنے کے لیے آئے تو آسکتا ہے۔ اور معتکف اس کا استقبال اور مشالقت حدودِ مسجد تک کرے تو یہ بھی جائز ہے۔

صحیح بخاری شریف میں ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے۔ فرماتی ہیں:

"وہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے جب سرکار اعتکاف میں تھے مسجد میں آئیں، یہ رمضان المبارک آخری عشرہ کی بات ہے اور کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی رہیں، پھر واپسی کے لیے کھڑی ہوئیں تو حضور اقدس بھی کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ جب وہ مسجد شریف کے دروازہ پر بابِ ام سلمہ کے قریب پہنچیں تو دو انصاری صحابی وہاں سے گزرے اور انھوں نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سلام کیا، آپ نے ان سے فرمایا: ذرا ٹھہرو! یہ عورت صفیہ بنت حی تھیں کوئی اور نہیں۔ انھوں نے کہا: سبحان اللہ! یارسول اللہ! یہ بات انھیں ناگوار ہوئی (کہ حضور کو ہمارے بارے میں بدگمانی کا اندیشہ ہوا) اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان انسان سے اتنا قریب ہے، جتنا انسان کا خون اس سے نزدیک ہوتا ہے اور مجھے خطرہ ہوا کہ وہ تمہارے دلوں میں کوئی بدگمانی نہ ڈال دے"۔ (صحیح بخاری)

سیدنا عمر کا اعتکافِ نذر:

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم طائف سے واپس ہوتے ہوئے جعرانہ کے مقام پر تشریف فرما تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! میں نے دورِ جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ مسجد حرام میں ایک دن کا اعتکاف کروں گا، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

"اذھب فاعتکف یوما"۔ (بخاری ومسلم)

ترجمہ:۔ جائو اور ایک روز کا اعتکاف کرلو۔

زمانۂ کفر کی نذر اسلام لانے کے بعد منسوخ ہے۔ مگر رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو یہ اعتکاف کرنے کو فرمایا، کیوں کہ اسلام میں بھی اعتکاف مشروع ہے۔ اور حضرت عمر نے ایک کارِ خیر کی اجازت مانگی تو حضور نے اجازت مرحمت فرمادی۔ اس سے ایک دن کے اعتکاف اور نذر اعتکاف کا ثبوت ملتا ہے۔ جب حضور نے حضرت عمر کو زمانۂ کفر کے نذرِ اعتکاف سے منع نہیں فرمایا، تو اگر کوئی مسلمان اعتکاف کی منت مانے تو اسے یہ اعتکاف پورا کرنا واجب ہونا ہی چاہیے۔

اعتکاف کے مقامات:

(۱)... سب سے افضل و اعلیٰ مقامِ اعتکاف مسجد حرام (مکہ مکرمہ) ہے۔

(۲)... دوسرے درجہ کی جگہ مسجد نبوی شریف (مدینہ طیبہ) ہے۔

(۳)... تیسرے درجہ کی جگہ مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) ہے۔

(۴)... چوتھے درجہ کی جگہ جامع مسجد ہے (یہاں کے معتکف کو نمازِ جمعہ کے لیے کہیں اور جانے کی بھی حاجت نہیں)

(۵)... پانچویں درجہ کی جگہ ہر وہ مسجد ہے جہاں نماز باجماعت ہوتی ہو۔

(۶)... آخری درجہ میں اس مسجد کے اندر بھی اعتکاف کرسکتے ہیں جہاں نماز باجماعت بھی نہ ہوتی ہو۔ مرد صرف مساجد ہی میں اعتکاف کرسکتے ہیں۔

عورت اپنے گھر میں اپنی عبادت کی مقررہ جگہ پر اعتکاف کرے، اگر گھر میں عبادت کی کوئی مخصوص جگہ نہ ہو تو کوئی کمرہ خاص کرلے۔ (فتاویٰ شامی، ج۲رص۱۲۹) اور وہیں اعتکاف کرے۔ منکوحہ عورت کو اعتکاف کے لیے شوہر سے اجازت بھی لینی چاہیے۔ اعتکاف کے لیے بھی عورت کا حیض ونفاس سے پاک ہونا شرط ہے۔

اقسامِ اعتکاف:

از روئے شرع اعتکاف کی تین قسمیں ہیں: (۱) واجب (۲) مسنون (۳) اور نفل

اعتکافِ واجب:۔ وہ اعتکاف ہے، جو نذر کرنے سے ضروری ہوجاتا ہے۔ جیسے کسی نے منت مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہوجائے تو میں تین دن کا اعتکاف کروں گا۔ تو ایسی صورت میں نذر کرنے والے پر یہ اعتکاف واجب ہوجائے گا، اس اعتکاف کے لیے بھی روزہ شرط ہے۔

یا اعتکافِ مسنون اگر کسی وجہ سے ٹوٹ جائے تو اس کو قضا کرنا بھی واجب ہوتا ہے۔

اعتکافِ مسنون:۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جسے نہایت اہتمام اور پابندی سے کیا، وہ رمضان المبارک آخری دس دن، اکیسویں رات سے شروع ہوکر عید کا چاند ہونے تک کیا جاتا ہے۔ یہ اعتکاف سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے۔ محلہ یا بستی کے مسلمان یا باشندوں میں سے اگر ایک مسلمان بھی اس اعتکاف کو کرلے تو پورے محلہ اور بستی کی طرف سے سنت ادا ہوجائے گی۔ اور اگر کسی نے بھی نہیں کیا تو سب لوگوں پر ترکِ سنت کا وبال آئے گا۔

اعتکافِ نفل:۔ ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔ یہ چند لمحوں کے لیے بھی ہوسکتا ہے اور کئی دنوں تک بھی، بلکہ بہتر ہے کہ مسلمان جب بھی مسجدوں میں داخل ہوں تو اعتکاف کی نیت کرلیا کریں۔ مسجد میں داخلہ کے بعد کی جانے والی عبادات کا ثواب تو ملے گا ہی، اعتکاف کا ارادہ کرلینے سے اعتکاف کا ثواب بھی حاصل ہوگا۔

ان تینوں قسموں میں سے مسنون اعتکاف، جو رمضان المبارک میں کیا جاتا ہے، وہی زیادہ معروف ہے۔

اعتکاف کا اہتمام:

بہتر یہ ہے کہ مسلمانوں کی تمام مسجدیں جہاں نماز باجماعت ہوتی ہے، وہاں مسلمان رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کریں۔ اس سلسلہ میں چند باتوں پر پہلے ہی دھیان دیں:

(۱)... ہر مسجد کے مصلیان آپس میں طے کرلیں کہ اعتکاف کون کرے گا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو ممکن ہے عین وقت پر معلوم ہو کہ امسال کوئی اعتکاف میں نہیں اور مسجد خالی ہے۔ بہتر ہے کہ ۱۵/ رمضان کے بعد ہی اس پر بات چیت کرلی جائے۔ دوسرے محلہ کا شخص بھی اعتکاف کرسکتا ہے، مگر اجرت پر کسی کو اعتکاف میں بیٹھانا جائز نہیں۔

(۲)... جو لوگ اعتکاف کا ارادہ کریں بہتر ہے کہ وہ اپنے بال بچوں اور گھر، کاروبار کی لازمی ضروریات کا انتظام بیس رمضان المبارک عصر سے پہلے پہلے کرلیں۔ تاکہ اس مدت میں وہ ان فکروں سے بالکل بے نیاز رہیں۔

(۳)... اعتکاف کے دوران جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تیار کرلیں۔ مثلاً کپڑے، مسواک، تولیہ، مصحف شریف، وظائف یا جو دینی کتب مقصود ہوں۔

(۴)... اعتکاف شروع کرنے سے پہلے معتکف کو حدودِ مسجد کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔ عام طور پر مسجد بولنے سے مسجد کی مکمل عمارت اور پورا احاطہ سمجھا جاتا ہے، مگر شرع میں مسجد صرف وہ حصہ ہے جسے بانی مسجد نے مسجد قرار دیا ہو کہ وہاں نماز کے سوا کوئی دنیوی کام نہ ہو۔

عبد معبود کے دروازے پر:

اعتکاف کرنے والا انسان وہ ہے، جس نے سب داتاؤں کے داتا اور سب سخیوں سے بڑے سخی پروردگارِ عالم سے مغفرت اور کرم کی بھیک لینے کے لیے اس کے آستانہ پر ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ اور زبانِ حال سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ مالک و مولا! میں تیرا ہی حقیر بندہ ہوں، تیری ہی زمین پر جیتا ہوں، تیرا ہی دیا رزق کھاتا ہوں، تیری ہی توفیق سے میری زندگی اور حاجاتِ زندگی کارواں رواں دواں ہے اور ایک دن مرکر تیرے ہی حضور آنا ہے۔ مولا! بخش دے۔ درگزر کردے۔ معاف فرما۔ خطائیں اور گناہ جو مجھ سے ہوئے، ان کو اپنے کرم کے چھینٹوں سے دھو ڈال۔ مجھے اپنے مقربین کے صدقے اپنا قرب اور نزدیکی عطا فرما۔

معتکف، سخی کے در پر بستر لگا کر اس پر توکل کا ثبوت دیتا ہے۔ تو رب کائنات تو صمد اور بڑا بے نیاز ہے، وہ اپنے متوکلین کو کب محروم رکھتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ توکل صادق اور طلب سچی ہو۔

ترے مے کدے میں کمی ہے کیا جو کمی ہے ذوقِ طلب میں ہے
جو ہوں پینے والے تو آج بھی وہی بادہ ہے، وہی جام ہے

علما فرماتے ہیں کہ اعتکاف اس مقصودِ اصلی کے لیے کیا جاتا ہے کہ فانی دنیا کے جھمیلوں سے یک سوئی دلا کر دل اور روح کو رب تعالیٰ کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔ ہر طرف سے کٹ کر اسی سے لگا جائے۔ ہر خیال سے ذہن کو پاک کر کے اس کے پاکیزہ ترین تصور میں کھو جایا جائے۔ ہر شغل کو خیر باد کہہ کے محض خدا کے ساتھ مشغول ہو جایا جائے۔ دنیا کے عارضی تماشوں سے مانوس ہو کر انسان کو انھیں چھوڑنا دشوار ہوتا ہے۔ حالت اعتکاف میں اگر اس کے مقصود کی ایک جھلک میسر آ جائے تو بندۂ مومن کیوں نہ اس کے لیے متاعِ زندگی قربان کرنے کو تیار ہو۔ ؎

بھلا اس سے بھلی کیا بات ہوگی
انھی کے ساتھ دن اور رات ہوگی
ہم ان سے خود انھی کو مانگ لیں گے
مرادِ زیست یہ سوغات ہوگی

حضرت سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بار اعتکاف میں تھے۔ آپ کی خدمت میں کوئی ضرورت مند آیا اور اپنا دُکھڑا رویا۔ اس کی بپتا سن کر آپ مسجد سے باہر نکلے اور اس کی حاجت پوری فرما دی۔ فقہی لحاظ سے یہ درست نہیں تھا، اس لیے لوگوں نے اس بات کا خیال کیے بغیر کہ اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت کے لیے حضرت نے اعتکاف توڑ دیا ہوگا، اسے پھر پورا کرلیں گے۔ آپ سے پوچھا کہ: آپ تو اعتکاف میں تھے، یہ اعتکاف شکن کام کیسے کر دیا؟ تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا:

''کسی ضرورت مند بھائی کی حاجت پوری کرنا میرے نزدیک ایک ماہ کے اعتکاف سے افضل ہے''۔ (ابن ماجہ، ج ۲/ ص ۳۱۲)

اسی طرح حضور غوث الثقلین، قطب الدارین شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوانح میں ہے کہ آپ مسجد میں معتکف تھے۔ کسی ضرورت مند نے اپنی ضرورت پیش کی، آپ اس کی ضرورت کو سن کر اعتکاف سے نکل آئے۔ اور ایک بندۂ مومن کی دست گیری پر اپنے اعتکاف کو نچھاور فرما دیا۔

مولا تعالیٰ ہم مسلمانوں کو اعتکاف کرنے اور اس کی برکتیں سمیٹنے کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے۔

آمین۔ برحمتك یا ارحم الراحمین۔

خوفِ خدااور زلف گرہ گیر

وہ ایک خوبصورت جوان تھا، چھریرہ بند، چوڑا سینہ، بھرے بھرے سے بازو اور اس کے مردانہ حسن کو اسلامی فکر و عمل کے غازہ نے اور چار چاند لگا دیے تھے۔ نیچی نگاہیں، حسین چہرہ، متواضع پیکر۔ دوشیزہ کی نگاہ پڑی اور وہ سراپا حیرت بنی اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کا موہنی چہرہ مکھڑا دل کے نہاں خانے میں سرک آیا۔ اس کے دل کی دنیا بدل کر رکھ دی۔ دن کا چین اور رات کی نیند بھی رخصت۔ ایک ایک پل اشتیاق وطلب کا تازیانہ برسنے لگا۔ ایک انجانا شخص، آنکھوں کی راہ دل میں اس طرح جاگزیں ہوگیا گویا کسی عالی شان محل میں صرف ایک پتھر کی جگہ خالی رہی ہو اور وہاں وہ خوبصورت پتھر لگا دیا جائے۔ اور وہ عمارت ہر اعتبار سے مکمل ہوجائے۔ صنف نازک کے احساس کا آبگینہ یوں بھی بڑا نازک ہوتا ہے۔ گرم رخسار کی آنچ لگی اور ٹوٹ گیا۔ نوجوان ہر روز اس کے گھر کے سامنے سے ہوکر گزرتا تھا۔ دوشیزہ کی بے چینی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ ہر آنے والا دن اس کی بے قراری کو فزوں کر جاتا۔ نوجوان کے آنے کا وقت قریب ہوتا اور وہ اپنے دروازہ سے آلگتی۔ ہر آنے والے پر اسے اپنے محبوب ہی کا گمان ہوتا۔ ؎

آہٹ پہ کان در پہ نظر دل میں انتظار
دیکھو کوئی چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم

قدم کی آہٹ ملتی اور اس کے قلب کی دھڑکنوں کی رفتار کا توازن قائم نہ رہ پاتا۔ یہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا مبارک و مسعود زمانہ تھا، جس کے سلسلے میں سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

''خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم''۔

ترجمہ:۔ بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر وہ جو میرے زمانہ سے متّصل ہو، یعنی خلفائے اربعہ کا زمانہ۔

گھر کے اندرونی ماحول سے لے کر عرصۂ خون و آہن تک ہر جگہ اسلامی تعلیمات کا چرچا تھا۔ ساغر تنفس کا ہر جرعہ رسول ہاشمی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے نشہ سے مملو تھا۔ امن و سکون، صلح وآشتی، ہمدردی و مروت اور عدل و انصاف کا دوسرا نام خلافت فاروقی ہے۔

جزیرۃ العرب کے باہر ہر جانب مجاہدین اسلام کے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ توحید کا غلغلہ دشت و جبل میں گونج رہا تھا۔ سعد و ابو عبیدہ، خالد و جرار کی خارا شگاف تلواریں مصر و یونان، شام و ایران سے جبر و تشدد، ظلم و ستم کا قلع قمع کر رہی تھیں۔ دارالامن مدینہ طیبہ سے سارے عالم کو پیغامِ رحمۃ للعالمین منتشر ہورہا تھا۔

''یا یہا الناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا''۔

نوجوان پاک باز اور سنجیدہ تھا۔ مسجد نبوی کا ایک گوشہ اس کا ٹھکانا تھا، جہاں وہ معبودِ حقیقی کی عبادت سے لذت آشنا ہوا کرتا تھا۔ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دور بیں نگاہیں خوب پہچانتی تھیں کہ اس نوجوان کا سینہ خشیت الٰہی کا گنجینہ ہے۔ اس کی

عبادت میں خلوص اور رکوع و سجود میں طلب صادق کا خشوع ہے۔ اس لیے شفقت بے پایاں سے نوازتے رہے۔ نوجوان کا اکثر وقت مسجد نبوی میں گزرتا تھا۔ مگر وہ روزانہ اپنے ضعیف باپ سے ملاقات کرنے کے لیے گھر ضرور جایا کرتا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ میری اس راہ میں کوئی پُر اشتیاق نظر فرشِ راہ بنی رہتی ہے۔ کواڑ کے آڑ سے جھانکتی ہوئی وہ آنکھیں روزانہ میرے چہرے کی بلائیں لیتی ہیں۔ میرے قدموں کی آہٹ کسی کے قلب کی حرکتیں تیز کر دیتی ہے۔ میری گزر گاہ میں امید و رجا کے بے شمار پھول بکھرے ہوئے ہیں، جنھیں میرا پائے تغافل روزانہ پامال کر کے چلا جاتا ہے۔ ایام و لیالی کا کارواں اپنی رفتار سے بدستور گزرتا رہا اور دوشیزہ کے عشق کی چنگاری آتش فشاں بنتی رہی۔

کہتے ہیں کہ سچی طلب کی تڑپ رفتہ رفتہ صبر و شکیت کی فصیلیں منہدم کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک روز جب کہ عشا کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ مدینۃ الرسول پر تاریکی کا شامیانہ تن رہا تھا۔ مصلی مسجد سے نکل نکل کر اپنے گھروں کو پہنچ رہے تھے۔ نوجوان حسب معمول مسجد سے نکل کر اپنے گھر کی طرف چلا۔ دوشیزہ نے موقع غنیمت جانا اور فوراً دروازہ سے باہر آکر راستے میں حائل ہوگئی۔ نوجوان ٹھٹک گیا، اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں کہ ایک چاند سے خوبصورت مکھڑے والی دوشیزہ، جس کے انگ انگ سے جوانی کا خمار برس رہا ہے، میرا راستہ روکے ہوئے ہے۔ دوشیزہ کی شیریں زبانی شروع ہوئی اور اس نے مختصر وقفہ میں کتابِ دل کے تمام اوراق گردان ڈالے۔ درد کی جو ٹیس اب تک صرف دوشیزہ کا احساس بنی ہوئی تھی، نوجوان میں بھی سرایت کر گئی۔ اب دو دل تھے جو ایک رفتار سے دھڑک رہے تھے، مگر نوجوان شریعت اسلامیہ اور قوانین الٰہیہ کی خلاف ورزی پہ آمادہ نہ ہوسکا۔ دوشیزہ ہر روز اسے چھیڑتی اور اپنے دامن حسن میں گرفتار کر کے معصیت کے گڈھے کی طرف بلاتی، مگر نوجوان تھا کہ تقاضائے سن و سال کے تحت دل میں ایک ٹیس اور خلش تو ضرور محسوس کرتا۔ مگر جہاں سرحد دین و شرع سے گزر کر دیوار پاک بازی میں نقب زنی کی بات آتی، اس کے رونگٹے تھرانے لگتے۔

اسی طرح کی ایک تاریک شب میں دوشیزہ نے نوجوان کے قدموں کو پھسلا دینا چاہا۔ ابلیس لعین کا تیر بہدف نسخۂ حسن جو انسانی دعوتِ التفات دیتے دیتے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے قریب آیا اور دوشیزہ نوجوان کو لے کر اپنے گھر کے دروازہ میں داخل ہو رہی تھی۔ نوجوان پیچھے پیچھے اسیر زلف گرہ گیر بنا چلا آرہا تھا۔ ناگہاں شیطنت کے طلسم ہوشربا کی تاریکی میں ہدایت کی ایک کرن چمکی اور نوجوان کے زبان پر رب تعالیٰ کا مقدس کلام آگیا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَكَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ ۝

ترجمہ:۔ بے شک جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں، جب انھیں شیطان چھوتا ہے تو وہ چونک جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

کلامِ ربانی کی تاثیر ایک کڑک دار بجلی تھی، جس نے وقتی جذبات پر وار کیا۔ خشیت الٰہی کا غلبہ ہوا اور ہوش جاتا رہا۔ غشی طاری ہوئی اور دروازہ ہی پہ گر کر ڈھیر ہوگیا۔ دروازہ پر نوجوان کے بے ہوش پڑے رہنے سے دوشیزہ کو اپنی بدنامی کا خطرہ ہوا۔ اس نے اپنی لونڈی کی مدد سے اسے اٹھایا اور اس کے گھر کے دروازہ پر رکھ آئی۔ نوجوان کا بوڑھا باپ اور گھر کے سبھی لوگ سخت انتظار میں تھے کہ وقت زیادہ ہوگیا اور صاحبزادہ اب تک نہ آیا۔ جب کافی دیر ہوگئی، بیمار باپ نے سوچا کہ چل کر دیکھیں کیا بات ہے۔ دروازہ سے نکل کر باہر آیا تو لڑکے کو بے ہوش پڑا پایا۔ گھر بھر میں ایک غوغا مچ گیا۔ اندر لاکر ہوش لوٹانے کی ترکیبیں ہونے لگیں۔ بہت رات گئے تک ہوش آیا، اہل خانہ اور پڑوس کے

بہت سے لوگ جمع تھے، سب کی نگاہیں نوجوان کے چہرہ پر مرکوز تھیں۔ یک بیک بے حس و حرکت جسم میں کسمساہٹ ہوئی اور آنکھیں کھل گئیں۔ ضعیف باپ نے خیریت پوچھی، نوجوان نے کہا: الحمد للہ! غشی کی وجہ جاننے کے لیے سب لوگ بے چین تھے۔ بالآخر باپ ہی نے دریافت کیا: بیٹا کیا بات ہوئی، جس کی وجہ سے تجھے غشی آگئی؟ نوجوان نے شرمندگی اور ندامت کے سبب سے کچھ دیر زبان نہ کھولی، مگر جب اصرار زیادہ بڑھا تو اس نے شروع سے آخر تک پوری داستان کہہ ڈالی۔ باپ نے پھر پوچھا: بیٹا کون سی آیت مبارکہ تھی، جس نے تیرے دامن تقدس کو داغ دار ہونے سے بچا لیا؟ نوجوان کے سینے سے ایک بھرپور ہوک اٹھی اور اس کے ساتھ مذکورہ بالا آیت زبان پر آگئی۔ آیت کی تلاوت کے ساتھ ہی دوبارہ غفلت طاری ہوگئی، مگر اس بار ہوش و حواس کے ساتھ روح بھی جسم کا آشیانہ چھوڑ چکی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس جوان مرگی نے سبھوں کو سوگوار بنا دیا۔ تاریک رات اور تاریک ہوگئی۔ راتوں رات لحد تیار ہوئی اور ایک متقی جوان کے جنازہ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

صبح کے وقت دربارِ فاروقی میں نوجوان کے موت کی اطلاع پہنچی، آپ بہت غم گین ہوئی، اس کے بوڑھے باپ کے پاس تعزیت کے لیے آئے اور کہا: ایسا صالح نوجوان مٹی میں دفن کر دیا گیا اور مجھے خبر نہیں۔ بوڑھے نے معذرت کی کہ رات اندھیری اور بہت دیر ہو جانے کی وجہ سے آپ تک خبر نہیں پہنچ سکی۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی قبر پر آئے اور بہ آوازِ بلند فرمایا:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ O

ترجمہ:۔ اور اس کے لیے جو خدا سے ڈرتا ہے، دو باغ ہیں۔

قبر کے اندر سے فوراً یہ آواز آئی:

''یا عمر قد اعطانیھما ربی فی الجنة''۔

ترجمہ:۔ یعنی اے امیر المومنین! اللہ نے مجھے جنت کے دونوں باغ عطا کر دیے۔ (ابن عساکر)

توسل اسلاف میں

دورِ فاروقی میں مزج القبائل کی جنگ ہو رہی تھی۔ یہ معرکہ ملک شام کی مہم کا کلیدی معرکہ تھا۔ مقدس جماعت صحابہ اور تابعین، دشمنانِ اسلام سے ''الحق یعلوا ولا یعلیٰ'' کی تصدیق کرا رہی تھی۔ ایک بار جوشِ جہاد میں متوالے مسلمان جیالے شامیوں پر اجتماعی دھاوا بولے تو ان کی زبانوں سے محسن کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اسم گرامی کا نعرہ بلند ہوا۔ یا محمد یا محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اور میدانِ کارزار لرز اٹھا۔ (فتوح الشام للواقدی، ج ۲ / ص ۵)

علامہ محمد ابن اسماعیل بخاری نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک بار حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا پائوں سن ہو گیا، ان سے کسی شخص نے کہا کہ اے ابن عمر! آپ جس کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں، اس کا نام لیجیے، شفا ہو جائے گی۔ چنانچہ ابن عمر نے پکارا: یا محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

''عن عبد الرحمن ابن سعد خدرت رجل ابن عمر فقال له رجل اذکر احب الناس الیك فقال: یا محمد!''۔

(ادب المفرد، ص: ۱۴۲، ونور الایمان مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی، ص: ۸)

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سید کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بایں طور توسل کرتے ہیں۔

یا مالکی کن شافعی فی فاقتی

انی فقیر فی الوریٰ والغناك

ترجمہ:۔ اے میرے مالک! پریشانی میں میری مدد فرمائیے، میں مخلوق میں محتاج ہوں اور آپ غنی ہیں۔

یا اکرم الثقلین یا کنز الوریٰ

جدی بجودك وارضی برضاك

ترجمہ:۔ اے دو عالم میں سب سے بزرگ! اے خزینۂ دنیا اپنی سخاوت سے نوازیے اور اپنی رضا مندی سے بہرہ ور کیجیے۔

انا طامع بالجود منك ولم یکن

لابی حنیفة فی الانام سواك

ترجمہ:۔ میں آپ کی سخاوت کا حریص ہوں اور آپ کے علاوہ ابو حنیفہ کا کوئی نہیں۔

(قصیدۃ النعمان مع شرح رحمۃ الرحمان مجتبائی دہلی، ص ۶۵)

قرنِ اول سے آج تک اہل اسلام کا توسل بالرسول کے سلسلہ میں جو عقیدہ تھا، اس کی جھلکیاں حدیث و تفسیر، تاریخ و تذکرہ کے ذخیرہ میں وافر ملتی ہیں۔

صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے اہل اسلام، جس طرح اس منفعت بخش عقیدہ پر عامل رہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ سید عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وسیلہ ہی تقرب الی اللہ کا واحد ذریعہ ہے۔ قرآن و شریعت جو کچھ بھی ملا، وہ صرف اسی قدسی صفات پیمبر کے وسیلہ سے۔ جب ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہی جملہ برکات و حسنات کا سبب ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اپنے تہی دامن کو ان کے انوار و برکات کی دولت سے خالی رکھا جائے۔

اسی لیے تو ہر دور میں اہل اسلام نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے توسل کو مستحسن سمجھا اور اس سے مستفیض ہوتے رہے۔

جماعت صحابہ سے جلیل القدر صحابیِ رسول حضرت عبداللہ ابن عمر۔ اور جماعت تابعین سے امام الائمہ امام اعظم ابوحنیفہ جیسی شخصیتیں نہ صرف اس کی مؤید ہیں، بلکہ خود عامل نظر آرہی ہیں۔ بڑی کم نصیبی ہوگی، اگر روحِ ایمان کا فہم رکھنے والی ان ذاتوں کو آج کل کے چند سر پھروں کے علم الرغم بے علم قرار دے کر امت مسلمہ کی متفقہ حقیقت پر پردہ ڈال دیا جائے۔

توسل، شفاعت، استعانت یہ تمام ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں، جسے مقربانِ خدا کے ذریعہ حصولِ تبرک کہا جاتا ہے۔ جیساکہ حضرت علامہ نبہانی تحریر فرماتے ہیں:

'' فالتوسل والتشفع والاستعانة كلها بمعنى واحد ليس لها في قلوب المؤمنين منه الا التبرك بذكر احباء الله لما ثبت ان الله يرحم بسيماهم سواء كان احياء او امواتا فالمؤثر والموجد حقيقتا هو الله تعالى وهؤلاء سبب عادى فى ذالك ''۔ (شواہد الحق، ص:۷۹)

ترجمہ:۔ توسل، شفاعت اور استعانت تمام کا ایک ہی مطلب ہے، مسلمانوں کے قلوب میں ان تمام کا مفہوم محبوبانِ خدا کے ذکر سے حصولِ برکت کے سوا کچھ نہیں۔ جیساکہ ثابت ہے کہ رب تعالیٰ ان کے طفیل رحمت فرماتا ہے، یا وہ زندہ ہوں یا مردہ، پس مؤثر و موجد تو دراصل خدا ہی ہے اور یہ محبوبانِ خدا سبب عادی ہیں۔

الغرض! مقربانِ بارگاہِ الٰہی ہمارے لیے خدا رسی اور دوسرے مقاصد خیر کے لیے احسن وسیلہ ہیں اور ان تمام وسائل میں سب سے مستحکم وسیلہ اللہ کے محبوب رحمۃ للعالمین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں، جن کو حضرت ابو البشر نے وسیلہ بنایا گندم خوری کے باعث۔

حضرت آدم علیہ السلام جب روئے زمین پر بھیج دیے گئے تو آپ تڑپ تڑپ کر روتے تھے اور حضرت آدم علیہ السلام کے گریہ و زاری سے اتنے آنسو بہے کہ اگر تمام روئے زمین والوں کے آنسو جمع کیے جاتے تو بھی حضرت آدم علیہ السلام سے زیادہ نہ ہوتے۔ (خازن، ج۱/ص۴۳)

اس وقت حضرت آدم علیہ السلام نے شفیع کائنات حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی کو وسیلہ بنایا تو ان کی توبہ قبول ہوئی۔ (روح المعانی)

تو اے اولادِ آدم! قابل غور مقام ہے کہ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام تو ان کے وسیلہ سے سرفراز ہوئے اور ہم محروم رہیں۔

یقیناً اعمالِ صالحہ بھی وسیلہ ہیں، مگر یہ سارے وسائل بھی تو ہمیں اسی مقدس بارگاہ سے حاصل ہوئے ہیں اور بقولِ خلیفۂ امام اہل سنت حضرت مولانا ضیاء الدین مہاجر مدنی:

اعمالِ صالحہ کی مقبولیت کی کوئی ضمانت نہیں، مگر ذاتِ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سراپا مقبول اور مستجاب ہے۔ بلکہ انھیں ان کے رب نے مصطفیٰ اور مجتبیٰ فرمایا ہے۔ تو کیوں نہ ہم ان کی پناہ میں آئیں، انھیں سے مدد طلب کریں، جن کے وسیلہ سے ہمیں دین و دانش سب کچھ ملا، اس کے وفادار بن کر رہیں۔ ؎

آج لے ان کی پناہ آج مدد مانگ ان سے
پھر نہ مانیں گے قیامت میں اگر مان گیا

عید مومن

خوشیوں اور شادمانیوں کا موسم، مسرتوں کی فصل بہار، شہر شہر، قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ، ہر اس خطۂ زمین پر جہاں مسلمان قوم آباد ہے۔ اس روز سعید برکتیں فراواں ہیں۔ کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ عید الفطر ہے کیا؟ دنیا کی اور قوموں اور ملتوں کے نزدیک خوشی اور غم کا پیمانہ چاہے کچھ ہو، مگر ملت ابراہیمی کی مسرت و خوشی کا ایک ہی معیار ہے، وہ ہے رضائے الٰہی۔

رمضان المبارک کا پورا مہینہ گزرا، جس میں بندہ نے اپنی حواس کی پوری صلاحیتوں کا امتحان دیا اور نفسانیت کے مقابلے میں روحانیت کے غلبہ کا ثبوت پیش کیا۔ امتحان کا یہ زمانہ گزرا، اور پروردگارِ عالم نے انعام میں اپنے رحمتوں کے دروازے کھول دیے۔ عید کا مبارک دن عطا فرمایا۔ روزہ تھا تو کام و دہن پر مہر لگی ہوئی تھی اور بندہ کھانے پینے اور لذاتِ دنیا سے روک دیا گیا تھا، مگر عید کا دن آیا تو خدائی دسترخوان اتنا عام ہوا کہ خود کھانے پینے اور اعزہ و احباب کو کھلانے کے لیے اذنِ عام ہے۔ اطاعت شعار بندہ جب روزہ کی فاقہ کشی کو فریضۂ الٰہی سمجھ کر ادا کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے عید کا مبارک دن انعام میں عطا فرماتا ہے۔ رب تعالیٰ اس دن بندوں پر برکت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ لیکن یہ انعامات اسی کے لیے خاص ہیں، جس نے ماہِ مقدس کے لحاتِ زریں کی قدر شناسی کی اور قربِ الٰہی کے لیے کوشاں رہا۔

عید ایک ثمرۂ سعادت ہے۔ عید کا مطلب یہ نہیں کہ نت نئے ملبوسات سے آراستہ ہوکر سنیما، تھیٹر اور خرافات میں وقت برباد کیا جائے۔ آج کے دور میں یہ وبا زور پکڑتی جارہی ہے اور یہ رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ ایک ماہ تو پابندی اور قید میں گزرا۔ عید کا چاند گلو خلاصی اور نوید مسرت ہے۔ اب لمبی لمبی تفریحوں اور موجودہ زمانہ کے بے ہودہ تماشوں کے لیے چھوٹ مل گئی۔ ایسا نہیں، بلکہ اس میں مسلمانوں کا مال بھی برباد ہوتا ہے اور وقت بھی۔

ایک مرد مومن کی عید تو رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں وہی کر کے خوش ہونا چاہیے، جس سے اللہ خوش ہو اور رسول راضی۔ روزہ دار ذاتی طور پر اس احساس سے دوچار ہوتا ہے، جو ایک فاقہ کش کو وقت کی روٹی نہ پاکر ہوتا ہے۔ عید کی مسرتوں میں اپنے غریب اعزہ اور پڑوسیوں کو فراموش نہ کیجیے، بلکہ انھیں بھی خوشیوں میں اپنا شریک بنائیے۔ یتیموں کی سرپرستی کیجیے، بیوائوں کی دست گیری فرمائیے اور اور معاشرہ میں ٹوٹے ہوئے لوگوں کے دست و بازو بنیے اور غور کیجیے! عید جیسی مسرت بخش ساعت ہمیں خوشی منانے کا اسلامی مزاج بتا رہی ہے۔ نگاہِ تصور اٹھائیے اور دیکھئے کہ:

صبح عید آئی، فجر ہی سے غسلِ عید شروع ہوگیا۔ حیثیت والوں نے صدقۂ فطر سے غریبوں کی دست گیری کی۔ حسب توفیق نئے کپڑے پہنے، خوشبو لگائی اور "اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد" پڑھتے ہوئے غریب امیر، چھوٹے بڑے، سب ایک ساتھ مل کر آبادی سے باہر چلے جارہے ہیں۔ وہاں بھی کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے، بلکہ صف بہ صف کھڑے ہوکر سب نے خداوند قدوس کی بارگاہ میں سر جھکا دیے۔ اس کی بڑائی کے گن گائے، تسبیح کی اور سجدۂ شکر ادا کیا۔ اور اس سے خوشی اور مسرت کا مزاج یہ سمجھ میں آیا کہ اسلام فرد کی خوشی کو جماعت کی خوشی کے ساتھ دیکھنا پسند کرتا ہے۔

قوم زندہ ربطِ باہم سے ہے تنہا کچھ نہیں

صدق کی برکت

وہ بلانوش تھا۔ اور رنگین شراب کا ایک لبریز جام اس کے سامنے تھا۔ رات کی تاریکی جب گہری ہوئی، بادہ پیما عرب دن بھر کی لُو، تپش، تیز دھوپ میں کام کرنے والے، ہوا کے نرم جھونکے پا کر نیند کی آغوش میں پہنچنے لگے تو اس کے پیکر میں سویا ہوا شرابی جاگ اٹھا۔

ہر روز کی طرح وہ بڑی پھرتی سے اس لال پری کی جانب لپکا، مگر پھر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اسے کچھ یاد آگیا..... وعدہ...... ایک انجانا محاسب اس کی نگرانی پر مامور تھا۔

یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں اپنے وعدے سے مکر جاؤں۔ شراب کا نشہ عقل کو مائوف اور دل و دماغ کی طاقت کو مفلوج کر دیتا ہے اور بے ہوشی، بے عقلی، پاگل پن اور دیوانگی سے دور رہنا ہر صحیح الدماغ انسان کو پسند ہے۔ لیکن میں نے صرف سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے۔ گھٹی میں پڑی ہوئی پُرانی عادت بولی۔

توکیا میں اس وقت چند گھونٹ لینے کے نتیجے میں مالک دو جہاں کی بار گاہ کا اقراری مجرم بن جاؤں۔

یہ نہیں ہوسکتا......ہرگز نہیں......کبھی نہیں۔

گم صم کچھ دیر گزر جانے کے بعد اسے یاد آیا۔

کوئی اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔

اس کے ساتھ گزرے ہوئے گزشتہ لمحات، جذبات اور نفسانی میلان کے تحت ہونے والی باتیں اور ساری وارداتیں، طبیعت بہنے لگی، ارادہ متزلزل ہونے لگا۔

اندرونی طور پر کسی ہیجان سے مغلوب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا، اس فاحشہ عورت کی طرف جانے کے لیے، جس کے ساتھ اس کا ماضی وابستہ رہا۔

مگر اپنے دروازہ سے قدم باہر نکالتے ہوئے اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی ہونے لگی۔

کسی اَن دیکھے احساس نے ٹھونکا لگایا۔

کیا......؟ بھول گیا اپنا وعدہ......؟ کہاں گیا تیرا پاسِ عہد...؟ کیا ہوئی تیری زبان کی وقعت...؟

پلٹ پڑا اور کسی شکست کھائے ہوئے شہ زور کی طرح اپنے بستر پر آگرا۔

نہیں مجھ میں یہ ہمت کہاں کہ عدالت مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں کھڑا ہو کر اپنی بد کاری کا اعلان کروں۔ ایسا ہو گیا تو گویا بدفعلی سے جس منہ کو کالا کیا ہے، اسے لے کر بار گاہِ عالیہ میں جانے کا جرم بھی مجھ پر عائد ہو گا۔

میں اس کی تاب کیسے لا سکتا ہوں۔

رات کا نصف حصہ گزرنے کو آیا۔ آج اس کی آنکھوں میں شرابِ سرخ کے ڈورے نہیں تھے۔ جسم کا کھنچاؤ جو رات کا اتنا وقت گزر جانے پر طاری ہوتا تھا، وہ بھی نہیں تھا۔

اب تو وقت آ گیا۔ جب ساری دنیا سو رہی ہوتی ہے۔ اور خدا سے ڈرنے والوں میں ۔ زاہدانِ شب زندہ دار۔ عبادت و ریاضت کے لیے بے دار رہتے ہیں یا مجھ جیسے لوگ۔

کس طرف نکلوں...... ؟ کس کی دیواریں پھاندوں...... ؟ کس کے گھر میں نقب لگاؤں... ؟

یہی تو میرا اصل ذریعۂ آمدنی ہے۔ ورنہ میں دن کی محنت و مشقت سے حاصل ہی کیا کر پاتا ہوں۔ زندگی کی وسیع ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بالائی آمدنی بھی تو ہونی چاہیے۔

خاموش ماحول...... پُر سکون فضا...... کوئی آواز اور آہٹ نہیں، مگر...... اِک جنگ کا سماں ہے... آخر یہ کیسی جنگ ہے۔ جس میں کوئی چیخ و پکار نہیں۔ شور اور ہنگامہ نہیں۔ شکست و ریخت نہیں۔ کیا ایسی بھی جنگ ہوتی ہے... ؟

ضرور!... انسان کے فکر و عمل کی قوت ایک عدالت ہے۔ جہاں مخالف نظریات کا مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ اور اسی بات کو بالکل انتہا پسندانہ اصلاح میں بولو، تو جنگ کہنا غلط نہیں۔

ذہن و فکر اور اعمال و افعال کی سطح پر خیر و شر دونوں قوتیں کبھی متصادم ہوتی ہیں۔ ٹکراتی ہیں۔ پھر ان دونوں میں سے جو غالب ہوتی ہے، وہی انسان پر اپنی حکمرانی کرتی ہے .... آج اس نے رات کی تاریکی سے کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیوں کہ اس اندھیرے میں بھی غیبی محاسبہ کی ایک تیز روشنی اس کے یقین کو جگمگا رہی تھی۔

صبح ہو گئی...... یہ اس کے لیے ایک عجیب صبح تھی۔ جس کے طلوع سے پہلے اس کے قلب و ذہن کے اُفق پر ایک اور آفتاب جگمگا رہا تھا...... صداقت اور سچائی کا آفتاب...... جو طلوع ہونے کے بعد پھر کبھی غروب نہیں ہوتا۔

واقعی اس کے لیے یہ زندگی کی بالکل عجیب رات تھی...... جب کہ اس نے

......شراب بھی نہیں پی۔

......بدکاری سے بھی محفوظ رہا۔

...... اور کسی کی چوری بھی نہ کی۔

نمازِ فجر کے بعد مسجد نبوی کے مقدس صحن میں محبوبِ رب العالمین حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے جھرمٹ میں جلوہ فرما ہیں۔

ایک شخص حاضر ہوا۔ رات بھر کی بے داری کا خمار آنکھوں سے جھلک رہا ہے۔

یہ تو وہی شخص ہے... جو کل دربارِ نبوی میں حاضر ہوا تھا۔ یا رسول اللہ!... مجھ میں چار بُری خصلتیں ہیں۔ بدکار ہوں۔ چوری کرتا ہوں۔ شراب پیتا ہوں۔ جھوٹ بولتا ہوں۔ اگر آپ حکم فرمائیں تو آپ کی خاطر ان میں ''ایک'' چھوڑ سکتا ہوں۔

معلم انسانیت نے فرمایا تھا:... جھوٹ نہ بولا کرو۔

وہی شخص آج پھر آیا ہے۔

فداک اُمی و ابی یارسول اللہ! میں نے آپ کے حضور میں صرف ایک خصلت بد، جھوٹ چھوڑنے کا عہد کیا تھا۔ مگر قربان میرے ماں باپ آپ کی حکمتِ نبوت پر، اے طبیبِ روحانی و جسمانی!

میں نے شراب نوشی، بدکاری اور چوری سے توتوبہ نہیں کی تھی۔ مگر جب ان اپنی پُرانی عادتوں پر عمل کرنے کا ارادہ کیا تو خیال آیا:... کہ یہ حرکتیں پھر کرکے یا تو دوبارہ آپ کی بارگاہ میں جھوٹ بولوں...؟ یا سچ بولوں تو بارگاہِ رسول کا اقراری مجرم بن کر اللہ کے عتاب وعقاب میں رہوں۔

یارسول اللہ!... صرف ایک سچ نے میری تمام برائیوں کا دروازہ بند کردیا۔

سیرت کے اوراق شاہد ہیں کہ اس کی باتیں سن کر سرکار محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسکرا پڑے تھے۔ اور ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ حضور کا مبارک تبسم رحمت الٰہی کے مژدۂ جانفزا کے سوا کچھ نہیں۔

جب مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی

جب لب کشا ہوئے تو گلستاں بنا دیا (ماخوذ: تفسیر عزیزی تحت سورۂ ن)

تجسس اور غیبت

کسی کی عیب جوئی اور شکوہ شکایت عام سماجی زندگی کے لیے بھی بُری بات ہے۔ اسلام نے جو معاشرہ ترتیب دیا ہے، اس میں اس پر بہت پابندی لگائی ہے۔ ایک مسلمان کی یہ ذمہ داری تو ہے کہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو برملا غلط کام کرتے دیکھے تو اسے نہی عن المنکر کرے اور خیر خواہی کے جذبے سے اس کو نیکی کی ہدایت دے۔ مگر کسی کی ٹوہ میں لگ کر اس کی پوشیدہ خرابیوں کو کریدنا اسلامی مزاجِ ہمدردی کے منافی ہے۔ مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ کسی کے چھپے ہوئے عیب کو طشت از بام کرے۔ کوئی شخص اپنے گھر کے اندر کس طرح رہتا ہے اور کیا مصروفیات ہیں؟ تانک جھانک کر معلوم کرنا، مذموم عمل ہے۔

اس کی ایک علت یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی بُرائی کو چھپا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حیا کا مادہ ابھی اس میں زندہ ہے، جو توفیق ایزدی سے کسی وقت اصلاح کی طرف لا سکتا ہے۔ اس کا یہ راز اگر فاش ہو جائے تو ممکن ہے، اس ضد میں وہ اپنی بُرائی پر مصر ہو کر جم جائے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے ناپسندیدہ عمل پر جب نامناسب طریقہ سے پابندی عائد کی جاتی ہے تو بجائے اصلاح قبول کرنے کے وہ اپنے عمل میں بضد ہو جاتا ہے۔ شرعی عوارض اس سے مستثنیٰ ہیں، جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

کسی مسلمان کی بُرائی کرنے اور عیب ظاہر کرنے کا حق کسی کو نہیں دیا گیا ہے۔ کیوں کہ اس سے نفرت اور مخالفت پیدا ہوتی ہے۔ کسی کی بُرائی ظاہر اور شائع ہو جانے کے بعد اس کے روبرو ذکر کرنا اگر بغرضِ اصلاح ہو تو کوئی حرج نہیں، پیٹھ پیچھے غیر موجودگی میں عیب چینی اور شکوہ سنجی، جس سے دوسروں کے نزدیک ہتک عزت یا وقار شوئی ہو، نہایت بُری عادت ہے۔ تجسس اور غیبت قرآن مجید میں صاف صاف ممنوع قرار دی گئی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ فَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ۔ (الحجرات:۱۲)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! بہت گمانوں سے بچو، بے شک کوئی گمان گناہ ہو جاتا ہے اور عیب نہ ڈھونڈو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو، کیا تم میں کوئی پسند رکھے گا کہ اپنے مرے بھائی کا گوشت کھائے۔ تو یہ تمھیں گوارہ نہ ہوگا۔

آیت بالا کی تفسیر میں صدر الافاضل فرماتے ہیں:

”بہت گمان سے بچو، کیوں کہ ہر گمان صحیح نہیں ہوتا، بلکہ کوئی گمان گناہ بھی ہو جاتا ہے۔ اسی لیے مسئلہ یہ ہے کہ مومن کے ساتھ بُرا گمان ممنوع ہے۔ اسی طرح اس کا کوئی کلام سن کر فاسد معنی مراد لینا باوجودے کہ اس کے دوسرے معنی موجود ہوں اور مسلمان کا حال ان کے موافق ہو، یہ بھی گمانِ بد میں داخل ہے“۔

سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

"گمان دو طرح کا ہے۔ ایک تو وہ کہ دل میں آئے اور زبان سے بھی کہہ دیا جائے۔ یہ اگر مسلمان کے حق میں بدی لیے ہوئے ہو تو گناہ ہے۔ دوسرا یہ کہ دل میں آئے اور زبان سے نہ کہا جائے۔ یہ اگرچہ گناہ نہیں، مگر اس سے بھی دل کو خالی رکھنا بہتر ہے"۔

گمان کی کئی قسمیں ہیں: ایک واجب ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان رکھنا۔ ایک مستحب ہے۔ وہ مومن صالح کے ساتھ نیک گمان۔ ایک ممنوع اور حرام ہے، وہ اللہ عزوجل کے ساتھ بُرا گمان اور مومن کے ساتھ بُرا گمان۔ ایک جائز، وہ فاسق معلن کے ساتھ ایسا گمان جیسے افعال اس سے ظہور میں آتے ہوں۔

"وَلَا تَجَسَّسُوْا الخ" کی تفسیر میں ہے:

"مسلمان کی عیب جوئی نہ کرو۔ اور ان کے چھپے حال کی جستجو میں نہ رہو، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ستّاری سے چھپایا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: گمان سے بچو۔ گمان بڑی جھوٹی بات ہے۔ اور مسلمان کی عیب جوئی نہ کرو۔ ان کے ساتھ حرص و حسد، بغض و بے مروتی نہ کرو۔ اے اللہ کے بندو! بھائی بنے رہو۔ جیسا تمھیں حکم دیا گیا۔ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ اس پر ظلم نہ کرے، اس کو رسوا نہ کرے، اس کی تحقیر نہ کرے۔ تقویٰ یہاں ہے۔ تقویٰ یہاں ہے۔ تقویٰ یہاں ہے۔ (حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ کہتے ہوئے اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا) مسلمان کے لیے یہ بُرائی بہت ہے کہ اپنے بھائی کو حقیر دیکھے۔ ہر مسلمان کے لیے مسلمان کا خون، اس کی آبرو اور اس کا مال حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں اور عملوں پر نظر نہیں فرماتا، لیکن تمھارے دلوں پر نظر فرماتا ہے۔ جو بندہ دنیا میں دوسرے کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی پردہ پوشی فرمائے گا"۔ (کنزالایمان، ص۷۴۸)

غیبت کرنا، اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا ہے۔ کون ہے جو اپنے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ کتنا بلیغ انداز ہے، قرآن عظیم کا۔ گویا جو شخص کسی مسلمان بھائی کی بُرائی اس کے پس پشت کرتا ہے، مسلمان کی عزت و آبرو جو اس کے اخلاقی جسم کے گوشت پوست ہیں، انھیں تار تار کرتا ہے۔ مردہ کی تشبیہ سے یہ نکتہ بھی مقصود ہے کہ جب کوئی کسی کی بُرائی اس کی عدم موجودگی میں کرے گا تو ظاہر بات ہے، اپنے لحاظ سے بیان کرے گا۔ اور جس کی بُرائی بیان ہوتی ہے، وہ خود وہاں موجود نہیں ہوتا تو بیان کرنے والا اپنی زبان سے اس کی عزت و آبرو اور وقار وعظمت کو پارہ پارہ کرتا ہے۔ جس طرح بغیر روح کا جسم، اپنی کوئی مدافعت نہیں کر سکتا، غیر موجود انسان کی جانب سے بھی کسی طرح کی صفائی نہیں پیش کی جا سکتی۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر کسی کی خرابیوں کا ذکر اصلاح کی غرض سے ہے تو غیر کے سامنے اس کے اظہار کی چنداں حاجت نہیں۔ اور یہ ایک نفسیاتی اصول ہے کہ جب کسی کے سامنے اس کی خرابیاں گنائی جائیں گی تو موجودگی کی رعایت ضرور ہوگی۔ اور اپنی جانب سے کمی بیشی کا بھی اندیشہ نہیں۔ اور اگر ہو بھی جائے تو صاحب معاملہ چوں کہ خود بھی موجود ہے، وہ اپنی صفائی پیش کرے گا۔

عیب چینی اور غیبت ایسے عیوب ہیں، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ میں اکثر حائل ہوتے ہیں۔ اس سے اختلاف، نفرت، بدگمانی اور دشمنی جیسے مفسدات جنم پاتے ہیں۔ اتحاد و اتفاق، امن و مروت کا خاتمہ ہوتا ہے۔

لغت کے اعتبار سے غیبت کسی کی پیٹھ پیچھے بُرائی بیان کرنا ہے۔ مگر اسلامی اخلاق میں اس کا بہت وسیع مفہوم ہے۔ حدیث پاک میں ایک ایسا واقعہ موجود ہے، جس سے غیبت کی مکمل تعریف سمجھ میں آجائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

یارسول اللہ! غیبت کسے کہتے ہیں؟

حضور ﷺ: تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کو بیان کرنا، جسے وہ ناپسند کرے۔

سائل: اگر وہ عیب اس میں موجود ہو تو...؟

ارشاد فرمایا: اگر وہ عیب اس میں ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور جو تم بیان کرتے ہو، اگر اس میں نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔

امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ''غیبت اپنے معروف طریقہ کے سوا بھی کئی طرح ہوتی ہے۔ کسی پر تعریض کرنا، کسی کی کسی عادت کو اشارہ اور کنایہ سے ظاہر کرنا، تحریر اور محاکات سے کسی کے عیب کا اظہار کرنا۔ صرف صفات میں نہیں، بلکہ لباس، جسم، مکان، دوکان، خاندان، قبیلہ، نام، نسب، دین، دنیا ہر چیز میں عیب چینی ہو سکتی ہے''۔

اور یہ تمام فرق مراتب کے ساتھ اپنی جگہ معیوب ہیں۔ رب تعالیٰ نے مردار بھائی کے گوشت سے مثال دے کر جس قدر اہمیت کا اظہار فرمایا ہے، وہ قابل غور ہے۔ انسان کا گوشت صرف اس کی عزت و حرمت کی وجہ سے حرام کیا گیا۔ تو اس کی آبرو کتنی اہم شے ہے، معلوم ہوا۔ میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے کسی کے اعضائے جسمانی کاٹ لینا بہادری ہے، مگر مردہ کے اعضا کاٹنا بہادری کے خلاف بزدلی ہے۔ یوں ہی کسی کی بُرائی اس کے منہ پر کرنا بھی اگرچہ نیک کام نہیں، مگر پشت کے پیچھے کرنے کی قباحت تو مردہ کے اعضا کاٹنے جیسی ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی لاش دیکھ کر ضبط کی تاب نہیں لا پاتا تو جو اس کے گوشت کو نوچے، اس کے دل کی قساوت سختی، بے مروتی اور سنگینی کا کیا حال ہوگا؟ مسلمان مردار گوشت صرف اس حال میں کھا سکتا ہے، جب اس کے سوا جان بچانے کا کوئی چارہ نہ ہو۔ اور اگر کسی اور جانور کا گوشت موجود ہو تو طبیعت یہ گوارہ نہیں کرے گی کہ اس کے بجائے انسان کا گوشت کھائے۔ اس لیے غیبت اس آخری منزل تک روا نہیں، جب تک شرعی، اخلاقی اور معاشرتی ضرورت مجبور نہ کرے۔

ابوداؤد شریف کتاب الادب باب الغیبۃ میں ہے:

''سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: رات میں ایک ایسی قوم پر گزرا، جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے ناخنوں سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبریل سے ان کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا: یہ لوگوں کا گوشت کھانے والے اور ان کی عزت لینے والے لوگ ہیں''۔

قرآن عظیم نے عیب جوئی اور چغل خوری کے ان طریقوں کی بھی مذمت کی ہے، جو زبان ہلائے بغیر کی جاتی ہے۔

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ، وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ۔ (القلم:۱۱، ہمزہ:۱)

ترجمہ:۔ آواز سے کستا اور چغل خوری کرتا پھرتا ہے، تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو عیب چینی کرتا ہے اور آوازیں کستا ہے۔

اہل لغت نے ''ہمزہ'' اور ''لمز'' کے جتنے معنی لکھے ہیں، وہ ملاحظہ فرمائیں:

ہمز: کسی کے سامنے اس کی بُرائی کرنا (آوازیں کسنا) خاص طور پر لوگوں کے نسب کی بُرائی ظاہر کرنا۔ ہاتھ کے اشارے سے غیبت کرنا۔ زبان سے غیبت کرنا۔ بُرے الفاظ سے پاس بیٹھنے والوں کی دل آزاری کرنا۔

لمز: پیٹھ پیچھے بُرائی کرنا۔ زبان سے غیبت کرنا۔ آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا۔ ہاتھ، سر اور ابرو کے اشارے سے ان لوگوں کی بُرائی جو ہم نشیں ہوں۔

اندازہ لگائیں !قرآن عظیم نے دو لفظ کے ذریعہ کتنے فتنوں کے دروازے بند فرمادیے۔

عیب اور بُرائی، ہجو، بے عزتی کرنے، نیچا دکھانے اور دوسرے نفسانی مقاصد کے لیے ہوں تو یقینا اچھی بات نہیں۔ لیکن جن لوگوں کی بُرائیاں اظہر من الشمس ہیں اور جو لوگ خدا اور سول کی دشمنی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں نام لے لے کر ان لوگوں کی بُرائیوں کو ظاہر فرمایا ہے۔ مگر ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ اکثر وبیشتر بد کاروں کی صفتیں ذکر کرکے ان کے بارے میں فرمادیا گیا ہے کہ وہ ظلم کرتے ہیں، کفر کرتے ہیں وغیرہ۔

بُرے لوگوں کی بُرائیاں، اصلاح اور سدھار کی غرض سے بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو بُروں کے سامنے ان کی غلطی کیسے ثابت ہوگی اور وہ اپنے راستے کو چھوڑ کر صراطِ مستقیم پر کیسے آئیں گے۔

مقدمات اور معاملات میں ایسا وقت بھی آتا ہے، جب کسی کے بارے میں صاف صاف بیان دینا پڑتا ہے کہ فلاں شخص کیسا ہے۔ اگر اس وقت بھی اس کے عیب ونقص کو چھپا لیا گیا تو عدل وانصاف کس بنیاد پر ہوں گے کہ شریعت نے ان مواقع کی تعیین فرمائی ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ (النساء:۲۱)

ترجمہ:۔ اللہ کو بدگوئی پسند نہیں آتی، مگر جس پر ظلم ہوا ہو۔

امام غزالی علیہ الرحمہ نے ان مواقع کو شمار کرکے بیان کردیا ہے، جن میں عیوب اور بُرائیوں کا چھپانا بُرا ہے اور ظاہر کرنا ضروری ہے۔

(۱)... امیر کے پاس حاکم کے مظالم کی فریاد کرنا۔

(۲)... مذہبی اور اخلاقی بُرائیوں کو ختم کرنے کے لیے بطورِ محاسبہ ذکر کرنا۔ اسی نظریہ کے تحت قرآن شریف میں کفار ومشرکین کی بُرائیوں کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

(۳)... فتویٰ طلب کرنے کے لیے کسی کی خرابی کا ذکر کرنا، جیسے ہند عتبہ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں شکایت کی کہ وہ بخیل ہیں، مجھے جو کچھ خرچ کے لیے دیتے ہیں، وہ میرے اور بچوں کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔ جس پر حضور نے بقدرِ ضرورت ان کے مال سے لے لینے کی اجازت دی۔

(۴)... کسی شخص کے شر وفساد سے لوگوں کو بچانے کے لیے جس طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک شخص کے بارے میں فرمایا: ''بئس ابن العشیر''۔ (قبیلہ کا بُرا آدمی ہے)

(۵)... کسی شخص کا ایسے لقب سے مشہور ہوجانا، جو ظاہری نظر میں گرچہ معیوب ہو، مگر اس لقب کو بہت شہرت مل گئی ہو اور خود لقب والا بھی اس کے استعمال کرنے پر کوئی بُرا اثر نہ لیتا ہو، تو ایسی صورت میں اس لقب کا استعمال روا ہے۔ جیسے خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی کو ''ابوتراب'' کہہ کر پکارا۔

(۶)... کھلے بندوں فسق وفجور اور خلافِ شرع کام کرنے والوں کی مذمت کرنا، اور اس کو ظاہر کرنا، تاکہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے۔

فقر و غنا کا اسلامی تجزیہ

دولت و ثروت بھی خدا کی نعمت ہیں۔ رب تعالیٰ جسے جس قدر چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے۔ یہ مالک بے نیاز کی حکمتیں ہیں کہ بندوں کو ان کے مناسب حال، کیفیات میں رکھتا ہے۔ غربت اور تنگ دستی اگر اپنے ساتھ صبر و قناعت رکھتی ہو تو یہ مولا عز و جل کی بہت عظیم نعمت ہے۔ موجودہ دور میں جب ساری دنیا معاشی اور اقتصادی استسقا کا شکار ہے، یعنی ہر طبقہ حصولِ دولت اور زیادہ سے زیادہ مال دار بننے ہی کو مقصد اولین سمجھ رہا ہے۔ یہ ربانی سبق دنیا کے سامنے پیش کرنا نہایت ضروری ہے کہ اصل شی دل کا غنا ہے۔ اسلامی آئینۂ حیات کی رو سے اہل دولت و ثروت کو اس سے بے نیاز نہیں ہونا چاہیے کہ مجھے جو کچھ نعمتیں دی گئی ہیں، ان میں سے ہر ایک کا حساب رب کائنات کے حضور پیش کرنا ہے۔ اس لیے ایسا نہ ہو کہ کوئی زعم باطل مجھے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے غافل کر دے۔ اس لحاظ سے غریب اور مفلس مجھ سے بہتر ہے کہ اسے کم نعمتیں ملیں اور اسے کم کا حساب دینا ہوگا۔ میں نے رب تعالیٰ کی نعمتوں میں سے زیادہ پایا تو مجھے زیادہ باز پُرس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وسعتِ رزق یا روزی کی تنگی سب اللہ تعالیٰ کی حکمتوں پر مبنی ہے۔ خود مالک بے نیاز ارشاد فرماتا ہے:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ O (الشوریٰ:۴۲-۲۷)

ترجمہ:۔ اور اگر اللہ اپنے سب بندوں کا رزق وسیع کر دیتا تو ضرور زمین میں فساد پھیلاتے، لیکن وہ اندازے سے اتارتا ہے جتنا چاہے، بے شک وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے، انھیں دیکھتا ہے۔

حضرت عمرو بن حریث سے مروی ہے کہ یہ آیت کریمہ اصحابِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اصحابِ صفہ میں سے لوگوں نے خواہش کی تھی کہ کاش ہم پر بھی متاعِ دنیا کی فراوانی ہوتی۔ خباب بن الارث سے روایت ہے، وہ فرماتے ہے کہ یہ آیت ہمارے ہی حق میں نازل ہوئی، کیوں کہ ہم نے بنی قریظہ، بنی نضیر و بنی قینقاع کے یہود کی دولت و ثروت دیکھ کر تمنا کی تھی کہ کاش یہ دولت ہمارے پاس ہوتی۔ اس پر یہ آیت اتری۔ اصحابِ صفہ وہ صحابۂ کرام تھے، جو اپنے گھر بار سب کو تج کر دین کے لیے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تھے۔ ان کے پاس مال و دولت، مکان اور ذریعۂ معاش کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ لوگ مسجد نبوی شریف کے صفہ میں رہا کرتے تھے۔ صحبت رسول کی دولت سمیٹتے تھے اور اہل استطاعت انصار و مہاجرین ان میں سے کچھ کو کبھی اپنے گھر دعوت دیتے۔ کبھی اپنے گھر سے کھانے کی چیزیں لا کر ان کی ضیافت کرتے۔ ان پاکیزہ نفوس کے اندر وسعتِ رزق کی خواہش پیدا ہوئی تو رب تعالیٰ نے اپنا فیصلۂ حکمت سنایا۔

گویا دنیاوی معاملات کی فراخی، رزق کی وسعت رب تعالیٰ کے نزدیک یہ اہم نہیں ہے۔ بلکہ اہم الاہم ایمان اور تقویٰ ہے، جن کے ہوتے ہوئے ان اشیا کی کوئی وقعت نہیں۔ اللہ کے نزدیک ایک فقیر و محتاج مومن کا مقام کسی کافر بادشاہ اور اہل ثروت سے بہت بلند ہے۔ بشرطیکہ وہ تقدیر الٰہی پر راضی ہو اور توکل اور صبر و قناعت کا دامن تھامے رکھے۔

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت خطیب بیان کرتے ہیں۔ حدیث قدسی ہے، جس کے اخیر حصہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

"اللہ تعالیٰ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: میرے مومن بندوں میں کوئی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ایمان کی درستی کے واسطے تونگری ہی لائق ہے اور اگر میں اس کو فقیر کردوں تو اس کا ایمان بگڑ جائے۔ اور میرے مومن بندوں میں سے کوئی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ایمان کے واسطے محتاجی ہی مناسب ہے اور اگر میں اسے مال دار بنا دوں تو اس کا ایمان بگڑ جائے۔ اور میرے مومن بندوں میں کوئی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ایمان کے واسطے تندرستی ہی مناسب ہے اور اگر میں اسے بیمار ڈال دوں تو اس کا ایمان بگڑ جائے۔ اور میرے مومن بندوں میں سے کوئی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ایمان کے واسطے بیماری ہی مناسب ہے، اگر میں اس کو تندرست کردوں تو اس کا ایمان بگڑ جائے۔ میں بندوں کے قلوب کا حال معلوم کرکے ان کے کام کی تدبیر فرماتا ہوں، میں خوب دانا اور خبردار ہوں"۔

غریب غربت کو، بیمار علالت کو معیوب نہ سمجھے۔ کیوں کہ سلامتی دین و ایمان کے لیے رب تعالیٰ کی حکمتوں کے مطابق ہمارے نصیب میں جو ہے، وہ حاصل ہوگا۔ غربا اور مفلسین کو اپنی کم مائیگی پر رنجیدہ خاطر اور کبیدہ دل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر آج ان کے لیے رزق قلیل ہے اور وہ اس پر قانع ہیں تو کل رب تعالیٰ کی نعمتیں کثیر ملیں گی اور انعاماتِ الٰہیہ و افضالِ ربانی کی فراوانی ہوگی۔ روزِ حشر انھیں آسان حساب کا سامنا ہوگا۔ بمقابل دولت مند اور اہل ثروت کے۔ فقرائے امت پہلے جنت میں داخل کیے جائیں گے۔

دنیا میں اہل ایمان اگر دولت و ثروت سے محروم ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ خزانۂ قدرت میں کوئی کمی ہے۔ بلکہ جواں مرد مومن کے زرِ ایمان کو اس کلفت و صعوبت کی بھٹی میں تپا کر اسے اور نکھارنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی راہ سے گزرنے کے بعد تو حضرت خلیفۃ الرسول سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رضوانِ الٰہ کا مژدہ نصیب ہوا۔

قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کے تحت امام فخر الدین رازی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تفسیر میں کثرتِ رزق سے بغاوت پیدا ہونے کے چند عقلی اسباب بیان کیے ہیں۔ ان میں یہ بھی ہے کہ:

☆... اللہ تعالیٰ اگر سب بندوں میں رزق برابر کردیتا تو ایک کو دوسرے کی طرف کچھ حاجت نہ ہوتی۔ حالاں کہ کارخانۂ عالم کا انتظام جتنا ہر شخص سے متعلق ہوتا ہے، وہ تنہا اپنی ذات سے پورا نہیں کرسکتا تو اس دنیائے فانی کی آبادی باقی نہیں رہ جاتی۔

☆... اور بعض اقوام میں خاص طبیعتیں اس قسم کی ہیں کہ ان میں کثرتِ رزق سے سرکشی پیدا ہوتی ہے۔

کثرتِ رزق سے سرکشی کی مثال:

ملک شام اور ایران کی فتح کے بعد عرب کے بعض خطوں سے دیہاتی لوگ منتقل ہوکر ان علاقوں کے مرغزار اور پُر بہار علاقوں میں جاکر آباد ہوگئے۔ آرام دہ زندگی اور اسبابِ دنیا کی فراوانی نے انھیں شریعت سے غافل کردیا۔ حضرت خلیفۃ المسلمین امام المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر ہوئی تو فرمایا:

"واللہ! یہ لوگ ایسے ہیں کہ بھوک اور تنگ دستی ہی ان کے لیے ذریعۂ اصلاح ہے"۔

زمانۂ جاہلیت میں پہاڑوں اور جنگلوں میں بسنے والے عرب کا عموماً یہ طریقہ تھا کہ جب انھیں کوئی پانی کی جگہ اور خوش حالی کا ماحول مل جاتا اور اولاد اور جانوروں میں ترقی ملتی تو تاک لگاتے اور جہاں کوئی کمزور پڑائو دیکھتے، ان پر چڑھ دوڑتے، خوں ریزی کرتے اور مردوں کو قتل کر کے عورتوں اور جانوروں کو پکڑ لاتے۔

خود اٹھارہویں صدی عیسوی ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو اس بات کا ثبوت ملے گا کہ اسلامی ریاست اور صوبوں کے اندر ایسے لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے سلطانِ وقت سے انحراف کیا۔ ان کے خلاف بغاوت کی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی لعنت کے مستحق ہوئے۔ مسلم ریاست میں فتنہ و فساد کی بنیادیں ڈالیں، شریعت کے خلاف سربازار فسق و فجور کا ہنگامہ برپا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم ریاست کی مرکزیت بھی ختم ہو گئی اور ملت مسلمہ کے غداروں کو بھی پناہ نہ مل سکی۔

اور کثرتِ رزق سے سرکشی پیدا ہونے کی مثالیں یورپ اور امریکہ میں تو بے حد میسر آ رہی ہیں اور ہم کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ غربت و فلاکت کے جھونپڑوں میں صبر و شکر سے خدا و رسولِ خدا کی اطاعت کرنے والوں کو رزق کی کثرت اور وسائل زندگی کی فراوانی نے مغرور صفت بنا دیا ہے۔

دین اور دین داری سے تعلق تو برائے نام ہی باقی ہے، مگر تمرد اور سرکشی کا عفریت سروں پر کچھ اس طرح سوار دکھائی دیتا ہے کہ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ بالا فقرہ بعینہٖ صادق آتا ہے۔

علامہ فخرالدین رازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ انسان اپنی تخلیق کے لحاظ سے احمق اور متکبر واقع ہوا ہے۔ اسی لیے اسے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ نبوتِ الٰہی سے اخلاق سیکھ کر اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ اور اخلاق کا حصول نفس کو زیر کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر اسے تونگری اور قدرت حاصل ہو گئی تو اپنی اصل خلقت کی جانب پلٹ جائے گا اور شہوات و فسادات میں مبتلا ہو جائے گا۔

ہالینڈ کی ہفت سالہ زندگی میں اس کے نمونے شب و روز نظر آتے رہتے ہیں۔ علم دین کے نام پر مسلمانوں کو اپنے عقائد کی موٹی موٹی باتیں بھی معلوم نہیں۔ اہم الفرائض نماز اور اس کے شرائط و لوازم تک کا علم نہیں، مگر اسلامی تنظیموں کی سربراہی کا شوق سر میں سمایا ہوا ہے۔ علمائے کرام کو نوکروں سے زیادہ وقعت دینا ناگوار ہوتا ہے۔ عربی کے حروفِ تہجی تک کا علم نہیں ہے، مگر پورے شہر اور ملک کو اسلام کی دعوت دینے کا ذمہ دار خود کو قرار دیا جا رہا ہے۔

کیا یہ بات علاماتِ قیامت میں سے ایک نہیں ہے کہ ایک دینی جماعت کا سربراہ مسلمانوں کی ایک مجلس میں شریک ہونے گیا، تاکہ وہاں گفتگو کر کے مسلمانوں کے مسائل حل کیے جائیں۔ نمازِ عصر کی جماعت کھڑی ہو چکی تھی، اخیر رکعت میں لاحق ہوا تو بایں شان کہ نیت باندھ کر پہلے اسی صف میں کھڑے ہو کر تین رکعتیں پوری کرنے لگا، بجائے اس کے کہ سلام کے بعد قیام کر کے بقیہ رکعتیں پوری کرتا، از سرِ نو پڑھنے لگا، یہاں تک کہ سلام پھر گیا اور اسے جماعت کے ہمراہ کھڑے ہونے یا بیٹھنے کا موقع بھی نصیب نہیں ہوا۔

ہالینڈ اور یورپ کے ماحول میں اس قسم کے لطیفے روزانہ اُبھرتے رہتے ہیں۔ مگر بقولِ امام رازی: دولت اور وسائل زندگی کی فراوانی نے اتنا متکبر اور خود سر بنا دیا ہے کہ واجب اور فرض چیزیں سیکھنا بھی عار سمجھا جانے لگا ہے۔ اس آئینے میں قرآن مجید کی حقانیت کا نور میرے سینے میں اور چمک اٹھا کہ خالق ارض و سما کا ارشاد برحق ہے اور غربت و امارت، مفلسی اور تونگری ہر ایک میں خداوندِ عالم کی جانب سے حکمتیں پوشیدہ

ہوتی ہیں۔ تقدیر پر ایمان ہر مومن مسلمان کا ہے۔ اور ہماری قسمت میں جو کچھ ہے، وہ ضرور ملے گا۔ "النصیب یصیب" (جو مقدر ہے مل کر رہے گا) پُر اعتماد رہنا چاہیے۔ مرد مومن کو لازم ہے کہ مقدر روزی پر قناعت بھی کرے، رزقِ حلال کے لیے سعی و کوشش جاری رکھے اور مالک و مولا سے خیر کی توفیق طلب کرتا رہے۔ وہی قادر و غالب اور رزاق و وہاب ہے۔

خود ارشاد فرماتا ہے:

اَللّٰهُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُo مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍo (الشوری:۴۲-۲۰)

ترجمہ:۔ اللہ مہربان ہے اپنے بندوں پر روزی دیتا ہے جس کو چاہے اور وہ ہے زور آور زبردست، جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی بڑھاویں ہم اس کو اس کی کھیتی اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی، اس کو دیں ہم کچھ اس میں، اور اس کو نہیں آخرت میں کچھ حصہ۔

ابن ماجہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ دنیا ملعونہ ہے اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے، سوائے یادِ الٰہی اور عالم و متعلم کے"۔

سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اس امت کو بشارت دے دی گئی کہ ان کو شوکت و نصرت اور رفعت و تمکین حاصل رہے گی، جب تک افرادِ امت آخرت کے کام سے دنیا طلبی نہ کریں۔ پھر جب یہ لوگ آخرت کے کام سے دنیا طلبی کرنے لگیں گے تو ایسے لوگوں کے واسطے آخرت میں بھی کوئی حصہ نہیں ہوگا"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا آیت کی تلاوت کی اور ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے بنی آدم! تو میری عبادت کے واسطے فارغ ہو، میں تیرے سینے کو تونگری سے لبریز کر دوں گا اور تیری حاجتیں بر لائوں گا۔ اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں تیرے سینے کو شغل سے بھر دوں گا اور تیری حاجتیں پوری نہ کروں گا"۔ (رواہ الحاکم والبیہقی)

مولائے کائنات علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم فرماتے ہیں:

"کھیتیاں دو ہیں، دنیا کی اور آخرت کی۔ دنیا کی کھیتی تو مال اور اولاد ہے۔ اور آخرت کی کھیتی باقیات الصالحات"۔

دین دار کون اور دنیا دار کون:

خوش حال زندگی کسے پسند نہیں اور کون ہے جو مصائب و آلام، دکھ درد میں زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ مگر آخرت کی فکر کرنے والے اور دین داری کو سینے میں بسانے والے دنیا پر ہمیشہ دین کو ترجیح دیتے ہیں۔ اُخروی مسرت کے واسطے دنیوی آرام و راحت کو خیرباد کہنا گوارہ کر لیتے ہیں۔

شیخ فخر الدین رازی علیہ الرحمہ لوامع میں دنیادار اور دین دار کی علامت لکھتے ہیں:

"دنیادار کی نشانی یہ ہے کہ جب اس کے سامنے ایسا معاملہ آجائے جس میں اس کے دین کا نقصان ہو، مگر دنیا کا فائدہ زیادہ ہو تو وہ دنیاوی فائدے پر راضی ہو جائے، باوجودیکہ اس کے دین کا نقصان صاف نظر آرہا ہو۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہو کہ دین کا فائدہ ہونے کی شکل میں بھی

وہ دنیاوی لحاظ سے محتاج نہیں ہوجائے گا، معاملہ صرف زیادتی کا ہو۔ اور مسلمانوں میں فقرا سے منہ موڑتا ہو۔ اور دنیاوی خیالات ہی سے وابستگی رکھتا ہو"۔

اور دین دار کے حالات اس کے برعکس ہیں۔

"یعنی جس چیز میں اس کے دین کا خسارہ ہو، اسے ترک کر دیتا ہو۔ اور اس کی توجہ فقرائے مسلمین کی جانب رہتی ہو۔ اور جب تک دنیا میں زندہ ہو، آخرت کا اہتمام اس کے پیش نظر رہتا ہو"۔

ایک مسلمان گویا دنیا میں اس طرح رہے، جیسے کوئی مسافر۔ اور اپنی اصل منزل آخرت کو تصور کرے۔ دنیا کا وہ اشتغال جو یادِ خدا اور آئین مصطفی سے برگشتہ کرنے والا ہو، اس سے اجتناب لازم رکھے۔

خود مالک دو جہاں خالق انس وجاں ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (الانعام:۳۲)

ترجمہ:۔ اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر کھیل اور تماشا، اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے ان کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں تو کیا تم نہیں سمجھتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کے مطابق لہو ولعب کافرانہ زندگی کا خلاصہ ہے۔ کیوں کہ کافر اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ کر اسی میں ساری خرمستیاں کر گزرنا چاہتا ہے۔ وہ زندگی کے قیمتی لمحات، غرور و نخوت اور اشغالِ باطل میں ضائع کر دیتا ہے۔ لیکن مومن کی زندگی اعمالِ صالحہ کا میدان ہے، وہ اس موقع کو غنیمت تصور کر کے اپنے لمحہ لمحہ کی حفاظت کرتا ہے۔ عبادت و ریاضت اور نیک اعمال کے ذریعہ آخرت کے لیے توشہ مہیا کرتا ہے۔

کسب حلال کی اہمیت:

خدا کی دی ہوئی تھوڑی روزی پر قناعت کرنا، ایمان کا عظیم موقف ہے۔ مگر مذکورہ بالا تحریروں سے کوئی یہ مطلب ہرگز نہ نکالے کہ حلال روزی کی کوشش کرنا اور اس کے لیے تگ و دو اور جد و جہد کرنا فضول ہے۔ نہیں۔ بلکہ حلال رزق کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا فرائض میں سے ہے۔ یعنی ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ اولیاتِ اسلام ہیں، ان کی ادائیگی فرض عین ہے۔ ان مقدم فرائض کے بعد حلال روزی طلب کرنے کی پوری پوری کوشش کرنا اور حرام سے اجتناب برتنا بھی اسلامی فریضہ ہے اور ہر فریضہ خدا کی اطاعت اور عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة"۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ:۔ حلال روزی حاصل کرنے کی فکر و کوشش، فرض کے بعد فریضہ ہے۔

گویا رزقِ حلال کی طلب میں جد و جہد کرنا نہایت اہم فریضہ ہے، تاکہ مسلمان حرام روزی سے بچیں۔ حرام روزی کا وبال چوں کہ ساری عبادتوں اور ریاضتوں کو برباد اور اکارت کر دیتا ہے، اس لیے حلال کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ رزقِ حلال اپنے اندر ایسی نورانیت رکھتا ہے، جو قلب کو منور کر دیتا ہے۔ اور عبادتوں کو قبولیت تک پہنچا دیتا ہے۔ لقمۂ حلال کی وقعت اس بات سے لگائیے کہ اساطین امت نے مشتبہ چیزوں سے بھی اجتناب فرمایا ہے، چہ جائیکہ حرام اور ناجائز۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ مروی ہے کہ ان کے ایک غلام نے انھیں کھانے کی کوئی شئ لا کر دی، آپ نے کھا لی، بعد میں پتہ چلا کہ اس غلام نے اسلام لانے سے پہلے جاہلیت کے زمانے میں کسی کو اپنا کاہن ہونا بتا کر اس کو کاہنوں جیسی کوئی بات بتائی تھی۔ اس شخص نے اس کام کی اُجرت کے طور پر یہ کھانے کی چیز اب اسے دی تھی۔ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دی اور جو کچھ کھایا تھا، باہر نکال دیا۔

اسی طرح بیہقی نے حضرت سیدنا عمر الفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ انھیں دودھ پیش کیا گیا۔ انھوں نے نوش فرمایا۔ بعد میں پتہ لگا کہ وہ زکوٰۃ کی اونٹنیوں کا دودھ تھا، تو آپ نے انگلی سے قے کر دی اور سب نکال ڈالا۔

حلال روزی کے سلسلہ میں کوشش کرنے والے کا مقام ملاحظہ فرمائیے۔ ترمذی اور دارمی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء"۔

ترجمہ:۔ یعنی نہایت سچائی اور ایمان داری سے کاروبار کرنے والا تاجر، نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

حرام مال کا وبال:

پاک پروردگار اپنے پاک باز بندوں کو پاک، طیب اور حلال مال ہی کھلانا، پلانا اور استعمال کرانا چاہتا ہے۔ حرام روزی اور حرام دولت کا استعمال کر کے انسان چاہے کچھ بھی کارِ خیر کرنا چاہے، وہ سب بے کار اور فضول ہے۔ جس طرح نجس اور ناپاک پانی کسی ناپاکی کو پاک اور طاہر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اسی طرح حرام مال بھی ناپاک اور خود نجس ہے۔ وہ گناہوں کی گندگی دھونے اور کفارہ و مغفرت کا ذریعہ بننے کے لائق ہر گز نہیں۔

☆... حرام مال سے کیا ہوا صدقہ قبول نہیں ہوتا۔

☆... حرام مال اور دولت میں برکت نہیں ہوتی۔

☆... حرام کمائی کرنا خود گناہ ہے اور اس سے اہل کی پرورش کرنا، ستم بالائے ستم ہے۔

☆... حرام اور ناجائز دولت، مورث اور وارث سب کے لیے باعث وبال ہے۔

☆... حرام و ناجائز مال سے کیا ہوا حج یا کوئی نیک کام مقبول نہیں ہوتا۔

☆... حرام مال سے پلا ہوا جسم جنت میں نہ جا سکے گا، جہنم اس کی زیادہ مستحق ہے۔

موجودہ دور میں حصولِ دولت کا نشہ انسان کو حلال و حرام کی تمیز سے بے گانہ کر رہا ہے۔ اور اس نشہ کا متوالا ہر سرحد عبور کر کے دولت مند بن جانے کا خواب دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی نظر میں روپیہ اور پیسہ، چاہے جیسا بھی ہو، صرف پیسہ ہے۔ حرام اور ناجائز راہوں سے آ رہا ہو، یا حلال و طیب طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو، وہ دونوں کو برابر سمجھتا ہے۔ ایسے ماحول میں جب کہ بڑے بڑے اہل علم دینی شعور سے بے گانہ ہو کر صرف دونوں ہاتھوں سے مال و دولت سمیٹنا اپنا مقصود بنا چکے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہادیٔ انسانیت، معلم کائنات، سرکار محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نور بیز ارشادات کا اجالا عام کیا جائے۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''یاتی علی الناس زمان لا یبالی المرء ما اخذ منه أمن الحلال ام من الحرام''۔

ترجمہ:۔ ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو اس کی پرواہ نہیں رہے گی کہ وہ جو لے رہا ہے، وہ حلال ہے یا حرام۔

شرح السنہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

”ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی ناجائز طریقے سے مال و دولت حاصل کرے اور اس میں سے خدا کے نام پر صدقہ کرے تو اس کا صدقہ قبول ہو۔ اور اس میں سے خرچ کرے تو برکت ہو۔ اور جو شخص حرام مال (مرنے کے بعد) چھوڑ جائے تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہوگا۔ رب تعالیٰ بدی کو بدی سے نہیں مٹاتا، بلکہ بُرائی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ گندگی، گندگی کو نہیں دھو سکتی''۔

صحیح مسلم شریف میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اے لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ وہ صرف پاک ہی چیز کو قبول کرتا ہے۔ اور اس نے اس بارے میں جو حکم اپنے رسولوں کو دیا ہے، وہی اپنے تمام مومن بندوں کو دیا ہے۔ پیغمبروں کے لیے اس کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔

ترجمہ:۔ اے پیغمبرو! تم پاک اور حلال غذا کھاؤ۔ اور صالح عمل کرو۔

اور ایمان والوں کو مخاطب کر کے اس نے فرمایا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! تم ہمارے دیے ہوئے میں سے حلال وطیب رزق کھاؤ (حرام نہ کھاؤ)۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ذکر فرمایا ایک ایسے آدمی کا، جو طویل سفر کر کے (کسی مقدس مقام پر) ایسے حال میں جاتا ہے کہ اس کے بال پراگندہ ہیں اور جسم و لباس پر گرد و غبار ہے اور آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا کرتا ہے۔ اے میرے رب! اے میرے پروردگار! اور حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام ہے، اس کا لباس حرام ہے اور حرام غذا سے اس کی پرورش ہوئی ہے، تو اس آدمی کی دعا کیسے قبول ہوگی؟

امام احمد اور بیہقی شعب الایمان میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے فرمایا:

''من اشتری ثوبا بعشرة دراهم وفیه درهم حرام لم یقبل الله له صلوة ما دام علیه''۔

ترجمہ:۔ جس شخص نے دس درہم میں کوئی کپڑا خریدا اور ان میں ایک درہم بھی حرام کا تھا تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا، اس کی کوئی نماز قبول نہ ہوگی۔

یہ فرمانے کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اپنی دونوں انگلیاں کانوں میں لگالیں اور فرمایا:

''بہرے ہو جائیں یہ میرے دونوں کان اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ بات فرماتے نہ سنا ہو''۔

سنن دارمی و مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''لا یدخل الجنۃ لحم نبت من السحت وکل لحم نبت من السحت کانت النار اولی بہ''۔

ترجمہ:۔ وہ گوشت اور وہ جسم جنت میں نہ جا سکے گا جس کی نشو ونما مالِ حرام سے ہوئی ہے اور ہر ایسا جسم اور گوشت جو حرام مال سے پل کر بڑھا ہے، دوزخ اس کی زیادہ حق دار ہے۔

وسعت رزق کے لیے حلال و حرام کی تمیز نہ کرنے والوں کو آقا و مولا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرامین زیب گوش کر کے دنیا و آخرت میں مفید ثابت ہونے والے طریقوں سے روزی حاصل کرنے کا عزم کرنا چاہیے اور من مانی راہوں کو چھوڑ کر توبہ و استغفار کی وسیع ربانی چادر میں پناہ ڈھونڈنی چاہیے۔ رب تعالیٰ ان لعنتوں سے ہمیں مامون و محفوظ رکھے۔ آمین۔

دشمنانِ خدا دنیا میں خوش حال کیوں ہے؟:

بعض مسلمان کبھی اضطراری طور پر کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم اہل حق ہیں، اس کے باوجود تکالیف و مصائب بھی ہم پر ہی زیادہ آتے ہیں۔ اور خدا کے دشمن، منکرین خدا اور باغیانِ اسلام کے پاس دولت و ثروت اور وسائل حیات کی فراوانی کیوں ہے؟ ان کی معیشت ہم سے بہتر، ان کا رزق ہم سے وسیع کیوں ہے؟

وجہ در اصل اللہ تعالیٰ کے قانون میں غور خوض سے کھل کر سامنے آتی ہے۔ دشمنانِ خدا کے لیے اصل عذاب اور سزا کا مقام تو آخرت ہے۔ جس طرح اہل حق کے انعامات واکرامات کے لیے دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے۔ لہٰذا سرکشوں کو مزید بڑھاوا دینے کے لیے اور کھلی آنکھوں سے خدا کی نشانیاں دیکھنے کے بعد ہی اسلام سے منکر ہونے والوں کے لیے کثرتِ اموال اور وسائل زندگی کی فراوانی دے کر رب تعالیٰ ان کی رسیاں ڈھیلی کر رہا ہے، تاکہ دنیاوی عیش و آرام کے بعد عذاب کی سخت پکڑ اور شدتِ مواخذہ ان کی تکالیف اور بڑھادے۔ جس طرح مومن اہل حق درد وغم کے دنیاوی ایام گزار کر آخرت کی حقیقی آرام گاہ میں رب تعالیٰ کے فضل و کرم کی بہاروں کا حقیقی لطف اٹھائے گا۔ دنیا میں مومن کی تکالیف ایمان کی پختگی کا ذریعہ اور آخرت میں بلندیٔ درجات کا سبب ہیں۔ یوں ہی کفار و مشرکین کے لیے اسبابِ دنیا کی فراخی ان کی گمراہی، تمرد و سرکشی کو اور اُبھارنے کا ذریعہ اور نار جہنم کا ایندھن بننے کا سبب ہیں۔

رب کائنات جل وعلا کا فرمان زیب گوش کیجیے:

وَلَوْلَآ اَنْ یَّکُوْنَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّکْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِھِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّۃٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیْھَا یَظْھَرُوْنَ، وَلِبُیُوْتِھِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیْھَا یَتَّکِئُوْنَ وَزُخْرُفًا وَّاِنْ کُلُّ ذٰلِکَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ عِنْدَ رَبِّکَ لِلْمُتَّقِیْنَ O (الزخرف:۳۵)

ترجمہ:۔ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک دین پر ہوجائیں تو ہم ضرور رحمن کے منکروں کے لیے چاندی کی چھتیں اور سیڑھیاں بناتے، جن پر وہ چڑھتے اور ان کے گھروں کے لیے چاندی کے دروازے اور چاندی کے تخت جن پر تکیہ لگاتے اور طرح طرح کی آرائش اور یہ جو کچھ ہے دنیوی زندگی کا سامان ہے اور آخرت آپ کے رب کے نزدیک پرہیز گاروں کے لیے ہے۔

اللہ اللہ! قربان جائیے اس فرمان کی حکمتوں پر کہ اگر اس بات کا لحاظ نہ ہوتا کہ ساری دنیا کافر ہوجائے گی اور سب انسان گمراہ ہوجائیں گے تو رب تعالیٰ کفار و مشرکین کو اتنی دولت دیتا کہ سونے چاندی کی بہتات کے باعث وہ اپنے مکان، سیڑھیاں، چھت چاندی سونے کے بناتے۔ مکانوں کے دروازے اور پلنگ بھی ان کے لیے سونے کے ہوتے۔ مگر رب تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، کیوں کہ ایسا نہ ہو کہ کم فہم لوگ کفار اور دشمنانِ خدا کی شان و شوکت اور سج دھج دیکھ کر انھیں برحق سمجھ بیٹھیں اور خود بھی انھیں کی طرح گمراہ ہوجائیں۔ لہٰذا اب آیت متذکرہ بالا سے ایمانِ مومن اور قوی ہوجاتا ہے کہ دنیا کی سنہری روپہلی دولت، یہ سب، کچھ بھی نہیں ہے۔ رب کائنات کے حضور اس کی مچھر کے پر برابر بھی وقعت نہیں۔ اصل دولت اور اصل سرمایہ آخرت کی کامیابی اور رب تعالیٰ عزوجل کی رضا ہے۔

ترمذی، ابن ماجہ سہل بن سعد سے مروی، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما سقى منه كافرا شربة ماء''۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ:۔ اس دنیا کی وقعت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی نصیب نہیں ہوتا۔

ایک خرابی:

موجودہ دور کی لعنتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جن مسلمانوں کے پاس کچھ مال و متاع ہوجاتا ہے، وہ غربائے ملت کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ مسکین اور کمزور حال مسلمانوں کو بے وقعت خیال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو ہوش آنا چاہیے کہ یہ مال اور دولت فرعون اور قارون کا ورثہ ہے، مگر فقر اور مسکنت آقائوں کے آقا سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اختیاری خلعت زیبا ہے۔ اور اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیں کہ ان کی دولت و ثروت ان کے خدا پسند ہونے کے باعث ہے (چاہے وہ فرائض اور واجبات تک سے غافل ہوں) اپنی دولت اور ثروت کو بعض جہال اپنے مقبولِ خدا ہونے کی علامت سمجھتے ہیں، انھیں عقل کے ناخن کی ضرورت ہے کہ معیارِ مقبولیت دولت نہیں ہے، معیارِ شریعت ہے۔ دین داری کے کامل تقاضوں کو کماحقہ پورا کرنے والا مفلس و نادار مسلمان سیکڑوں متکبر اور سرکش دولت مندوں سے بہتر و برتر ہے۔

آقا و مولا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

''ليس الغنى عن كثرة العرض ولكن الغنى القلب''۔ (ترمذی)

ترجمہ:۔ غنا، دولت کی زیادتی سے نہیں بلکہ غنا، نفس سے حاصل ہوتا ہے۔

حضرت سیدنا سلیمان علیہ السلام کی امثال میں ہے کہ:

''جو شخص مسکین پر ہنستا ہے، گویا اس کے بنانے والے ک ی حقارت کرتا ہے''۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''علم پیغمبروں کی میراث ہے، اور مال و دولت فرعون و قارون کی''۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ:

''عزتِ دنیا مال سے ہے، مگر عزتِ آخرت اعمال سے''۔

حضرت مولائے کائنات علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا فرمان ہے:

''حرص سے کچھ روزی نہیں بڑھ جاتی، مگر آدمی کی قدر ضرور گھٹ جاتی ہے''۔

وقارنسواں اور اسلام

صنف نسواں، ماضی کے دور میں بھی ظلم و تعدی کا شکار رہی اور موجودہ ترقی کے زمانے میں بھی وہ اہل ہوس کے معاشرہ میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ دور جاہلیت میں خود اہل عرب اپنے گھر پیدا ہونے والی بچیوں کو زندہ دفن کردینا، قابل فخر سمجھتے تھے۔

عورت جاہلیت جدیدہ میں:

آج بھی دنیا کے کئی خطوں میں بچیوں اور لڑکیوں کو وبالِ جان تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستان تو بطورِ خاص اس معاملہ میں دنیا کے اندر بدنام ہے۔ جہاں بڑے شہروں میں ایسے ڈکٹروں کے پاس (جو استقرارِ حمل کے ابتدائی ایام ہی میں، آلاتِ جدیدہ کی مدد سے یہ جان لیا کرتے ہیں کہ شکم مادر میں آنے والا، لڑکا ہے یا لڑکی) نوجوان جوڑوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اور جب انھیں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ شکم میں لڑکی ہے تو وہ اسے بلا تکلف گروادیا کرتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک آج بھی لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکی قابل نفرت ہے۔ ان کے خیال میں لڑکی پرائے گھر جانے والی ایک شئے ہے، جس کی پرورش بوجھ ہے۔ اس کے علاوہ جہیز کی لعنت، اور ہندوستانی جاہلانہ معاشرہ میں ستی (شوہر کے ساتھ جل مرنے کا قانون) کا احیا بھی عام ہندو ذہنوں میں لڑکیوں کو حقارت کے خانے میں پہنچا رہا ہے۔

عرب جاہلیت اور عورت:

قدیم جاہلیت پھر سے زندہ کی جارہی ہے۔ جب کہ صنف نسواں زندگی کے حق سے بھی محروم کردی گئی تھی۔ تصور کیجیے!
عرب کے اس جاہلی زمانے کا، جب باپ فخر سے سر اونچا کرکے کہا کرتا تھا کہ میں وہ ہوں، جس نے سات بیٹیوں کو زندہ درگور کیا ہے۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

قیس بن عاصم نے جاہلیت میں آٹھ یا دس لڑکیوں کو دفنایا تھا۔

(تفسیر ابن کثیر، ج۴ر ص۴۷۷۔۴۷۸)

اس دور کی تصویر کشی سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے، جو صحیح مسلم کتاب الطلاق میں مروی ہے:

”بخدا! جاہلیت کے زمانے میں ہم لوگ عورتوں کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اپنی ہدایات نازل فرمائیں اور ان کے لیے جو کچھ مقرر فرمانا تھا، فرمایا“۔ (صحیح مسلم)

بعض عورت بیزار ایسے بھی تھے کہ انھیں جب اپنے گھر میں لڑکی پیدا ہونے کی خبر ملتی تو وہ منحوس سمجھ کر اپنے مکان ہی کو خیرباد کہہ دیتے تھے۔

(ابن کثیر، ج۷ر ص۴۳۵)

قرآن مجید، جاہلی عربوں کی لڑکی ذات سے نفرت اور اس کی پیدائش پر اظہار تنفر کی تصویر کشی فرماتا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ O يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ۔(النحل:۵۸)

ترجمہ:۔ اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے، اور وہ گھٹنے لگتا ہے غم کے مارے، اس چیز کو وہ اتنا بُرا سمجھتا ہے کہ اپنے آپ کو اپنی قوم سے چھپائے پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت اٹھا کر اسے باقی رکھے یا زمین میں دفن کر ڈالے۔

ایک شخص نے اپنا ایسا ہی واقعہ دربارِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں بیان کیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

''ان کی ایک بچی تھی، جو ان سے بہت مانوس بھی تھی، کہ جب انھیں دیکھتی پیار سے پاس آجاتی، ان کی پکار پر دوڑ پڑتی، ان پر ایک دن ''دخترکشی'' کا جاہلانہ جنون سوار ہوا۔ اپنی اس بیٹی کو ساتھ لے کر چلے اور لے جاکر ایک کنویں میں جھونک دیا۔ اس وقت بھی وہ ''ابا جان'' ابا جان پکارتی رہی اور اسی عالم میں مرگئی۔ اس واقعہ کو جب انھوں نے ذکر کیا تو رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بہت روئے، یہاں تک کہ آپ کی ریشِ مبارک اشکوں سے بھیگ گئی''۔

(سنن دارمی باب ماکان علیہ الناس قبل بعث النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

جاہل عرب، عورتوں کے بارے میں نہایت سرکش تھے۔ جتنی عورتوں سے چاہتے شادی کرتے اور جس طرح چاہتے طلاق دے دیا کرتے تھے۔ شوہروں کے مرنے پر عورتیں ورثا کے رحم و کرم پر رہتیں۔ مال کے حرص میں سوتیلی مائوں تک سے شادی کر لیا کرتے تھے۔ وراثت میں عورت کا کوئی حصہ نہیں تھا۔

عورت قدیم روم و یونان میں:

عورتوں کے ساتھ ناانصافی اور بدسلوکی کا یہ برتائو محض عرب تک ہی خاص نہیں تھا، بلکہ تمام قدیم، خدا بے زار تہذیبوں میں عورت اپنے صحیح وقار و عزت سے محروم تھی۔ قدیم یونان میں عورت کا کیا حال تھا؟

''عورت مدت العمر غلام بن کر جیتی تھی۔ یونانی قانون نے عورت کو طلاق کا حق دیا تھا، مگر عملاً وہ اس حق کے استعمال سے محروم تھی۔ افلاطون مرد و عورت کی برابری کا دعوے دار تھا، مگر عملی دنیا میں عورت کو برابری کا مقام نہ دلا سکا۔ اسپارٹا کے قانون میں یہ شق مندرج تھی کہ فوج میں قومی سپاہیوں کے اضافہ کے پیش نظر کم عمر اور کمزور شوہروں کو چاہیے کہ اپنی بیویاں جوانوں کے نکاح میں دے دیں''۔

(تاریخ اخلاق یورپ، لیکی)

یہی مصنف روم کے بارے میں لکھتا ہے کہ پانچ سو بیس سال تک روم میں کسی نے طلاق کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہاں زن و شوہر نہایت خوش گوار زندگی گزارتے تھے، بلکہ شوہر کے حقوق اتنے وسیع تھے کہ وہ بیوی کو قتل تک کر سکتا تھا۔ مرد، عورت سے چاکری کرانے اور منافع اندوزی کے لیے شادی کیا کرتا تھا۔ عورت کسی عہدہ کی اہل نہ تھی اور نہ کسی معاملہ میں گواہی دے سکتی تھی۔ البتہ اس کو طبعی کمزوریوں کی وجہ سے کچھ سہولتیں فراہم کر دی گئی تھیں۔ پھر بعد کے دور میں البتہ رومیوں نے عورت کے حقوق پر دھیان دیا۔

ایک صدی پہلے تک یورپ میں بھی عورتیں سخت بدحالی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ ''مل'' نے لکھا ہے کہ:

''یورپ کی تاریخ کو دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ باپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہتا بیچ ڈالتا تھا اور لڑکی کی مرضی کی قطعًا پرواہ نہیں کرتا تھا''۔

(محکومیت نسواں، مل)

خود انگلستان میں عورت کی حالت نہایت پست تھی۔ شادی کے بعد عورت کی کل جائداد کا مالک مرد ہوجاتا تھا، عورت کے لیے مرد کے خلاف آواز اٹھانے کا کوئی حق یا ضابطہ نہیں تھا۔ مرد عورت کو وراثت سے بھی محروم کر سکتا تھا۔ عورت کسی معاملہ میں آزاد نہ تھی، نہ وہ خود کما کر خرچ کر سکتی تھی، نہ ہی اپنی مرضی کی شادی کا اختیار رکھتی تھی۔ لڑکیوں کی شادی باپ کے لیے ایک نفع بخش تجارت تھی۔

ہندومت اور عورت:

اسی طرح قدیم مذاہب کا مطالعہ کیجیے تو وہاں بھی ہر جگہ عورت مظلومیت کے شکنجہ میں کسی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ہندو دھرم کے مقنن منوجی نے لکھا ہے کہ:

''جھوٹ بولنا عورتوں کا ذاتی خاصہ ہے''۔

(دھرم شاستر ادھیائے ۹/اشلوک ۱۷)

جانکیہ برہمن منوجی کی شاستر کے تزئین کار اور حاشیہ نگار ہوتے ہیں۔ ان کے مرتبہ قوانین، ہندومت کے دستور العمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا:

''دریا، مسلح سپاہی، پنجے اور سینگ رکھنے والے جانور، بادشاہ اور عورت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے''۔ (ہیانک نیتی ۱/۱۵)

''جھوٹ بولنا، بغیر سوچے کام کرنا، فریب، حماقت، طمع، ناپاکی، بے رحمی، یہ عورت کے جبلی عیب ہیں''۔

''شہزادوں سے تہذیب اخلاق، عالموں سے شیریں کلامی، قمار بازوں سے دروغ گوئی اور عورتوں سے مکاری سیکھنی چاہیے''۔ (۱۳/۱۰۸)

''آگ پانی، جاہل مطلق، سانپ، خاندانِ شاہی اور عورت یہ سب موجب ہلاکت ہوتے ہیں''۔ (۱۴/۱۰۲)

''دوست، خدمت گار اور عورت، مفلس آدمی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور جب وہ دولت مند ہوجاتا ہے تو پھر اس کے پاس آجاتے ہیں''۔ (۱۵/۱۰۵)

جہاں تک عورت کے قانونی حقوق کا تعلق ہے، منوجی کی شاستر کا قانون ملاحظہ کیجیے!

''عورت لڑکپن میں باپ کے اختیار میں رہے، جوانی میں شوہر کے اختیار میں اور بیوہ ہوجائے تو اپنے بیٹوں کے اختیار میں رہے۔ خود مختار ہوکر کبھی نہ رہے''۔

(منوسمرتی ۵/۱۴۵)

''عورت نابالغ ہو یا جوان یا بوڑھی، گھر میں کوئی کام خود مختاری سے نہ کرے''۔ (منوسمرتی ۵/۱۴۷)

پروفیسر ڈبلیو، بی، آرنلڈ نے ''دی پریچنگ آف اسلام'' میں لکھا ہے کہ:

''ہندوستان کی غریب اور اچھوت ذاتوں میں ذات پات، پنچ اونچ اور چھوت چھات کی وبائوں نے بھی بہتیرے انسانوں کو جانوروں سے بد تر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے''۔

بیوہ عورتوں کو شوہروں کی موت کے بعد زندگی کا کوئی حق میسر نہیں تھا، وہ گندے جانوروں کے بھٹوں جیسے مقام پر رہنے پر مجبور کی جاتی تھیں۔ اس لیے وہ ایسی زندگی سے شوہر کے ساتھ جل مرنا بہتر خیال کرتی تھیں۔ طرفہ تماشا ہے کہ اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی ہندو احیا پرست ہندوستان میں ستی کی ظالمانہ رسم کو پھر سے زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ کملا دیوی کا حالیہ واقعہ ہندوستانی جمہوریت کے نام پر ایک زناٹے دار طمانچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں منو سمرتی میں ہے:

''عورت کو چاہیے کہ اپنے شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے کا نام بھی نہ لے، کم خوراکی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن پورے کرے''۔

(منو سمرتی ۵/۱۵۷)

یہودیت اور عورت:

یہودیت کی مسخ شدہ تعلیم نے بھی عورت کو قعرِ مذلت میں ڈالا اور یہ رجحان زندہ کیا کہ مرد نیکی کا پتلا ہے اور عورت بُرائی کا مجسمہ۔ حضرت آدم علیہ السلام بذاتِ خود جنت کی نعمتوں میں تھے، مگر سب سے پہلے حوا نے ان کو خدائے تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کیا۔ عہد نامہ قدیم کہتا ہے کہ:

''خدا نے آدم علیہ السلام سے ممنوعہ پھل کھانے کی بابت دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ جس عورت کو تو نے میرا ساتھی بنایا ہے، اس نے مجھے دیا اور میں نے کھایا۔ اس سزا میں خدا نے عورت کو حمل اور ولادت کی تکلیف میں ڈالا''۔

(پیدائش، باب ۳)

یہودی قانون میں مرد وارث کی موجودگی میں عورت وراثت سے محروم رہتی ہے۔ اور اسے دوسری شادی کا بھی استحقاق نہیں۔ عہد نامہ قدیم کا ایک اقتباس دیکھتے چلیے:

''جو کوئی خدا کا پیارا ہے، وہ اپنے کو عورت سے بچائے گا۔ ہزار آدمیوں میں سے میں نے ایک خدا کا پیارا پایا ہے، لیکن تمام عالم کی عورتوں میں ایک عورت بھی ایسی نہیں پائی جو خدا کی پیاری ہو''۔ (عہد نامہ قدیم، باب واعظ)

کتاب مقدس میں ہے:

''عورت موت سے زیادہ تلخ ہے''۔

توریت میں ہے:

''اگر دو بھائی ایک جگہ رہتے ہوں اور ان میں سے ایک بے اولاد مر جائے تو اس متوفی کی بیوی کا بیاہ کسی اجنبی سے نہ کیا جائے، بلکہ اس کے شوہر کا بھائی اس سے خلوت کرے اور اپنی بیوی بنائے۔ اور بھاوج کا حق اسے ادا کرے۔ اور یوں ہوگا کہ پہلوٹھا جو اس سے پیدا ہو تو اس کے مرے ہوئے بھائی کے نام کا شمار ہوگا، تاکہ اس کا نام اسرائیل سے نہ مٹ جائے، اگر یہ شوہر بننے سے انکار کرے تو اس کی بھائوج جھوں

کے سامنے اس پر اپنے پاؤں کی جوتی نکالے اور اس کے منہ پر تھوک دے اور جواب دے اور کہے کہ جو شخص اپنے بھائی کا گھر نہ بنائے یہی کیا جائے گا"۔

(توریت، استثنا باب ۲۵)

مسیحیت اور عورت:

اصل مسیحیت نے تو عورت کو اپنے معاشرے سے خارج ہی کر دیا تھا۔ اور حتی الامکان عورتوں سے نفرت کے بیج بو کر اپنی سوسائٹی کی تسکین کا پروگرام مرتب کیا تھا۔ کلیسا کی یہی زیادتیاں تھیں، جن کے تحت بڑے بڑے پادریوں میں سے بعض نے عمر بھر اپنی ماں کی صورت نہیں دیکھی۔ کیوں کہ وہ ہر عورت کو بُرائی کا پیکر اور گناہ کی مشین تصور کرتے تھے۔

ان کے خیال میں حضرت حوا کی وجہ سے نسل آدم مبتلائے گناہ ہوئی اور ہر عورت حوا کے حکم میں ہے۔ ہر عورت شیطان کا دروازہ ہے اور عورت ہی نے خدا کی تصویر یعنی مرد کو مبتلائے گناہ کر کے برباد کیا ہے۔

سینٹ پال نے میتھس کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

"عورت کو چپ چاپ کمالِ تابعداری سیکھنی چاہیے۔ میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے، یا مرد پر حکم چلائے، بلکہ خاموش رہے۔ کیوں کہ پہلے آدم بنایا گیا، پھر حوا اس کے بعد بنائی گئی۔ اور آدم نے فریب نہیں کھایا، بلکہ عورت فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی"۔ (پہلا خط، باب ۲)

ایک بڑا مسیحی رہنما کرائی سوسٹم عورتوں کے بارے میں کہتا ہے:

"عورت ایک ناگزیر بُرائی ہے، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب مصیبت اور ایک گھریلو آفت ہے"۔

اسلام عورت کے لیے رحمت:

اسلام وہ پہلا عظیم انقلابی مذہب ہے، جس نے عورت کو اس کا صحیح منصب اور درجہ عطا کیا۔ اسے حقیقی عزت و وقار کی چادر اُڑھائی۔ اور اسے معتوب و مبغوض گرداننے والوں کی زبانیں بند کیں۔ اسلام نے ثابت کیا کہ عورت مرد ہی کی طرح ایک مخلوق ہے۔ جو اطاعت خداوندی کے ذریعہ بلند درجات بھی حاصل کر سکتی ہے۔ اور رب تعالیٰ کی دنیوی و اخروی نعمتوں سے مالا مال بھی ہو سکتی ہے۔ اسے بھی مردوں ہی کی طرح زندگی کے حقوق حاصل ہیں۔ عورت نہ پیدائشی گنہگار ہے، نہ اس کے جسم میں شیطان کی روح ہے، نہ اس کی ذات مردوں کی تباہی کا سبب ہے۔ ارشاد ربانی ہوا:

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ○ (النساء:۱)

ترجمہ:۔ اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور پھیلا دیے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں ۔ اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے ، وہ اللہ، مانگتے ہو تم ایک دوسرے سے

(حقوق اپنے) جس کے واسطے سے اور ڈرو رحموں (کے قطع کرنے) سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تم پر ہر وقت نگراں ہے۔

عزت و کرامت کی اصل بنیاد خواہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کے لیے تقویٰ اور پرہیز گاری ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (الحجرات:۱۳)

ترجمہ:۔ اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے اور بنادیا ہے تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، تم میں سے زیادہ معزز اللہ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔

پانی کے قطرہ سے انسان کو عالم ظہور میں لاکر اسے قبیلہ وخاندان اور رشتہ و قرابت کی منزلوں سے گزارنا، قدرت و حکمت والے پروردگار کا کمال ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا۔ (الفرقان:۵۴)

ترجمہ:۔ اور وہی (اللہ) ہے جس نے پیدا فرمایا انسان کو پانی کی بوند سے اور بنا دیا اسے خاندان والا اور سسرال والا اور آپ کا رب بڑی قدرت والا ہے۔

میاں اور بیوی معاشرتی گاڑی کے دو پہیے ہیں، جن کے ذریعہ نسل انسانی کی بقا ہوتی ہے۔ زوجین کے درمیان باہمی الفت و محبت، ایثار و خلوص رب کائنات کی عظیم نعمت اور کامل نشانی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ O

(الروم:۲۱)

ترجمہ:۔ اور اس کی (قدرت کی) ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے پیدا فرمائیں تمہاری جنس سے بیویاں تاکہ تم سکون حاصل کرو ان سے اور پیدا فرمادیے تمہارے درمیان محبت اور رحمت (کے جذبات) بے شک اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔

عبادت و ریاضت، تقویٰ اور پارسائی اور ہر کارِ خیر کرکے جس طرح مرد خدا کا مقرب ہوسکتا ہے، عورت بھی ہوسکتی ہے۔

اِنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ۔

(آل عمران:۱۹۵)

ترجمہ:۔ بے شک میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو برباد نہیں کرتا خواہ مرد ہو یا عورت، بعض تم میں جز ہے بعض کا۔

نیکیوں اور بھلائیوں کا صلہ جس طرح مردوں کو ملتا ہے، عورت بھی اس سے محروم نہیں کی جاتی، بلکہ مردوں ہی کی طرح عورتوں کو بھی دنیا و آخرت میں بہترین جزا مقدر ہے۔

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O (النحل:۹۷)

ترجمہ:۔ جو بھی نیک کام کرے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے عطا کریں گے ایک پاکیزہ زندگی اور ہم ضرور دیں گے ان کا اجر ان کے اچھے کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے۔

مذکورہ بالا آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ رب تعالیٰ کی میزانِ عدل میں کسی مرد کی نیکی محض اس کے مرد ہونے کی بنیاد پر عورت کی نیکیوں سے عظیم تر نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی عورت کے حسنات صرف صنف نسواں سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر کم درجہ قرار دیے گئے ہوں، بلکہ مرد اور عورت میں سے جو بھی نیکیوں کا خزینہ اکٹھا کرے گا، خداوند عالم کے انعامات کا حق دار ہو گا۔ اور "حیاتِ طیبہ" سے نوازا جائے گا۔

ہماری ماں بہنوں کے لیے کیا یہ بات کم شرف و عزت کی ہے کہ قرآن عظیم میں دو سورتیں خاص انھیں سے منسوب ملتی ہیں۔ سورۃ النساء اور سورۃ الطلاق۔ یہ رب کریم کا بے پایاں کرم ہے عورت جنس پر کہ اس نے سورۃ النساء میں عورتوں کے حقوق اور ان کے متعلق احکام کو بالتفصیل نازل فرمایا ہے۔ اور معاشرتی زندگی کے بارے میں ہدایات کی ہیں۔ نکاح کی جائز و ناجائز صورتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ طلاق کے مسائل و احکام دیے ہیں۔ اور باہمی تنازعات کی صورت میں مفاہمت و مصالحت کا طریقہ بتایا ہے۔

الغرض! سورۃ النساء میں عورتوں سے متعلق اہم فرامین رب العالمین آئے ہیں۔ بیوائوں کی سرپرستی، تقسیم وراثت، بیانِ محرمات، بیانِ سربراہی، والدین، اہل رشتہ، مسکینوں، پڑوسیوں، دوستوں، مسافروں اور زیر دستوں سے حسن سلوک، نزاعی امور میں اللہ و رسول کے فیصلے، مذمت شرک، بیویوں پر احسان وانصاف اور اس باب میں خوفِ خدا وغیرہ احکامات موجود ہیں۔ اسی طرح سورۃ الطلاق میں طلاق کے احکامات عدت کے زمانے میں عورتوں پر ظلم نہ کیا جائے۔ فریقین کو ہر حال میں خوفِ خدا کی تاکید۔ یوں ہی حاملہ کے طلاق کے متعلق احکامات، نان ونفقہ کے احکامات، زوجین کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں مزید رب تعالیٰ کے انعامات اور عذاب کے وعدے اور وعید کا ذکر آیا ہے۔

اور اسی طرح سورۃ البقرہ کی متواتر اکیس آیات میں نیز سورۃ الاحزاب اور سورۃ التحریم میں عورتوں کی ذمہ داریاں، آبرو کی حفاظت، طہارت، پاکیزگی، اخلاق حسنہ کی تلقین وارد ہوئی ہے۔ دنیا کی تمام متمدن کہلانے والی قابل ذکر قوموں میں عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوقِ زندگی کا سراغ تک نہیں ملتا۔ یہ محض اسلام کا احسان ہے کہ اس نے عورتوں کو مردوں کی طرح زندگی اور لوازماتِ زندگی میں حقوق عطا کیے۔ وراثت میں عورتوں کو حصہ دار بنایا، کسی عورت کو قتل کرنے کے جرم میں بطورِ قصاص مرد کو واجب القتل قرار دیا۔ اسی طرح دنیا میں حقوقِ نسواں کو پہلی بار باقاعدگی نصیب ہوئی اور عورت باوقار زندگی گزارنے کی حق دار پائی۔ اور جانوروں، چوپایوں کے قطار میں شمار کی جانے والی بنت حوا کو اسلام نے عزوشرف کا درجہ عطا کیا اور آج بھی دنیا کے تمام ازم عورت جس راہ پر لگا رہے ہیں، ان کی حقیقت تلاش کی جائے تو عورت ذات کو سکون و طمانیت صرف ایک گہوارہ میں میسر آسکتی ہے، وہ ہے اسلام کا پُرامن اور پُرسکون گہوارہ، جو قیامت تک کے لیے اٹل اور لازوال ہے۔

اسلام ایک مستقل نظامِ زندگی ہے۔ ایک اٹل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے دامن میں پناہ لینے والا ہر شخص، اس مقدس رشتے میں منسلک ہونے والا ہر انسان، ایک مکمل نظامِ حیات کا پابند ہے۔ جس کو بالفاظِ دیگر یوں کہہ لیجیے کہ مسلمان مخلوقِ انسانی کا وہ پاکیزہ ترین گروہ ہے، جو انسانی قوانین کی پابندیوں سے آزاد ایک ایسی شاہراہ کا سالک ہے، جس کے پیچ وخم کو انگشت قدرت نے خود مرتب فرمایا ہے۔ وہ انسانی جکڑ بندیوں سے از سر تا پا آزاد ہے۔ اسلام کے اسی پیغام پر لبیک کہنے والوں نے زمانے کو اپنی راہ میں آنکھیں بچھانے پر مجبور کر دیا اور وہ ایک خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر دوعالم کے دوسرے معبودوں سے بے نیاز ہو گئے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مگر آج ہمارا مکمل اسلامی نظامِ حیات پر عمل تو کیا معنی باعزت طور سے اسلامی سانس لینا بھی دشواری کے قبیل سے نکل کر محال کے دائرے میں داخل ہوتا جارہا ہے۔ اور مسلمان ہے کہ خوابِ غفلت سے بے دار ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس کے ذہن و کردار کے فعال ومتحرک عناصر، جمود و تعطل کے بُری طرح شکار ہیں۔ اے کاش! آج بھی کوئی پیکر عزم و استقلال، جہادِ زندگانی کے لیے رزم گاہِ عمل میں کود پڑتا اور حیدر علی کے لاڈلے کا یہ نعرہ بلند کر دیتا۔ ؎

ہزار سال کی گیدڑ کی زندگانی ہیچ
ملے تو شیر کا اِک لمحۂ حیات بہت

اسی شرابِ حریت کا اثر تھا کہ موسیٰ ابن غسان نے جب دیکھا کہ اندلس کی سرزمین پر چہار جانب سے ظالم عیسائیوں کے نرغے میں ہے اور مسلم سلاطین جو اَب شمشیر کی جھنکار کے بجائے چنگ و رباب کے تاروں سے دل بہلانے کے عادی ہو چکے ہیں، جن کے ہاتھ قبضۂ شمشیر کے بجائے مضراب کا انتخاب کر چکے ہیں۔ جو تکبیر کی فتح مند ضرب کے بجائے خوشامدی گویوں کے دل دادہ ہو چکے ہیں۔ اس عظیم خطرے کو سر سے ٹالنے کے لیے ہمت مردانہ سے کام لینے کے بجائے خراج کی بیش بہا رقم کی ادائیگی کے نام پر اندلس کے لاکھوں مسلمانوں کے جان و مال اور عزت وآبرو کا سودا کر رہے ہیں اور زر خرید علما و مشائخ ان کی اس پیش قدمی کے لیے جواز و استحباب کے راستے صاف کیے جارہے ہیں۔ اس مردِ مجاہد کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ صلح کا عہد نامہ نہیں مرتب کیا جارہا ہے، بلکہ عیسائیوں کو اسپین کے مسلمانوں کی رگوں سے خون کا ایک ایک قطرہ چوس لینے کی دعوت دی جارہی ہے۔ اور وہ قوم جو آج میدانِ جہاد میں سر بکفن ہو کر حق زندگانی حاصل کرنے سے کترا رہی ہے، کل یقیناً وہ تاسف کے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی زندگی کے تلخ لمحات گزارنے پر مجبور ہوگی۔ تو اس مجاہد حیات نے اپنی سعی پیہم اور جہد مستقل کے ترکش کا آخری تیر بھی چلے پر رکھ لیا کہ شاید اس قوم کی غیرتِ ایمانی اب عود کر آئے اور اسپین کے مسلمانوں کی قسمت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ اس بلا خیز طوفان سے بچ نکلے۔ اسی مقصد عظیم کے تحت اس نے دنیا سے بغاوت کی تھی۔ اس نے بھرے دربار میں اپنی غیرت کا اعلان کیا اور یوں کہا کہ:

”اے ذمہ دارانِ قوم وملت! ایسی ذلت کی زندگی سے تو عزت کی موت بہتر ہے۔ آئو آئو سر کو ہتھیلی پر رکھ کر اس پرچم کے تحفظ کے لیے ایک بار پھر نکل پڑیں۔ اگر فتح نصیب ہوئی تو الحمد للہ! اور اگر شہید ہو گئے تو طارق ابن زیاد کی روح اعلیٰ علیین میں تمہارا استقبال کرے گی اور کہے گی کہ اے اسپین کے شہیدو! اول روز میں نے بھی اسی خواہش میں اپنی کشتیوں کو جلا ڈالا تھا کہ اگر اندلس پر اسلام کا سکہ بٹھانے میں کامیاب نہ ہوسکا تو مجھے کوئی جامِ شہادت سے محروم نہ رکھ سکے گا“۔

مگر یہ امید بھی بر نہ آسکی اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ اور پھر وہ مرد میدان لشکر اعدا کی پہنائیو میں اس طرح کھو گیا کہ دنیا والے آج تک اس کا سراغ لگانے میں ”لا تشعرون“ کی سطح پر ہاتھ پائوں مار رہے ہیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج قدم قدم پر ہمارے ایمان و ایقان کا امتحان ہو رہا ہے۔ ہمارے عزم و حوصلے کو چیلنج کیا جارہا ہے۔ ہماری غیرت وحمیت کو للکارا جارہا ہے۔ اور ہم ہیں کہ خاموش تماشائی بنے دیکھ رہے ہیں۔... تو کیا...... محض ...... ہماری یہ خاموشی ہی قوم کے درد کا درمان اور ملت کے زخموں کا علاج ہوسکتی ہے۔ کیا ہمارے سکوت ہی سے مظلومیت کے آبلے سرد پڑ جائیں گے۔ نہیں اور ہرگز نہیں۔ اس کے لیے احساس اور بے داری کی ضرورت ہے۔ ہر فرد بجائے خود انفرادی ذمہ داریوں کا پابند ہونے کے ساتھ ساتھ ”انما المؤمنون اخوۃ“ کے اجتماعی گہروارے میں آکر ”اولی الامر منکم“ کے ایک ہی مرجعِ خلائق کی جانب قلب و نظر کو موڑ لے۔

تو بن خود اپنے سفینے کا ناخدا اے دوست!
خطر پسند ہوائوں کے رُخ بدلتے ہیں

کسی بھی قوم کی تعمیر ماضی کی بنیاد پر ہوا کرتی ہے۔ اگر اس کا گزشتہ دور درخشندہ ہے، تو اس کی ضیا باریاں مستقبل کے لیے مشعل راہ بن جایا کرتی ہیں۔ بفضل خدا ہمارے ماضی کا کیا کہنا۔ ہمارا ماضی تو وہ ہے، جس میں دریائے دجلہ و فرات کی طغیانیوں نے بھی ہمارے عزائم کی صلاحیت دیکھی ہے۔ اور ہم نے یہ بتایا کہ مسلمان جہازوں اور کشتیوں کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔ اس کے سامنے آنے والا ہر مغرور اپنی پیشانی جھکا کر جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس قوم نے ساری دنیا کے خالق ومالک کے آگے سر جھکا کر اس کی رضا وخوش نودی حاصل کرلی ہے۔ پہاڑوں کے جگر کو چیرنے والے بھی ہمیں ہیں، خشکیوں میں کشتی چلانے والے بھی ہمیں ہیں، جن کی حکومت تمام مخلوق پر رہ چکی ہے، ہم بڑے بڑے طوفانوں سے ٹکرا چکے ہیں، مگر عزم و ہمت نے کہیں زک نہیں اٹھایا۔

مقامِ دار و رسن ہو کہ عالم زنداں
ہم اہل دل کے بھی تیور کہیں بدلتے ہیں

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہماری موجودہ بدحالی، ہماری بداعمالیوں کا نتیجہ نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ خدائے تعالیٰ جب کسی قوم سے ناراض ہوتا ہے تو اس پر ظالم اور جابر حکمراں کو مقرر کرتا ہے۔ گویا اس ظالم وجابر حکمراں کا قہر وغضب ہی عذابِ خداوندی ہے۔ اپنوں کا شکوہ اپنوں ہی سے ہوا کرتا ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ درد مندانِ قوم کی دلوں پہ اُبھرے ہوئے آبلے، پھوٹ پھوٹ کر الفاظ کی صورت میں برآمد ہوتے ہیں اور اپنے بھائیوں کے اندر استہزا وتمسخر کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور جو

لوگ کچھ ہاتھ پائوں مارنا بھی چاہتے ہیں تو ان کے حوصلے پست ہوکر رہ جاتے ہیں۔ یہ ہے ہمارا آج کا مسلمانوں کا ماحول۔ فیلسوفِ اسلام اقبال نے پہلے ہی کہا تھا: ؎

وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

کاش! رحمت یزداں ایک بار پھر جوش میں آئے اور مسلمان اپنی کھوئی ہوئی اسلامی دولت، اخوت، مساوات، بھائی چارگی، اخلاق و مروت سے واقف ہوجائیں۔ جس نے پوری دنیا کو مانند مقناطیس اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ ؎

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

اور ہر شاعر و مفکر، نثر نگار و انشاء پرداز، واعظ و خطیب انقلابِ زندگی کی ایک ایسی شمع لے کر اٹھے، جو تیرہ سو برس کی دبیز تاریکی کو چاک کر کے ہر مومن کے سینے میں ایمان کی تنویر بسا دے اور عملی طور پر ہر فردِ مسلم بذاتِ خود پیکر اسلام بن کر دنیا کے سامنے آجائے، جس کے خد وخال سے اسوۂ محمدی ہویدا ہو۔ جو کردارِ صدیقی، جلالِ فاروقی کا آئینہ دار اور شانِ عثمانی، شکوہِ مرتضوی کا مظہر ہو۔

اگرچہ آج کا انسان ترقی کی منزلیں پانے کے لیے زمین کی وسعتوں کو کھنگال کر آسمان کی پہنائیوں میں محو پرواز ہے، مگر ایک مردِ مسلم کے لیے تیرہ سو سال قبل کے مرتب شدہ نقوشِ راہ ہی فوز وفلاح کا پہلا اور آخری زینہ ہیں۔ یہی ایک راستہ ہے، جو مسلمانوں کو موجودہ قعرِ مذلت سے نکال کر بامِ عروج تک لا سکتا ہے۔ یقینا یہی ہماری جملہ مشکلات کا حل اور ہمارے تمام امراض کا علاج ہے۔ ؎

وقت تو ٹھہر! مسلماں تو ہو لینے دے
سارے عالم پر ہمیں چھائیں گے، ان شاء اللہ!

چاہے کچھ بھی ہو، ہمارے ضمیر کے ایک گوشے سے اب بھی یہ صدا آرہی ہے کہ اگر یہ چراغ پھر روشن ہوگیا تو تمام آندھیوں کے حوصلے پست ہوکر رہ جائیں گے۔ قوم و ملت کے نونہالوں اور نوجوانوں سے ہمیں اب بھی یہ امید وابستہ ہے (جن کی رگوں میں جوانی کا نیا خون ہے) کہ وہ قوم کی ڈوبتی ہوئی نیّا کا پتوار بن کر پھر اُبھریں گے۔

ان شاء اللہ الرحمن الرحیم

نہ ہو مایوس اے اقبال! اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اسلام اور شہوانیت

فطری جذبات

انسانی کالبد خاکی، اللہ کے اعجازِ قدرت کے گوناگوں عجوبات پر مشتمل ایک مختصر سی دنیا ہے۔ اس کارخانۂ جسدی میں الگ الگ اعضا و جوارح، مختلف امور پر متعیّن ہیں۔ ہر جزو بدن اپنی انفرادی خصوصیت اور ڈیوٹی کا پابند ہے۔ یوں ہی انسانی طبائع کے اندر بھی رب تعالیٰ نے کئی اوصاف رکھے ہیں، جو انسان کی خود داری، جرأت مندی، حیا، پرہیزگاری جیسے اوصافِ حسنہ یا کم ہمتی، بزدلی، بے شرمی اور حسد وکینہ توزی جیسے رذائل کا منبع ہیں۔ اسلامی معلمین اخلاق قدیم ہوں یا جدید سب کے نزدیک یہ بات اختلاف سے ماوریٰ ہے کہ انسانی طبائع میں ودیعت کی ہوئی ہر صلاحیت بجائے خود بُری نہیں ہے۔ البتہ اس کا غلط میلان اسے مضر بنا دیتا ہے۔ انسان کو فطرت کے جو بے بہا خزانے عطا کیے گئے ہیں، ان میں قوتِ شہوت بھی ایک خزانہ ہے، جو کئی مستحسن خوبیوں کا مبدأ ہے۔ جسم کی نشوونما اور بقا، نیز توالد و تناسل سب اس کے مرہونِ منت ہیں۔

جن نظام ہائے تمدن کی بنیاد فقط معاش ہے، ان کے نزدیک تو اخلاق کا کوئی مفہوم ہی نہیں۔ مگر دنیا کی وہ تمام تہذیبیں، جو وحی والہام کے خطوط پر زندگی کے اصولوں کی ترتیب دیتی ہیں، ان تمام پر اخلاق کی چھاپ ضرور نظر آئے گی۔ ہر آسمانی مذہب کی تعلیم اس منزل میں متحد و متفق ہے کہ انسان کوئی ایسا جانور نہیں، صرف قیام، طعام اور پوشش ہی جس کی ضرورت ہو۔ بلکہ اخلاقی اور روحانی نشاط کا حصول بھی اس کی ضرورتوں میں سے ایک اہم ترین ضرورت ہے۔

اسلام انسان کو جو نظامِ زندگی عطا کرتا ہے، اس کا اصل مقصد اپنے خالق ومالک کی معرفت اور عبادت ہے۔ زندگی کے دوسرے اور تمام مطالبات جزوی اور عارضی ہیں۔ وہ آدمی کو روایتی ترقی اور عارضی چاشنی سے بلند ہوکر عزتِ نفس اور وقارِ انسانیت کی منزل سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ (معاذ اللہ)

اسلام اپنے پیروؤں کو زندگی اور مصائب زندگی سے فرار نہیں سکھاتا، بلکہ گوناگوں نئی حیات میں حکیمانہ اصولوں کی تابعداری کر کے معرفت حق کی دولت لازوال عطا کرتا ہے۔

موجودہ دور کی نفس پرست دنیا میں شہوت کی صحیح تعریف جاننے کی ضرورت ہے، تاکہ فقط حیوانی مطالبات ہی کو سب کچھ سمجھ کر اس کے پیچھے دوڑنے والے قدرت کے ان مخفی خزانوں سے بھی مطلع ہوسکیں، جو اولادِ آدم ہونے کے طفیل انھیں بخشی گئی ہیں۔

قوتِ شہوانی کیا ہے:

قدیم فلسفۂ اخلاق کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ انسان کے تمام اوصافِ حسنہ کی بنیاد دو قوتوں پر ہے، جن میں سے ایک کا نام غضب اور دوسرے کا نام ''شہوت'' ہے۔

شہوت، بذاتِ خود بُری نہیں۔ بلکہ انسانی جسم میں خدا کی عطاکردہ اہم صلاحیتوں میں سے یہ بھی ایک عظیم سرچشمۂ قوت ہے۔ یہی قوت جب کامل اعتدال پر ہو تو اسے ''عفت'' کہتے ہیں۔ جو انسانی صفات کے مختلف خانوں میں تقسیم ہوکر الگ الگ ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ مثلاً شرم و حیا، پرہیزگاری، پاک دامنی، جود و سخا، صبر وقناعت، خوش طبعی وغیرہ اوصافِ صالحہ۔ اور اسی قوتِ شہوت میں جب افراط و تفریط ہوتی ہے تو بے شرمی، بے حیائی، اوباشی، بخل، ریا، تملق وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہوتے ہیں۔ حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

اسلام نے قوتِ غضب کو دبانے کی تعریف کی ہے۔ اس قوت کو مٹانے کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اسی لیے ''والکاظمین الغیظ'' (اور غصہ پی جانے والے) فرمایا۔ ''والفاقدین الغیظ'' نہیں کہا۔ اسی طرح قوتِ شہوت کو فنا کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ نکاح کے ذریعہ عفت کی تعلیم فرمائی۔

بے اعتدالی کے نتائج:

قوتِ انسانی کے اس مخزن ''شہوت'' کی مختلف شاخوں میں سے اِس وقت ہماری گفتگو کا موضوع صرف ''شہوتِ فرج'' ہے۔

اس بات کے لیے کسی تائید اور شہادت کی قطعاً ضرورت نہیں کہ اس کے واضح مطالبات کتنے شدید ہیں۔ بعض مکاتب فکر نے تو اسے حاصل زندگی اور مقصد حیات قرار دے لیا ہے۔ اس کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ ہر زمانے میں سفلی بازیگروں نے اس جذبہ کو اپنی سستی شہرت کا ذریعہ بنایا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ''شہوتِ فرج'' ہی وہ موضوع ہے، جس میں افراط وتفریط نے بعض قوموں کو ایسے حیوانوں میں تبدیل کر دیا، جن کے نزدیک ماں، بہن، بیٹی کی تمیز بھی جاتی رہی۔ اور کبھی ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو راہب اور جوگی بنادیا۔ میرے یہی دو مختصر جملے ان ساری تاریخوں کو محتوی ہیں، جو شہوتِ فرج کے سلسلہ میں بے اعتدالی کا شاخسانہ بن کر ظاہر ہوئی ہیں۔ بے شک انسانی طبیعت کے اندر اس کی جڑیں بہت مستحکم ہیں اور تمام خواہشات میں یہ سب سے بڑی خواہش ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

''انسان کی تمام خواہشات میں شہوتِ فرج سب سے برتر و فائق ہے۔ اس کی تسکین کے لیے بعض اوقات انسان ہلاکت خیز خطرات میں بھی کود پڑتا ہے''۔

(حجۃ اللہ البالغہ، ص ۳۱۲)

فطری مطالبہ کا فطری علاج:

اسلام نے اس خواہش کو کچلنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ افراط وتفریط سے بچاکر نکاح کے ذریعہ صالحیت عطا فرمادی۔ چنانچہ رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نوجوانوں کو مخاطب کرکے فرمایا:

''یا معشر الشباب! من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج''۔ (مشکوۃ، ج:۲/ص:۲۸۶)

ترجمہ:۔ نوجوانو! جو تم لوگوں میں حقوقِ زوجیت ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ نکاح ضرور کرے۔ کیوں کہ اس سے نظر کی احتیاط اور شرم گاہ کی حفاظت ہے۔

غیر متزوج مسلمان کے مقابلہ میں شادی شدہ، اپنے پورے ایمان کو محفوظ کرنے کا سامان مہیا کرلیتا ہے، گویا منکوحہ بیوی ایمان و اسلام کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔

''اذا تزوج العبد فقد استکمل نصف الایمان''۔

(بخاری، ج:۲/ص:۷۵۸)

ترجمہ:۔ جب بندہ نکاح کرلیتا ہے تو اس کا نصف ایمان بھی مکمل ہوجاتا ہے۔

سرچشمہ خیروبرکت:

بہت سے لوگ غربت و افلاس کے خوف سے یا اخراجات کے اندیشہ سے نکاح نہیں کرتے۔ مگر وہ اس کو کیوں فراموش کر جاتے ہیں کہ ہر انسان اپنی تقدیر کا نوشتہ ہی استعمال کرتا ہے۔ جب اس کے ساتھ ایک دوسری زندگی بھی رشتہ ازدواج کے اندر منسلک ہوگئی تو یہ خیر و برکت کا سبب ہے۔

نص قطعی، ہر عمر کے لوگوں کے لیے نکاح کو باعث خیر و برکت قرار دیتی ہے:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌO (النور:۳۲)

ترجمہ:۔ اور نکاح کردو اپنوں میں ان کا جو بے نکاح ہوں اور اپنے لائق بندوں اور کنیزوں کا اگر وہ فقیر ہوں تو اللہ انھیں غنی کردے گا اپنے فضل کے سبب اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ ''ایامیٰ'' سے مراد مرد اور عورت دونوں ہیں۔ یعنی جس مرد کی بیوی نہ ہو، اسے بھی ایم کہتے ہیں اور جس عورت کا شوہر نہ ہو، اسے بھی۔ اس آیت کریمہ میں ایم کے تحت ہر وہ شخص داخل ہے، جس کی سرے سے شادی ہوئی ہی نہیں، یا شادی کے بعد بیوی یا شوہر کسی کا انتقال ہوگیا ہو۔

علامہ محمود آلوسی علیہ الرحمہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اس آیت کریمہ میں نکاح کرنے والوں کے لیے تونگری کا وعدہ معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جو لوگ فقر و افلاس کو بہانہ بنا کر نکاح سے دور رہنا چاہتے ہیں، ان کے خیال کی بہانہ جوئی کی تغلیظ مقصود ہو۔ اس مقام پر خدائے تعالیٰ کی دو صفتوں ''واسع'' اور ''علیم'' کا ذکر ہوا ہے۔ جس سے یہ بتایا گیا ہے کہ رزق کی تنگی و فراخی نکاح کرنے اور نہ کرنے پر موقوف نہیں ہے، بلکہ خدائے تعالیٰ اپنے علم و حکمت کے تقاضہ سے جس کو چاہتا ہے، رزق کی کشائش فرما دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے، تنگی میں مبتلا کردیتا ہے۔

اسباب پر اعتماد رکھنے والی طبیعتوں میں یہ بات جاگزیں ہوتی ہے کہ اہل و عیال سے تنگی اور نہ ہونے سے فراخی ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بے بنیاد خیال کی غلطی واضح فرمادی۔ واقعات اس بات پر بطورِ خود شاہد ہیں کہ کبھی مال کی فراوانی اور اولاد کی کثرت دونوں باتیں جمع ہوجاتی ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کے پاس نہ مال ہوتا ہے نہ اولاد۔ اولاد کی کثرت کے ساتھ تنگی اور تنہائی سے خوش حالی کو

لازم وملزوم سمجھ لینا، محض غلط ہے۔ بلکہ خوش حالی و تنگ دستی دونوں اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے آتی ہیں۔ انسان کو جب اس پر یقین کامل ہوجائے گا تو نکاح کرنے سے نہیں ڈرے گا۔ (روح المعانی، ج۸/ص۱۴۸۔۱۴۹)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''اطیعوا اللہ فیما امرکم بہ من النکاح ینجز لکم ما وعدکم من الغنی''۔ (روح المعانی، ج۸/ص:۱۴۹)

ترجمہ:۔ اللہ کے حکم کی تعمیل کرو جو اس نے تمہیں نکاح کے بارے میں کیا، اس کے صلہ میں اپنا غنا (خوش حال بنانے) کا وعدہ پورا فرمائے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی فرمان ہے:

''ابتغوا الغنی فی النکاح''۔ (روح المعانی، ج:۸/ص:۱۴۹)

ترجمہ:۔ خوش حالی تلاش کرو نکاح سے۔

صرف شخصیت کی تکمیل اور معاشرہ کی بہبودی کے پیش نظر نہیں، بلکہ خدا کی سچی بندگی کے واسطے جس فراغ و سکون کی ضرورت ہے، اس کے حصول کے واسطے بھی ''نکاح'' کی بے پناہ اہمیت قرار پاتی ہے۔

قرآن وحدیث میں نکاح کی ترغیب اور رہبانیت وغیر فطری جنسی تعلقات سے اجتناب کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ بے شمار مظہر و مخفی مصلحتوں کی بنیاد پر ہیں۔

نکاح ہی صنف نسواں کے شہوانی مطالبات کے لیے بھی ذریعۂ تسکین ہے اور دل و نگاہ کو غلط اندیشوں سے محفوظ رکھنے کا سامان بھی۔

اسلام کا فطری طریقۂ زندگی وہی ہے، جس پر رسولِ خدا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عمل پیرا رہے۔ آپ نے اپنی مقدس حیاتِ طیبہ میں نکاح خود فرمایا اور اپنے امتیوں کو بھی نکاح کی ترغیب دی۔ حضور سب سے زیادہ خدا سے محبت کرنے والے، اس کی عبادت کماحقہ کرنے والے ہیں اور دنیا کی ساری بُرائیاں اور دنیاداری کی ساری قباحتیں آپ کے سامنے آشکارا ہیں، اس کے باوجود آپ نے رہبانیت سے اجتناب کرکے فطری طریقۂ زندگی کو اپنایا۔ اور فرمایا:

''اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی''۔

(بخاری و مسلم کتاب النکاح)

ترجمہ:۔ میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جس نے میری سنت سے روگردانی کی، وہ میرے طریقہ پر نہیں۔

خدا کی نشانی:

یوں تو زمین کی گولائی خدا کی بے شمار آیات اور مظاہر سے لبریز ہے، مگر زن و شوہر کے دل میں رب تعالیٰ کی جانب سے ایک مخصوص محبت ڈالی جاتی ہے، جو خاص اس کے کرم و فضل اور اس کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت طیبہ ہونے کے باعث ہے۔ صرف نفسانی جذبات کی تسکین ہی کو مرد و زن کے ملاپ کا سبب سمجھنے والے، محبت اور قربانی کے اس جذبہ کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے، جو ایک انسانِ صالح کو اس کی پاکیزہ بیوی سے اور ایک پاکیزہ خاتون کو اپنے دین دار شوہر سے ہوتی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ O

(الروم:۲۱)

ترجمہ:۔ اور اس کی نشانیوں سے ہے کہ تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے کہ ان سے آرام پاؤ اور تمہارے آپس میں محبت اور رحمت رکھی، بے شک ان میں نشانیاں ہیں غور وفکر کرنے والوں کے لیے۔

سکون واطمینان ازدواجی زندگی کا ایک نتیجہ ہے۔ کشاکش زندگی اور حوادثِ روزگار میں پریشان ہونے والوں کو ازدواجی گہوارہ سکون فراہم کرتا ہے۔ مرد اور عورت کے جوڑے کو پروردگار عالم نے جنسی وشہوانی خواہشات کی تکمیل جمیل اور معاشی ومعاشرتی ضرورتوں کے پورا ہونے کا ذریعہ بنایا ہے۔ قربان جائیے قرآن عظیم کی بلاغت پر ایک بے مثال تمثیل کے ذریعہ کس طرح زوجین کو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہونے کا فلسفہ بیان فرماتا ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (البقرة:۱۸۷)

ترجمہ:۔ وہ (بیویاں) تمہارے لباس ہیں اور تم ان کے لباس۔

جس طرح لباس ستر پوشی اور زینت کے لیے ہوتا ہے اور انسانی عزوجاہ میں اضافہ کرتا ہے۔ زوجین بھی ایک دوسرے کے واسطے پردہ پوش، ایک دوسرے کے لیے سامانِ زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل اور عزت ووقار کا ذریعہ ہیں۔

عورت اور مرد کسی خارجی محرک کے اثر سے متاثر ہوکر نہیں، بلکہ اپنے فطری جذب وانجذاب کے جذبہ کے تحت دو قالب ایک قلب ہوتے ہیں۔ یہی ایک رشتہ دنیا کے تمام رشتوں اور قرابت داریوں کی بنیاد ہے۔ اگر ان اسباب کو تحلیل کردیا جائے تو شیرازہ بندی کی تمام گرہیں، جو اس کے علاوہ ہیں، سب بالکل ڈھیلی اور پھسپھسی ہیں۔ ایک ہم پیشہ دوسرے ہم پیشہ سے، ایک دوست اور ہم سایہ اپنے دوست اور ہم سایہ سے ضرور تعلق رکھتا ہے، مگر اس قسم کا کوئی تعلق بجائے خود اتنا مستحکم نہیں ہے، جو اس کی حیثیت کے تبدیل ہونے پر اثر انداز ہوسکے۔ جب بھی ان میں کا کوئی ایک دوسرے سے دور ہونا چاہتا ہے، اپنے پڑوسی دوست یا ہم پیشہ کا کوئی خیال کیے بغیر دور ہوجاتا ہے اور اس کی محبت بھی دور ہوکر فراموش کردیتا ہے۔ مگر رشتہ ازدواج، اپنی اپنی الگ مصروفیات دائرۂ کار اور بعد مکانی کے باوجود اپنے اندر وہ کشش رکھتا ہے، جسے صرف موہبتِ ربانی ہی کہا جاسکتا ہے۔

فطرت کی خلاف ورزی سے بچو!:

رہبانیت کی زندگی گزار کر یا خلافِ فطرت نفس کش طریقے اپنا کر یا اباحت پسندی اور حیوانی طریقۂ التذاذ میں ڈوب کر کوئی بھی انسان حقیقی مقصد زندگی سے ہم کنار نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ فرمانِ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے:

''لا صرورة فی الاسلام''۔

(مسند احمد، ج:۱/ص:۳۱۲/ ومستدرک حاکم، ج:۲/ص:۱۵۹)

ترجمہ:۔ ترکِ نکاح اسلام میں نہیں۔

حضرت سمرہ بن الجندب کی روایت ہے:

''ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن التبتل''۔

(ترمذی کتاب النکاح باب النہی عن التبتل)

ترجمہ:۔ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شادی نہ کرنے اور دنیا سے کنارہ کش ہونے سے منع فرمایا۔

اصحابِ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے حضرت علی، عبداللہ بن عمر و عثمان ابن مظعون۔ (فتح الباری، ج۹ر ص۷۹) بیٹھے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عبادت و ریاضت کا تذکرہ کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کے سارے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمادیے ہیں، اس کے باوجود حضور اتنی عبادت فرماتے ہیں۔ پھر ہمیں تو اور زیادہ عبادت کرنی چاہیے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے عہد کیا کہ میں مسلسل روزہ رکھوں گا۔ دوسرے نے تمام رات جاگ کر ذکر و عبادت کا عہد کیا۔ اور تیسرے نے اپنی بیوی کے پاس کبھی نہ جانے کا عہد کیا۔ اتنے میں سرکار ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے۔ ارشاد فرمایا:

''میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں اور اس کی نافرمانی سے بچتا ہوں، اس کے باوجود میرا یہ حال ہے کہ کبھی روزہ رکھتا ہوں کبھی نہیں بھی رکھتا، رات میں نماز پڑھتا بھی ہوں سوتا بھی ہوں، میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں، پس جو میری سنت کو چھوڑے گا، وہ میرے طریقہ پر نہیں''۔

(بخاری، ج۲ر ص۷۵۷۔۷۵۸)

حضرت سعد فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون کو تبتل سے روک دیا۔ اگر آپ انھیں اجازت دے دیتے تو ہم لوگ بھی اپنے آپ کو خصی کر لیتے۔ (مسلم، کتاب النکاح)

حضرت سعد بن ہشام حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ تجرد کی زندگی کے بارے میں آپ کیا فرماتی ہیں؟ فرمایا: کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں سنا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً۔ (الرعد:۳۸)

ترجمہ:۔ بے شک ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور انھیں بیویاں اور اولاد عطا کی۔

(نسائی، کتاب النکاح، باب النہی عن التبتل)

انہی حضرت سعد بن ہشام کے بارے میں مروی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور جائیداد فروخت کر کے سب کچھ جہاد میں خرچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے قبیلہ والوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے فہمائش کی:

سعد!... تمہاری ہی طرح چھ آدمیوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ حضور نے انھیں ترکِ دنیا سے منع کیا اور فرمایا:

''الیس لکم فیّ اسوۃ حسنۃ''۔ (مسند احمد، ج:۶ر ص:۵۳)

ترجمہ:۔ کیا تمہارے لیے میری زندگی اچھا اسوہ نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ابوالزوائد نامی ایک شخص تھا، جو تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے کہا: تمہارے نکاح نہ کرنے کی وجہ یا تو رجولیت کا فقدان ہے یا تم مبتلائے معصیت ہو گئے ہو۔

حضرت طاؤس تابعی نے ایک ایسے ہی شخص کو جو نکاح نہیں کر رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: تم نکاح کرلو ورنہ میں بھی تمہارے بارے میں وہی کہوں گا جو حضرت عمر نے ابوالزوائد کے بارے میں فرمایا تھا۔ (المحلی لابن حزم، ج۹/ص۴۴۰)

ایک ہی معیار:

سید عرب وعجم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دین مستقیم جن اخروی نتائج کے یقین پر قائم ہے، اس میں مرد اور عورت دونوں کو اپنی اپنی ایمانی اور عملی خوبیوں کا پیکر ہونا چاہیے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَO (النحل:۹۷)

ترجمہ:۔ جو اچھا کام کرے مرد ہو یا عورت اور ہو مسلمان، تو ضرور ہم اسے اچھی زندگی عطا کریں گے اور ضرور انھیں ان کے کام کا بدلہ دیں گے جو ان کے سب سے بہتر کام کے لائق ہوں۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصَّآئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًاO (الاحزاب:۳۵)

ترجمہ:۔ بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے اور ایمان والیاں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور جبر والے مرد اور جبر والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزے دار مرد اور روزے دار عورتیں اور اپنی پارسائی کی حفاظت کرنے والے مرد اور اور پارسائی کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ نے بخشش اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

گویا اسلام صلاح و پرہیزگاری، دین داری اور تقویٰ صرف مردوں یا صرف عورتوں کے لیے خاص نہیں کیا، بلکہ عبادت وبندگی، اطاعت وسرافگندگی، صدق وخشوع، صبر ونیاز مندی، عفت و پاک بازی دونوں صنفوں کے لیے برابر لازم قرار دیا ہے۔ اور روزِ حساب، جنس کی بنیاد پر کسی کو اجر وزجر نہیں ملے گا، بلکہ مردوں کو ان کے اچھے بُرے کا بدلہ اور عورتوں کو ان کے حسنات وسیئات کی جزا ملے گی۔

جنسی تسکین عبادت کس طرح ہے؟:

جذبۂ شہوت کو نکاح کے صالح قانون نے فطرتِ انسانی کے عین مطابق ترتیب دے کر بے شمار انسانی الجھنوں کو سمیٹ دیا ہے۔ اس میں دین داری بھی ہے، شریعت پر عمل بھی ہے اور دنیاوی مصالح کی رعایت بھی۔ نکاح کی شرعی اہمیت کو مشہور شارح فقہ حنفی امام اکمل الدین بابرتی یوں واضح فرماتے ہیں:

''احکامِ شرع میں سے کسی بھی حکم کی پشت پر اتنے سب محرکات نہیں پائے جاتے، جتنے نکاح کے پیچھے شریعت، فطرت اور عقل کے محرکات عمل پیرا ہیں''۔

(حاشیہ فتح القدیر، ج۲/ص۳۳۹)

نکاح کے سوا اور تمام غیر فطری طریقوں سے دنیا کو بچا کر تباہی سے باز رکھنے کے لیے رسولِ غیب داں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شدومد سے احکام نافذ فرمائے ہیں اور ترغیبات دی ہیں۔ ارشادِ گرامی ہے:

''وفی بضع احدکم صدقة''۔

ترجمہ:۔ بیوی سے ہم بستری کرنا بھی صدقہ ہے۔ (مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب ان اسم الصدقہ یقع علی کل نوع من المعروف)

حضرت امام ابن الہمام علیہ الرحمہ نے تو قرآن و حدیث کے دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ:

''ازدواجی زندگی میں مشغول رہنا، اس سے کنارہ کش ہو کر محض عبادت میں لگے رہنے سے افضل ہے''۔ (فتح القدیر، ج۲/ص۳۴۰)

مفسرین قرآن آیت کریمہ:

فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ الخ۔ (بقرۃ:۱۸۷)

ترجمہ:۔ تو ان سے صحبت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھا ہے۔

کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ سے حلال عورتوں سے ان کے حلال مقام اور حلال حالت میں جماع کر کے طمانیت اور سکون حاصل کرنا، بیان کیا گیا ہے۔ جس کو سورۂ اعراف میں ''لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا'' اور سورۂ روم میں ''لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا'' سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ''وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ'' سے اولاد مراد ہے۔ لہٰذا آیت کریمہ سے نیک اولاد کے حصول کے واسطے صحبت کرنا بھی ثواب ثابت ہوا۔

طلب اولاد کے لیے رب تعالیٰ سے دعا کرنا سنت انبیا و صالحین ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اور زکریا علیہ السلام نے فرزند صالح کی دعائیں مانگی ہیں۔ حضرت مریم کی والدہ حنہ نے بھی نیک بچے کی دعا مانگی ہے۔

ہم جنسی کی مذمت:

قوتِ شہوت کے غلط استعمال میں ایک نہایت رذیل اور گھناؤنا طریقہ لواطت بھی ہے۔ مرد کا اپنے ہی ہم جنس سے شہوت کا یہ طریقہ جس قدر غیر طبعی ہے، اسی قدر گندہ بھی ہے۔ کسی بھی سلیم الفطرت انسان کا اس کی طرف راغب ہونا تو درکنار صرف تصور ہی اس سے شدید کراہت پیدا کر دیتا ہے کہ جو مقام صرف اخراجِ فضلات کے لیے ہو، اس کو محل شہوت سمجھ لینا اور آلۂ سرور و نشاط بنانا، حد درجہ غلاظت پسندی ہے۔ مگر کیا کیجیے گا کہ متمدن کہے جانے والے ممالک یورپ اور امریکہ میں آج کل یہ ایک فیشن اور تحریک کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یہ در اصل شاخسانہ ہے، اس عیاش پسند معاشرہ کا، جس کی مقصدیت شہوتِ فرج اور شکم تک ہی محدود ہے۔ جن کا سارا نظامِ زندگی انھیں محوروں پر گردش کر رہا ہے۔ اس شیطانی حرکت کو یونانی دورِ عروج میں بھی بہت ترقی ہوئی تھی۔

لواطت کا عمل سب سے پہلے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں شروع ہوا۔ گویا وہی اس فعل شنیع کی موجد ہے۔ اس پر عمل در آمد کرنے والوں کو قومِ لوط کے ہول ناک انجام سے آگاہ ہونا چاہیے۔

قومِ لوط کا انجام:

حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے حقیقی بھتیجے تھے۔ توریت میں ان کا تذکرہ نہایت تفصیل سے ہے۔ البتہ توریت میں تحریف کرنے والوں نے آپ کے ساتھ بہت سی ناروا باتیں بھی منسوب کردی ہیں۔ دیکھئے (توریت، کتاب پیدائش، باب ۱۱ر تا ۱۹)

آپ کو جس قوم میں مبعوث کیا گیا، وہ قوم شام کے جنوبی حصہ میں دریائے یرون کی وادی میں آباد تھی۔ یہ علاقہ بڑا ہی خوش گوار اور پُرفضا اور سرسبز و شاداب تھا۔ توریت میں ہے:

''یرون کی ساری ترائی خداوند کے باغ اور مصر کے ملک کی طرح خوب سیراب تھی''۔ (پیدائش ۱۳۔۱۰)

ان کا نام سدوم و عمودہ تھا۔ یہ لوگ حضرت لوط علیہ السلام کی تبلیغ سے کوئی اثر قبول کرنے کے بجائے الٹی چال چلتے تھے اور طرح طرح کی سرکشی میں مبتلا تھے۔ ان کے غیر فطری اور غیر انسانی اعمال و کردار میں سے ایک اہم گناہ فعل اغلام بازی بھی تھا۔ جس پر حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو فہمائش کی، مگر وہ اتنے منہ زور تھے کہ کہنے لگے: ''بڑے پاک صفا بنتے ہیں''۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝ (الاعراف:۸۲)

ترجمہ:۔ اور لوط کو بھیجا، جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا وہ بے حیائی کرتے ہو جو تم سے پہلے جہان میں کسی نے نہ کی، تو تم مردوں کے پاس شہوت سے جاتے ہو عورتیں چھوڑ کر۔ بلکہ تم لوگ حد سے گزر گئے اور ان کی قوم سے کوئی جواب نہ بن پڑا مگر لگے (آپس میں) کہنے کہ ان کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ لوگ پاک صاف بنتے ہیں۔

جب ان کی یہ سرکشی حد سے زیادہ ہوگئی تو رب تعالیٰ نے دو فرشتوں کو حضرت لوط علیہ السلام کے گھر بھیجا، وہ نہایت خوبرو نوجوان کی شکل میں آئے تو قوم نے حضرت لوط علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اپنے ان مہمانوں کو ہمارے حوالے کرو، آپ پر اس وقت تک ان مہمانوں کا فرشتہ ہونا ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ آپ بہت متردد ہوئے، قوم کو مظلوم عورتوں کے حقوق پامال کرکے مردوں کی طرف متوجہ ہونیسے باز رہنے کی تلقین کرنے لگے۔ بالآخر فرشتوں نے خدائی حکم بیان کیا کہ ہم لوگ ملائکہ ہیں اور اس سرکش قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ رب تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے اصحاب کو بچا لیا اور پوری آبادی پر ایسی سنگ باری ہوئی کہ سب تہس نہس ہوگئے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ، وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ۔ (الاعراف:۸۴)

ترجمہ:۔ تو ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو نجات دی، مگر اس کی عورت رہ جانے والوں میں ہوئی اور ہم نے ان پر ایک مینہہ برسایا تو دیکھو کیسا انجام ہوا مجرموں کا۔

ایک قول یہ ہے کہ آبادی میں جتنے لوگ تھے، ان پر تو زمین کو الٹ دیا گیا۔ اور جو سفر میں تھے، ان پر ایسے پتھر برسے جو گندھک اور آگ سے مرکب تھے۔ علاقہ سدوم کی تباہی کا زمانہ ماہرین آثارِ قدیمہ کے اندازہ کے مطابق تخمیناً ۲۰۶۱ ق م ہے۔ تفاسیر کے مطابق یہ کئی بستیاں تھیں، جن کی آبادی کا اندازہ چار لاکھ کے قریب ہے۔

رہبانیت کے شگوفے:

عیسائیت کے اندر انسانی فطرت کو کچل کر راہبانہ زندگی گزارنے کا جو قانون کلیسا کی چہار دیواریوں سے برآمد ہوا تھا، اس نے عام دنیا پر کیا اثرات مرتب کیے۔ اس کی ناکامی اور تغلیط کے لیے یہی کیا کم ہے کہ آج کی مسیحیت خود بحیثیت مجموعی اس سے دست بردار ہے۔ ہم تاریخی شواہد میں سے چند ایک ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

تاریخ اخلاق یورپ کا مصنف اس زمانۂ رہبانیت کے بارے میں لکھتا ہے:

''دنیا کی تاریخ اخلاق میں شاید اس وبائے رہبانیت سے زیادہ پُر درد و پُر اثر کوئی داستان نہیں۔ غضب ہے کہ جو قومیں افلاطون و سسرو کے مے خانہ سے سرمست تھیں اور جن کی نگاہ میں سقراط وکیٹو کی محترم سیرتیں موجود تھیں، اب ان کا مطمحِ نظر، ان کا نصب العین ایک ایسا حقیر و عاجز مراقی وجود رہ گیا تھا، جو جہالت کا پتلا، وطن کی محبت سے خالی، اخلاقی خوبیوں سے ناآشنا اور بے بہرہ ہے۔ دو چار سال نہیں، مکمل دو سو سال تک جسم کشی منتہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی''۔

(تاریخ اخلاق یورپ، ج ۲/ص ۴۳/ و ۵۷)

عیش پرستی اور بے ضمیری کا فروغ ملاحظہ فرمائیں۔ یہی مصنف دوسرے مقام پر لکھتا ہے:

''رومن قوم اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے درمیان ہچکولے کھا رہی تھی، بلکہ بعض شہروں میں جہاں راہبین پیدا ہوئے تھے، وہیں عیش پرستی اور بدچلنی کی زیادہ گرم بازاری تھی۔ رائے جمہور میں اس درجہ کمزوری آگئی تھی کہ لوگوں سے رسوائی اور بدنامی کا خوف زائل ہوگیا تھا۔ البتہ ''ضمیر'' کو مذہب کا کھٹکا ہوتا تھا، لیکن مذہب ہی نے اس کی خلش کو دور کردیا تھا کہ دعائوں وغیرہ کے ذریعہ سارے گناہ معاف ہوسکتے ہیں''۔ (تاریخ اخلاق یورپ، ج ۴/ص ۱۰۴)

رہبانیت کے سربراہوں کے احوال بھی مذکورہ کتاب میں یوں مذکور ہیں:

''پاپائے اعظم جان بست و دوم (۲۲) خود اپنی ماں بہن کے ساتھ زنا کاری کے مرتکب ہوئے۔ کنٹربری کے اسقف اےااء میں صرف ایک موضع میں ۱۷/ ناجائز بچوں کے باپ ثابت ہوئے۔ اسپین کے ایک اسقف ۱۹۳۰ء میں ۷۰/ کنیزیں رکھے ہوئے تھے۔ ۱۲۷۴ء میں ہنری سوم سیسٹر کے پادری کی ساٹھ ناجائز اولادیں تھیں۔ مسیحی خانقاہیں اب خانقاہیں نہیں رہی تھیں، بلکہ حرام کاری کے اڈے اور ناجائز بچوں کے قبرستان تھے''۔

یہ ہے نتیجہ اس فطری قوت کی بندش کا، جو بقائے نسل انسانی کے لیے ذریعہ بنائی گئی تھی۔

اباحت پسندی کا وبال:

تہذیب و تمدن کے نام نہاد معماروں نے رہبانیت کے بالکل برعکس ایک ایسا طریقۂ حصولِ لذت تلاش کیا، جو جنسی راستے کی تمام رکاوٹوں کو کاٹ چھانٹ کر دور کردے۔ محرمات، یعنی ماں، بہن، بیٹیوں تک کو اس نظریہ نے مباح کرلیا (معاذ اللہ) اباحت پسندی کے رجحان کو فروغ دینے والوں کی دلیل یہ ہے کہ جب انسان پیدائیشی طور پر آزاد بنایا گیا ہے تو جنسی تسکین کے لیے اس پر کیوں پابندیاں عائد ہوں؟ گویا یہ جنسی آوارگی بھی تقاضائے فطرت ہے۔

بعض لیڈروں نے تو اسے سماجی اور تمدنی ضرورت بتایا ہے۔ اور بیوائوں کو "سوشل ورکر" کا خطاب عطا فرمادیا ہے۔ گویا اس نظریہ نے عیاشی اور لذت کوشی کے جتنے ممکنہ راستے تھے، سب کو جزو تہذیب بنادیا ہے۔ عیاشی، ہوس رانی، زناکاری، عصمت فروشی کی اس طرح ہمت افزائی کی ہے کہ متمدن کہا جانے والا دنیا کا ہر ملک آج اس کی آنچ سے تپ رہا ہے۔

لیکن کیا؟...... دورِ قدیم میں جب کبھی اس نظریہ کو ترقی ہوئی، اس وقت یا آج جن آبادیوں میں اس کی کار فرمائی ہے، وہاں کے معزز شہری امن و سکون سے ہیں؟۔ انھیں اطمینانِ قلب اور دل کا چین میسر ہے؟

جواب...... نفی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

رہبانیت، شہوت پرستی اور اباحت پسندی یہ سب کے سب قانونِ فطرت کو توڑنے والے ہیں۔ اس لیے ان میں سے کسی کو اپنا کر انسانیت، کمالِ انسانیت کا حصول ہرگز نہیں کرسکتی۔ لہٰذا قدرت کے اس عظیم سرچشمۂ قوت کو برباد ہونے سے محفوظ صرف اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ اسے خود قدرت کے عائد کردہ اصولوں کی روشنی میں نکاح کے ذریعہ برتا جائے۔ جو بجائے خود اسلام کے دین فطرت ہونے کا بیّن ثبوت اور کھلی نشانی ہے۔

مذہب! کامیاب زندگی کا جوہری عنصر

موجودہ دور میں جب کہ سائنس اپنی نئی نئی ایجادات کے ذریعہ دنیا کے ذہن پر غلبہ حاصل کر رہی ہے۔ عام رجحان پیدا ہو رہا ہے کہ اب مذہب کی ضرورت سے دنیا سبک دوش ہوگئی، بلکہ ذرا اور مبالغہ کے ساتھ یوں بھی کہا جانے لگا کہ ”سائنس کی ترقی سے مذاہب کا جنازہ نکل جائے گا“۔ یہ فاسد ذہن دراصل مذہب کی معنویت اور حقیقت سے بے بہرہ ہے۔

مذہب اسلام کا ادنیٰ خادم ہونے کی حیثیت سے میں بلا جھجک کہہ سکتا ہوں کہ مذہب حق ایسا شجر رحمت ہے، جس کی جڑیں خالق کائنات کے قدرتی چشمہ سے سیراب ہوتی ہیں۔ اور اس کی شاخیں انسانی زندگی کے ہر شعبے میں فطری طور پر رچی بسی ہیں۔ اس لیے مذہب سے بیزاری کا دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ انسان اپنے شجر حیات کی اسی ڈال پر کلہاڑی مارے، خود جس پر وہ بیٹھا ہوا ہے۔

یورپ کے مشہور ماہر نفسیات فرانڈے نے مذہب کی اشاعتوں کا تمسخر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”انسانی زندگی تین واضح ادوار سے گزرتی ہے: دورِ وحشت، دورِ مذہب اور دورِ سائنس۔ اب سائنس کا دور ہے، لہٰذا مذہب کی اب کوئی وقعت اور معنویت نہ رہی۔ وہ فرسودہ اور بے قدر و قیمت شئے کے مانند ہوگیا“۔

مگر اس چودھویں صدی کے آخری دور میں سائنس زدہ ماحول سے مذہب کی کونپلوں کا نمو اور مادہ پرستی کی زمین سے خدا پرستی کے چشموں کا پھوٹ نکلنا، وہ بھی صرف کسی مخصوص خطہ میں نہیں، بلکہ زمین کی پوری گولائی پر جو مذہب اور لادینیت کی شدید آویزشیں آج رونما ہو رہی ہیں اور خدا بیزار اصولوں، ظالم شکنجوں میں دبی پھنسی ہوئی انسانیت، مذہب کے نام پر انقلاب کا نعرہ لگا رہی ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے؟

اس بے داری سے میری مراد، اسلامی بے داری ہے۔ بات اگر صرف عرب ریاستوں کی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ مسلمانوں کا صدیوں سے دبا ہوا ولولۂ ایمانی، علمائے اسلام کی جاں فشانیوں کے نتیجہ میں پھر دین حقیقی کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ مگر ایشیا اور افریقہ کے علاوہ یورپ کی دنیا اور ممالک متحدہ امریکہ اور دہریت کے سب سے بڑے مسکن روس میں قلب و نظر کی بے چینی، کسی اضطراب کے ساتھ اپنی روحانی تشفی کے لیے اسلام کے چشمۂ صافی کے قریب آ رہی ہے۔ یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں۔

لادینیت اور اس کا انجام:

علم و تحقیق کی روشنی میں دنیا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہی ہے کہ لامذہبیت کا خطرناک عفریت جو انسانی دل و نگاہ پر مسلط تھا، کمزور پڑ رہا ہے۔ مادیت کی یہ لعنتیں اظہر من الشمس ہو رہی ہیں کہ اس لعنت میں گرفتار ہونے والا انسان مفاد پرستی اور شخصی فائدہ کا اتنا متوالا ہو جاتا ہے کہ حصولِ مفاد میں کسی کی حق تلفی کا بھی مطلقاً خیال نہیں کرتا، بلکہ اپنے بھائی کی گردن کاٹنے کے لیے مستقل بر سر پیکار رہتا ہے۔ اس کے سر پر حرص و طمع اور نفسانی خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ اسے صرف اپنی ذاتی غرض، اپنا فائدہ اور اپنا ہی عیش و آرام یاد رہتا ہے۔ یہاں تک کہ

اس کا یہ نشہ اس کی زندگی کو اپنے ساتھ لے ڈوبتا ہے۔ مادہ پرست انسان چوں کہ خود کو کسی مافوق ہستی کے تابع نہیں سمجھتا، اس لیے وہ اپنی خواہشات ہی کا تابعدار ہوجاتا ہے۔ اور بشری خواہشات جو مذموم فضا میں پروان چڑھ کر انسان نما شیطان کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ اسے قدم بہ قدم تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتی ہیں۔ انسانی فلاح و بہبودی کے بڑے بڑے منصوبے بنائے جاتے ہیں، مگر ان میں بھی چوں کہ کسی مافوق ہستی (جو دانا وبینا اور ڈھکے چھپے اور ظاہر بات کا پورا علم رکھتی ہے) پر اعتماد نہیں ہے اور دل و احساس پر محاسبہ نہیں ہے۔ اس لیے شخصی اور قومی ہر ایک کام میں ایک مستقل آویزش کی کیفیت رہتی ہے، جو نتیجہ ہے اس چھپے ہوئے چور کی مفسدانہ مساعی کا جو پورے نظام پر محتوی ہے۔

مذہبی قوتِ عمل:

اس کے برعکس مذہب صرف ظاہر کو نہیں متاثر کرتا، بلکہ دلوں میں سچائی اور احساسِ ذمہ داری پیدا کرتا ہے۔ بُرائیوں کے استحصال کے لیے مردانہ وار ڈٹ کر سامنے آنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ مذہب کی سب سے نمایاں انفرادیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر کام کی دو جہتیں پیش کرتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر تم نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بحُسن وخوبی ادا کیا اور اپنی صلاحیت اور قویٰ کو استحکامِ انسانیت وقیامِ امن و سلامتی میں صرف کیا تو اس سے تمہاری دنیا بھی سدھر جائے گی۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہارا خالق ومالک تم سے خوش ہوجائے گا، تمہیں اس کی رضا حاصل ہوجائے گی۔ مذہب دوسری جہت یہ پیش کرتا ہے کہ اگر تم نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی اور عائد شدہ ذمہ داریاں پوری نہ کیں تو نہ صرف یہ کہ تم کام چور کہلاؤ گے۔ اگر دنیا میں تمہاری خیانت کسی طرح پوشیدہ بھی رہ گئی تو یہ یقین رکھو کہ تمہارے دل کے کھوٹ اور نیت کی بُرائی کو تمہارا پروردگار ملاحظہ فرمارہا ہے، جس سے عالم وعالمیاں کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔

یہی عقیدہ مسلمان کو جبر و استبداد کے سامنے سد سکندری بن جانے کی ہمت عطا کرتا ہے اور اسی کے بل بوتے پر ظلم وتشدد کے مہیب، دیو پیکروں کے مدمقابل وہ نحیف ونزار ہونے کے باوجود پیکر استقلال بن جاتا ہے۔

مذہب کی یہی تقویت بازوؤں کو فولاد کی سختی اور شبنم کی نرمی عطا کرتی ہے۔ اور مسلمان جابروں اور قاہروں کے سامنے شیر ببر بن جاتا ہے۔ اور مظلوم، زیردستوں، غریبوں، یتیموں، بیوائوں اور مفلسوں کے لیے فرشِ راہ بن جاتا ہے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو تلوار ہے مومن

عقیدہ آخرت:

مذہب زندگی کی معنویت کا دوسرا نام ہے۔ اس کے بغیر انسان، انسانیت کا صحیح مزاج شناس نہیں بن سکتا۔ اور لطف حیات سے لذت اندوز نہیں ہوسکتا۔ خوب و زشت، نرم وگرم، امارت وفلاکت، آسائش و تنگی تو انسانی زندگی کے لازمی مراحل ہیں۔ مگر انسان ان ناہموار راہوں سے جب اپنے خالق ومالک کی خوشی وناخوشی کا احساس لے کر گزرتا ہے تو اس کے ایک ایک قدم میں بلا کا توازن ہوتا ہے۔ مذہب کی بنیادی عقائد میں سے، عقیدہ آخرت بھی ہے۔ یعنی اس بات کا اعتماد ویقین کہ زمین کی سطح پر رہ کر ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں، جسم سے روح کا

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد ایسا نہیں کہ یہ سب ''کعصف ماکول'' ہوجائے گا۔ بلکہ عالم آخرت میں دنیا کے کیے ہوئے ہر چھوٹے بڑے، اچھے بُرے عمل کا بدلہ ملے گا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗO وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗO (الزلزال:۸،۷)

ترجمہ:۔ تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے اس کو دیکھے گا۔

عالم بے کراں:

اس عقیدہ کے ساتھ ہی انسانی زندگی کو نئی وسعتیں نصیب ہوتی ہیں اور پھر وہ اس محدود زندگی کے لیے ہی سب کچھ نہیں کرتا، بلکہ اب یہ مختصر زندگانی کا میدان اس کے لیے دارالعمل ہے۔ یہ ایک کھیت ہے، جس میں گرایا ہوا ایک عمدہ بیج کل شجر رحمت بن جائے گا۔ اور آج بویا ہوا ایک بُرا بیج کل کانٹے دار جھاڑیوں کی شکل میں نمودار ہوگا۔ انسان عقیدۂ آخرت کے ساتھ اپنی یقینی وابستگی رکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی مختصر نہیں ہے، انسانی زندگی بہت بسیط ہے۔ البتہ اس کے مختلف مراحل ہیں۔ کچھ امتحان و آزمائش کی دنیا اور کچھ نتیجہ و انعام یابی کا عالم۔ آدمی احساس اور شعور سے کہیں بھی خالی نہیں ہوتا۔ آرام و عیش کی لذت یابی ہو یا تکلیف و عذاب کی اذیت، یہ دونوں عالم میں موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جس نے اس عالم میں رہ کر ایک سچے معبود کی عبادت کی، اس کے احکام و فرامین پر عمل کر کے اس کے بندوں اور مخلوق کو آرام پہنچا کر خدا کو راضی کرلیا، اسے اُس عالم میں آرام ہی آرام ہے۔ وہ غم سے آشنا نہیں ہوگا۔

اور جس نے اپنے مالک سے سرکشی اور بغاوت کی، اس کے احکام و فرامین کو ٹھکرایا، انبیا و رسل کی باتوں کو نہیں مانا، خدا کی بھیجی ہوئی کتابوں کا انکار کیا، یومِ آخرت کا منکر رہا اور نفس کی خواہش پر زندگی کے سفینہ کو چھوڑ دیا، ہوا و ہوس میں مست رہا، حقوقِ انسانی کو پامال کیا، مخلوقِ خدا کو اذیتیں دیں۔ وہ اس آخرت کے عالم میں خوشی کو ترس جائے گا۔ غم وافسوس میں اس کا اوڑھنا بچھونا ہوگا۔

ھباءً منثوراً:

عقیدۂ آخرت کا منکر اپنی زندگی کا دشمن ہے۔ اس نے اسی مختصر سی عمر کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہے کہ تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ لذتیں سمیٹ لے۔ اس منزل پر آدمی صرف اپنی خواہشات کا غلام رہ جاتا ہے۔ اسے فکر و غم سے نفرت، دکھ درد کی داستانوں سے الجھن اور پریشانیوں کے تذکرے سے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ پھر اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بے فکری کی زندگی ہو، عیش دنیا اور آرام و آسائش کے سارے وسائل ہوں اور ہماری عیش کوشیوں میں کوئی دخیل بھی نہ ہو، ورنہ کچھ لمحات ضائع ہوجائیں گے۔ دنیا اور وسائل دنیا کو صرف ایک خوانِ یغما سمجھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ کس طرح تھوڑے ہی وقت میں زیادہ خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹ لوں۔ مگر ناثبات دنیا کی فانی لذتیں بہت جلد اسے داغِ مفارقت دے جاتی ہیں اور وہ ہاتھ ملتا ہوا زبانِ حال سے یہ کہتا رخصت ہوجاتا ہے: ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

یومِ آخرت پر ایمان و عقیدہ رکھنے والا انسان، کسی چھوٹے سے شخصی یا قومی جرم کو بھی بہت عظیم گناہ تصور کرتا ہے۔ نان و نوش کی ہما ہمی ہی اس کے لیے سب کچھ نہیں۔ ہاتھ میں اٹھایا ہوا لقمہ اس احساس سے لبریز ہوتا ہے کہ کہیں یہ کسی کی حق تلفی کر کے، کسی پر ظلم کر کے، کسی کا

دل دکھا کے تو نہیں حاصل کیا گیا۔ ؟

اپنی خوش پوشی اور لباسوں کی چمک دمک کسی کو ننگا کر کے، کسی کو بے ستر کر کے، یا کسی کا حق مار کر تو نہیں حاصل کی جا رہی ہے ؟
وہ آرام کے بستر پر سوتا ہے تو غم و آلام کے ستائے ہوئے، دکھ درد کے مارے ہوئے انسانوں کو فراموش نہیں کرتا۔ وہ عالی شان محلوں اور فلک نما بلڈنگوں میں رہائش اختیار کرتا ہے تو خس پوش جھونپڑوں اور سفامہ بردوش خستہ مکانوں کے حقوق کو یاد رکھتا ہے۔ بلکہ تخت و حکومت کا اقتدار اور عظمت و بلندی کی عظیم مسند میں بھی اسے متکبر و مغرور بنانے کے بجائے پیکر عجز و مجسمۂ انکسار بنا کر مالک و مولا کے آگے جھکا دیتی ہیں۔

الغرض! عقیدۂ آخرت، انسانی زندگی میں ایک عظیم صالح انقلاب کا سر چشمہ ہے۔ جس سے راست روی، امن و مساوات، صالحیت اور حق نیوشی کی صفتیں پروان چڑھتی ہیں۔ اور اس سے انکار کی صورت میں انسانی معاشرہ دنایت، خود غرض، لذت کوشی، ذخیرہ اندوزی اور قومی سطح پر دون ہمتی، کم نگاہی، خانہ جنگی، اور منافرت کی قبیح صفتیں پیدا کرتا ہے۔

پاکیزہ نصب العین:

مذہب، انسان کو دوسروں کی ہمدردی اور محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی خود غرض اور پُر نفع وفائدہ کا دائرہ صرف اپنے تک محدود نہ رکھا جائے، بلکہ اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی خدمت کا پاکیزہ نصب العین مذہب کی بنیادی تعلیم ہے۔ اور اسی تعلیم کی جزا کا یقین شدائد وآلام سے ٹکرانا سکھلاتا ہے۔

"اس وقت تک ایمان کامل نہیں ہوتا جب تک ہم دوسروں کے لیے انھیں چیزوں کو پسند نہ کریں، جو ہمیں پسندیدہ ہیں"۔

مذہب بیزار دنیا میں آج کھلے بندوں یہ نظارا دیکھا جاسکتا ہے کہ مائیں اپنی اولاد کی پرورش کو بارِ دوش سمجھ رہی ہیں۔ اور یہ بات کہنے کی نہیں کہ اس کے پیچھے لذت کوشی اور عیش طلبی کا وہی ناپاک جذبہ کار فرما ہے، جس نے شہوانی خواہشات ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ اس طبقہ کا گمان یہ ہے کہ اولاد ہوگی تو ہمیں اس کی نگہداشت اور پرورش پر محنت کرنی ہوگی۔ اور اولاد ہماری من مانی تفریحات میں حائل ہوگی۔ گویا اولاد ایک کانٹا ہے، جس کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی فکر میں سیکڑوں نہیں ہزاروں ادویات اور ذلیل ترین طریقۂ برأت استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب کہ دنیاوی رشتوں میں ماں کی مامتا سب سے قوی محبت رکھتی ہے اور ساری محبتیں اس کے آگے ہیچ ہیں۔ مگر بُرا ہو اس مادّہ پرست، خدا دشمن معاشرہ اور ماحول کا، جس نے قیامِ دنیا کے خدائی مشن کی راہ میں روڑے ڈالے۔ صحیح ہے کہ اگر انسان مذہب کے بخشے ہوئے عقائد توحید، رسالت، آخرت، حیات بعد الممات وغیرہم سے محروم ہوجائے تو پھر وہ اپنی ذات ہی کو دیکھے گا اور اس کی ساری مساعی اپنی ذات ہی تک محدود ہوں گی۔ وہ خود غرضی اور موقع پرستی کا مجموعہ بن جائے گا۔

عقیدۂ آخرت سے بہرہ ور انسانوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ خود بھوکے رہ کر دوسروں کو آسودہ کرتے ہیں۔ خود خستہ حالی میں رہنے کے باوجود، دوسروں کی ستر پوشی کرتے ہیں۔ انسانیت کی خدمت گزاری کے لیے خود مشقتیں برداشت کرنے ہی میں انھیں راحت نصیب ہوتی ہے۔

روشن مثال:

تاریخ اسلام میں مہاجرین صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی انصارِ مدینہ کے ساتھ مواخات، اس کی بڑی تاباں مثال ہے۔ مکہ مکرمہ سے اپنا گھربار، مال ومنال چھوڑ کر جو لوگ مدینہ طیبہ آئے تھے۔ اہل مدینہ نے انھیں اپنا بھائی بنالیا۔ اور وہ اپنے اپنے گھروں میں ان کو رکھتے تھے اور اپنا نصف مال ان کے تصرف میں دے دیتے تھے، باوجودیکہ ان کے حالات بھی بہت اچھے نہیں تھے۔

بخاری کتاب المناقب باب اخبار النہی میں ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایک بھوکا شخص آیا۔ آپ نے ازواجِ مطہرات کے حجروں میں پوچھا، مگر اس وقت کسی کے پاس کھانے کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اصحابِ کرام سے فرمایا: جو شخص اس کو مہمان بنائے، خدا اس پر رحم وکرم فرمائے گا۔ حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور اسے لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ گھر پہنچ کر مہمان کو عزت سے بٹھایا۔ زنان خانہ میں پہنچ کر بی بی سے دریافت کیا: کچھ کھانا ہے؟ انھوں نے کہا: صرف دونوں بچوں کے واسطے تھوڑا سا کھانا رکھا ہوا ہے، اس کے سوا تو کچھ نہیں۔

حضرت ابوطلحہ نے فرمایا: بچوں کو بہلا کر سُلا دو اور مہمانِ رسول کے لیے بچوں کا حصہ کھانا لائو۔ جب مہمان کھانا کھانے لگے اور ان کے ساتھ ہی حضرت ابوطلحہ بھی دسترخوان پر شریک ہوگئے تو ان کی اہلیہ نے چراغ کی بتی درست کرنے کے بہانے چراغ ہی گل کردیا۔ کھانا شروع ہی ہوچکا تھا، مہمان نے پورا کھانا کھایا اور حضرت ابوطلحہ صرف خالی ہاتھ منہ تک اٹھاتے رہے، تاکہ مہمان شکم سیر ہولے اور کھانا کم ہونے کی وجہ سے تکلف کا شکار نہ ہو۔ حضرت ابوطلحہ اور ان کے بیوی بچوں نے بھوکے رات گزار کر مہمان کی خاطر کی۔ صبح کے وقت جب رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور پہنچے تو حضور نے فرمایا: رات ابوطلحہ اور میرے مہمان کے ساتھ یہ واقعہ گزرا۔ اللہ تعالیٰ ابوطلحہ سے بہت راضی ہے۔ اور یہ آیت کریمہ نازل فرمائی ہے:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (الحشر:۹)

ترجمہ:۔ اور اپنی جانوں پر ان کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں شدید محتاجی ہو، اور جو اپنے نفس کے لالچ سے بچایا گیا تو وہی کامیاب ہیں۔

اسی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے اور انسانوں میں جذبۂ ایثار وقربانی ہویدا کرنے کے واسطے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دنیا کو پیغام دیا:

”تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا“۔

(ترمذی، ج۲/ص۱۴)

یقین محکم:

دنیا کا ہر تعلیم یافتہ انسان ایسے کچھ لوگوں کو ضرور جانتا ہوگا، جنھوں نے اپنی زندگی سچائی کو فروغ دینے میں گزاری اور بہتوں نے اپنی دنیاوی عزت، حکومت، سلطنت تک کو گنوادیا۔ یہاں تک کہ اسی کے لیے اپنی جان بھی دے دی۔ تو اگر موجودہ نظریہ سے اندازہ کیجیے تو ان لوگوں نے کوئی فائدہ بخش کام نہیں کیا اور نہ ہی اپنی کوشش کا وہ کوئی ثمرہ پا سکے۔ مگر آپ اگر ان لوگوں کے جوشِ عمل اور پختگی کردار کی تاریخ کو غور سے دیکھئے تو ہر گام پر نظر آجائے گا کہ وہ لوگ اس فانی دنیا میں عمل کے بیج بو رہے تھے۔ وہ ان کا ایمان ویقین تھا، جس نے انھیں آخری

سانس تک مقصد کے حصول کی کوششوں میں مصروف رکھا۔ اور موت کا جھٹکا ان کے کارناموں پر حسرت و تاسف کا پانی بہانے کا دن نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ اس تمنا میں محوِ پیکار تھے کہ اسی دنیا میں ان کے حسن عمل کی جزا مل جائے۔ بلکہ ایمانِ آخرت نے ان کے جسم و جان کو تادمِ آخر آخرت کے واسطے تازہ دم رکھا اور یقیناوہ کامیاب و کامران ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محبت خیر کی بنیاد ہے:

کوئی نظریۂ فکر یا حکومت و مملکت محض منافرت کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ بالفاظِ دیگر اگر کسی تحریک کا نصب العین سلبی ہو تو چاہے وہ کسی وقتی غلط قوت کو ختم کرنے کے لیے رونما ہو، اس کی پائیداری عارضی اور محدود ہے۔ البتہ رسم محبت و الفت کو عام کرنے کے لیے منافرت کی جھاڑیوں کو قطع کرنا اور معاشرتی جنگلوں کی صفائی کو منافرت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ جب تک سب سے عظیم و برتر محبوبِ حقیقی، اللہ تعالیٰ کی محبت عام نہ ہوجائے۔

جس اصول و قانون کو خدا کی محبت اور حقیقی انسان دوستی کے سرچشمہ سے بلا واسطہ روغن حیات میسر آرہا ہو، اس کو بقا اور استحکام کا حق ہے۔ جس مذہب کو کسی وقتی ہیجانی کیفیت اور بغض و عداوت نے نہ جنم دیا ہو، بلکہ جو انسانیت کی محبت میں اور حقیقی قیامِ امن کے لیے اپنے پروانوں کی جانیں بھی قربان کر دینا لازم سمجھے، وہ اس بات کا مستحق ہے کہ پوری انسانیت کا مذہب قرار پائے۔ اور دنیا اسی کے ذریعہ پائیدار امن اور حقیقی لذتِ حیات اور ارتقا کی صحیح منزلوں سے آشنا ہوسکتی ہے۔ اس کا اصلی جوہر ایک خدا کی محبت اور محبوبِ خدا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اتباع اور تمام انبیا و کتب پر ایمان ہے اور یہی اس کے عالمگیر اور آفاقی ''الدین'' ہونے کی دلیل ہے۔

آخرت کا ایمان انسان کو ایک احساسِ تحفظ عطا کرتا ہے اور اس محدود زندگی کی خوف زدگی سے دور کرکے حیاتِ دوام کی نوید جاں فزاسناتا ہے۔ عقیدۂ بعث اس آزار سے مستثنیٰ کرتا ہے کہ مجھے ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں اسی دنیا میں رہنا ہے۔ کبھی انسان، کبھی جانور اور کبھی جمادات و نباتات بن کر۔ اسلام کا عطا کردہ عقیدۂ بعث اس قدیم مشرکانہ ذہنیت کا بیخ کنی ہے، جو انسان کو اندر سے محبوس کر دیتا ہے کہ چاہے کچھ بھی کرڈالیں اسی دنیا میں تو پھر آنا ہے۔ چاہے کسی اچھی سے اچھی شکل میں یا بدتر سے بدتر ڈھانچہ میں۔ آخرت پر اعتقاد کے بعد انسانی ذہن کی بے شمار گرہیں خود بخود کھل جاتی ہیں اور وہ بے کراں فضائوں میں قانونِ الٰہی کے نغمے الاپنے کا حوصلہ پا لیتا ہے۔ پھر وہ جسم و جان کی پوری صلاحیت سے انسانیت کی خدمت میں کوشاں ہوتا ہے۔ دولت و ثروت، عظمت و شوکت، حکومت و مرتبت کی ساری بڑائیاں اس کے روبرو ''رضائے خدا'' کے مقابلہ میں ہیچ ہوجاتی ہیں اور وہ اپنا سب کچھ لٹا کر بھی اس لیے مطمئن رہتا ہے کہ اس کی جدوجہد رائیگاں اور فضول نہیں ہوئی۔ اس دنیا میں جلب منفعت مقصود ہوتا تو انھیں محدود دائروں کے لحاظ سے زندگی گزارتا۔ مگر لامحدود زندگی کا یقین وایمان ایک مسلمان کو لامحدود وسعتوں میں اپنے کردار وعمل کے جوہر دکھانے کی صلاحیت بخشتا ہے۔ نتیجہ اور اجر کا اثاثہ یہ ہے کہ دنیا کے اچھے اعمال کا صلہ خدا کی بارگاہ سے بہترین انعام کی صورت میں ملے گا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا وَّمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًاO (النساء:۱۲۲)

ترجمہ:۔ اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے کچھ دیر جاتی ہے کہ ہم انھیں باغوں میں لے جائیں گے، جن کے نیچے نہریں بہیں، ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں، اللہ کا سچا وعدہ اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔

نتیجہ:

☆...... اتباع و پیروی انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ انسان اگر خدائی قانون کی پیروی نہیں کرے گا تو نفس و شیطان کا پیرو ہو جائے گا۔

☆...... سائنس انسانی علم و فکر کا نتیجہ ہے۔ یعنی خدا کی دی ہوئی عقل سے وہ خدا کی دیگر مخلوقات کی ماہیت سے واقفیت حاصل کرتا ہے، جو مستور تھی۔ انکشافات میں کائنات کے تمام اجزا کا مرتب اصولوں پر گردش کرنا، مرتّب (خدا) کی ذات و صفاتِ محکم کا یقین بخشتا ہے اور یہی مذہب کا اولین پیغام ہے۔

☆...... خدائی محاسبہ کی بندش ہی انسان کی حقیقی آزادی ہے، ورنہ نام نہاد آزاد دنیا محبوبِ حقیقی سے پھر کر بندشِ نفس و شیطان کا شکار ہو جاتی ہے۔

☆...... خدائی قانون کی پیروی کرنے والا ہی انسانی فلاح و بہبود کی کامیاب خدمت گزاری کر سکتا ہے۔

☆...... مذہب اسلام نے عقیدۂ آخرت کے ذریعہ انسانی زندگی کو اس کی بے پناہ وسعتوں سے آگاہ کیا۔ دنیا میں پیدائش، نشو و نما، جوانی، بُڑھاپا اور موت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کی زندگی کے علاوہ برزخ کی زندگی اور حشر و نشر، یہ ہے انسانی زندگی کا عالم بے کراں!

☆...... قبر، حشر اور نشر کی کامیابی و ناکامی، دنیا کی زندگی پر منتج ہے۔

اسلامی حیا اور مغربی تہذیب

جب انسان صحیح الفطرت ہو تو اسے نیکی، مسرت و شادمانی سے بہرہ ور کرتی ہے۔ اور بُرائی ناگواری کا احساس دے کر غمگین اور افسردہ بنا دیتی ہے۔ ایمان اسی جذبہ کی پرورش کرتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''اذا سرتك حسنتك وساء تك سيئتك فانت مؤمن''۔

(مشکوۃ کتاب الایمان)

ترجمہ:۔ جب تمہیں اپنا اچھا عمل سرمد کرے اور بُرائی ناگوار محسوس ہو تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو۔

انبیائے ماسبق کی تعلیم:

جب انسان کے وجدان اور ضمیر، ایمانی روغن سے پرورش پاتے ہیں تو وہ اپنی منزل سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور اس میں یہ اعتقاد راسخ ہوتا ہے کہ محرمات کا ارتکاب اور ممنوعات پر عمل معیوب ہے۔ گناہ کر لینے کے بعد وہ خوش نہیں ہوتا، بلکہ اس میں ناگواری اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ معصیت کی اذیت اس کے لیے باعث شرم و حیا چیز ہوتی ہے۔

اور جن لوگوں میں یہ جذبات نہیں پائے جاتے، گویا ان کے ضمیر کا مومن مر چکا ہوتا ہے۔ پھر وہ عصیاں شعاری، بدکاری اور جرم و گناہ کر کے بھی بے حس رہتا ہے۔ دل میں کھٹک نہ آنکھوں میں شرم و ندامت۔

انبیائے کرام علیہم السلام انسانوں میں اسی ایمانی روح کے پھونکنے پر مامور فرمائے جاتے رہے اور انھوں نے انسانوں میں اسی جذبۂ صالحہ کو فروغ دینے کی مساعی فرمائیں۔

سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ان مما ادرك الناس من كلام النبوة الاولى اذا لم تستحى فاصنع ما شئت''۔ (ابو داؤد کتاب الادب باب فی الحیاء)

ترجمہ:۔ گزشتہ انبیا کی تعلیم کا حصہ جو لوگوں تک پہنچا ہے، ان میں یہ بھی ہے کہ جب حیا رخصت ہوگئی تو جو چاہے کرو۔

محرکاتِ فتن کا انسداد:

اسلامی نظامِ زندگی میں عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ میدانِ عمل کا تقرر اور باہمی میل جول، کھلے بندوں عورتوں کے گھومنے پھرنے اور آزادیٔ نسواں پر جس سبب سے پابندی عائد کی گئی ہے، وہ دراصل ان دونوں صنفوں کے فطری جذبات کی اصلاح کے پیش نظر اور مفسدات سے محفوظ رکھنے کے لیے ہیں۔ مردوں کا عورتوں کی جانب جنسی میلان اور عورتوں کا مردوں کی طرف کھینچاؤ، ایک پیدائشی جذبہ ہے۔ جسے خوفِ خدا اور ایمان و عفت کے سوا کوئی زنجیر قابو میں نہیں رکھ سکتی۔

مغربی ملکوں میں بچپن ہی سے اسکولوں کی تعلیم کے دوران اور فلم ٹیلی ویژن اور عریاں ترین عام معاشرہ کے باعث انسانی نگاہوں سے غیرت کا پانی مرجاتا ہے۔ اور یہ تمیز ختم کر دی جاتی ہے کہ شرم و عفت بھی کسی شئے کا نام ہے۔ اس لیے کہ ان ملکوں میں ترقی اور کامیابی کی

ساری اساس معاش پر رکھی گئی ہے۔ انھیں اس دنیاوی زندگی کے آرام و آسائش کے سوا کچھ اور سوچنے اور سمجھنے کی فرصت ہی میسر نہیں آتی۔ مسلمان آبادی والے ممالک، جہاں اگرچہ کامل اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں پایا جاتا، افراد کے دینی جذبات اور فطری حیا و شرم کے سبب اب تک عام ماحول غیرت منداور پردہ دار ہے۔

مگر اس وقت ہماری بحث کا عنوان اس بارے میں اسلامی قوانین سے ہے۔ اس لیے یہ نظریہ مد نظر رکھنا چاہیے کہ اسلام کا تمام تر مقصد خدا کی رضا اور خوش نودی ہے۔ اس لیے وہ اس مجموعۂ انسدادِ دنیا میں جہاں "خیر و شر" دونوں عناصر موجود ہیں، انسان کو عقل و شعور سے کام لے کر خیر و فلاح کی راہ اپنانے کی دعوت دیتا ہے۔ عورت اور مرد کے عمومی ملاپ، جس بنیادی باریکی کے سبب پابندی عائد کی ہے، اس کی جانب معلم انسانیت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ قول مرکزی حیثیت رکھتا ہے:

"ما ترکت بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء"۔

(بخاری کتاب النکاح باب ما یبتغی من شؤم المرأة)

ترجمہ:۔ میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے ضرر رساں کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔

مثال سامنے ہے:

عورت اگر اسلامی زیورِ حیا سے خالی ہو تو یقیناً فتنۂ مجسم ہے۔ اور ہم اس کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے خود کر رہے ہیں کہ مسلم ممالک سے شریف النسل نوجوان یورپ اور امریکہ کے ممالک میں آتے ہیں اور سرخ و سپید جلا کے ابلیسی پیکروں میں دین و دانش کو فراموش کر کے اپنے آبا و اجداد کی غیرتوں کا سودا کر بیٹھتے ہیں۔

ایک تو علم کی قلت اور تعلیماتِ اسلامی سے برگشتگی نے ان مسلمانوں کے عمومی رجحان کو یوں ہی دین کی صحیح لذتوں سے محروم کر دیا ہے۔ اس پر مستزاد جب عشوہ طرازان مغرب کا حسن بے باک اس پر برق پاش ہوتا ہے تو بڑے بڑے شیوخ کے صاف شفاف لمبے دامنوں سے نفس و شیطان کے پنجے برآمد ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ حدیث مذکور کو بار بار پڑھیے اور اس فتنۂ عظیمہ سے اپنے ایمانی سرمایہ کی حفاظت کا بند و بست کیجیے۔

اسی عنوان پر رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ قول مکرم بھی ہے۔ آپ نے فرمایا:

"ہر صبح دو فرشتے اعلان کرتے ہیں کہ مردوں کے لیے عورتیں تباہ کن ہیں اور عورتوں کے واسطے مرد"۔ (مستدرک حاکم، ج۲/ص۱۹۰)

حضرت ابو سعید خدری روایت کرتے ہیں۔ حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"تمہارے واسطے دنیا ایک میٹھی اور سرسبز و شاداب شئ ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس لذیذ دنیا کا جانشین بنانا چاہتا ہے، لہٰذا تم دنیا کی رنگینیوں سے بچو"۔

"واتقوا النساء فان اول فتنة بنی اسرائیل کانت فی النساء"۔

(مسلم، ابواب الفتن)

ترجمہ:۔ اور عورتوں کے فتنہ سے بچو، تم سے اگلی امت بنی اسرائیل کی پہلی آزمائش عورتوں ہی کے ذریعہ ہوئی تھی۔

عورت و مرد کے باہمی بے حجابانہ میل ملاپ کے دوران گناہ کی آلودگیوں سے بچ رہنا کوئی آسان امر نہیں۔ اس لیے مذہب اسلام، جو صالحیت پیدا کرنے والا مذہب ہے، اس کو جائز نہیں سمجھتا۔ اور جہاں تک حسب ضرورت اجازت بھی ہے، اس میں پوری احتیاط، شائستگی، آداب اور خشیت کی تاکید ہے۔ انسان کے ہاتھ میں اگر خوفِ خدا کی رسّی اور محاسب حقیقی کا حاضر و ناظر متیقن ہو تو یہی سب سے زبردست قوت ہے، جو حفاظت وصیانت کے لیے دیوار بن جاتی ہے۔

تہذیبی ناسور:

موجودہ دنیا جس تہذیب سے دوچار ہے، اس میں یہ بات قطعًا معیوب نہیں سمجھی جاتی کہ ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے بالکل مادر زاد ننگا ہی ہوجائے۔ بلکہ ترقی پسند شیطنت نے دنیا کے مختلف حصوں میں انسانی آزادی کے نام پر ایسی متعدّد بستیاں بسا رکھی ہیں، جہاں لوگ اپنے پیدائشی لباس میں رہتے ہیں۔ اس خیال کی ترویج کرنے والے، اس برہنگی کو اپنا پیدائشی حق تصور کرتے ہیں۔ یہ تو ہونا ضروری بھی تھا، کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا اپنے اختتام کا سفر کیسے طے کرتی۔ فحاشی، بدکاری، اخلاق دشمنی کو اپنا کر سراسر نفسانیت کو تہذیب اور تمدن کا نام دینا، دراصل اس صورِ اسرافیل کا پیش خیمہ ہے، جس کی آواز بلند ہوتے ہی ساری آوازیں فنا ہوجائیں گی۔

اگر اس طبقہ کو ننگ انسانیت قرار دے کر خارج عن البحث کر دیا جائے، پھر بھی دنیا کی گولائی کے تقریبًا نصف حصہ پر آج جس تہذیب کو کامیاب تہذیب اور جس نظامِ حیات کو اچھا نظامِ زندگی سمجھا جارہا ہے، اسے ناقدانہ نظر سے دیکھنے کے واسطے سامنے اسلام کا فطری، منصفانہ اور مقدس نظام رکھ لیا جائے تو ہر ذی شعور کو کھرے اور کھوٹے کی پہچان میں آسانی ہوجائے گی۔

آج کی بے حیائی، فحاشی، منشیات کا اندھادھند استعمال، خودکشی، جرائم کی بہتات، مانع حمل ادویات کا تنوع، نسل کشی کا ماتم، ہپی ازم کا فروغ، کیا یہ سب اسی تہذیب کی شکستہ دیوروں کے سنگ و خشت نہیں ہیں، جسے تہذیب مغرب کہتے ہیں۔

پرائیویٹ زندگی:

یہاں زندگی گزارنے والا اپنی پرائیویٹ لائف کو عام طور پر عریانیت کے ساتھ گزارتا ہے اور اسے بھی آزادی کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔ دراصل اس کا یہ ذہن اپنے گرد و پیش کے ننگے ماحول کا ایک جز ہے۔ آئو تمھیں میں دنیا کے سب سے عظیم اور انسانیت کے سب سے بڑے معلم کی پرائیویٹ زندگی کا ایک ورق دکھائوں۔

> رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبوب ترین بیوی، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:
> ”میں نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قابل ستر عضو کبھی نہیں دیکھا“۔

(مسند احمد، ج۶/ ص ۲۸۳)

ساری دنیا میں حیا، پاک بازی اور عفت و عصمت کا نظام قائم کرنے والے خدا کے آخری رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود شرم و حیا اور عفت و عصمت میں تمام انسانوں سے زیادہ تھے۔ پردہ نشین دوشیزائوں میں جس قدر شرم و حیا ہوتی ہے، آپ میں یہ جوہر ان سے کہیں زیادہ تھا۔ چنانچہ غیرتِ نبوت کے خلاف اگر کہیں کوئی ناگوار شئ محسوس فرماتے تو شرم کے باعث زبان سے اظہار بھی نہیں کرتے تھے۔ مگر مزاج شناس حاضرین بزم حضور کی ناپسندیدگی کو صرف روئے مبارک دیکھ کر بھانپ جاتے تھے۔

''کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشد حیاء من العذراء فی خدرھا وکان اذا کرہ شیئا عرفناہ فی وجھہ''۔
(مسلم، کتاب الادب باب کثرۃ حیائہ صلی اللہ علیہ وسلم)

ترجمہ:۔ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پردہ نشین دوشیزہ سے زیادہ شرمیلے تھے، جب منافی حیا کوئی ناپسندیدہ بات ہوجاتی تو ہم لوگ ناگواری کو حضور کا رُخ مبارک دیکھ کر جان جاتے۔

''ایک صحابی نے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا: یارسول اللہ! ہمیں کہاں ستر پوشی کرنی چاہیے اور کہاں نہیں کرنی چاہیے؟ آپ نے فرمایا: اپنی شرم گاہ کو اپنی بیوی اور اپنی باندی کے علاوہ کسی کے سامنے نہ کھلنے دو۔ انھوں نے کہا: یارسول اللہ! جب لوگ باہم ملے جلے ہوں اور آدمی ستر پوشی پر اچھی طرح قادر نہ ہو تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟ فرمایا: جہاں تک ممکن ہو کوشش کرو کہ کوئی شخص تمہارے قابل ستر مقامات کو نہ دیکھ سکے۔ انھوں نے کہا: یارسول اللہ! جب کسی کو تنہائی ہو تو کیا اس وقت بھی وہ ننگا نہیں ہوسکتا؟ فرمایا: اس وقت اللہ تو موجود ہوتا ہے۔ اللہ کی ذات لوگوں کے لحاظ سے اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اس سے شرم کی جائے''۔
(ترمذی، ابواب الاستیذان والادب، باب ماجاء فی حفظ العورۃ)

میاں اور بیوی کے باہمی اتصال کا وظیفہ بھی حیوانوں کی طرح کھلے بندوں ننگے ہوکر کرنا اسلام میں مکروہ و معیوب قرار دیا گیا ہے۔ اس بارے میں رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اذا اتی احدکم اھلہ فلیستتر ولا یتجرد متجرد العیرین''۔

(ابن ماجۃ ابواب النکاح باب التستر عند الجماع)

ترجمہ:۔ جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے ہم بستری کرے تو چاہیے کہ پردہ کرلے اور اس حالت میں دونوں گدھوں کی طرح ننگے نہ ہوجائیں۔

اب موازنہ کیجیے! اسلامی حیاداری اور موجودہ دنیاوی تہذیبوں کا۔ اسلام نے خواہشاتِ نفسانی کو نہ تو رہبانیت میں محبوس کیا ہے اور نہ ہی اسے اتنی کھلی چھوٹی دی ہے کہ حیوانیت کی منزل میں داخل ہوجائے۔ بلکہ انسان کے فطری جذبات اور دواعی کا پورا پورا لحاظ بھی ہے اور خوفِ خدا، عفت و پاک بازی کی چلمن بھی پڑی ہوئی ہے۔ اور یہی راہِ اعتدال ہے۔

دنیا جب اس معاملہ میں افراط یا تفریط کا شکار ہوئی، انسانی معاشرہ بدامنی کا شکار ہوا ہے۔ عیسائیت کا رہبانی دور اس کے غیر فطری دبائو کا زمانہ تھا۔ اور مغرب کی موجودہ سوسائٹی حد سے زیادہ آزادی کا زمانہ ہے۔

اسلام ایسے میں اپنا صالح، معتدل اور فطری اصولِ زندگی پیش کرتا ہے۔ اور ہیجان و بدامنی، بے سکون دنیا کو طمانیت کا پیغام دیتا ہے۔ فضل الٰہی کے متلاشیوں کو مژدۂ جاں فزا ہے۔ اسلام کا بابِ کرم ہمیشہ ہر ایک کے واسطے کھلا ہوا ہے۔ ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ مَا زَکٰی مِنْکُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌO (النور:۲۱)

ترجمہ:۔ اور اگر اللہ کا فضل اور رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں کوئی بھی کبھی ستھرا نہ ہو سکتا، ہاں اللہ ستھرا کر دیتا ہے جسے چاہے، اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

کریم ہے وہ کرم سے نواز دیتا ہے
بہت قریب ہے دل سے اسے پکار کے دیکھ

مسلمان اور نعت سے بغض؟

ہر امتی اپنے نبی کا غلام ہوتا ہے۔ جس کی نسبت غلامی زیادہ قوی ہوتی ہے، وہ بقدرِ استعداد فیضانِ نبوت سے زیادہ انعام و اکرام پاتا ہے۔ محکوم کو اپنے حاکم کا، اولاد کو والدین کا، شاگرد کو استاذ کا جتنا اطاعت گزار اور وفا شعار ہونا ضروری ہے، اس سے بہت زیادہ امتی کو اپنے نبی اور رسول کا مطیع و فرماں بردار ہونا لازم ہے۔

حضور سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

''والذی نفس محمد بیدہ لا یکون احدکم مومنا حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین''۔ (حدیث)

ترجمہ:۔ قسم اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد کی جان ہے! تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کے دل میں میری محبت اس کے باپ، بیٹے اور دنیا جہان کے تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔

اب یہ طرفہ تماشا ہے کہ اس دور میں امتی کہلانے والوں کو اپنے نبی کی عظمت شان سن کر غصہ آجاتا ہے۔ ان کی تعریف و توصیف، جس سے قرآن معمور ہے، جو صحف ماسبق میں مسطور ہے، جو اہل عشق و محبت کے سینے کا نور اور دل کا سرور ہے، جس عظمتِ نبی کے لیے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے سرفروشی سے اپنی جانیں قربان کیں، سولی پر لٹکائے گئے، مکان و وطن کو خیرباد کہا، خویش واقارب سے بے گانگی اختیار کی۔ الغرض اپنی زندگی کا ہر سکھ چین، جس ذاتِ گرامی فداہ امی و ابی کی عظمت شان کا علَم بلند کرنے میں قربان کردیا۔ اور ادھر دورِ حاضر میں ایسے لوگ خود کو سچا موحد کہتے ہیں، جنھیں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعریف ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ (العیاذ باللہ)

اہل محبت مسلمانوں کا تو سکون و قرار ہی ذاتِ رحمۃ للعالمین (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) سے وابستہ ہے۔ ہماری مجلسیں، نعت پاک اور مدیح نبوی سے آباد رہتی ہیں۔اور یہ کچھ آج کی نئی بات نہیں۔ سیدنا حسان بن ثابت اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے وقت سے نعت خوانی کا پُر محبت سلسلہ چلا آرہا ہے۔ دورِ جدید کے موحدین کو یہ سلسلۂ نعت گوئی و نعت خوانی، سخت ناگوار ہے۔ اور اسے وہ شرک و بدعت کے رواج کے مرادف خیال کرتے ہیں۔

حالاں کہ اگر ایمان و احتساب سے جائزہ لیجیے تو خیر القرون سے آج تک کی نعتیہ شاعری بھی اسلام کے فروغ کا ایک نہایت موثر ذریعہ رہی ہے۔ اور خود دورِ نبوی کے شعرائے نعت نے جو مضامین اپنی نعتوں میں باندھے ہیں، حسان بن ثابت سے علامہ بوصیری تک اور جامی و رومی سے امام احمد رضا اور اقبال تک عشق رسول کی تر و تازگی کا ایک ایمان افروز سلسلہ محسوس ہوتا ہے۔ نعت شریف میں بیان معجزات وفضائل کے ساتھ ساتھ، رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم غیب، حضور سے استمداد و شفاعت، ان کے روحانی تصرفات اور کائنات پر ان کے اختیارات کے مضامین سے اہل بیت، صحابہ اور سلف صالحین کے کلام روشن و منور ہیں۔

حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی حیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی مجالس و محافل، ذکر خدا اور ذکر رسول سے ہمیشہ شاداب رکھتے تھے۔ اور سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پردہ فرمالینے کے بعد ان کی مجالس ذکر حبیب سے پُر رونق رہا کرتی تھیں۔

آیئے علامہ ابن کثیر کی تفسیر میں مذکورہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت سے دل و نگاہ روشن کریں اور دیکھیں کہ خلیفۂ ثانی خطبہ کے دوران ایک مداحِ رسول سے کس چیز کی فرمائش کر رہے ہیں۔

حضرت براء کا بیان ہے:

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک روز خطبہ ارشاد فرمارہے تھے، دورانِ خطبہ پوچھا: کیا سواد بن قارب موجود ہیں؟ مسجد میں خاموشی طاری رہی۔ دوسرے سال آپ نے پھر سواد بن قارب کو آواز دی۔ اس بار حضرت براء بن عازب نے عرض کیا: یہ سواد کون صاحب ہیں؟ جنھیں آپ پوچھ رہے ہیں۔فرمایا: ان کے ایمان لانے کا واقعہ بڑا عجیب و غریب ہے۔

اتنے میں حضرت سواد حاضر خدمت ہوئے۔ امیر المومنین نے ان سے فرمایا: اپنے ایمان لانے کا واقعہ بیان کرو۔

حضرت سواد بن قارب نے کہا: اے امیر امومنین! میں ہند میں تھا۔ ایک جن میرے قبضہ میں تھا۔ ایک رات کی بات ہے۔ میرے جن نے مجھے نیند سے بے دار کیا۔ او کہنے لگا: میری بات دھیان سے سنو! اللہ تعالیٰ نے قبیلۂ لوئی بن غالب میں ایک نبی مبعوث فرمایا ہے۔ ڈرو اور اس پر ایمان لائو۔ یہی معاملہ میرے ساتھ تین شب پیش آتا رہا۔ جنات کی اس بار بار کی ترغیب سے میرے دل میں اسلام کی جوت جاگ اٹھی۔ میں اونٹنی پر سوار، مکہ مکرمہ پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے حلقہ میں لیے بیٹھے ہیں۔ جب حضور کی نگاہِ کرم مجھ پر پڑی۔ تو آپ نے فرمایا:

''مرحبابک یا سواد بن قارب! قد علمنا ما جاء بک''۔

ترجمہ:۔ اے سواد! تیرا آنا مبارک۔ ہم تیرے لانے والے کو بھی جانتے ہیں۔

حضرت سواد نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے چند اشعار موزوں کیے ہیں، اجازت ہو تو حاضر خدمت کروں؟ حضور (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے اجازت دی۔

حضرت سواد بن قارب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احمد و محمود و محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور اپنا نعتیہ کلام پیش کیا۔ اس مبارک قصیدہ میں انھوں نے اپنے خواب کا ذکر کیا اور نہایت اخلاص و محبت کے ساتھ اپنے ایمان کا اعلان فرمایا۔ اور ساتھ ہی ساتھ حضور اقدس کا وسیلہ جلیلہ بارگاہِ رب الصمد میں کتنا عظیم سرمایہ ہے، اس کا بیان کیا۔ اور اپنے جذبۂ اطاعت گزاری اور غلامانہ ذوق و شوق، علم غیب نبی اور شفاعت سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نظم کیا ہے۔ ان کے چند اشعار سے ہم لوگ بھی اپنے ایمان وایقان کو جلا بخشیں۔

فاشهد ان الله لا رب غيره

وانك مامون على كل غائب

ترجمہ:۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں اور آپ کو ہر قسم کے غیبوں کا امین بنایا گیا ہے۔

وانك ادنى المرسلين وسيلة

الى الله يا ابن الاكرمين الاطائب

ترجمہ:۔ اے بزرگوں اور پاک بازوں کے فرزند گرامی! اللہ تعالیٰ کی جناب میں آپ کا رتبہ تمام رسولوں سے زیادہ ہے۔

وکن لی شفیعا یوم لا ذو شفاعة

سواك بمغن عن سواد بن قارب

ترجمہ:۔ یارسول اللہ! اس دن سواد بن قارب کی شفاعت فرمائیں، جب کہ حضور کے بغیر کسی کی شفاعت لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔

حقیقی ایمان اور محبت کے جذبات سے لبریز، حضرت سیدنا سواد بن قارب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نعت مبارک سماعت فرماتے ہوئے رحمت کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ حتیٰ کہ سرکار کے دندانِ مبارک کی لمعانی صحابہ نے ملاحظہ کرلی۔ اور آقا ومولا نے فرمایا:

''افلحت یا سواد''۔ (اے سواد! جا تو دونوں عالم میں کامیاب ہوا)

اب کوئی ایمان سے بتائے کہ آج علما اور ذی شعور شعرائے اہل سنت، اپنی نعتوں میں ان مضامین ہی کو باندھیں تو اسے سنت صحابہ کہیں گے یا کچھ اور......؟

اسلام میں یتیموں کی رعایت

کسی بچے کے سر سے والدین کا سایۂ عاطفت اٹھ جانا، یا ماں باپ میں سے کسی ایک کا اس سے جدا ہوجانا، بچے کی زندگی پر بہت اثر انداز ہوتا ہے۔ جیسے گلزار ہستی میں لہلہاتی شاخوں پر اُبھر تا غنچہ، نسیم بہار کی طراوت اور شبنم کی عنبر فشانی سے محروم کردیا جائے۔ یتیم و یسیر ہونے کے بعد بچہ یاس و حرماں کا شکار ہوجاتا ہے۔ ماں کی ممتا کا محروم اور باپ کی شفقت کا بھکاری، یہ دولت کسی اور خزانے سے حاصل نہیں کرسکتا۔

قابل غور یہ ہے کہ زندگی اور موت کے مراحل میں سے کوئی بھی انسان کے قبضہ میں نہیں۔ حیاتِ مستعار مالکِ حی وقیوم کی امانت ہے، وہ جب چاہتا ہے لے لیتا ہے۔

لہٰذا بذاتِ خود یتیم ہونا کسی کے لیے باعث ننگ و عار ہرگز نہیں۔ بلکہ بعض حالات میں یہ خاصانِ خدا اور عظیم ہستیوں کی الٰہی داشت و پرداخت کا ذریعہ ہے۔ کسی اور جانب کیوں دیکھیں۔ آیئے مکہ معظمہ کی مقدس سرزمین پر سیدہ آمنہ بی بی کی آغوش میں تشریف لانے والے سید الکونین، رسولِ اکرم، دریتیم، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ پر غور فرمایئے کہ ولادتِ مبارکہ سے پہلے ہی باپ کا انتقال ہوجاتا ہے اور صرف چھ سال کی کم سنی میں ماں کا سایہ رب تعالیٰ کھینچ لیتا ہے۔ مگر یہ یتیمی اور ناچارگی انسانیت عظمیٰ کی تشکیل میں مانع اور حائل نہیں ہوئی، بلکہ آپ کی سرپرستی اور تولیت براہِ راست رب کائنات نے فرمائی۔ تا آں کہ دنیا نے کھلی آنکھوں سے آپ کو سید الاولین والآخرین، رحمۃ للعالمین اور محبوبِ رب العالمین دیکھا۔ رب تعالیٰ نے اپنے رسولِ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دست گیری و تولیت کو بطورِ امتنان خود بیان فرمایا:

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ○ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ○ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ○ (الضحی:٦ تا ٨)

ترجمہ:۔ کیا اس نے تمہیں یتیم نہ پایا پھر جگہ دی، اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی، اور تمہیں حاجت مند پایا پھر غنی کردیا۔

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام قدرتِ الٰہی سے بے باپ کے پیدا ہوئے۔ اور اولوالعزم پیغمبر آیت اللہ للعالمین ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایامِ طفولیت میں باپ کی نگرانی اور شفقت سے دور قصر فرعون میں رہے اور خدائی تعلیم و تربیت نے انھیں کلیم اللہ بنا دیا۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام باوجودیکہ ایامِ طفولیت ہی میں ماں سے محروم ہوگئے تھے اور بھائیوں کی حرکتوں کے باعث ایک زمانے تک باپ سے بھی دور رہے، مگر الٰہی تعلیم و تادیب نے انھیں نبوت و رسالت کے منصب جلیلہ پر فائز کیا۔ ان خاصانِ خدا اور قائدین امم رسولانِ باوقار، انبیا والاتبار علیہم السلام کے معاملات تو بہر حال عام انسانی حالات سے الگ تھلگ اور ربانی حفاظت و صیانت اور تعلیم و تربیت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ تاہم یہی کیا کم ہے کہ ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کی شفقتوں سے محروم ہونے والا فرزند یا دختر دل شکستہ اور کبیدہ خاطر نہ ہو، کیوں کہ رب تعالیٰ کے عظیم رسول اور پیغمبر بھی یتیم ہوئے ہیں۔

یتیمی داغِ قسمت کا نہیں، عظمت کی ڈالی ہے
فلا تقہر انھیں کے حق میں فرمانِ جلالی ہے
سنا دے بدر مژدہ جا کے یہ مومن یتیموں کو
کہ تیری اشک شوئی کے لیے طیبہ کا والی ہے

ماں اور باپ ہی بچے کی خوشیوں اور مسرتوں کا میدان ہیں۔ اور ان کی شفقتیں اور پیار ہی نونہال زندگیوں کی روشنی ہے۔ جس بچے کو یتیمی کا داغ لگ گیا، اس کے شگفتہ چہرہ پر کمھلاہٹ آجاتی ہے۔ اس کا حوصلہ مند دل مرجھا جاتا ہے۔ اور اِن محبت و رافت کی گھنیری چھائوں سے محروم ہونے کے بعد بچہ خود کو شکست خوردہ اور بے سہارا محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے یتیم کی دل داری، پرورش، داشت و پرداخت، دیکھ بھال، شفقت و پیار اور اس کے ساتھ احسان پر بہت زور دیا ہے۔ اور ان ننھی جانوں کے ساتھ انصاف، شفقت و محبت اور حسن سلوک کو تقویٰ کی علامت شمار کیا ہے۔ حکم ربانی ہے:

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ (الضحیٰ:۹۔۱۰)

ترجمہ:۔ پس یتیم پر دبائو نہ ڈالو، اور سائل کو نہ جھڑکو۔

قتادہ نے کہا کہ یتیم کے ساتھ مہربان باپ کی طرح برتائو رکھنا چاہیے۔

(تفسیر ابن کثیر)

اہل عرب دورِ جاہلیت میں یتیموں کو لاوارث جان کر انھیں دباتے تھے اور ان کا مال خرد بُرد کر ڈالتے تھے۔ اس قول کی روشنی میں آیت کریمہ گویا امت کو یتیموں کے معاملات میں نصیحت کر رہی ہے کہ ہر شخص غور کرلے کہ وہ اگر اس یتیم کی جگہ ہوتا تو قہر و غضب اور دبائو سے اس کا دل کس طرح ٹوٹ جاتا۔ یہ سوچ کر یتیموں پر ظلم کی کوئی راہ نہ کھولو۔

یتیموں کے ساتھ انصاف کرنے کا حکم ہو رہا ہے۔ رب کائنات ارشاد فرماتا ہے:

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ۝ (النساء:۱۲۷)

ترجمہ:۔ اور یہ کہ یتیموں کے حق میں انصاف پر قائم رہو اور تم جو بھلائی کرو تو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

دورِ جاہلیت میں اہل عرب عورتوں اور بچوں کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں دیتے تھے۔ جب آیت میراث نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا عورتیں اور بچے اب وارث ہوں گے؟ تو رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں یہ آیت کریمہ شروع سے تلاوت فرما کر جواب دیا۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ یتیموں کے ولیوں کا یہ دستور تھا کہ اگر یتیم لڑکی صاحب مال و جمال ہوتی تو اس سے تھوڑے مہر پر نکاح کر لیتے اور اگر وہ حسین و مال دار نہ ہوتی تو اسے یوں ہی چھوڑ دیتے اور اگر حسنِ صورت نہ ہوتا اور دولت مند ہوتی تو اس خوف سے کسی سے نکاح نہ کراتے کہ اس کا مال اس کے ساتھ چلا جائے گا۔ رب تعالیٰ نے یہ اور اسی قبیل کی تمام ناانصافیوں کے انسداد کے لیے آیت بالا نازل فرمائی اور یتیموں کے ساتھ کامل انصاف اور عدل کا سلوک اپنانے کا حکم دیا۔

قرآن مجید میں احسان کا حکم ماں باپ کے ساتھ، قرابت داروں کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ فرمایا جارہا ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ ○ (البقرۃ:۸۳)

ترجمہ:۔ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے۔

سورۂ بلد میں اصحاب المیمنہ (جنتیوں) کے اعمال بیان فرمائے گئے ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ:

اَوْ اِطْعٰمٌ فِىْ يَوْمٍ ذِىْ مَسْغَبَةٍ ○ يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ○ (البلد:۱۴۔۱۵)

ترجمہ:۔ یا بھوک کے دن کھانا دینا، رشتہ دار یتیم کو یا خاک نشین مسکین کو۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرنے والا اس کی طرح ہے، جو جہاد فی سبیل اللہ میں سعی کرتا ہے، بے تکان شب بیداری کرتا ہے اور متواتر روزے رکھتا ہے۔

یتیم کے اکرام کو مومنین ابرار کی صفت بتایا گیا ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ (الدہر:۸)

ترجمہ:۔ اور کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین اور یتیم اور اسیر کو۔

رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''مسلمانوں کے گھروں میں وہ گھر سب سے اچھا ہے، جس میں کسی یتیم کی عمدگی سے پرورش ہو رہی ہو۔ اور وہ گھر ان میں سب سے بُرا ہے، جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا جاتا ہو''۔ (ابن ماجہ، عن ابی ھریرۃ)

رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو خود درِّ یتیم ہیں، انھوں نے یتیموں کے دکھی دلوں کا مرہم مہیا فرمایا ہے۔ اور عالم اسلام میں یتیم ہوجانے والے ہر بچے کا ولی ووالی خود کو بنایا ہے۔ گویا ماں باپ کی محبت و شفقت سے محروم ہونے والا بچہ، رسولِ رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خاص دامن کرم میں جگہ پاتا ہے۔ اور نظامِ مصطفی، یعنی حکومت اسلامیہ اس کی کفیل و ذمہ دار ہے۔

کوئی بچہ یتیمی میں نہ رونے پائے کہ اس کو
اٹھا کر گود میں رب کے دُلارے چوم لیتے ہیں

سرکار ارشاد فرماتے ہیں:

'' انا اولی بکل مومن من نفسه فمن ترك دينا او ضيعة فالی ومن ترك مالا فلورثته ''۔ (اخرجه ابوداؤد)

ترجمہ:۔ میں ہر مومن کی جان سے قریب تر ہوں تو جس نے قرض چھوڑا، یا عیال چھوڑا تو اس کا ذمہ مجھ پر ہے، اور جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے ورثا کے لیے ہے۔

شرح السنہ میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من اٰوی يتيما علی طعامه وشرابه اوجب الله له الجنة''۔

(شرح السنة)

ترجمہ:۔ جو شخص یتیم کو اپنے کھانے پینے میں شریک کرے اللہ تعالیٰ اس کے واسطے جنت واجب کر دے گا۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

''انا و کافل الیتیم له او لغیرہ فی الجنۃ ھٰکذا''۔

ترجمہ:۔ میں اور اپنے یا پرائے یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں ہوں گے۔

حضور نے یہ فرمایا اور اپنی انگشت شہادت اور بیچ والی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا اور ان دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔ گویا یتیم کی پرورش و کفالت کرنے والے بندۂ مومن کا درجہ جنت میں اتنا بلند فرمایا کہ آپ نے اپنی انگلیوں کو قلت فاصلہ کی مثال کے لیے استعمال فرمایا۔ رب کائنات، آقا و مولا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کے فرامین مبارکہ کی تلاوت و سماعت کی برکت سے پہلے مجھ بندۂ نابکار کو ان پر عمل کی توفیق سے بہرہ ور فرمائے اور تمام مسلمانوں کو ان فرمودات سے ایقان کی آنکھیں روشن کرنے کی سعادت بخشے۔ آمین۔

یتیم پر شفقت کی برکت:

محض رضائے حق کی نیت سے جو خوش نصیب یتیموں کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہیں، ان کو حضور رحمتِ عالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بشارت ہو۔ آقا و مولا ارشاد فرماتے ہیں:

''جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر صرف اللہ کے لیے ہاتھ پھیرا۔ تو سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرا، ہر ہر بال کے حساب سے اسکی نیکیاں ثابت ہوں گی''۔

(رواہ احمد والترمذی عن ابی امامہ رضی اللہ عنہ)

مسند احمد ہی میں ہے کہ سید دو عالم حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اور اس نے اپنی سخت دلی، قساوتِ قلبی کی شکایت کی۔ اور حضور حکیم روحانی صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے اس کے اس مرض کا علاج تجویز کیا۔ اور فرمایا:

''امسح رأس الیتیم واطعم المسکین''۔ (رواہ احمد عن ابی ھریرۃ)

ترجمہ:۔ یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا کرو اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو۔

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے قبل یتیموں پر بہت ظلم ہوتا تھا۔ اور اس کمزور طبقۂ انسانی کو حرص و آز کے بندے اپنی ستم رانی اور ظالمانہ ماحول میں کچل رہے تھے۔ دنیا میں یتیموں کے والی، غریبوں کے داتا، بے کسوں کے ہم درد، دکھیوں کے سہارا بن کر سرکار تشریف لائے۔ آپ نے ظالم کے پنجے مروڑ کر مظلوموں کی داد رسی کی۔ ظلم کی چکی میں پسنے والے غریبوں اور دکھیوں کی حمایت میں آوازِ حق بلند فرمائی اور نظامِ مصطفوی کے سائے میں انسانیت کے بے قراروں کو قرار نصیب آگیا۔

کس درد مندی اور ہمدردانہ لجاجت سے یتیموں کے مسائل کو سرکار بارگاہِ احدیت میں پیش کرتے ہیں۔ قربان ہوں ان مبارک لبوں پر انسانی نطق کی قوت۔ سماعت فرمالیجیے:

''اللھم انی احرج حق الضعیفین الیتیم والمرأۃ''۔

(النسائی، عن خویلد بن عمر)

ترجمہ:۔ اے میرے اللہ! میں دو کمزور قسم کے لوگوں کے حق کو محترم قرار دیتا ہوں، یتیم کے حق کو اور عورت کے حق کو۔

یتیم کی کفالت:

تقریر بالا سے یتیموں کی کفالت کے مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں جہاں کہیں قوانین اسلامی کا بول بالا ہے، وہاں حکومتِ اسلامیہ یتیموں کی کفالت اور ان کے حوائج و ضروریات پوری کرنے کی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس مجبور طبقہ کا ذکر بھی ان مستحقین میں آیا ہے، جنھیں اسلامی ریاست سرکاری خزانے سے پرورش کرے گی۔ اسلامی ریاست کفار سے جہاد کر کے جو مالِ غنیمت حاصل کرتی تھی، دورِ نبوی میں اس کے مصارف یہ تھے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (انفال:۴۱)

ترجمہ:۔ اور جان لو کہ جو کچھ غنیمت لو تو اس کا پانچواں حصہ خاص اللہ و رسول اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کا ہے۔

گویا مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ، پھر پانچ حصوں پر تقسیم ہو۔ اس میں کا ایک حصہ جو پورے مال کا پچیسواں حصہ ہوا، وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے تھا۔ اور دوسرا حصہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قرابت داروں کے لیے۔ اور بقیہ تین حصے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے۔ نظامِ مصطفیٰ کی کرم نوازی دیکھیئے کہ حضور کے بعد ان کے حصہ کا مال اور آپ کے اہل قرابت کا حصہ بھی انہیں تین کمزور طبقوں کے لیے خاص کر دیا گیا۔ جن میں پہلے نمبر پر یتیم ہے (یہی قول امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے)

ایک اور مقام پر قرآن مجید کا فرمان ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ۔ (الحشر:۷)

ترجمہ:۔ جو غنیمت دلائی اللہ نے اپنے رسول کو شہر والوں سے، وہ اللہ اور رسول کی ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے کہ تمہارے اغنیا کا مال نہ ہو جائے۔

یہ تو وہاں کا معاملہ ہے، جہاں اسلامی قوانین کا نفاذ من کل الوجوہ ہے۔ کسی شخص واحد پر یتیموں کا بوجھ نہیں۔ مگر جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے اور لوگ فیضانِ اسلام سے بطورِ اتم مستفیض نہیں ہو پا رہے ہیں، وہاں کے لیے کیا حکم ہے؟

فقہائے اسلام تصریح فرماتے ہیں کہ یتیموں کی کفالت فرضِ کفایہ ہے، اہل قرابت پر۔ اگر کسی نے یہ ذمہ لے لیا تو سب سے ساقط ہو جائے گا، ورنہ سارے اہل رشتہ ماخوذ ہوں گے۔ اور اگر یتیم کے رشتہ داروں میں سے کوئی اس کی کفالت کا اہل نہیں ہے تو عامۃ المسلمین پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی ضرورتوں کی نگہداشت کریں اور مل جل کر اس کی حاجتیں پوری کریں۔

یتیم کی تعلیم و تربیت:

تعلیم و تربیت بھی کفالت کا ایک بہت اہم جز ہے۔ اکثر لاوارث بچے، جن کے سر پر سرپرستوں کا سایہ نہیں ہوتا، ناخواندہ اور آزاد ہوجاتے ہیں۔ یتیموں کی اور ساری ضرورتوں کے ساتھ ساتھ نہایت اہم ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی صحیح تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ دورِ حاضر کی بہت ساری خرابیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نئی نسل میں بے ادبی اور سرکشی کی وباعام، بہت سارے خوش حال کنبے اپنے نونہالوں کو اسلامی تعلیم وتربیت سے خود دور ہونے کے باعث، نیک اور صالح نہیں بنا پاتے۔ دولت کی ہوس، عیش وعشرت کی طلب کو ہی آج کی دنیا میں زندگی کا مقصد تصور کر لیا گیا ہے اور رفتہ رفتہ یہ بیماری مسلمان قوم میں بھی گھر کرتی جارہی ہے۔ آج کا مسلمان یہ بھولتا جارہا ہے کہ اصل شئے ایمان اور دین داری ہے۔ نیکی اور صالحیت کے ساتھ کھائی ہوئی خشک روٹی، سرکشی اور عدوان کے عیش و تنعم سے افضل ہے۔ ایسے ماحول میں کون ہے، جو قوم کے یتیموں اور بیوائوں کے اخلاق وعادات کی نگہداشت کرے۔؟

مگر جن کے سینوں میں اسلامی حمیت زندہ ہے او جو خدا اور رسول پر ایمان و ایقان رکھتے ہیں، وہ آج بھی اسلام کے زریں اصولوں پر عمل پیرا ہیں۔ اور ایسے ہی خوش نصیبوں کے لیے رب کا رضوان ہے۔

یتیموں کی تعلیم و تربیت ایک مسلمان صادق کو اپنی اولاد کی طرح کرنی چاہیے۔ اور ایک باپ جس طرح اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کے مرحلہ میں پیار ومحبت اور موعظت و نصیحت کرتا ہے اور گاہے سختی سے جھڑکتا اور تہدید کرتا ہے، اسی طرح یتیم کے کفیل کو بھی اس کے ساتھ کرنا چاہیے۔ تاکہ اسے باادب انسان اور معاشرے کا اچھا فرد بنا سکے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ، وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ۔ (البقرۃ:۲۲۰)

ترجمہ:۔ اور تم سے یتیموں کا مسئلہ پوچھتے ہیں، تم فرمائو ان کا بھلا کرنا بہتر اور اگر اپنا ان کا خرچ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور خدا خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے۔

معجم طبرانی میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

''کن وجوہ سے میں اس یتیم کو مار سکتا ہوں، جو میری سرپرستی میں ہے؟ آپ نے فرمایا: جن وجوہ سے تم اپنی حقیقی اولاد کو مار سکتے ہو (نیز آپ نے فرمایا) خبردار! اپنے مال کو بچانے کی خاطر اس کا مال برباد نہ کرنا اور نہ اس کے مال سے اپنی جائیداد بنانا''۔ (معجم طبرانی)

گویا اپنی اولاد کو جس طرح تعلیم و تربیت کے لیے اور تہذیب و شائستگی سکھانے کے لیے مارا جاسکتا ہے، اسی طرح جس یتیم و یسیر کی کفالت تمہارے ذمہ ہے، اس کی تعلیم و تربیت کے لیے اسے بھی تم سرزنش کرسکتے ہو۔ اس لیے کہ ادب آموزی کے لیے بچے کو مارنا، اس کے حق میں رحمت ہے۔ کوئی باپ اپنی اولاد کو علم و ادب سے بہتر دولت نہیں دے سکتا۔ سیدی و آقائی مولائے کائنات علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کا ارشاد ہے کہ:

''تعلیم و تربیت کے لیے باپ کا اپنی اولاد کو مارنا، خشک زمین پر برسنے والی بارانِ رحمت کے مثل ہے''۔

اس لحاظ سے خوش نصیب اور نیک بخت ہے وہ مرد مسلمان، جو کسی یتیم کو تعلیم و تربیت سے آراستہ و پیراستہ کرنے میں جد وجہد کرتا ہے۔ ہر شخص کو اپنی حقیقی اولاد سے تو فطری لگائو اور قلبی محبت ہوتی ہے۔ مگر اُن بے سہارا جانوں پر محض خدا کی خوش نودی کے لیے مساعیٔ

جمیلہ صرف کرنے والا انسان ضرور رب تعالیٰ کا کوئی نیک بندہ ہوگا۔

یتیم کے مال کی حفاظت:

مال ودولت کسی غیر کا ہو تو بلا اجازت تصرف جائز نہیں، چہ جائے کہ کسی یتیم و یسیر کا مال۔ اس میں خیانت یا بد معاملگی سخت ترین حرام ہے۔ اس بارے میں قرآنی احکام ملاحظہ کیجیے:

سورۂ انعام میں رب تعالیٰ نے جہاں کئی حرام کاموں کا ذکر فرمایا ہے، اسی کے ساتھ بدنیتی سے یتیم کی دولت کے قریب جانے کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ اس مقام پر سب سے پہلے یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، مفلسی کے باعث اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق عطا فرماتے ہیں، انھیں بھی دیں گے، کھلی ہوئی اور پوشیدہ بے حیائیوں کے پاس نہ جاؤ، اور جس جان کی اللہ نے حرمت رکھی ہے اسے ناحق نہ مارو، یہ تمہیں حکم فرمایا ہے تاکہ سمجھو۔

اس کے بعد ارشادِ رب العالمین ہے:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ۔ (الانعام:۱۸۳)

ترجمہ:۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر بہت اچھے طریقہ سے، جب تک وہ اپنی جوانی کو پہنچے۔

یتیم کے مال کی حفاظت کا اہتمام اپنے مال اور دولت سے زیادہ کرنا چاہیے۔ اور ان کے حقوق وامانت میں بہت زیادہ خوفِ خدا رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ وہ دل شکستہ روح ہے، جس کا اضطراب اور بے چینی رب تعالیٰ کو بھی ناگوار ہے۔ جہاں تک ممکن ہو، اپنی روزی میں سے اسے کچھ حصہ دے کر اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ہرگز نہ ہو کہ ان کے مال کا کوئی حصہ ناجائز تصرف میں آجائے اور دانستہ یا نادانستہ یتیم کی امانت میں خیانت کا جرم عائد ہوجائے۔ یہ اکبر کبائر گناہوں میں سے ایک ہے۔ قرآنی فرمان ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا O (النساء:۱۰)

ترجمہ:۔ وہ جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ تو اپنے پیٹ میں خالص آگ بھرتے ہیں اور کوئی دم جاتا ہے کہ بھڑکتے دھڑے (دوزخ) میں جائیں گے۔

صحیحین میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اجتنبوا السبع الموبقات سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون کون سی چیزیں ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، سحر کرنا، محترم جان کو بلا وجہ قتل کرنا، سود کھانا، (واکل مال الیتیم) اور یتیم کا مال کھانا، کفار سے جہاد کے وقت پشت دکھانا، مومن، پاک دامن غافل عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا''۔ (صحیح البخاری، کتاب الوصایا)

اور سدی نے کہا کہ یتیم کا مال کھانے والا قیامت کے روز اس طرح اٹھایا جائے گا کہ آگ کی لپٹ اس کے منہ سے نکلتی ہوگی اور اس کے کان آنکھ اور ناک سے آتشیں آثار نمایاں ہوں گے، جن کو دیکھنے والا سمجھ جائے گا کہ اس نے دنیا میں یتیم کا مال کھایا ہے۔

ابو بُرزہ اسلمی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے روز ایک قوم اپنی قبروں سے نکلے گی، بایں حال کہ آگ کا دھواں اس کے منہ سے نکلتا ہوا (دھونکنی کے مثل) عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: تم نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا، الخ''۔

غیر اسلامی ماحول میں یتیم کے ساتھ نت نئے طریقوں سے ظلم کیا جاتا تھا۔ جب کسی کا باپ مرجاتا تو چچا یا بڑے بھائی سب دولت پر قبضہ کر لیتے اور نابالغوں یا چھوٹوں کو ان کا حق نہیں دیتے تھے۔ یا مویشی اور جانوروں کی تقسیم کے وقت یتیموں کو گنتی پوری کرنے کے لیے لاغر اور کمزور مویشی دے دیتے تھے اور فربہ و تنومند کار آمد جانوروں پر خود قبضہ کر لیتے تھے۔ یا ایسا ہوتا کہ یتیموں کی دولت کو حفاظت کے نام پر اپنی دولت میں خلط ملط کر لیتے تھے اور رفتہ رفتہ کرکے ان کا مال ہڑپ کر جاتے تھے۔ اور آج بھی خدائی قوانین کی پرواہ نہ کرنے والے، ایسی مہلک حرکتوں میں مبتلا ہیں۔ رب کائنات نے ان تمام حرکتوں پر سخت نکتہ چینی کی اور حرام قرار دے کر سختی سے روکا۔ اور واضح کر دیا کہ یہ تمام حرکتیں بہت عظیم گناہ اور سخت عذاب کا موجب ہیں۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ، وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا○ (النسائ:۲)

ترجمہ:۔ اور یتیموں کو ان کے مال دے دو، اور ستھرے کے بدلے گندہ نہ لو، اور ان کے مال اپنے مالوں میں ملا کر نہ کھا جائو، بے شک یہ بڑا گناہ ہے۔

جس کے پاس کسی یتیم کی امانت ہو، اسے اس کا مال کب دے دینا چاہیے۔ اور امانت کو اپنے پاس کس طرح رکھنا چاہیے۔ اور اس سلسلہ میں کن آفات و فتن سے بچنا ضروری ہے۔ ربانی تعلیمات اس سلسلہ میں ہدایات دے رہی ہیں:

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا۔ (النساء:۶)

ترجمہ:۔ اور یتیموں کو آزماتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کے قابل ہوں، تو اگر تم ان کی سمجھ ٹھیک دیکھو تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو اور انھیں اسراف سے نہ کھائو اور اس جلدی میں کہ کہیں بڑے نہ ہو جائیں گے۔

اس آیت پاک سے یتیم کے مال کی واپسی کا وقت اور اس کی شرائط معلوم ہوئیں۔ ان میں کی ایک بلوغ ہے اور دوسری رشد، جب یہ دونوں پالی جائیں تو انھیں ان کے مال حوالے کر دیے جائیں۔ رشد کا مطلب مالی انتظام اور کاروبار کی سوجھ بوجھ ہے۔ اس صلاحیت کو آزمانے کے لیے دولت کا قلیل حصہ دے دیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس سلسلہ میں وہ کیا ہونہاری ظاہر کرتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کاروبار اور معاملاتی امور میں اس سے مشورہ طلب کیا جائے۔ اگر اس کی رائے میں سنجیدگی، متانت، عقل مندی ہو اور صلاحیت و قابلیت کے لحاظ سے اسے پختہ پایا جائے تو اس کی امانت اس کے حوالے کر دی جائے۔

موعظت ربانی:

سبحان اللہ! سبحان اللہ! قربان جائیے قرآن مجید کے اندازِ نصیحت پر۔ یتیموں کے حقوق کی ادائیگی، ان کے اموال کی حفاظت اور امانتوں کی ادائیگی کے احکام میں کتنا انذار اور تہدید کا انداز اپنایا گیا ہے۔ اور سورۂ نساء میں ان احکامات اور وصیت کے بارے میں فرمان جاری فرمایا گیا ہے۔ اور عجیب نفسیاتی انداز سے ایک مردِ مومن کے دل کو لرزا دینے والا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ کہ اے یتیموں کے معاملات میں ناعاقبت

اندیشی کرنے والو! ان مجروح دلوں پر نمک پاشی کرنے والو! انھیں کمزور ومجبور سمجھ کر ظلم وستم کا نشانہ بنانے والو! کس خوابِ غفلت میں سرمست ہو؟ میرے جن نحیف ونزار کم سنوں پر تم جور وتعدی کر رہے ہو، ذرا ان کی جگہ اپنے جگر گوں کو، اپنے نورِ چشم کو فرزندوں کو رکھ کر تو غور کرو! اور خدا کی خشیت سے قلوب کو لبریز کرکے تو سوچو! تمہاری سرکشی کا زہر آب ہوجائے گا۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا O (النساء:۹)

ترجمہ:۔ اور ڈریں وہ لوگ اگر اپنے بعد ناتواں اولاد چھوڑتے تو ان کا کیسا انھیں خطرہ ہوتا، تو چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کریں۔

سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ کا حضرت خضر سے ان کے علومِ تکوینی کے سلسلہ میں استفادہ کے واسطے ملاقات کا واقعہ مفصل آیا ہے۔ جس میں یہ بھی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ کے حکم سے قریہ کے اندر مکان کی ایک گرتی ہوئی دیوار کو درست کر دیا۔ اس دیوار میں دو یتیموں کا دفینہ محفوظ تھا، جو اُن کے صالح آباء میں سے کسی نے رکھا تھا۔

حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ وہ ایک سونے کی ٹھوس تختی تھی، جس پر لکھا تھا "بسم اللہ الرحمن الرحیم"۔ سخت تعجب ہے کہ تقدیر پر ایمان رکھنے والا غمگین کیوں ہوتا ہے؟ تعجب ہے کہ موت پر یقین رکھنے والا خوشی کیوں مناتا ہے؟ اور تعجب ہے کہ جس نے دنیا کو اور اس کی گردشوں کو لوگوں کے ذریعہ پہچان لیا، وہ اس پر مائل کیوں ہوتا ہے؟ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ ابن جریر جعفر ابن محمد کا قول نقل کرتے ہیں کہ ان دونوں یتیموں کے مال کی حفاظت ان کے باپ کے صالح ہونے کی وجہ سے کی گئی، خود ان یتیموں کے عمل کے باعث نہیں۔ اور وہ صالح مرد بھی ان کے آبا میں سات پشت پہلے گزرا تھا اور پیشہ کے لحاظ سے نور باف تھا۔ اس سے مفسرین قرآن نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ صالح انسان کی نیک نفسی کا اثر نسلوں میں دیر تک قائم رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے ہم سائے بھی فیض یاب ہوتے ہیں"۔ (تفسیر ابن کثیر)

مولا عزوجل ہمیں یتیموں کے حقوق کی رعایت اور ان کے بارے میں خدا ترسی کی توفیق سے نوازے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سید المرسلین خاتم النبیین انیس الیتمی والمساکین وعلیٰ آلہ وعترتہ وصحبہ اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین۔

صراطِ مستقیم

دین اسلام اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کے ساتھ سرچشمۂ خیر وبرکت ہے۔ فطرتِ انسانی کے عین مطابق، سہل و آسان، سیدھا راستہ ہے۔ اس میں کجی اور ٹیڑھا پن نہیں۔ تخلیق انسانی کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ محض یہی دین ہے۔ رضائے الٰہی کی راہیں اسی نے کشادہ کی ہیں۔ اور امتحان گاہِ ہستی سے کامیاب و کامران گزر کر، رب کائنات کے غفران ورضوان میں جابسنے کے واضح اصول اسی کے پاس ہیں۔ اس لیے قرآنی زبان میں اسے "صراطِ مستقیم" بھی فرمایا گیا ہے۔ صراطِ مستقیم، یعنی سیدھا راستہ اور خوف وخطر سے آزاد راستہ۔

ہادی حقیقی محض اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی اپنی حکمت کی رُو سے جسے چاہتا ہے ہدایت سے بہرہ ور فرماتا ہے اور بد باطنوں کو ضلالت میں ڈال دیتا ہے۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت پانا، رب تعالیٰ کا بہت عظیم انعام واکرام ہے۔ دنیا وآخرت کی سرفرازیاں، کامیابیاں سب اسی سے متعلق ہیں۔

ہدایت الٰہیہ کی تقسیم کے ذرائع میں ذاتِ رسول سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی ہیں اور قرآن مجید بھی۔

حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں رب تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتا ہے:

وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (الشوریٰ:۵۲)

ترجمہ:۔ اور تم اے محبوب! ضرور سیدھی راہ کی ہدایت کرتے ہو۔

سورۂ جمعہ میں آیا:

هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (الجمعۃ:۲)

ترجمہ:۔ وہی (اللہ) ہے، جس نے ان پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا کہ ان پر اس کی آیتیں پڑھے، اور انھیں پاک کرتے ہیں، اور انھیں کتاب و حکمت کا علم عطا فرماتے ہیں۔

یہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شانِ ہدایت ہے کہ جہل غبارت کی اندھیریوں میں گم گشت گانِ راہ، معلمین زمانہ بن گئے۔ علم و دانائی سے کوسوں دور وحشیانہ ماحول کے عاری، شرک و بت پرستی کی غلاظتوں میں لت پت، ہادی و مزکی رسول کے ذریعہ صراطِ مستقیم پا گئے۔

قرآن مجید کلامِ الٰہی بھی ہادی ہے۔ ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى۔ (البقرۃ:۲)

ترجمہ:۔ ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت ورہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں ہیں۔

سورۂ اسراء میں ہے:

اِنَّ الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا۔ (الاسراء، بنی اسرائیل:۹)

ترجمہ:۔ قرآن اس راستے کی ہدایت دیتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور ایمان والوں کو خوش خبری دیتا ہے جو اچھے کام کریں کہ ان کے لیے بڑا ثواب ہے۔

نبوی و قرآنی ہدایت کے انوار نے دنیا میں توحید کا اجالا پھیلا دیا۔ دنیوی زندگی میں خدائی قوانین کا نظام محکم قائم کر کے انسانیت کو معراجِ کمال عطا کر دیا۔ مگر کیا...؟ قرآن کا ہر قاری ہدایت یاب ہوتا ہے؟ اور کیا دعوتِ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہر مدعو نے ہدایت کی دولت حاصل کرلی؟ ظاہر بات ہے کہ نہ ہر قاریٔ قرآن ہدایت یاب ہوا، نہ ہر مدعوئے رسول کو صراطِ مستقیم نصیب ہوئی۔ ہدایت موہبتِ ربانی ہے۔ قرآن سے دولت ہدایت بھی محض وہی لوگ پاتے ہیں، جو خدا کی مرضی و حکمت میں قابل ہدایت ہیں۔ اسی طرح حضور رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، رب تعالیٰ کے نمائندے، ترجمان اور فنافی اللہ ہیں۔ اس لیے آپ کے ذریعہ انہی خوش بختوں کو ہدایت ملتی ہے، جن کے لیے خدا کا ارادہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں حضور سے عدمِ ہدایت کا ذکر ہے، ہر جگہ اسی مفہوم میں ہے۔

قرآن مجید میں سورۂ فاتحہ کی پانچویں آیت ہے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ (الفاتحہ:۵)

ترجمہ:۔ چلا ہم کو سیدھے راستے پر۔

علمائے مفسرین نے بیان فرمایا ہے کہ ہدایت کے بے شمار مدارج ہیں۔ ایک سے ایک بلند اور اعلیٰ ترین۔ لغت میں ہدایت ''مہربانی اور عنایت سے کسی کو منزلِ مقصود تک پہنچانا'' ہے۔ اور ''صراطِ مستقیم'' عربی زبان میں ایسی راہ کو کہتے ہیں، جس میں کوئی کجی اور دشواری نہ ہو۔

راہِ آخرت میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسی ہی رہنمائی فرمائی کہ کوئی شک و شبہ، کجی اور زیغ باقی نہ رہا۔ بلکہ دین کا منور چہرہ دنیا کے سامنے آگیا۔ راہِ بہشت صاف صاف واضح ہوگئی۔ رضائے خداوندی کے اصول و ضوابط کھول کھول کر بیان فرمادیے۔ اور قلوب و اذہان پر حملہ کرنے والے مخفی دشمنوں، یعنی شیطان اور نفس کے خطرات سے بھی آگاہ کردیا۔ یہ بھی سمجھا دیا کہ یہ راہ، اصلاحِ قلب اور انوارِ اطاعت سے آسان ہوتی ہے۔

بندۂ مومن بار بار رب کائنات سے ہدایت اس لیے طلب کرتا ہے کہ ایمان و ایقان کے بلند مراتب اور اعلیٰ درجات پائے، وہ درجات ایمان واحسان سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ فرائض و واجبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ خلوصِ یقین کا مرتبہ پانا اور اس میں ترقی کرتے چلے جانا، یہ مسلم و مومن کا مقصود ہوتا ہے۔ ان درجات کے حاصل کرنے والوں ہی کو اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ ان بندگانِ خدا کے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ گروہ ہیں۔ سب سے اعلیٰ ترین گروہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہے، پھر تابعین کا۔ معرفتِ الٰہیہ کی کوئی حد تو ہے نہیں، اپنی اپنی بساطِ پرواز کے لحاظ سے ہر طالب کو منازل نصیب ہوتی ہیں۔ گویا بندہ نعمت ایمان کے حصول کے بعد صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرتا ہے اور حمد و ثنا میں خلوص وللّٰہیت برتتا ہے تو ایقان اور احسان کے مرتبہ پر جا پہنچتا ہے۔ اور جو جتنی بلندی پر پہنچ جاتا ہے، اس سے اور عالی درجہ کے لیے حضورِ رب العالمین گڑگڑاتا ہے کہ یارب! مجھے اور ترقی عطا فرما۔ حتیٰ کہ بندہ کا وقتِ اخیر آجاتا ہے۔ زندگی کے دن پورے ہوجاتے ہیں اور یہ لامتناہی سفر ختم نہیں ہوتا۔

تفسیر ابن کثیر میں علامہ عماد الدین ابوالغداء اسماعیل بن بشیر دمشقی، متوفی ۷۷۴ھ فرماتے ہیں:

''اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ مومن کے لیے ہدایت یافتہ ہونے کے باوجود، ہدایت کی دعا کے کیا معنی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بندہ ہمہ وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے، ایمان کی پختگی اور استمرار کے لیے۔ اس لیے رب تعالیٰ نے اسے ارشاد فرمایا کہ ہمیشہ ثبات قدمی اور ترقی ایمان کی توفیق مانگتا رہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ایمان داروں کو ایمان کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ'' اور اس کا مقصود، ایمان کو مضبوط و مستحکم اور اس پر ثبات قدمی بخشنے والے اعمال پر مداومت ہے''۔ (مختصر تفسیر ابن کثیر للعلامہ عماد الدین ابوالغداء اسماعیل بن بشیر دمشقی، متوفی ۷۷۴ھ، تلخیص و اختصار محمد علی الصابونی استاذ التفسیر جامعۃ الملک عبدالعزیز، مکۃ المکرمۃ، مطبوعہ دارالقرآن، بیروت، ج۱ر ص۲۴)

ہدایت کے قرآنی مفاہیم:

ہدیٰ:(ہدایت) اپنے مختلف صیغوں میں قرآن مجید کے اندر ۲۷۷/ دو سو ستہتر مقامات پر آیا ہے۔ قرآن کے رمز آشنا علمائے مفسرین کی تصریح کے مطابق سولہ معنوں میں استعمال ہوا ہے، جنھیں ہم تمثیلی آیات کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

(۱)... ہدیٰ: بیان کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)۔۔۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (البقرۃ:۵)

وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

(۲)۔۔۔ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ۔ (السجدہ، فصلت:۱۷)

اور رہے ثمود تو ہم نے انھیں ہدایت کی راہ دکھائی۔

(۳)۔۔۔ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ۔ (الاعراف:۹۹)

اور کیا وہ جو زمین کے مالکوں کے بعد اس کے وارث ہوئے انھیں اتنی ہدایت نہ ملی کہ ہم چاہیں

تو انھیں ان کے گناہوں پر آفت پہنچائیں۔

(۲)۔۔۔ ہدیٰ: دین اسلام کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)۔۔۔ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ۔ (الاعراف:۹۹)

بے شک تم راہِ ہدایت (اسلام) پر ہو۔

(۲)۔۔۔ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ (الحج:۶۸)

تم فرمادو! اللہ ہی کی ہدایت، ہدایت ہے۔

(۳)۔۔۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ۔ (البقرۃ:۱۲۰)

تم فرمادو کہ اللہ ہی کی ہدایت، ہدایت ہے۔

(۳)۔۔۔ ہدیٰ: ایمان کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)۔۔۔ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى۔ (آل عمران:۷۳)

اور جنھوں نے ہدایت پائی اللہ ان کی اور ہدایت بڑھائے گا۔

(۲)۔۔۔ اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى۔ (مریم:۷۶)

کیا ہم نے تمہیں روک دیا ہدایت سے۔

(۴)۔۔۔ ہدیٰ: ہادی اور داعی کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)۔۔۔ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (سبا:۲۳)

اور بے شک تم ضرور سیدھی راہ بتاتے ہو۔

(۲)۔۔۔ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ (الشوریٰ:۵۲)

تم تو ڈر سنانے والے ہو اور ہر قوم کے ہادی۔

(۳)۔۔۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا۔ (الرعد:۷)

اور ہم نے انھیں امام کیا کہ ہمارے حکم سے بلاتے (دعوتِ دین دیتے) ہیں۔

(۴)... وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰی اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ۔ (الرعد:۷)

اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے کہ حق کی راہ بتاتا ہے۔

(۵)... وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ۔ (الانبیاء:۷۳)

اور ہمارے بنائے ہوؤں میں ایک گروہ وہ ہے کہ حق بتائیں اور اس پر انصاف کریں۔

(۶)... یَهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (الاعراف:۱۵۹)

کتابِ خدا (قرآن) حق اور سیدھی راہ دکھاتی ہے۔

(۷)... اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ۔ (الاحقاف:۳۰)

ہم نے ایک عجیب قرآن سنا کہ بھلائی کی راہ بتاتا ہے (یعنی صراطِ مستقیم کی دعوت دیتا ہے)

(۸)... فَاهْدُوْهُمْ اِلٰی صِرَاطِ الْجَحِیْمِ۔ (الجن:۲)

ان سب کو ہانکو، راہِ دوزخ کی طرف۔

(۵)... ہدیٰ: معرفت کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)... وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ۔ (الصافات:۲۳)

اور علامتیں اور ستارے سے وہ راہ پاتے ہیں۔

(۲)... وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی۔ (النحل:۱۶)

اور بیشک میں بہت بخشنے والا ہوں اسے جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھا کام کیا، پھر ہدایت پر رہا۔

(۳)... نَنْظُرْ اَتَهْتَدِیْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ۔ (طٰہٰ:۸۲)

ہم دیکھیں کہ وہ راہ پاتی ہے یا ان میں ہوتی ہے جو ناواقف رہے۔

(۶)... ہدیٰ: رسل اور کتاب کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)... فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی۔ (النحل:۴۱)

پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے (رسل و کتب)

(۲)... فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (البقرۃ:۳۸)

تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا، اسے نہ کوئی اندیشہ نہ کوئی غم۔

(۷)... ہدیٰ: ہدایت اور رشد کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)... عَسٰی رَبِّیْۤ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ۔ (القصص:۲۲)

قریب ہے کہ میرا رب مجھے سیدھی راہ بتائے۔

(۲)... اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى۔ (طہٰ:۱۰)

یا آگ پر راستہ پاؤں۔

(۸)... ہدیٰ: حکم محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)... اَلَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى۔ (البقرۃ:۱۵۹)

وہ جو ہماری اتاری ہوئی روشن باتوں کو چھپاتے ہیں۔

(۲)... وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى۔ (محمد:۳۲)

اور رسول کی مخالفت کی، بعد اس کے کہ ہدایت ان پر ظاہر ہو چکی تھی۔

(۹)... ہدیٰ: قرآن مجید کے مفہوم میں۔ جیسے:

(۱)... لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى۔ (النجم:۲۳)

حالاں کہ بے شک ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آئی۔

(۲)... وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى۔ (الکہف:۵۵)

اور آدمیوں کو کس چیز نے روکا کہ ایمان لاتے، جب ہدایت ان کے پاس آئی۔

(۱۰)... ہدیٰ: توریت کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)... وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى۔ (المؤمن:۵۳)

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو رہنمائی عطا فرمائی۔

(۲)... وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ (السجدۃ:۲۳)

اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت کیا۔

(۱۱)... ہدیٰ: معصیت کے وقت استرجاع کے مفہوم میں۔ جیسے:

(۱)... اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ (البقرۃ:۱۵۷)

یہ لوگ ہیں، جن پر ان کے رب کی درودیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔

(۲)... وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ۔ (التغابن:۱۱)

اور جو اللہ پر ایمان لائے، اللہ اس کے دل کو ہدایت فرما دے گا۔

(۱۲)... ہدیٰ: حجت کی طرف عدمِ ہدایت، یعنی انتظام عن الحجۃ کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)... فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (البقرۃ:۲۵۸)

تو ہوش اُڑ گئے کافروں کے اور اللہ راہ نہیں دکھاتا ظالموں کو۔

(۱۳)... ہدیٰ: توحید کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)... وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعُ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا۔ (القصص:۵۷)

اور کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں تو لوگ ہمارے ملک میں ہمیں اچک لے جائیں گے۔

(۲)... هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ۔ (التوبۃ:۳۳)

وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا۔

(۱۴)... ہدیٰ: سنت اور طریقہ کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)... اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ (الزخرف:۲۲)

ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم ان کی لکیر پر چل رہے ہیں۔

(۲)... اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ۔ (الانعام:۹۱)

یہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی تو تم انھیں کی راہ چلو۔

(۱۵)... ہدیٰ: عدمِ ہدایت اور عدمِ اصلاح کے معنی میں۔ جیسے:

(۱)... وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ۔ (یوسف:۵۲)

اور اللہ دغابازوں کا مکر نہیں چلنے دیتا۔

(۱۶)... ہدیٰ: ہدایت اور الہام کے مفہوم میں۔ جیسے:

(۱)... رَبُّنَا الَّذِىْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔ (طٰہٰ:۵۰)

ہمارا رب وہ ہے، جس نے ہر چیز کو اس کے لائق صورت دی پھر راہ دکھائی۔

(۲)... وَالَّذِىْ قَدَّرَ فَهَدٰى۔ (الاعلیٰ:۳)

جس نے اندازہ پر رکھ کر راہ دی۔

''ہدایت'' دین اسلام، ایمان اور بیان وقرآن کے معانی میں آکر ہمارے پورے اصولِ حیات اور قوانین زندگی کی تشریح کرتی ہے۔ اور اگر اس کی تفصیل میں اتریے تو دین و دانش کا کوئی شعبہ ہدایت سے خارج نہیں۔

یقیناً اسلام، عقائد واعمال ہر ایک کو جامع ہے۔ دینی ضرورت کا کوئی گوشہ اور دنیوی معاملات کا کوئی جزیہ اقتصاد، معاش، سیاست، تجارت، صنعت و حرفت۔ الغرض مہد سے تا لحد کوئی ایسا سوال نہیں جس کے جواب میں اسلام ہادی بن کر نہ کھڑا ہو۔ بلکہ اس سے بہت بلند ہو کر دنیوی زندگی کے خاتمہ کے بعد برزخی دنیا کی تفصیلات اور پھر حشر ونشر کو بھی قبل از وقت اس وضاحت سے پیش کرتا ہے کہ گویا سننے اور پڑھنے والا سامنے مناظر آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

گویا دینی ہدایت کا گنجینہ بھی اسلام ہے۔ اور دنیوی ہدایت کا سرچشمہ بھی اسلام ہے۔ اور ہادیٔ برحق سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس ہدایت کے داعی، مبلغ اور رہنما بن کر تشریف لائے اور ذات وصفاتِ رسول خود سراپا ہدایت ہے۔ ''ہدایت'' کے مذکورہ بالا تمام قرآنی معانی پر غور فرمائیے! ذاتِ محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہر ایک کا کسی نہ کسی طرح تعلق موجود ہے۔

بیانِ قرآن تو حضورِ اقدس فداہ امی وابی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خاص شان ہے۔ اور منصب رسالت کے فرائض میں ایک اہم ترین فریضہ، بیانِ قرآن کا ہے۔ سرکار ہی نے قرآن عظیم کے ابدی حقائق اور محکم صداقتوں سے انسانیت کو روشناس فرمایا۔ سید دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس خصوصیت کا ذکر قرآن مجید خود فرماتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ O (النحل:۴۶)

ترجمہ:۔ اور اتارا ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) تاکہ آپ اے میرے رسول! کھول کر بیان کریں لوگوں کے لیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے ان کی طرف تاکہ وہ غور کریں۔

دوسری جگہ ہے:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ (المائدۃ:۱۵)

ترجمہ:۔ اور ہم نے تم پر کتاب نہ اتاری مگر اس لیے کہ تم لوگوں پر روشن کردو جس چیز میں اختلاف کریں۔

قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ۔

(مختصر تفسیر ابن کثیر، ج:۱ر ص:۲۳)

ترجمہ:۔ (اے اہل کتاب!) بے شک تمہارے پاس ہمارے یہ رسول تشریف لائے کہ تم پر ظاہر فرماتے ہیں بہت سی وہ چیزیں جو تم نے کتاب میں چھپا ڈالی تھیں۔

آیاتِ بالا اور قرآن مجید کی بہت سی آیات سے سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا منصبِ تبیینِ قرآن پر فائز ہونا واضح ہے۔

ہر آئینہ ہدایت:

اسی طرح تمام معانی پر غور کیجیے تو ذاتِ ختم الرسل سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر آئینہ روشن و تابناک سامانِ ہدایت ہے۔ اس مقام پر محض اشارہ کر رہا ہوں۔ خدا توفیق بخشے کہ اس عنوان کو مزید قرآنی دلائل کی روشنی میں منظر عام پر لائوں۔

دین اسلام: کیا ہے؟۔ پیغامِ خدا، پیغامِ رسول، اقوال واعمال سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

ایمان: اور جانِ ایمان حضور ہی ہیں۔

ہادی و داعی: ذاتِ مصطفیٰ ہے۔

معرفت: کا حصول، اسلام وایمان اور وسیلۂ رسول ہی سے ہے۔

فخر رسل: آپ ہیں۔ امام الانبیا آپ ہیں۔

رشد وہدایت: حضور کا منصب ہے۔ حضور مرشد راہِ حق اور صراطِ مستقیم کے ہادی ہیں۔

توریت: میں بھی ذکر رسول موجود ہے۔ وہ بھی اصل حالت میں قرآن ہی کی طرح خدا کی کتاب ہے۔

معصیت: سے بچا کر راہِ حق اور فضل و انعام الٰہی کی جانب لانے والے، حضور ہی تو ہیں۔

باغیانِ رسول: دلائل قرآنی اور معجزاتِ نبوی دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے۔

توحید: ہی رسولِ اکرم اور جملہ انبیا و رسل کی بنیادی دعوت ہے (علیہم السلام)

سنن حسنہ: کو قائم رکھنے اور سنن سیئہ کو مٹانے والے حضور ہیں۔

خیانت: اور دغا، فریب شریعت محمدیہ میں بھی ہدایت حقیقی کی راہ میں حائل ہونے والے روڑے ہیں۔

ملہم اللہ: حضورِ اقدس ہی رب تعالیٰ کے اعلیٰ ترین ملہم الیہ ہیں۔ حضور کے صدقے وجود پذیر ہو کر ہر شئے ہدایت و الہام سے بہرہ ور ہے۔

''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

''صراطِ مستقیم کا خلاصہ اگر کسی ایک شئے کو کہنا چاہیں تو وہ اللہ اور رسول کی اطاعت ہے''۔ (مختصر تفسیر ابن کثیر، ج ۱ ص: ۲۳ و ص ۲۴)

ایک روایت یہ ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد کتاب اللہ ہے۔

ایک قول کے مطابق صراطِ مستقیم اسلام ہے۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ''وہ دین ہے کہ جس میں کوئی کجی نہیں''۔

ابن حنفیہ نے فرمایا کہ ''صراطِ مستقیم وہ اللہ کا دین ہے، جس کے سوا اور کوئی دین بندوں کی طرف سے خدائے تعالیٰ کے حضور مقبول نہیں''۔

مجاہد کا قول ہے کہ ''صراطِ مستقیم ''حق'' کو کہتے ہیں''۔

کنزالایمان میں ہے کہ ''صراطِ مستقیم سے مراد اسلام یا قرآن یا خلق نبی یا حضور کے آل و اصحاب ہیں''۔

(کنزالایمان ترجمہ امام احمد رضا قادری و مفسرہ مولانا نعیم الدین مرادآبادی، ص ۳)

مذکورہ تمام معانی میں کوئی اختلاف نہیں۔ صراطِ مستقیم شریعت اسلام احکامِ الٰہیہ اور دین حق کی وہ شاہ راہ ہے، جو ہر زمانے ہر ماحول کی رہنمائی اور منزل رسی کی ضمانت ہے۔ اور آگے کی آیت نے اس کے مفہوم کو اور زیادہ روشنی بخش دی۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ (الفاتحہ: ۷)

ترجمہ:۔ ان کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔

مینارِ ہدایت:

لفظ صراط نے تمام اسلامی و قرآنی تعلیمات و ہدایات کو احاطہ کر لیا۔ مگر رحمٰن و رحیم پروردگار نے مزید شفقت و کرم فرما کر ان تعلیمات و ہدایات کے عملی نمونوں کو بھی صاف صاف بتا دیا۔ وہ عملی نمونے ملائکہ اور عالم بالا کی مخلوقات سے نہیں، بلکہ انسانی روح و قالب میں، بشری شکل و صورت میں ہیں۔ وہ انعام یافتہ لوگ کون ہیں...؟

مفسرین کرام نے سورۂ نساء کی اس آیت مبارکہ سے تعیین فرمائی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ (النساء:٦٨)

ترجمہ:۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا، جن پر اللہ نے فضل کیا، یعنی انبیا اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

انعام و فضل والوں کی تعیین اس آیت مبارکہ نے فرمادی کہ انعام پائے ہوئے لوگ انبیا و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم ہیں۔ جن کے واقعات و حالات، منصۂ عالم پر آفتاب وماہتاب کی طرح آشکار ہیں۔ ان میں خاص طور سے اس پاکیزہ جماعت کے پاکیزہ ترین سردار حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، جن کی سیرتِ مبارکہ اقوال و افعالِ طیبہ کا ایک ایک جزئیہ محفوظ ہے۔ پھر آپ کے نائبینِ حقیقی، صحابۂ کرام، اہل بیت، دل سے خدا و رسول کی سچی تابعداری کرنے والے صدیقین اور راہِ حق میں اپنی قیمتی جان کا نذرانہ بارگاہِ رب الصمد میں پیش کردینے والے شہدا اور قیامت تک اسلام و ایمان، قرآن و شریعت کو سینے سے لگا کر رکھنے والے اہل تقویٰ، صالح اور پرہیزگار مسلمان اولیائے کرام، بزرگانِ دین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ورحمہم اللہ تعالیٰ۔

گویا یہ برگزیدہ بندگانِ حق کا گروہ، ایمان وفضل والا گروہ ہے۔ جن کی راہ صراطِ مستقیم ہے۔ جن کا طریقہ، طریقۂ ہدایت ہے۔ جن کی زندگی کے نقوش، نقوشِ راہِ ہدیٰ ہیں۔ خدا کے فضل وانعام کا استحقاق زورِ بازو کے ذریعہ نہیں، محض موہبتِ ربانی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ آج کے دور میں اسلام اور قوانین شرعیہ کو مغربی نظریات کی روشنی میں دیکھنے والوں نے نہایت سخت، مشکل اور ناقابل عبور سمجھ رکھا ہے۔ رب کائنات نے سورۂ فاتحہ ہی کے اندر اس فتنہ کا انسداد فرماکر واضح فرمادیا ہے کہ رب تعالیٰ کے بندوں نے، اسی زمین پر، اسی آسمان کے نیچے، بشری حدود میں رہ کر، صراطِ مستقیم کی ہدایت حاصل کی ہے۔ اور وہ محض چند ایک ہی نہیں، بہت کثیر ہیں۔ لہٰذا آج بھی رضائے الٰہی کے طالبین اگر چاہیں تو ان کے نقش قدم کو اپنا کر یقیناً شاہ راہِ ہدیٰ پر گامزن ہوسکتے ہیں۔

جرأت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

خدائے تعالیٰ کے لیے کذب اور ہر عیب ناممکن

قرونِ اولیٰ سے تاہنوز تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ جھوٹ سے پاک ہے اور صرف جھوٹ ہی نہیں، ہر عیب اور نقص سے اس کی ذاتِ عالی منزہ و مبرہ ہے۔ اس کے حق میں کذب یا کسی قبح و نقص کا امکان بھی صحیح نہیں ہے۔ بلکہ کذب اور ہر عیب اور نقص اس کے لیے محال ہے۔

خود پاک بے نیاز رب ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا○ (النساء:۸۷)

ترجمہ:۔ اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہے۔

اسی سورۂ مقدسہ میں دوسرے مقام پر فرمانِ رحمٰن ہے:

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَّمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا○ (النساء:۱۲۲)

ترجمہ:۔ اللہ کا وعدہ سچا اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہے۔

سورۂ آل عمران میں ذوالجلال اکرام پروردگار ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ○ (آل عمران:۹)

ترجمہ:۔ بے شک اللہ کا وعدہ نہیں بدلتا۔

اسی سورۂ مبارکہ میں آگے ایک مقام پر اپنی تنزیہ و تقدیس خود بیان فرماتا ہے:

اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ○ (آل عمران:۱۹۴)

ترجمہ:۔ بے شک (اے رب) تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

اسی سورۂ آل عمران ہی کے اندر جہاں حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے بارے میں سرکار حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مباہلہ کرنے کے لیے فرمایا جارہا ہے، جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے۔ اسی مقام پر پاک پروردگار کاذب پر اپنی لعنت فرمارہا ہے۔

فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ۔ (آل عمران:۶۱)

ترجمہ:۔ تو جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں۔

ان واضح اور غیر مبہم آیات ہی نے مسلمانانِ اہل سنت کو یہ عقیدہ عطا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک اور صاف ہے۔ اس کے لیے کسی قسم کا عیب ممکن ماننا قرآن کے خلاف ہے۔

چنانچہ علامہ علاء الدین علی بن محمد البغدادی (متوفی ۷۲۵ھ) تفسیر خازن میں بیان فرماتے ہیں:

''لا احد اصدق من اللہ فانہ لا یخلف المیعاد و لا یجوز علیہ الکذب''۔ (تفسیر خازن مصری، ج:۱/ص:۴۲۱)

ترجمہ:۔ اللہ سے سچا کوئی نہیں اور وہ خلافِ وعدہ نہیں کرتا اور اس کا جھوٹ بولنا ممکن نہیں۔

یوں ہی امام فخر الدین محمد بن عمر تیمی رازی (متوفی ۶۰۶ھ) تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں:

''اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان: ''فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ'' (اللہ ہرگز اپنا عہد جھوٹا نہ کرے گا) دلالت کرتا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ ہر وعدو وعید میں کذب سے منزہ ہے۔ ہمارے اہل سنت اس دلیل سے کذبِ الٰہی کو ناممکن جانتے ہیں کہ وہ صفتِ عیب ہے اور اللہ تعالیٰ پر عیب

محال اور ناممکن ہے"۔

علامہ مذکور اسی عنوان پر تقریر فرماتے ہوئے بیان دیتے ہیں:

"ان تجویز الکذب علی الله محال"۔ (تفسیر کبیر، ج:۴، ص:۳۴)

ترجمہ:۔ اللہ پر جھوٹ کی تجویز محال ہے۔

ایک دوسرے مقام پر تسبیح ربی بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو عقائد کے اس اہم باب میں تنبیہ فرماتے ہیں اور سبحان السبوح پر پاکیزہ قصیدہ کی جانب رغبت دلاتے ہیں:

"ان المؤمن لایجوزان یظن بالله الکذب یخرج بذالك عن الایمان"۔ (تفسیر کبیر، ج:۵، ص:۱۷۲)

ترجمہ:۔ کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کا گمان کرے، بلکہ ایسا گمان ایمان سے خارج کر دیتا ہے۔

اسی طرح علامہ قاضی نصیر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر البیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) تفسیر بیضاوی میں اس اہم عنوان پر بحث فرماتے ہوئے واضح قرآنی فیصلہ کرتے ہیں۔ عبارت کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ: "جھوٹ اللہ تعالیٰ میں کسی طرح راہ نہیں پا سکتا، کیوں کہ وہ نقص (عیب) ہے اور نقص اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے۔

(تفسیر بیضاوی، ص ۱۵۰)

صاحب تفسیر مدارک التنزیل علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفی (متوفی ۷۱۰ھ) فرماتے ہیں:

"اس (رب تعالیٰ) سے سچا کوئی نہیں۔ اس کی خبروں میں، وعدہ و وعید میں، اس لیے کہ جھوٹ اپنے قبح کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر ناممکن و محال ہے، کیوں کہ وہ کسی شئ کی اس کے خلاف خبر دیتا ہے، در حقیقت وہ جیسی ہے"۔

(تفسیر النسفی، مدارک، ج ۱، ص ۴۲۱)

علامہ ابوالسعود محمد بن عادی الحنفی (متوفی ۹۸۲ھ) تفسیر ابوالسعود میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ پر ہی کذب محال و ناممکن ہے، اس کے غیر پر نہیں"۔

(تفسیر ابوالسعود، ج ۴، ص ۴۱۲)

علامہ اسماعیل حقی بن مصطفی (المتوفی ۱۱۳۷ھ) تفسیر روح البیان میں سورۂ نساء میں مذکورہ بالا آیت نمبر ۸۷ کی تفسیر میں رقم طراز ہیں: "اس آیت مبارکہ میں اس بات کا انکار ہے کہ خدا سے زیادہ کوئی سچا نہیں، کیوں کہ کذب عیب ہے اور عیب اللہ ہی پر محال و ناممکن ہے، نہ کہ اس کے غیر پر"۔

جو صفت بندوں کے لیے عیب اور نقص ہو، بندوں کے قادر و قیوم رب پر اسے ممکن جاننا کتنا صریح جرم اور کیسی قبیح جسارت ہے۔ معتزلہ اور خوارج وغیرہ فرقوں نے باوجود اپنی ضلالت کے نجس عقائد کو مانا اور تسلیم کیا۔ دورِ فتن میں نام نہاد موحدین نے ان کو نکالا اور اسی جدید مشن کا نام اسلام رکھ لیا۔

ناظرین غور فرمائیں! کہ قرآنی آیات میں ہمارا سبوح وقدوس رب خود ہر عیب سے اپنی تنزیہ بیان فرماتا ہے اور ائمہ کرام، علمائے اعلام، فقہا اور مفسرین، نیز موقرین اسلام کی وافر شہادتیں امکانِ کذبِ باری کی تردید میں میسر ہیں، جن کے بعد کسی اہل حق کو اسلام کا عقیدہ بتا کر معاذ اللہ کذبِ باری تعالیٰ کے ممکن ہونے کے فاسد خیال پر ورغلایا نہیں جاسکتا۔ اوپر آپ نے علامہ فخرالدین رازی کی بات ملاحظہ فرمائی کہ اس گمان سے انسان خارج عن الاسلام ہوجاتا ہے۔

چودھویں صدی کے عبقری مفکر اسلام امام احمد رضا فاضل بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ) نے ''سبحان السبوح'' نامی اپنی عظیم تصنیف میں اس عقیدہ کو آفتاب سے زیادہ روشن کر دکھایا ہے۔ تفصیل کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس کتاب کے علاوہ چند عظیم اور عقائد کی بنیادی کتابوں کے حوالے درج ذیل کرکے بات تمام کرتا ہوں، جو اہل تحقیق چاہیں خود ملاحظہ فرمالیں۔

شرح مواقف، مطبوعہ نول کشور، ص۶۰۴، و ص۶۷۴/، نیزص۶۷۵۔ مسامرہ، ص۸۴۔ مسایرہ، ص۱۶۶۔ شرح عقائد جلالی، شرح مقاصد، علامہ عبدالحمید بغدادی کی تصنیف شرح اللالی شرح امالی، ص۹۲۔ قاضی عضد الدین کی عقائد عضدیہ، ص۲۷۔ علامہ بحرالعلوم کی فواتح الرحموت، ص۳۲/ وغیرہ وغیرہ۔

اخیر میں شرحِ فقہ اکبر کی ایک جامع اور مختصر عبارت سے اس عنوان پر مہر خاتم لگاتا ہوں۔

''والکذب علیه محال''۔ (شرح فقہ اکبر، ص:۲۲) ترجمہ:۔ اور جھوٹ اللہ تعالیٰ پر محال ہے۔

اس کے خلاف:

یہی ابتدا سے آج تک ساری دنیائے اسلام کا عقیدہ ہے اور ان شاء المولیٰ السبوح القدوس اسی پر تا قیامت اہل سنت وجماعت زندہ رہیں گے۔ اس قرآنی اور جمہوری عقیدہ کے برخلاف جن لوگوں نے آواز اٹھائی اور رب تعالیٰ کے دامنِ تقدیس کو کذب سے داغ دار بتانے کی بدعت گڑھی وہ کون لوگ ہیں؟

وہ وہابی فرقہ ہے، جس کی کتابوں میں بکثرت بزور، رب تعالیٰ مجدہٗ کے لیے امکانِ کذب ثابت کیا جاتا ہے اور یہی اس کی شان بتائی جاتی ہے۔ طوالت کے خوف سے ہندوستان میں اس فرقہ کے ترجمانِ اول جناب اسمٰعیل دہلوی صاحب مصنف تقویۃ الایمان کی اپنی تحریر ان کے رسالہ یک روزی سے نقل کی جاتی ہے۔ انداز کی جارحیت اور قرونِ اسلام کے مسلمہ عقیدے کے خلاف بیان بازی کا زور تو ملاحظہ کیجیے۔

''عدمِ کذب را از کمالاتِ حضرت حق سبحنہ می شمارند واو راجل شانہ بآں مدح می کنند، برخلاف اخرس وجماد کے ایشاں را کسے بعدمِ کذب مدح نمی کند، پر ظاہر است کہ صفتِ کمال ہمی ست کہ شخصے قدرت بر تکلم بکلامِ کاذب می دارد، وبناء بر رعایت مصلحت ومقتضائے حکمت بہ تنزہ از شوب کذب تکلم کلامِ کاذب نمی بیاید، ہماں شخص ممدوح می گردد، بخلاف کسے کہ اوسان او مائوف شدہ''۔ (یک روزی، ص۱۴۵)

ترجمہ:۔ جھوٹ نہ بولنے کو خدا کے کمالات میں سے شمار کرتے ہیں، اس سے اس کی مدح کرتے ہیں، بخلاف گونگے اور پتھر کے۔ اور صفت کمال یہی ہے کہ کذب پر قدرت ہوتے ہوئے بلحاظِ مصلحت اس کی آلائش سے بچنے کے لیے جھوٹ بات نہ بولے وہی قابل تعریف ہوتا ہے، بخلاف اس کے جس کی زبان بے کار ہوگئی ہو۔

''لانسلم کہ کذب مذکور محال بمعنی مسطور باشد''۔ (یک روزی، ص۱۴۵)

ترجمہ:۔ ہم نہیں تسلیم کرتے کہ اللہ کا جھوٹ بولنا محال و ناممکن ہو۔

یہ اور اسی قبیل کی متعدّد عبارتوں سے اہل سنت کے عقائد میں رخنہ ڈال کر جدید فتنوں کا دروازہ کھولا۔ سب تو سب اپنے خالق و مالک کی شان میں ایسے خیالات ظاہر کیے اور قرآن مقدس کتاب الٰہی کی واضح منصوصات اور عقیدۂ جمہور اسلام کے (علیٰ امرغم نیا پھاٹک کھولا) دلائل مذکورہ بالا اور دہلوی صاحب کی بات میں کتنا فاصلہ ہے۔ گویا ایک جانب اسلام اور السواد الاعظم، کتاب اللہ اور شارحین کتاب، فقہائے اسلام کے دلائل کا لشکر لے کر کھڑا ہے اور رب تعالیٰ کی تقدیس و تسبیح کا پرچم لہرا رہا ہے، دوسری جانب کسی گوشے سے چند اسلاف بے زار آواز بغاوت میں غوغو کی باغیانہ آواز نکال رہے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

آثارِ مبارکہ: قسط (اول)

ایمان واسلام کیا ہے؟:

اعمال و افعال کی ساری صلاحیتیں اطاعت محمدی میں لگا دینا اور ہر اعتبار سے حضور سرور کائنات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی فرماں برداری کے لیے سر تسلیم خم کر دینا۔ اقرار و تسلیم کی منزلِ اولین سے گزرنے کے بعد کاملیت ایمان کے لیے لازمی ہے کہ جسم و روح کو:

''لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین''۔ (بخاری و مسلم)

ترجمہ:۔ تم میں کا کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے ماں باپ اور اولاد اور سب سے زیادہ محبوب نہ ہوجائوں۔

کے سانچے میں ڈھال دے۔ اور ان کی عزت و تکریم کو دین و ایمان کا لازوال سرمایہ سمجھے۔ بہ الفاظِ حکیم مشرق:

محمد عربی کابروئے ہر دو سرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

بدیہی بات ہے کہ جسے کسی شخص سے محبت ہوگئی، وہ اس کی ایک ایک حرکت اور ہر ہر ادا کو محبت کی نگاہوں سے دیکھے گا۔ جسے حضور محبوب العالمین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سچی الفت ہوگی، ضروری ہے کہ اسے آپ کے تمام متعلقات و منسوبات سے عقیدت مندانہ رابطہ ہوگا۔ فخر الاماثل علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''ومن اعظامہ اکبارہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اعظام جمیع اسبابہ وما لمسہ او عرف بہ''۔

(نسیم الریاض، ج:۳، ص:۴۳۴)

ترجمہ:۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعظیم کا ایک جزیہ بھی ہے کہ جس چیز کو حضور سے کوئی تعلق ہو، حضور نے اسے چھوا ہو، یا حضور سے پہچانی جاتی ہو، ان سب کی تعظیم کی جائے۔

محبت رسول مسلمانوں کے لیے ایمان کا ایسا بنیادی سرمایہ ہے، جس پر دین و دیانت کی ساری عمارتیں قائم ہیں۔ اس لیے جس طرح بھی ممکن ہو، اس رشتہ لطیف کو محکم رکھنے کے لیے ان وسائل و ذرائع کو فراموش نہ کیا جائے، جو ازدیادِ محبت کا سبب واقع ہوئے ہیں۔

زمانۂ رحمت تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ متزلزل ہوا جاتا رہا ہے۔

''خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم''۔

ترجمہ:۔ بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر ان لوگوں کا جو مجھ سے ملے، پھر ان لوگوں کا جو ان لوگوں سے ملے۔

اب کائنات کی عمر جتنی دراز ہوتی جائے گی، دنیا پر بدعنوانی پھیلتی جائے گی۔ گویا خیر القرون کی برکتیں دور سے دور تر ہوتی چلی جائیں گی۔

جیسا کہ بخاری شریف میں زبیر ابن عدی سے مروی ہے:

''قال اتینا انس ابن مالك فشکونا الیه ما یلقون من الحجاج فقال اصبروا فانه لا یاتی علیکم زمان الا الذی بعده شر منه حتی تلقوا ربکم سمعته من نبیکم صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم''۔

(بخاری، ج:۲، ص:۱۰۴۷، مطبع احمدی)

ترجمہ:۔ زبیر ابن عدی نے کہا، ہم انس ابن مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے ان تکالیف کی شکایت کی جو حجاج سے پہنچی تھیں، تو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: صبر کرو، کیوں کہ تم پر ہر آنے والا زمانہ پچھلے سے بدتر ہوگا، یہاں تک کہ تم اپنے خدا سے مل جائوگے، میں نے یہ حدیث تمہارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنی ہے۔

اصحابِ کرام اور ہم:

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مقدس جماعت اپنے ایمان میں جس قدر کامل تھی، اس کے اسباب عقیدت و محبت کی ایمانی نگاہ سے رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دیدار اور ان کے قربِ زمانی ومکانی کے سوا اور کیا ہوسکتے ہیں۔ یوں ہی درجہ بدرجہ تابعین، تبع تابعین تک، ایمان و محبت کی روشنی پہنچی۔ تہی دستی قسمت کہ ہم رُخِ زیبائے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو کُجا، ان کے دیدار کرنے والوں کی زیارت سے محروم ہیں، ورنہ ہر عاشق جاں باز کی آرزو تو ہمیشہ یہی ہے کہ ؎

دشت طیبہ میں ترے ناقہ کے پیچھے پیچھے

دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتا جاتا

(آسی علیہ الرحمہ)

تو اب ہم دور افتادہ کی تسکین وتسلی کا سامان، حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آثارِ مبارکہ ہیں۔ اور وہ جماعت علما وصلحا، جو نیابت رسول کی دولت سے مالا مال ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی استحکامِ محبت رسول کے دیگر متعدّد وسائل میسر ہیں، جنکے ذریعہ دلوں میں عظمت مصطفی کے چراغ روشن ہیں۔

علمائے ربانی ہوں یا اور دوسری اشیائے مبارکہ جن سے قریب ہونے کا سرکار نے حکم دیا ہے، کیا صرف اسی بنیاد پر محترم اور قابل تعظیم نہیں ہیں کہ انھیں کسی نہ کسی طرح حضور سے قربت ونزدیکی نصیب ہے؟ علمائے اسلام چوں کہ انبیا کے وارث ہیں، کیا اس نسبت سے انھیں درجۂ عظمت نہیں ملا؟

اگر ایسا نہیں تو پھر بتایا جائے کہ آخر وہ مابہ الامتیاز شئ کون سی ہے؟

مندرجہ ذیل مقالہ میں ہم یہ جائزہ لیں گے کہ قرآن وسنت میں اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جس طرح حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اسلام وکفر کے درمیان حد فاصل ہے اور آپ کی محبت کمالِ ایمانی کا معیار ہے۔ اسی طرح حضور سے تمام متعلق و منسوب اشیا اور اشخاص بھی قابل تعظیم ہیں۔

منصف اول کتاب اللہ:

مومن و مسلم اپنے ہر مسئلہ کا حل قرآن عظیم اور سنت رسول سے چاہتا ہے۔ ہم سب سے پہلے قرآن مجید سے اپنے سوالات کا تشفی بخش جواب چاہتے ہیں۔

سورۂ بقرہ، بنی اسرائیل کے تذکرہ میں ایک ایسی آیت کا سراغ ملتا ہے، جس میں حضرت شمویل علیہ السلام نے انبیائے ماسبق کے تبرکات کو اس قوم کی خوش قسمتی اور ان کے آثار کو خدا کی نشانی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (بقرۃ، پ:۲/ع:۱۶، آیت:۱۴۸)

ترجمہ:۔ اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا: اس کی (طالوت علیہ السلام کی) بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے تمہارے پاس تابوت جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کا چین ہے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں، معزز موسیٰ اور معزز ہارون کے ترکہ کی، اٹھالائیں گے اسے فرشتے، بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لیے اگر ایمان رکھتے ہو۔

لفظ سکینہ کی تحقیق اور اس کا معنی:

سکینہ بمعنی تسکین، تسلی، خاطر اطمینان، سکون سے بروزن فعیلۃ مصدر ہے، جو اسم کی جگہ استعمال ہے، جیسے عزیمۃ۔

(تفسیر نیشاپوری، ج:۱/ص:۷۷۷/بر حاشیہ ابن جریر، مطبوعہ مصر)

تفسیر نعیمی میں حکیم الامت مولانا احمد یار خاں صاحب علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

''سکینہ سکن سے بنا، بمعنی حرکت کے بعد ٹھہرنا، اس کو سکون بھی کہتے ہیں، یہ بروزنِ فعیلۃ ہے، جیسے قضیۃ بقیۃ عزیمۃ۔ یہاں (آیت مبارکہ میں) سکونِ قلبی اور چین واطمینان مراد ہے، یعنی اس تابوت میں تمہارے قلبوں کو چین و سکون حاصل ہوگا، یا اس میں قرارِ قلب کا سامان ہوگا''۔ (تفسیر نعیمی، ج:۲/ص:۵۳۹)

تفسیر لباب التاویل میں امام محی السنہ علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی نے تحریر فرمایا ہے:

'' وقال قتادة والكلبي هي فعيلة من السكون اى طمانية من ربكم ففى اى مكان كان التابوت اطمأنوا وسكنوا اليه ''۔ (تفسیر لباب التاویل، زیر آیت بالا)

ترجمہ:۔ قتادہ اور کلبی نے کہا: یہ سکون سے فعیلۃ کے وزن پر ہے، یعنی تمہارے رب کی جانب سے اطمینان، تو یہ تابوت جس جگہ ہوگا لوگ اطمینان و سکون سے رہیں گے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں:

''سکینہ وہ اطمینان، چین، قرار اور سکون ہے، جسے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قلب میں اس وقت نازل فرماتا ہے جب کہ وہ ہول ناکیوں کی شدت سے مضطرب ہوجاتے ہیں، پھر اس کے بعد جو کچھ بھی ان پر گزرے اس سے گھبراتے نہیں، یہ ان کے ایمان میں پختگی، یقین میں قوت اور استقرار کو پائیداری بخشتا ہے۔ اسی لیے حق سبحانہ نے ''یوم الغار'' اور ''یوم الحنین'' جیسے قلق واضطراب کے مواقع پر اپنے رسول اور مومنین کے لیے نازل فرمانے کی خبر دی ہے''۔ (تاج العروس، تحت آیت مذکورہ)

تابوتِ سکینہ کیا ہے؟:

تابوتِ سکینہ کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

''قال عطیۃ ابن سعد عصا موسیٰ وعصا ہارون وثیاب موسی وثیاب ہارون''۔

ترجمہ:۔ عطیہ ابن سعد نے کہا کہ اس میں حضرت موسیٰ وہارون کے عصا اور ان کے کپڑے تھے۔

لباب التاویل میں ہے:

''قیل کان فیہ عصاء موسی ونعلاہ وعصاء ھارون وعمامتہ''۔

ترجمہ:۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی اور ان کے جوتے اور حضرت ہارون علیہ السلام کی لاٹھی اور ان کا عمامہ تھا۔

ابن جریر ابن ابی حاتم عبد اللہ ابن عباس (م۶۸ھ) سے راوی ہیں:

''وقال بقیتہ مما ترك اٰل موسی وعصاہ ورضاض الواح''۔

(ابن جریر بحوالہ بدر الانوار، ص:۵)

ترجمہ:۔ اس میں تبرکاتِ موسویہ ہے اور (توریت کی) تختیوں کی کرچیں۔

ان کے علاوہ بھی متعدّد اقوال ہیں، ان میں سے وہ قول جس پر تفسیر کبیرؒ میں امام فخر الدین رازی اور مفسر خزائن العرفان وغیرہ نے اعتماد کیا ہے۔ وہ ذکر کیا جاتا ہے:

یہ تابوت شمشاد کی لکڑی کا صندوق تھا، جس پر سونے کی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا طول تین ہاتھ اور عرض دو ہاتھ تھا۔

(وکان من خشب الشمشاد مموھا بالذھب نحوا من ثلاثۃ اذرع فی ذراعین۔ بیضاوی، ص۱۶۱)

یہ تابوت اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔ اس میں انبیائے کرام اور ان کے مکانات کی تصویریں تھیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے دولت خانہ کی تصویر ایک سرخ یاقوت میں تھی۔ حضور مجامت نماز قیام میں ہیں اور آپ کے گرد صحابۂ کرام ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے دور میں اس کے اندر توریت مقدسہ اور اپنا خاص سامان بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ اس میں توریت کی تختیوں کے چند ٹکڑے اور آپ کا عصا اور آپ کے کپڑے اور نعلین شریف اور حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ اور ان کا عصا اور تھوڑا سا ''مَن'' جو بنی اسرائیل پر اترتا تھا۔

(تفسیر کبیرؒ، روح المعانی، روحِ ایمان، خازن، بحوالہ تفسیر نعیمی، ج۲ ص۵۴۱)

تابوتِ سکینہ کی تاریخ:

حضرت آدم علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے تابوتِ سکینہ عطا فرمایا تھا۔ آپ کے بعد نسلاً بعد نسل یہ انبیاعلیہم السلام کے پاس منتقل ہوتا رہا۔ حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو ملا۔ اور ان کے بعد دیگر انبیائے بنی اسرائیل کو مرحمت ہوا۔ جب بنی اسرائیل کی بدعملی حد سے بڑھی تو ان پر عمالقہ مسلط ہوئے، جو اُن سے تابوت بھی چھین لے گئے۔ عمالقہ نے تابوت کی بے حرمتی کی، گندی جگہ رکھا، اس کی بے حرمتی کے سبب

عمالقہ سخت بیماریوں میں مبتلا ہوئے، جو کوئی اس کے پاس تھوکتا یا پیشاب کرتا سخت بواسیر میں مبتلا ہوجاتا۔ عمالقہ کی پانچ بستیاں بھی تباہ ہوگئیں، تب انھیں یقین ہوا کہ یہ مصیبتیں تابوت کی بے حرمتی کے سبب نازل ہورہی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے تابوت ایک بیل گاڑی پر رکھ کر بیلوں کو ہانک دیا۔

ادھر حضرت شمویل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو خبر دی کہ تمہارے سامنے طالوت کے پاس تابوت آرہا ہے۔ فرشتے بیلوں کو ہانکتے ہوئے طالوت کے پاس لائے۔ بنی اسرائیل تابوت دیکھ کر خوش ہوگئے اور انھیں اپنی فتح مندی کا یقین ہوگیا۔ سب نے طالوت سے بیعت کرکے انھیں اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا۔

(تفسیر نعیمی، ج۲ر ص۵۹۱)

تابوتِ سکینہ کا مصرف:

ہر زمانہ میں تمام افرادِ امت انبیا کی اس مقدس نشانی کی تعظیم وتکریم کرتے تھے اور اپنی مشکلات کے وقت اس سے استمداد اور اکتسابِ فیض کرتے تھے۔ جنگ وغیرہ کے اہم مواقع پر لشکر کے ساتھ رکھتے تھے اور اس تابوت کی برکت سے رب تعالیٰ انھیں فتح وکامرانی عطا فرماتا تھا۔

’’وکانوا اذا حضروا اتقال قدموہ بین ایدیھم ویستفتحون بہ علی عدوھم فینصرون‘‘۔ (خازن زیر آیت بالا (وکان موسیٰ علیہ السلام اذا قاتل قدمہ فتسکن نفوس بنی اسرائیل ولا یفرون۔ (بیضاوی، ص:۱۶۱)

ترجمہ:۔ جب میدانِ جنگ میں جاتے تو اسے لشکر سے آگے رکھتے تھے اور اس کے ذریعہ دشمنوں پر فتح طلب کرتے تھے تو فتح یاب ہوجاتے تھے۔

آثار موسیٰ وہارون کی عظمت:

اوپر کی تشریحات سے معلوم ہوا کہ تابوتِ سکینہ میں حضرت موسیٰ وہارون وغیرہ انبیائے کرام علیہم السلام کے آثارِ مبارکہ تھے۔ رب تعالیٰ نے ان کی اس طرح عزت افزائی فرمائی کہ اسے فرشتوں سے اٹھوایا۔ ’’تحملہ الملٰئکۃ‘‘ کی تفسیر میں حضرت مولانا احمد یار خاں صاحب نعیمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

’’ملائکہ سے فرشتوں کی ایک خاص جماعت مراد ہے۔ یا تو سبھی فرشتے اٹھاکر لائے تھے، یا ایک فرشتہ اٹھائے ہوئے تھا اور سب اس کے ساتھ جلوس کی شکل میں تھے، یا یہ صندوق کسی اور چیز پر آیا تھا اور فرشتے اس کے ساتھ تھے۔ بہرحال فرشتوں کا ساتھ ہونا، اظہارِ عظمت کے لیے ہے‘‘۔ (تفسیر نعیمی، ج۲ر ص۵۴۰)

قرآنی راہ:

مذکورہ بالا آیت اور اس کی تفسیر کی روشنی میں جو قرآنی راہ نظر آئی، وہ یہ ہے:

(۱)... انبیا ومرسلین علیہم السلام کے آثار خدا کی آیت (نشانیاں) ہیں۔

(۲)... ان کی تعظیم وتکریم کرنا اور ان کے وسیلہ سے فتح وکامرانی کی دعا کرنا جائز ہے۔

(۳)...ان آثار و تبرکات کی بے حرمتی سخت بے ادبی اور بدنصیبی کی علامت ہے۔

آثار مبارکہ: قسط (دوم)

کیا یہ سچ نہیں؟:

شریعت اسلامیہ کے تمام ارکان و احکام کا نقطہ عروج یہ ہے کہ بندہ خدا کی معرفت اور اس کی خوشنودی حاصل کرے، ہر مسلمان جانتا ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی خوشی تلاش کرنے والوں کو حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت و الفت کرنے کا حکم دیا ہے، یہ اس لیے کہ زلف واللیل کا اسیر ہوجانے کے بعد احکام الٰہیہ جو حضور ہی کے واسطہ سے اہل علم کو دیے جارہے ہیں۔ ان پر عمل کرنے میں شوق اور لگن پیدا ہو۔

یہ فطری امر ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کے احکام کی تکمیل اور اتباع کرنے میں دلی مسرت محسوس کرتا ہے، انس انسان کا سب سے اہم اور لطیف جذبہ ہے جو بطور قدر مشترک تمام فرزندان آدم کو عطا ہوا ہے، اس کا صحیح اور کامل مصرف یہ ہے کہ اسے خدا اور رسول کی قربت و خوشنودی کے حصول میں صرف کیا جائے۔ کوئی محب صادق ایسا نہ ہوگا جس کا محبوب اس سے اپنی پیروی اور اتباع کی خواہش رکھے اور محب روگردانی کرے، اس لیے کہ محب کا مزاج ہی یہ ہے کہ:

"ان المحب لمن یحب یطیع"۔

ترجمہ:۔ محب ہمیشہ اپنے محبوب کا اطاعت گزار ہوتا ہے۔

عاشقان خدا کو محبوب حقیقی کے ذکر سے قرار ملتا ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (قرآن حکیم)

یہ کیفیت ان کی ہے جو خداوند تعالیٰ کے کشتگان خنجر تسلیم ہیں، اور انبیا و رسل کے وہ آثار شریفہ جو عرفان و محبت کی طرف موصل ہیں، ان سے دل کا چین اور روح کا سکون نصیب ہوتا ہے۔ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ۔

آثار میں کیسا سکون ہے، آیت مبارکہ میں کوئی تخصیص نہیں گویا عام ہے کہ اس میں قلب و روح جان ایمان سب کے لیے اطمینان ہے۔

قرآن کی ایک اور آیت:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ فِیْہِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا۔ (آل عمران پ ۴، ع ۱)

ترجمہ:۔ بیشک سب میں پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کو مقرر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہاں کا رہنما اس میں کھلی نشانیاں ہیں ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں داخل ہوا، مامون ہوگیا۔

تعمیر کعبہ کا تاریخی جائزہ:

خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت آدم علیہ السام کی تخلیق سے پیشتر فرشتوں نے رب تعالیٰ کے حکم سے کی۔ یہ دنیا کا سب سے پہلا عبادت خانہ ہے جو فرشتوں کے قبلہ بیت المعمور کے بالکل مقابل بنایا گیا۔ مورخین کی تصریح کے مطابق خانہ کعبہ کی تعمیر ۹ر بار عمل میں آئی۔ جن کی تفصیل یوں ہے:

پہلی بار: ملائکہ نے تعمیر کیا۔

دوسری بار: حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد نے تعمیر کیا۔

تیسری بار: حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے ۲۰۰۰ قبل مسیح میں تعمیر کی۔

چوتھی بار: بنی جرہم نے تعمیر کیا۔

پانچویں بار: عمالیق نے ۱۰۰ اق م میں تعمیر کیا۔

چھٹویں بار: قصی بن کلاب نے بعثت محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دو سال قبل تعمیر کیا۔

ساتویں بار: قریش نے ۱۸ قبل ھ میں تعمیر کیا، حضور نے جس میں خود پتھر اٹھائے۔

آٹھویں بار: ۶۴ھ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے دیواریں کمزور ہوجانے کی وجہ سے منہدم کرواکے از سر نو تعمیر کرایا۔

نویں بار: ۸۴ھ میں حجاج ابن یوسف ثقفی نے عبدالملک ابن مروان کے حکم سے ابن زبیر کی تعمیر منہدم کراکے خانہ کعبہ کو پھر سے تعمیر کیا۔

کعبہ کا ایک نام بیت العتیق بھی ہے، امام بغوی کے قول کے مطابق، طوفان نوح میں کعبہ کی عمارت کا مامون و محفوظ اور طوفان کی تباہ کاریوں سے آزاد رہنا ہی اس نام کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس موقع پر رب تعالیٰ نے اس گھر کو زمین سے اٹھالیا۔

(خلاصۃ التواریخ ص۲۱، معالم التنزیل ج۵، ص ۱۳)

مرکز توحید میں آثار ابراہیمی:

بیت اللہ شریف توحید کا مرکز ہے، جہاں سے ایک خدا کی توحید کا اعلان ہوا، رب سبحانہ اس آیت مذکورہ بالا میں اپنے اس مقدس گھر کا تعارف کرا رہا ہے۔

دنیا کے بت کدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

ایک ہی آیت میں اس مکرم و محترم بیت اللہ کی تعریف کر رہا ہے، اور ساتھ ہی اس پتھر (آثار ابراہیمی) کا بھی ذکر فرمارہا ہے، جس پر برگزیدہ رسول حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کا نقش قدم پاک ہے۔

مقام ابراہیم:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے شہزادہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مدد سے خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی، حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا اٹھا کر دیتے جاتے تھے اور آپ دیوار چنتے جاتے تھے، دیوار جب اونچی ہوگئی تو آپ ایک پتھر پر کھڑے ہوکر دیوار چننے لگے، دیوار جوں

جوں بلند ہوتی جاتی پتھر خود بخود اوپر ہوتا جاتا اور پھر جس طرف دیوار چننی ہوتی اس طرف بلند ہوجاتا، اس پتھر پر آپ کا نقش قدم بن گیا۔

امام فخرالدین رازی (۵۴۴ھ ۔۶۰۶ھ) علیہ الرحمہ مقام ابراہیم کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

'' الفضیلۃ الثانیۃ لھذا البیت مقام ابراھیم ھو الحجر الذی وضع ابراھیم قدمہ علیہ فجعل اللہ ماتحت قدم ابراھیم علیہ الصلوٰۃ والسلام من ذلک الحجر دون سائر اجزائہ کالطین حتی غاص فیہ قدم ابراھیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ھذا فمالا یقدر علیہ الا اللہ تعالیٰ ولا یظھرہ الا علی الانبیا ثم کما رفع ابراھیم علیہ الصلوٰۃ والسلام قدمہ عنہ فیہ الہ الصلابۃ الحجویۃ مرۃ اخری ثم انہ تعالیٰ القی ذالک الحجر علی سبیل الاستمرار والدوام فھذہ انواع من الآیات العجیبۃ المعجزات الباھرۃ اظھرھا اللہ تعالیٰ فی ذالک الحجر''۔ (تفسیر کبیر تحت آیت مذکور)

ترجمہ:۔ کعبہ کی دوسری فضیلت مقام ابراہیم ہے، یہ وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا قدم مبارک رکھا تو جتنا حصہ ان کے زیر قدم آیا تو تر مٹی کی طرح نرم ہوگیا، یہاں تک کہ ان کا قدم مبارک اس میں پیر گیا، یہ اللہ کی عظیم قدرت اور انبیا کے عظیم معجزات میں سے ہے پھر جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنا قدم اٹھایا تو اللہ تعالیٰ نے اس ٹکڑے میں پتھر کی سختی پیدا کردی کہ وہ نشان قدم محفوظ رہ گیا پھر اسے حق سبحانہ نے مدت دراز تک باقی رکھا تو یہ قسم قسم کی نشانیاں اور حیرت انگیز معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس پتھر میں ظاہر فرمائے ہیں۔ (تفسیرِ کبیر تحت آیت مذکور)

اس ایک ہی پتھر میں رب تعالیٰ کی کئی نشانیاں موجود ہیں صاحب ارشاد العقل السلیم نے ان نشانیوں کو یوں شمار کرایا ہے:

'' ان کل واحد من اثر قدمیہ فی صخرۃ صماء و غوصہ فیھا الیٰ الکعبین ولانہ بعض دون بعض وابقائہ دون سائر اٰیات الانبیا علیھم الصلوٰۃ والسلام وحفظہ مع کثرۃ الاعداء الوف سنۃ آیۃ مستقلۃ''۔

(ارشاد العقل السلیم بحوالہ بدر الانوار ص:۴)

ترجمہ:۔ اس سخت پتھر میں ابراہیم علیہ السلام کا نقش قدم ہونا (ایک آیت) ان کے قدموں کا ٹخنوں تک پیر جانا (دو) اور پتھر کے ایک حصہ کا نرم ہوجانا اور باقی کا اپنے حال پر رہنا (تین) اور انبیائے ماسبق کے معجزات میں اس معجزہ کا باقی رکھنا (چار) باوجود کثرت اعداء کے ہزاروں برس اس کا محفوظ رہنا (پانچ) ان میں کا ہر ایک بجائے خود معجزہ ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس سے عبد ابن حمید و ابن الجریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم و ازرقی نے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے:

'' اثر قدمیہ فی المقام آیۃ بینۃ''۔

ترجمہ:۔ اس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نشان قدم ہونا کھلی ہوئی نشانی ہے۔

صاحب تفسیر خزائن العرفان صدرالافاضل مولانا سید نعیم الدین صاحب مرادآبادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ شریف کی تعمیر کے وقت کھڑے ہوتے تھے۔ اور اس میں آپ کے قدم مبارک کے نشان تھے، جو باوجود طویل زمانہ گزرنے اور بکثرت ہاتھوں سے مس ہونے کے ابھی تک باقی ہیں''۔ (خزائن العرفان ص۹۱)

تمام دنیا کے پتھروں میں اس پتھر کی حیثیت ممتاز ہوجاتی ہے، جب وہ اللہ کے ایک عظیم رسول کے قدم ناز سے مس ہوتا ہے۔ اسی طرح سنگ اسود جس کا استلام (بوسہ دینا اس کی طرف ہاتھ کر کے چومنا) حجاج کرام کی سعادت ہے حالانکہ نفس حجریت پر غور کیجیے تو اس میں اور دوسرے پتھروں میں جیسی ہی صلابت وغیرہ دوسری صفات پائی جاتی ہیں، مگر اس سنگ اسود کو اور تمام پتھروں میں درجہ امتیاز اس لیے نصیب ہے کہ جنت سے آیا ہوا یہ پتھر خدا کا امین اور مسلمانوں کا شاہد ہے، اس کے سوا ایک عظیم نسبت یہ بھی ہے کہ ہمارے آقا سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود اس کو عقیدت کے ساتھ بوسہ دیا ہے۔

(بعض علمائے اسلام نے تقبیل حجر اسود سے بزرگوں کے مزارات کا بوسہ دینا مستنبط کیا ہے:

''استنبط بعضهم من شرعية تقبل الاركان جواز تقبل كل من يستحق العظمة من''۔

ترجمہ:۔ ارکان کعبہ کے چومنے سے بعض علما نے بزرگوں کے تبرکات کا چومنا ثابت کیا ہے۔

''ونقل عن الامام احمد انه سئل عن تقبيل منبر النبي عليه السلام ويقبل قبره ولم يربه باسا ونقل عن ابن الصنف اليماني احمد علما مكة من الشافعية جواز تقبيل مصحف واجزاء الديث وقبور الصالحين''۔

(شرح بخاری لابن حجر پ٦ ص:١١٥)

ترجمہ:۔ امام احمد بن حنبل سے روایت ہے کہ ان سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے منبر اور قبر شریف کے چومنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے اس میں کوئی حرج نہیں بتلایا۔ اور ابن ابی الصنف یمانی جو مکہ کے علمائے شافعیہ میں سے ہیں منقول ہے کہ قرآن کریم، حدیث کے اوراق اور بزرگان دین کی قبر چومنا جائز ہیں۔

حضرت مولانا نعیم الدین صاحب علیہ الرحمہ نے جواہر المنظم کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ خاتون جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم روضہ پاک کی خاک شفا کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔

''جاء عن فاطمة الزهراء رضى الله تعالىٰ عنها انه صلى الله تعالىٰ عليه وسلم لما اقبر اخذت قبضة من تراب قبره الشريف وجعلته على عنها بكت''۔ (آداب الاخیار:٣٣)

ترجمہ:۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں منقول ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقبرہ میں تشریف لانے کے بعد آپ نے قبر مبارک سے ایک مشت خاک لے کر آنکھوں سے ملی اور گریہ فرمایا۔

حجر اسود اور فاروق اعظم:

اس موقع پر غیر مناسب نہ ہوگا اگر ہم امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ پیش کر دیں جو ہمارے موضوع سے متعلق بھی ہے، احادیث میں ہے کہ اپنے دور خلافت میں آپ حج بیت اللہ کے موقع پر سنگ اسود کو بوسہ دیا اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

''انی اعلم انك حجر لا تنفع ولا تضرو لولا انی رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم ماقبلتك''۔

ترجمہ:۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے نہ نفع دے نہ نقصان اگر میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تجھے چومتے نہ دیکھا ہوتا تو ہرگز نہ چومتا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو اس کی خبر ملی تو آپ نے فرمایا: اے امیر المومنین! حجر اسود منفعت بخش بھی ہے اور مضر رساں بھی، کاش آپ نے قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر پر غور فرمالیا ہوتا:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ۔

میثاق کے روز رب تعالیٰ نے عہد وپیمان لیا تو وہ عہد ایک ورق میں لکھ کر حجر اسود میں محفوظ کر دیا۔

یہ حجر اسود قیامت کے روز اٹھے گا تو اس کی آنکھیں اور زبان اور لب ہوں گے اور مومنین کی گواہی دے گا۔ اس طرح یہ خدا کا امین اور مسلمانوں کا شاہد ہے۔ اس جواب کو سن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''لا ابقانی اللہ بارض لست فیہا یا ابا حسین''۔

(مقدمہ ہدایہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی)

ترجمہ:۔ اے علی جہاں تم نہ ہو خدا مجھے وہاں نہ رکھے۔

سنگ اسود ہو یا مقام ابراہیم کا پتھر، ان دونوں کی عظمت و بزرگی کا دار و مدار نسبت اور آثار پر ہے۔ اسی تکریم کی وجہ سے خاص مقام ابراہیم کے لیے ارشاد ہوا:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِیْمَ مُصَلًّى۔

ترجمہ:۔ مقام ابراہیم کو جائے نماز بناؤ۔

ہر شخص کو معلوم ہے کہ مقام ابراہیم حرم پاک میں ہے۔ اور بیت اللہ شریف کے چاروں طرف مسجد حرام ہی ہے، پھر مسجد میں یہ بتانے کی حاجت محسوس نہیں کہ یہاں نماز پڑھو۔ ساری مسجد میں تو نمازی نماز پڑھتے ہی ہیں، مگر بتانا یہ ہے کہ پوری مسجد الحرام کے بلحاظ مقام ابراہیم پر نماز پڑھنا کچھ اور اہمیت رکھتا ہے۔

سنگ اسود کا بوسہ دینا تمام مسلمانوں کے نزدیک بالاتفاق جائز و مستحسن ہے، اسی سے استدلال کرتے ہوئے بعض عارفوں نے بزرگان دین کی قبروں کا بوسہ دینا جائز قرار دیا ہے۔

''استنبط بعض العارفین من تقبیل الحجر الاسود تقبیل قبور الصالحین''۔

ترجمہ:۔ حجر اسود کے چومنے سے بعض عارفوں نے بزرگوں کی قبروں کا چومنا ثابت کیا ہے۔

آثار کی توضیح:

آثار انھیں اشیا اور مقامات کو کہتے ہیں جنھیں انبیائے کرام علیہم السلام یا اولیا صلحا سے نسبت ہو جائے۔ مکہ کو رب تعالیٰ نے اپنی قسم میں ارشاد فرمایا اور صرف اس لیے کہ اسے پیارے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نسبت اور تعلق ہے۔

لَاۤ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔

ترجمہ:۔ اے نبی چونکہ آپ اس شہر میں ہیں اس لیے میں اس کی قسم کھاتا ہوں۔

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ۔ ترجمہ:۔ اور اسی شہر امین کی قسم۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے پائے مبارک سے جو پانی منسوب ہوا شفا بنا انھوں نے فرمایا:

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ O

آثار مبارکہ: قسط (سوم)

تعلیم امت:

اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حیات طیبات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرات اپنی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام میں حضور کی متابعت کرنا سعادت تصور فرماتے تھے ان کے لیے حضور کے آثار و تبرکات نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالحلیم ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء تا ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء صاحب والد ماجد مولانا عبدالحی فرنگی محلی قدس سرہما تحریر فرماتے ہیں:

''وقد کا ابن عمر رضی اللہ عنہما یتحری الصلوٰۃ والنزول والمرور حیث صلی اللہ علیہ وسلم ونزل و وضع ابن عمر رضی اللہ عنہما فی موضع جلس فیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم یدہ مسح وجھہ بیدہ''۔

(دارالایمان بزبان زیارت آثار حبیب الرحمن ص:۱۰)

ترجمہ:۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نماز پڑھتے اور سواری سے اترنے اور کسی رہ گزر میں چلنے کے لیے اس مقام کی جستجو فرماتے تھے جہاں سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی ہو۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نزول فرمایا ہو۔ جہاں سرکار نے تشریف ارزانی فرمائی تو حضرت ابن عمر اپنا ہاتھ وہاں رکھ کر چہرے پر پھیرتے تھے۔

آخر ایسا کیوں نہ ہو جب کہ ان کی نگاہیں خود شاہد ہیں کہ اللہ کے محبوب اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حصول برکت کا طریقہ خود اپنے عمل سے تعلیم فرمایا ہے۔ لیجئے حضرت ابن عمر ہی کی روایت ملاحظہ کیجئے:

''قال کان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یبعث المطاھر فیوتی بالماء فیشربہ یرجوا بہ برکۃ ایدی المسلمین''۔

ترجمہ:۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسلمانوں کی طہارت گاہوں سے پانی منگا کر نوش فرماتے اور اس سے مسلمانوں کے ہاتھوں کی برکت لینا چاہتے۔

اس حدیث کے تحت علامہ عبدالرؤف فتاویٰ تیسیر میں اور علامہ علی ابن احمد عزیزی سراج المنیر میں فرماتے ہیں:

''یرجوا بہ برکتہ الخ: لانھم محبوبون للہ تعالیٰ بدلیل ان اللہ یحب التوابین و یحب المتطھرین''۔

(تیسیر ج:۲، ص:۲۶۹)

ترجمہ:۔ حضور مسلمانوں کے مقامات وضو سے اس لیے امید برکت رکھتے تھے کہ وہ محبوبان خدا ہیں (کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے) اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے اور طہارت والوں کو۔

حدیث مذکورہ کو امام احمد رضا فاضل بریلوی (۱۲۷۲ھ تا ۱۳۴۰ھ قدس سرہ العزیز اپنی کتاب بدرالانوار فی آداب الآثار میں نقل فرمایا ہے اس کی مختصر تشریح کے بعد لکھتے ہیں:

'اللہ اکبر! یہ حضور پر نور سید المبارکین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں جنکی خاک نعلین پاک تمام جہاں کے لیے تبرک دل وجان و سرمہ چشم دین و ایمان ہے۔ وہ اس پانی کو جس میں مسلمانوں کے ہاتھ دھلے تبرک ٹھہرائیں اور اسے منگا کر بغرض حصول برکت نوش فرمائیں۔ حالانکہ واللہ مسلمانوں کے دست و زبان و دل و جان میں جو برکتیں ہیں سب انھیں کے عطا فرما ہیں۔ انھیں کے نعلین پاک کے صدقہ میں ہاتھ آئیں۔ یہ سب تعلیم امت اور تنبیہ مشغولان خواب غفلت کے لیے تھی یوں نہ سمجھیں تو اپنے مولا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فعل سن کر بیدار اور برکت آثار اولیا و علما کے طلبگار ہوں''۔

(سراج المنیر ج۳، ص۱۴۰۔ بدرالانوار ص ۱۳، ۱۲)

بھلا اس سے زیادہ محکم ودلیل اور کیا چاہئے جب کہ خود سرو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عمل شریف ہمارے سامنے ہے۔ وللہ حجۃ البالغہ۔

سجدہِ گاہ نبی سے برکت:

حصول برکت کے لیے اپنے گھروں میں سرکار کو لے جانا اور قدوم میمنت لزوم سے گھر کو رشک ارم بنانا تو کوئی دیارِ مصطفیٰ کے حاضر باشوں سے سیکھے ان کے مقدس قدم کی برکتیں لینے کا طریقہ سرور عالم کے جانبازوں سے معلوم کرے۔ اکتساب فیوض کے طریقے اصحاب کرام سے زیادہ کون جانتا ہے اور وہ بھی فدیت و محبت کے پورے جذبہ کے ساتھ ذیل میں دیکھیے ایک دیوانہ نبی بارگاہ رحمت میں عرض گزار ہے کہ سرکار میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر دو رکعت نماز پڑھ دیں تاکہ آپ کی اس سجدہ گاہ پر میں عمر بھر نالہ شبینہ اور آہِ صبح گاہی کا لطف لیتا رہوں۔ ناممکن ہے کہ سجدہ گاہ حبیب پر خلوص قلب سے نماز پڑھی جائے اور رحمت الٰہی جھوم نہ پڑے۔

حضرت علامہ محمد ابن اسماعیل بخاری ۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ محمود ابن ربیع انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں۔ عتبان ابن مالک بدری نے حضور کے دربار میں التجا کی:

''وددت یا رسول اللہ انك تاتینی فتصل فی بیتی فاتخذہ مصلی فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سافعل انشاء اللہ تعالیٰ فقال عتبان فقد اعلیٰ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وابوبکر حین ارتفع انھار فاستاذن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فاذنتہ لہ فلم یجلس حین دخل البیت ثم قال تحب ان اصلی من بیتك قال فاشرت لہ الیٰ ناحیۃ من البیت فقام رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فکبر فقمنا فصففنا فصلی رکعتین ثم سلم''۔

(بخاری شریف جلد جلد ص:۶۰،۲۵۔ فتح الباری ص:۲۶۰)

ترجمہ:۔ یارسول اللہ میری آرزو ہے کہ حضور میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلیں اور میرے مکان میں دو رکعت نماز پڑھ دیں تو اس جگہ کو مقام نماز قرار دوں حضور نے فرمایا انشاء اللہ جلد چلونگا۔ عتبان کہتے ہیں کہ حضور صبح کے وقت تشریف لائے۔ حضور کے ساتھ حضرت ابوبکر بھی تھے سورج بلند ہو چکا تھا۔ حضور نے مکان میں تشریف فرما ہونے کے لیے اجازت طلب کی۔ میں نے اجازت دی۔ سرکار گھر میں آکر بیٹھے نہیں کہ فرمایا کہاں نماز پڑھوانا چاہتے ہو؟ عتبان نے کہا: میں نے گھر کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کیا۔ حضور وہاں کھڑے ہوئے تکبیر کہی تو ہم لوگ بھی صف لگا کر کھڑے ہو گئے آپ نے دو رکعت نماز پڑھی پھر سلام پھیرا۔

علامہ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ بخاری شریف کی شرح میں فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں:

''وفيه التبرك بالمواضع اللتي صلى فيها النبي صلى الله عليه وسلم او وطئها''۔

ترجمہ:۔ اس حدیث میں ثبوت ہے کہ جن مقامات پر حضور نے نماز پڑھی یا قدم مبارک رکھا اس سے برکت حاصل کرنی چاہیے۔

آگے لکھتے ہیں:

''وفيه اجتماع اهل المحلة على الامام و العالم اذا اورد منزل بعضهم يستفيدوا منه و تتبركوا به''۔

(فتح الباری ج:ص:۲۶۰)

ترجمہ:۔ اس میں اس بھی سند ملتی ہے کہ امام و عالم اگر کسی مکان میں تشریف فرما ہوں تو اہل محلہ کو حصول برکت کے لیے مجتمع ہونا جائز ہے۔

یہ حدیث عتبان ابوالحسن محمد ابن الحلاج قشیری (۲۰۲ھ تا ۲۶۱ھ) نے اپنی جامع صحیح میں بھی دوسری سند سے نقل فرمائی ہے اس جگہ ہم سند اور متن حدیث کو تطویل کے خوف سے قلم انداز کرتے ہیں بلکہ حدیث کی شرحوں سے چند اقتباس ہدیہ قارئین کریں گے جس سے بخوبی واضح ہوجائے گا کہ علما سلف و محدثین عظام اور دین و دیانت میں پائگاہ رکھنے والی عظیم شخصیتیں بھی قرون ماسبق سے اسی عقیدہ پر چلی آرہی ہیں جو آج تک اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے۔ اور ہر زمانہ کے مسلمانوں کو اولیا انبیا کے تبرکات سے گہری شیفتگی رہی ہے۔ بلاوجہ نہیں بلکہ ذخائر احادیث میں اس کے لیے ٹھوس دلائل موجود ہیں۔

حدیث عتبان کی تشریح:

۲۶۔امام ابوزکریا نووی کے آثار کی مدح میں خاتمۃ المجتہدین ابوالحسن علی ابن عبدالکافی سبکی (۷۵۶ھ) نے فتح المنعال فی مدح الخیر النعال میں لکھا ہے، مناسب ہے کہ اس کو بھی پیش کیا جائے۔ شیخ الاسلام ابوزکریا نووی مدت دراز تک شام کے دارالحدیث کی مسند تدریس پر حدیث کا سبق دیتے رہے۔ ان کے بعد علامہ ابوالحسن علی عبدالکافی سبکی نے ان کے تبرکات کی مدح فرمائی:

''وفى دارالحديث لطيف معنىٰ الىٰ بسط لها اهبوا راوى لعلى ان امس بحر وجهى مكاناً مسه دم النووى''۔

ترجمہ:۔ یعنی دارالحدیث میں معنی کی ایسی لطافت پھیلی ہوئی ہے کہ میں اس میں طالب علمانہ زندگی گزاروں اور قرار حاصل کروں آرزو ہے کہ سیر چہرہ اس مقام کی جاروب کشی کرے جس پر امام نووی (نووی) کے مبارک قدم پڑے ہیں۔

امام نووی کی وفات کے بعد علامہ ابوالحسن ہی ان کے جانشیں ہوئے۔

''حكى جماعة من الشافعية ان الشيخ العلامه تقى الدين بالحس علماء البكى الشافعى كما تولىٰ تدريس دارالحديث بالاشرفيه بالشام بعد وفاة الامام النووى من يفتخر به المسلمون خصوصاً الشافعيه الشريفه''۔ (بدرالانوار)

ترجمہ:۔ شافعیہ کی ایک جماعت نے بیان کیا کہ شیخ ابوالحسن سبکی جب شام کے دارالحدیث الشرفیہ کی تدریس پہ مسلمانوں خصوصًا شافعیہ کی قابل فخر شخصیت امام نواوی (نووی) کی وفات کے بعد فائز ہوئے تو یہ اشعار مدحیہ فرمائے۔

'' فی ھذا الحدیث انواع من العلم فیه التبرك بأثار الصالحین وفیه زیارۃ العلما والصلحا والکبار اتباعھم و قبریکم ایاھم ''۔
(شرح مسلم ج:۱، ص:۲۴۷)

ترجمہ:۔ اس حدیث میں علم کی بہت سی قسمیں ہیں اس میں آثار صالحین سے برکت لینے کا بھی ثبوت ہے اور علما صلحا و اکابرین کی زیارت ان کی پیروی اور ان سے حصول برکت کا بھی ثبوت ہے۔

'' فی حدیث عتبان ھذا فوائد کثیرۃ منھا التبرك وطاب التبریك منھم ''۔ (شرح مسلم ج:۱، ص:۲۳۲)

ترجمہ:۔ عتبان کی اس حدیث میں بہت سے فائدے ہیں۔ انھیں میں سے برکت لینا اور برکت مانگنا بھی ہے۔

یہ تو ممکن نہیں کہ صحابہ کرام کسی ایسے کام کی طرف رخ بھی کریں جس کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ناگواری کا شائبہ بھی ہو۔ بلکہ ان جانثارانِ رسول کا تو یہ اندازِ زندگی تھا کہ وہ مزاج مبارک کے تیور دیکھتے رہتے تھے۔ کسی بھی کام میں اقدام اسی وقت کرتے تھے جب سرکار کی رضا معلوم کر لیتے تھے۔ ایسی بھی حدیثیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کو اپنی ذات شریفہ سے حصول برکت کے مواقع خود فراہم کیے۔

غسالہ کی برکت:

چنانچہ بخاری شریف میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے:

''قال ابو موسیٰ دعا النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم بقدح فیه ماء فغسل یدیه و وجھه ۔۔ومج فیه ثم قال لھما اشربا منه وافرغا علیٰ وجوھکما و نحورکما''۔ (بخاری شریف ج:۱)

ترجمہ:۔ ابوموسیٰ اشعری نے کہا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک بڑا برتن لیا جس میں پانی تھا۔ تو حضور نے اس میں اپنے دونوں ہاتھوں اور منہ دھلے اور کلی کی پھر فرمایا اس کو پی لو اور اپنے چہروں اور سینوں پر ڈال لو۔

یہ اشارہ حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما کی جانب تھا جو وہاں موجود تھے۔ ظاہر سی بات ہے وہ سرکار سراپا رحمت جب خود اپنا غسالہ مبارکہ بانٹ رہے ہیں تو عشق محمدی کے سرشار دیوانے کیوں نہ بڑھ بڑھ کر ابر رحمت سے سیراب ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام جسد اطہر کا دھوون لینے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی فرماتے تھے۔

'' اذا توضأ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم کادوا یقتتلون علی وضوئه ''۔
(بخاری شریف ج:۱)

ترجمہ:۔ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وضو فرماتے تو صحابہ کرام غسالہ لینے کے لیے ایسا لگتا تھا کہ آپس میں قتال کریں گے۔

سرکار کی بینی مبارک کی رطوبت اور دہن اطہر کا پانی زمین پر نہ گرنے پاتا تھا۔

''فوالله لا تختم رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم نخامة الا وقعت فی کف رجل منهم فدالك وجهه وجلده واذا امرهم اشدروا امره''۔

(بخاری شریف ج:۱، ص:۲۷۵)

ترجمہ:۔ قسم خدا کہ حضور نے اپنی بینی مبارک کی رطوبت جب جدا فرمائی ضرور صحابہ میں سے کسی کے ہاتھ میں آئی اور انھوں نے برکت کے لیے اسے اپنے چہرے اور جلد پر مل لیا اور جو حضور نے انھی حکم کردیا فوراً تعمیل کی۔

حضرت ابو حجیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں:

''خرج علینا النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم مالها جره فاتی بوضوء فتوضأ فجعل الناس یاخذون من فضل وضوئه فینمسحون به''۔

ترجمہ:۔ حضور ہمارے یہاں دوپہر کے وقت تشریف لائے وضو کے لیے پانی حاضر کیا گیا حضور نے وضو فرمایا تو صحابہ کرام آپ کے وضو کا پانی لے کر اپنے چہروں پر ملنے لگے۔

کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ صحابہ کرام جس پانی کو اپنے رخسار پہ مل رہے تھے وہ حضور کے وضو کرلینے کے بعد برتن میں بچا ہوا پانی تھا۔ بلکہ جو پانی آپ نے استعمال فرمایا اور وہ آپ کے اعضائے وضو سے بہا اصحاب کرام اسے اپنے ہاتھوں پر لے کر چہرے وغیرہ پر ملتے تھے۔

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدم ایم
ای بے خبر ز لذت شرب مدام ما

شرح بخاری میں علامہ بدرالدین عینی قدس سرہ کا فرمان ہے:

''هذا الحدیث یطلق الترجمة اذا کان المراد من قوله یاخذون من فضل وضوئه ما سأل من اعضاء النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم''۔

(عینی ج:۱، ص:۸۲۳)

ترجمہ:۔ یہ حدیث ترجمہ باب بخاری کے مطابق ہوجائے گی۔ اگر ابو حجیفہ کے قول ''یاخذون من فضل وضوئہ'' سے وہ پانی مراد ہو جو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اعضائے مبارک سے بہا۔

امام بخاری نے اس حدیث کے لیے جو باب باندھا ہے اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس پانی سے ''ما سال من اعضاء النبی'' مراد ہو۔ لیکن اگر باب بخاری کا لحاظ نہ کیا جائے۔ بلکہ وضو کے بعد برتن میں بچا ہوا پانی مراد لیا جائے۔ پھر تو مدعا اور بداہت سے ثابت ہوگا کہ جو پانی حضور کے اعضائے مبارکہ سے بہہ بھی نہ سکا بلکہ صرف اتنا نسبت حاصل ہے کہ اس برتن میں بچا ہوا ہے جس سے آپ نے وضو فرمایا ہے، اس قلیل نسبت رکھنے والے پانی کے لیے اصحاب کرام کا اسے حاصل کرنے کے لیے مسابقت کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرکار سے ادنیٰ تعلق رکھنے والی شئ بھی اہل ایمان کی نگاہ میں گوہر شب تاب سے قیمتی ہے۔

اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے علامہ عینی فیصلہ دیتے ہیں۔

”فيه الدلالة على جواز التبرك بآثار الصالحين“۔(عینی ج:۱، ص:۸۲۴)

ترجمہ:۔ اس حدیث میں نیکوں کے آثار کو تبرک بنانے کی دلیل ہے۔

آثار مبارکہ: قسط (چہارم)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جبہ سے طلب شفا:

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے:

''انها اخرجت جبة طيالسة كسروانية لها لبنة ديباج وفرجيها مكفوفين بالديباج فقالت هذه جبة رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم كانت عند عائشة فلما قبضت قبضتها و كان النبى صلى الله تعالىٰ عليه وسلم يلبسها فنحن نغسلها للمرضىٰ تستشفى بها''۔ (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص:۳۷۴)

ترجمہ:۔ (انھوں نے حضرت اسماء) نے ایک اونی جبہ کسروانی ساخت کا نکالا اس کی پلیٹ ریشمی تھی اور دونوں چاکوں پر ریشم کا کام تھا۔ کہا یہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جبہ ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تھا ان کے انتقال کے بعد میں نے لے لیا۔ حضور اس کو پہنتے تھے۔ ہم اسے دھو دھو کر مریضوں کو پلاتی ہیں اور اس سے شفا طلب کرتی ہیں۔

یہ حدیث بزرگوں کے تبرکات سے حصول برکت کی بین دلیل ہے۔ کیونکہ حضور کا ملبوس مبارک دھوکر مریضوں کو پلانا اور اس کے ذریعہ مریضوں کا شفا طلب کرنا، ان پاکباز خواتین کا طریقہ تھا، جن کے شام و سحر وحی الٰہی کی چھاؤں میں گزرتے تھے۔

اسی حدیث اسماء کی شرح میں امام نووی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''وفى هذا الحديث دليل علىٰ استحباب التبرك بآثار الصالحين و ثيابهم''۔ (شرح مسلم للنووی ج:۲، ص:۱۹۱)

ترجمہ:۔ اس حدیث میں صالحین کے آثار اور ان کے ملبوس سے حصول برکت کے مستحب ہونے کا ثبوت ہے۔

سند المحدثین شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۹۵۸ھ تا ۱۰۵۲ھ) علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

''غرض اسماء از آوردن ایں جامہ و نمودن آں بمردم اظہار نعمت و برکت وجود ایں جامہ شریف بود نزد وے''۔

(اشعۃ اللمعات ج ۳، ص ۴۴۶)

ترجمہ:۔ حضرت اسماء کا یہ کپڑا لانے اور دکھانے کا مقصود ان کے نزدیک اظہار نعمت اور اس مبارک کپڑے کے وجود کی برکت ہے۔

ان تمام آثار اور اعمال صحابہ وغیرہ کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ تقرب الی الرسول کے ان مثبت ذرائع کو نظر انداز کر دیا جائے، جس پر قرنہا قرن سے مسلمانوں کے سواد اعظم کا عمل رہا ہے۔ اور علمائے ربانیین و فقہا و محدثین نے جنھیں کتاب و سنت کے دلائل سے مبرہن کیا ہے۔

موئے مبارک:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آثار و تبرکات میں آپ کے موئے مبارک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شاید دنیا کا کوئی خطہ ایسا ہو جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو اور موئے مبارک نہ ہو ایمان والوں کے قلوب میں اس کی عظمت و وقعت بھی بے پناہ ہے جو بالیقین حضور کی محبت میں کاملیت کی دلیل ہے۔ یہ وہ اہم تبرک ہے جو سرکار نے خود بھی اپنے دست مبارک سے تقسیم فرمایا ہے۔

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

''ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دعا بالحلاق و ناول الحالق شقة الایمن فحلقه ثم دعا ابا طلحة الانصاری فاعطاہ ایاہ ثم ناول الشق الایسر فقال احلق فحلقه فاعطاہ ابا طلحة فقال اقسمه بین الناس''۔

(صحیحین بخاری بخاری و مسلم)

ترجمہ:۔ نبی علیہ السلام نے حجام کو بلاکر سر مبارک کے دائیں جانب کے بال مونڈنے کا حکم دیا۔ پھر ابو طلحہ کو بلاکر سب بال ان کو دے دیئے۔ پھر بائیں طرف کے بالوں کے لیے حکم فرمایا اور کہا انھیں تراشو تو حجام نے تراشا پس وہ بھی ابو طلحہ کو دے دیئے اور فرمایا یہ لوگوں میں بانٹ دو۔

اب آپ ہی بتائیں حضور کا بھیجا ہوا تبرک دنیا کا کون سا مسلمان ہے جو کلیجے سے لگاکر نہ رکھے گا۔ چنانچہ آگے کی روایات سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دلدادگان عشق مصطفیٰ نے اس عظیم تبرک کو حرز جاں بناکر رکھا ہے۔

بخاری شریف میں عثمان ابن عبداللہ ابن مواہب سے روایت ہے، انھوں نے کہا:

''دخلت علی ام سلمة فاخرجت الینا شعرا من شعر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مخضوباً''۔

ترجمہ:۔ میں ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے ہمیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی زیارت کرائی اس پر خضاب کا اثر تھا۔

اوپر کی تحریروں سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آثار و تبرکات میں موئے مبارک کو جو عظمت اور اہمیت حاصل ہے وہ قرون اولیٰ سے آج تک مسلمانوں میں قدر مشترک ہے اور اس قدر و منزلت ہی کا اثر ہے کہ ان آثار کی برکت سے مسلمانوں کے دامن ہمیشہ مستفید ہوتے رہے موئے مبارک نے رزم و بزم کی ہر مشکل میں ان کی مشکل کشائی کی۔

حضرت خالد ابن ولید اور موئے مبارک:

حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۱۳ھ مطابق ۶۳۴ء) کے دور خلافت میں یمامہ کی جنگ ہوئی جس کی کمان حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔ جنگ کے دوران آپ کی ٹوپی سر سے گر گئی، اس ٹوپی کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو بڑی جانکاہی کرنی پڑی اس شدت میں آپ کی تلوار سے دشمنوں کا بے تحاشہ قتل ہوا۔ کثرت مقتولین کو دیکھ کر صحابہ کرام نے آپ سے تعرض کیا۔ کہ آخر ایک ٹوپی میں کون سی ایسی خاص بات تھی کہ آپ نے اتنے سارے دشمنوں کے قتل میں دریغ نہ فرمایا۔ اس پر حضرت خالد سیف اللہ نے فرمایا

میری اس کلاہ میں حضور اقدس جناب محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے موئے مبارک تھے۔ دل نے یہ گوارہ نہ کیا کہ موئے مبارک دشمنوں کے قبضہ میں چلا جائے اور میں اس کی برکتوں سے محروم ہو جاؤں۔

''وکانت فی قلنسوۃ خالد ابن ولید شعرات من شعرہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فسقطت قلنسوتہ فی بعض حربہ فشد علیہا شدۃ انکر علیہ اصحاب النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لکثرۃ من قتل فیہا فقال لم افعلہا بسبب القلنسوۃ بل لما تضمنتہ من شعرہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لئلا اسلب برکتہا وتقع فی اید المشرکین''۔

(نسیم الریاض ج:۳، ص:۳۱۴)

ترجمہ:۔ حضرت خالد کی ٹوپی میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے موئے مبارک تھے۔ ان کی ٹوپی کسی جنگ میں گر گئی تو انھوں نے اس کے لیے بہت خوں ریز جنگ کی دیگر اصحاب نے کثرت مقتولین کے سبب اس کو ناگوار سمجھا تو حضرت خالد نے کہا کہ میں نے ٹوپی کی وجہ سے ایسا نہیں کیا بلکہ اس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے موئے مبارک تھے وہ مشرکین کے ہاتھ نہ لگیں اور اس کی برکت مجھ سے منقطع نہ ہو۔

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی علیہ الرحمہ اس کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ

''ذالک امر عظیم یخاطر بالارواح لاجلہ بہ''۔

ترجمہ:۔ (موئے مبارک سے محرومی) اتنا عظیم اندیشہ ہے جس کے لیے جانیں خطرے میں ڈال دی جاتی ہیں۔

تبرکات کو ایک سے دوسری جگہ لے جانا:

تبرک و آثار کے باب میں حضرت طلق ابن عدی کی حدیث بھی نہایت اہم ہے طویل متن حدیث کو قلم انداز کر کے یہاں ہم صرف اس کے مفہوم پر اکتفا کریں گے۔ اور اس حدیث پاک کی تشریحات کے مختصر اقتباس پیش کریں گے۔

حضرت طلق ابن عدی مدینہ طیبہ سے دور کسی شہر کے رہنے والے تھے۔ سرکار کے وضو کا بچا ہوا پانی بطور تبرک اپنے وطن لے گئے۔ (اس کو سنن نسائی نے بھی نقل کیا ہے)

حضرت ملا علی قاری مکی ۱۰۱۴ھ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں اسی حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

''فیہ التبرک بفضلتہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ونقلہ الی البلاد نظیر ماء زمزم''۔

ترجمہ:۔ اس حدیث میں حضور کے جبہ سے حصول برکت اور اسے آب زمزم کی طرح باقی ماندہ وضو کے پانی دوسرے شہروں میں لے جانے کا ثبوت ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''ویوخذ من ذالک ان فضلۃ وارثیہ من العلما والصلحا کذالک''۔

ترجمہ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیا کے وارث علما اور صلحا کا بقیہ ماندہ بھی ایسا ہی ہے۔

شیخ محقق فرماتے ہیں:

"دریں حدیث استحباب و تبرک است بہ بقیہ آب وضو پس ماندہ آں حضرت و نقل آں ببلاد و مواضع بعیدہ مانند آب زمزم"۔

اس حدیث میں حضور کے وضو کا بچا ہوا پانی اور دیگر باقی ماندہ چیزوں سے حصول برکت کا مستحب ہونا ثابت ہے اور دوسرے شہروں اور دور دراز مقامات پر لیجانا بھی درست ہے اور سرکار جب مدینہ میں تشریف رکھتے تھے تو حاکم مکہ سے آب زم زم منگواکر تبرک بناتے تھے۔ حضور کے وارث علما وصلحا ہیں تو ان کا بقیہ اور ان کے آثار و انوار سے حصول برکت کو بھی اسی پہ قیاس کیا ہے۔

حضور کی مبارک انگشتری:

علامہ قسطلانی مواہب میں شیخین سے نقل فرماتے ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جو حضور کے دست مبارک میں رہی سرکار کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس رہی ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں آئی۔ شہادت فاروقی کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ملی وہ اویس کے کنوئیں میں گرگئی۔ مذکورہ بالا روایت کے مطابق سرکار کی انگوٹھی آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کو منتقل ہوتی رہی۔ گویا اس کی تفصیل بقید سنہ یوں ہوسکتی ہے۔

۱۲/ربیع الاول شریف ۱۱ھ مطابق ۹/جون ۶۳۲ء سرکار کا وصال اس کے بعد صدیق اکبر کو ملی۔ ربیع الاول ۱۱ھ جون ۶۳۲ء تا جمادی الاخریٰ ۱۳ھ مطابق ۶۳۴ء حضرت صدیق اکبر کے پاس رہی۔ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ ۶۳۴ء تا ذی الحجہ ۲۳ھ ۶۴۴ء حضرت فاروق اعظم کے پاس رہی۔ محرم ۲۴ھ ۶۴۸ء میں جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تخت خلافت پہ متمکّن ہوئے تو وہ انگشتری مبارک آپ کے قبضہ میں آئی۔ اور آپ کے خلافت کے ساتویں سال ۳۱ھ مطابق ۶۵۱ء میں یہ مبارک انگوٹھی مدینہ کے اویس نامی کنوئیں میں گرگئی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس تبرک کی گم شدگی کے بعد سے امور خلافت میں انتشار شروع ہوگیا۔ خوارج نے سر ابھارا اور بالآخر جمادی الاولیٰ ۳۵ھ مئی ۶۵۶ء میں آپ کو نہایت بیدردی اور بے رحمی کے ساتھ شہید کردیا گیا۔

آثارِ مبارکہ: قسط (پنجم)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جو مبارک انگشتری بیر اویس میں گر کر ضائع ہوگئی اس کے متعلق علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

'' كان ذالك فى السنة السابعة من خلافته ومن يومئذ انتقض امر عثمان وخرج عليه الخوارج وكان ذالك مبدأ الفتنة اللتى افضت الىٰ قتله و انصلت الىٰ آخر الزمان قال بعض العلما فكان فى هٰذا الخاتم النبوى من السر شئ مما كان فى خاتم سليمان لانه لما فقد خاتمه ذهب ملكه ''۔ (زرقانی ج:۵، ص:۳۰)

ترجمہ:۔ یہ واقعہ عثمان کی خلافت کے ساتویں سال رونما ہوا۔ اسی روز سے امر خلافت خلل پذیر ہوا۔ آپ پر خوارج نے خروج کیا یہی اس فتنہ کی ابتدا تھی جس کا اختتام آپ کی شہادت پر ہوا اور وہ فتنہ اخیر تک قائم رہا بعض علما نے فرمایا کہ اس انگشتری میں کوئی ایسا راز تھا جیسا حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگشتری میں تھا، جب وہ گم ہوئی ملک جاتا رہا۔

عمرابن عبدالعزیزاورآثارشریفہ:

بنی امیہ جس کا دور ۴۱ھ سے شروع ہوکر ۱۲۷ھ تک رہا اور چودہ اُمراء برسر اقتدار آئے ان تمام میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز منفرد خصوصیات کے حامل ہیں۔ آپ نے صرف ۲۹/ ماہ کی خلافت میں پوری اسلامی ریاست کو منہاج نبوی کے اصولوں پر ڈھال دیا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں آپ کا دور زریں اوراق میں شمار ہوتا ہے آپ کے اصول خلافت میں تمام ترللّٰہیت خشیت اور زہد و ورع کا عکس جھلکتا ہے۔ قوانین شرعیہ حدود میں سمٹی ہوئی آپ کی سادہ سی زندگی نے تمام بلادِ محروسہ کو دین داری و باضابطگی کا خوگر بنادیا تھا۔

تمام معتقدات اسلامی اور اعمال دینی میں آپ جس قدر کامل سخت گیر تھے اسی طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت بھی آپ کے ایمان کا جزو لاینفک تھی۔ آثار نبوی اور تبرکات سے آپ کو جتنا گہرا تعلق تھا اس کے لیے شیخ محقق کی ایک تصریحی عبارت پیش کرتا ہوں:

'' كان عند عمر بن عبد العزيز اشياء من متروكاته صلى الله تعالىٰ عليه وسلم منها الخفاك والقطيفة والكنانه وغيرها كان هو يحافظها ويهتم بها وكان يزورها كل يوم مرة واذا جاء عنده واحد من الاشراف اذهب هناك ويقول هٰذا ميراث من اكرمكم و عزكم به كذا اورد الشيخ الدهلوى ''۔

(نور الایمان بزیارت آثار حبیب الرحمن ص:۱۰)

ترجمہ:۔ عمر ابن عبدالعزیز کے پاس حضور کے کئی تبرکات تھے۔ ان میں سے دو موزے، چادر اور ترکش تھا۔ آپ ان کی بڑی حفاظت کرتے اور بڑا اہتمام فرماتے اور روزانہ ایک بار زیارت کرتے تھے۔ جب سادات میں سے کوئی آتا تو وہ انھیں لے جاکر تبرکات دکھاتے اور فرماتے کہ یہ اس اکرم و اعلیٰ شخصیت کی میراث ہے، جن کی بدولت خدا نے تمہیں معزز و مشرف کیا۔

آثار و تبرکات کی روز آنہ زیارت وہی شخص کرے گا جو طلب مصطفی میں والہ و شیدا ہو۔ ہر میزبان اپنے مہمان کو اپنی قیمتی شئ اور وقیع کارنامہ ہی دکھاتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی نگاہ میں ان آثار کی اتنی وقعت تھی کہ اپنی سلطنت و مملکت اور شاہانہ کروفر اور زیب و

جدال اور اہم و نمایاں کارنامے دکھانے کے بجائے، وہ شئ دکھا رہے ہیں جو واقعی تمام دنیاوی دولتوں سے اہم ہے اور جسے حضور کی نسبت حاصل ہے۔

دیوانگی عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنالیں

شاہ ولی اللہ اور آثار مبارکہ:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ (۱۱۷۶ھ) نے بھی اپنی تحریروں میں آثار مبارکہ سے اکتساب فیض کے لیے وافر ثبوت فراہم کیے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے انفاس العارفین وفیوض الحرمین)

لیکن ہم اس جگہ آپ کی ہمعات سے صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں تاکہ اہل بصیرت اندازہ لگائیں کہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آثار و تبرکات توالگ اولیا، صلحا، علما کے آثار کی برکت کے حصول میں بھی دور قدیم کے مسلمان کتنے مخلص و معتقد تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ:

حرمین شریفین کے ایک شخص نے سیدنا غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کلاہ مبارک پائی رات خواب میں دیکھا کہ سرکار غوث پاک فرمارہے ہیں کہ میری یہ ٹوپی ابوالقاسم اکبرآبادی کو پہنچادو۔ اس شخص نے بغرض امتحان ٹوپی کے ہمراہ ایک قیمتی جبہ بھی ابوالقاسم اکبرآبادی کی خدمت میں پیش کیا اور کہا یہ دونوں غوث پاک کا تبرک ہے۔ مجھے آپ کے پاس پہنچانے کا حکم ہوا تھا۔ شیخ ابوالقاسم بہت مسرور ہوئے اور نہایت اعزاز واکرام سے تبرک لے لیا۔ لانے والے صاحب نے کہا اس حصول تبرک کے اعزاز میں اہل شہر کو دعوت دیجیے۔ شیخ ابوالقاسم نے صبح کے وقت بہت سے لوگوں کی دعوت کی۔ لوگوں نے کھانا کھایا اور فاتحہ پڑھیں۔ رخصت ہوتے وقت کچھ لوگوں نے شیخ ابوالقاسم سے پوچھا، آپ تو غریب آدمی ہیں، اتنی شاندار دعوت کا انتظام کیسے کرلیا؟ فرمایا: یہ سب غوث پاک کا کرم ہے۔ تبرک کے ہمراہ ایک قیمتی جبہ بھی مل گیا تھا، جو غالبًا اسی لیے تھا، اس لیے میں نے اسے بیچ دیا اور تبرک کے اعزاز میں آپ لوگوں کی دعوت کردی۔ سب کی زبان سے یک لخت نکلا ”حق بحق دار رسید“

آثار مصطفی، امام احمد رضا کی نگاہ میں:

چودھویں صدی ہجری کی سب سے مہتمم بالشان علمی شخصیت جسے زمانہ امام احمد رضا فاضل بریلوی کے نام سے جانتا ہے۔ (۱۲۷۲ھ تا ۱۳۴۰ھ) وقت کا کون سا نازک ترین مسئلہ تھا، جس کی آپ کے ناخن تدبیر نے عقدکشائی نہیں کی (۲۲x۱۸) سائز پہ فتاویٰ رضویہ کی دس ضخیم جلدوں کے علاوہ پچاسوں فنون پر سینکڑوں تصنیفات آپ کے مجددانہ کارنامہ کی شہادت دے رہی ہیں۔ آثار مبارکہ سے متعلق بھی آپ نے رسالے تحریر فرمائے ہیں۔ (بدرالانوار ص ۱۰)

مشتے از خروارے کے طور پر آپ کی تحریر کا صرف ایک اقتباس حاضر خدمت ہے، جس سے بخوبی واضح ہوجائے گا کہ آثار مبارکہ کی عظمت و وقار کیا ہے؟:

”ائمہ دین و علمائے معتمدین نعل اقدس کی شبیہ و مثال کی تعظیم فرماتے رہے اور اس سے صدہا عجیب مددیں پائیں اور اس باب میں مستقل کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جب نقشہ کی یہ برکت وعظمت ہے تو خود نعل اقدس کی برکت وعظمت کا خیال کیجیے۔ پھر روئے اقدس، جبہ مقدسہ،

عمامہ مکرمہ پر نظر کیجیے۔ پھر ان تمام آثار و تبرکات شریفہ سے ہزاروں درجے اعظم و اعلیٰ و اولیٰ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ناخن کا تراشہ ہے کہ سب ملبوسات تھے، وہ تو جزوِ بدن والا ہے۔ اور اس سے اجل و اعظم و ارفع و اکرم حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ریش مبارک کا موئے مطہر ہے۔ مسلمان کا ایمان گواہ ہے کہ ہفت آسمان و زمین ہرگز اس موئے مبارک کی عظمت کو نہیں پہنچتے"۔ (بدرالانوار)

علمائے فرنگی محل اور آثار نبوی:

بارہویں اور تیرہوی صدی میں فرنگی محل، علما کا مرکز تھا۔ اس خانوادہ نے ولی اللہ خاندان کے بعد ہندوستان میں اپنی علمی خدمات کے بہت اہم نقوش چھوڑے ہیں۔ ممالک اسلامیہ کے بعض خطوں میں ہندوستان، اسی گھرانہ کے بتوسط متعارف ہوا۔ اس خاندان کے علما نے فقہ و حدیث اور سب سے زیادہ علومِ عقلیہ، منطق و فلسفۂ اسلامی کے ذریعہ اپنی خدمات پیش کیں۔ اسی منبع علم و دانش کے دُرِ شہسوار حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۵ء تا ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء علیہ الرحمہ ہیں۔

درسِ نظامیہ کی تمام مروجہ تعلیمات میں جتنے فنون رائج تھے، آپ کو بھی ان میں مربیانہ درک تھا۔ اسلامی معتقدات میں اس گھرانے نے اسلافِ اہل سنت کے مسلک کی خوب خوب خدمت کی۔ نمونے کے طور پر ہم حضرت مولانا عبدالحلیم علیہ الرحمہ کی آثار مبارکہ سے متعلق مختصر کتاب "نورالایمان بزیارت آثار حبیب الرحمن" کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ مولانا نے اس کتاب کے ابواب کو "تنویر" اور فصلوں کو "نور" سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ تنویرالاول کی دوسری فصل کو:

"النور الثانی فی اعظام مأثر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و حکم من عابہ"۔

"یعنی دوسری فصل حضور کی نشانیوں کی تعظیم اور اس کی توہین کرنے والوں کے حکم میں"۔ کا عنوان دیا ہے۔

اسی فصل میں لکھتے ہیں:

"ان من اعظامہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم واکبارہ و اعظام جمیع مشاھدہ و اعظام جمیع امکنتہ و معاھدہ وما لمسہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بیدہ او برجلہ او عرف بہ"۔ (نورالایمان ص:۹)

ترجمہ:۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نشانیوں کی تعظیم و تکریم بھی حضور ہی کی تکریم کا ایک حصہ ہے۔ یوں ہی حضور کے مکانات، قیام گاہیں اور وہ جنھیں حضور کے دست مبارک، پائے اقدس یا پہلوئے ناز نے چھولیا، یا جو حضور کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں، ان سب کی تعظیم در اصل حضور کی تعظیم ہے۔

"وقال شیخ الدھلوی فی المدارج ان الاحترام والتوقیر و حسن الادب بعد وفاتہ عند ذکرہ و سماع اسمہ و سیرہ و حالاتہ و سماع حدیثہ کما ھو فی حضورہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم"۔

ترجمہ:۔ شیخ عبدالحق دہلوی نے مدارج النبوۃ میں فرمایا کہ حضور کی وفات کے بعد آپ کا وہی احترام و توقیر اور حسن ادب، آپ کے تذکرۂ اسم گرامی سننے اور سیرت و حالات اور حدیث سننے کے وقت کرنا چاہیے، جو حیات میں تھا۔

''وقال ابو ابراھیم واجب علی کل مومن متیٰ ذکرہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم او ذکرہ عندہ ان یخضع ویخشع ویتوقر ویسکن حرکتہ ویاخذہ من ھیبۃ واجلال ماکان یاخذ بہ نفسہ لوکان بین یدیہ''۔ (نوارالانوار)

ترجمہ:۔ ابوابراہیم نے کہا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب حضور کا ذکر خود کرے یا کسی دوسرے کو کرتا سنے تو وہی خشوع وخضوع توقیر وسکون اختیار کرے اور ان کی عظمت شان کی وہی ہیبت ملحوظ رکھے، جو حضور کے روبرو ہونے کے وقت رکھتا تھا۔

حصولِ برکت ہی کی قبیل سے حضرت کبشہ کی وہ حدیث ہے، جس میں انھوں نے فرمایا کہ حضرت میرے گھر تشریف لائے، وہاں پانی سے بھری ایک مشک لٹک رہی تھی، آپ نے اس سے منہ لگاکر پانی نوش فرمایا تو میں نے مشک کا دہانہ کاٹ کر رکھ لیا۔ محدثین نے فرمایا ہے کہ کبشہ کا یہ عمل تبرک کے لیے تھا، کیونکہ مشک کے دہانہ سے سرکار نے اپنے دہن مبارک کو مس فرمایا تھا۔

بخاری نے ابن سیرین سے روایت کیا، وہ کہتے ہیں: میں نے عبیدہ سے کہا کہ میرے پاس حضور کا موئے مبارک ہے، جو مجھے حضرت انس کے خاندان سے ملا ہے۔ تو عبیدہ نے تاسف سے کہا:

''لان تکون عندی شعرۃ منہ احب الی من الدنیا ومافیھا''۔

ترجمہ:۔ اگر میرے پاس حضور کا موئے مبارک ہو تو میں اسے دنیا ومافیہا سے زیادہ محبوب رکھوں۔

آثار مبارکہ: آخری قسط

صدرالافاضل اور آثار مبارکہ:

حضرت مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ صاحب تفسیر خزائن العرفان، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کے ہمعصر علما میں ہیں۔ اپنے دور میں آپ بھی مرجع الفتاویٰ رہ چکے ہیں۔ صاحب تصانیف ہیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آثار و تبرکات کے بارے میں انھوں نے بھی ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے: ''آداب الاخیار فی تعظیم الآثار'' مصنفہ صدرالافاضل کا مطالعہ کیجیے۔

افادۂ ناظرین کے خیال سے اس کا بھی مختصر تراشہ حاضر خدمت ہے:

آثار مبارکہ کی زیارت و عزت کرنا نہ صرف جائز بلکہ موجب ثواب عظیم ہے۔ جو شخص ان آثار کی عزت نہ کرے، وہ حب نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعمت سے محروم ہے۔ یہ ایک ایسا بدیہی مسئلہ ہے کہ اس پر دلیل پیش کرنے کی بھی حاجت نہیں۔ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت ہی تو ذریعہ ایمان اور اصل دین ہے۔ اسی کی بدولت نعمت اسلام و دولت خداشناسی میسر ہوئی۔

وجدانِ سلیم حاکم ہے کہ محبوب کے تمام اقوال و افعال، رفتار و گفتار، اوضاع و خصال اور اس سے علاقہ رکھنے والی ہر شئ اور جو چیزیں اس کی طرف منسوب ہوں، سب محب کو پیاری اور محبوب ہوتی ہیں اور اس کا جذبہ محبت ان سب کی قدر و عزت اور احترام و اکرام کا متدعی ہوتا ہے اور یہ محبت کی نشانی ہے اور ایسا نہ ہو تو محبت کا دعویٰ لاف زنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احد شریف کے حق میں جو مدینہ طیبہ کے قریب ایک پہاڑ ہے، حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا (نحبہ) ہم اس کو محبوب رکھتے ہیں۔ (آداب الاخیار ص ۹،۱۰)

اخیر کتاب میں فرماتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کی طرف نظر کرنا، حق کی طرف مائل کرے اور خدا کو یاد دلائے وہ عبادت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آثار شریفہ کی زیارت سے خدا یاد آتا ہے اور محبوب کبریا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی زیارت داخل عبادت ہوئی۔ (آداب الاخیار)

امام مالک اور توقیر حبیب:

ائمہ اربعہ میں امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۱۷۹ھ) بھی ہیں۔ آپ کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ مختصر یہ کہ علم و فضل میں یکتائے روزگار، ظاہر و باطن کے امام تھے۔ ''المدونہ'' آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، جس میں ۳۶؍ ہزار فتاویٰ ہیں۔

آپ کے بارے میں خاتم المحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''ایشاں را دریں امر نہایت احتیاط بود گویند کہ تمام عمر در حد حرم مدینہ منورہ قضائے حاجت نہ کرد بیرون حرم می رفت مگر در حالت مرض''۔ (بستان المحدثین)

ترجمہ:۔ آپ اس معاملہ میں بڑے پابند تھے۔ کہتے ہیں کہ پوری زندگی مدینہ منورہ کے حرم میں رفع حاجت نہ کیا، ہمیشہ باہر چلے جاتے، سوائے بیماری کی حالت کے۔

''وگاہے در مدینہ طیبہ سوار نمی شدومی فرمود''۔

ترجمہ:۔ اور مدینہ طیبہ میں کبھی سواری پہ نہ بیٹھے۔

فرماتے ہیں:

''انا استحی من اللہ ان اطأ تربتہ بھا قبر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم احاذ تربتہ''۔ (بستان العارفین)

ترجمہ:۔ میں خدائے تعالیٰ سے شرم کرتا ہوں کہ اس سرزمین کو سواری سے روندوں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر ہے اور (سوار ہوکر) حضور کی تربت کے مقابل ہوجاؤں۔

حاصل گفتگو:

قرآن و حدیث اور فرامین محدثین و علما سے ماخوذ ان تمام مرقومات کے آئینہ میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے کہ حضور روحی فدا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آثار مبارکہ اور تبرکات کو ہر زمانہ کے مسلمان قابل توقیر و تعظیم سمجھتے رہے اور ہر زمانہ میں جاںثارانِ نبی اسے حرزِ جاں بنائے رہے اور تمام ادوارِ سابقہ میں، تمام صحیح العقیدہ مسلمانوں نے حضور کی نشانیوں میں حضور کا جلوہ دیکھنے کی کوشش کی۔

گویا: ۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

اس محبوب دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ملبوسات پاک، نعلین مقدس، موئے مبارک اور تراشہ ناخن اقدس میں جب اس قدر برکت و عظمت ہے تو ذاتِ والا کی خوبیاں اور ان کی لازوال عظمت و برکت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

ندانم آں گل خنداں چہ سنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنے آروئے او دارد

مادر پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر زلذت شرب مدام ما

(شیرازی)

باب چہارم: کربلا کی یاد میں

ہر کربلا کے بعد

معرکوں اور جنگوں کی فہرست میں شہادت امام عالی مقام اور واقعاتِ کربلا کی اہمیت کا سبب صرف یہ نہیں کہ اس میں سبطِ پیغمبر کو شہید کیا گیا، اہل بیت مصطفی کو خاک و خون میں تڑپایا گیا، اللہ کے رسول کا سرسبز و شاداب گلشن تاراج ہوا۔ بلکہ تاریخ اسلام میں اس کی اہمیت و افضلیت کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ یزیدیت نظامِ مصطفی میں جو رخنہ اندازی کر رہی تھی، دین نبی کے اصول و فروع کو اپنے اعمال سے جس طرح پامال کرنا چاہتی تھی، مسلمانوں میں فتنہ کا جو دروازہ فسق و فجور کے ذریعہ کھول رہی تھی۔ حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے انسداد کے لیے اپنی بیش قیمت ذات کو پیش کر دیا۔ پورا کنبۂ اہل بیت، اسلام کی حفاظت وصیانت پر قربان کر دیا۔

یہ مخفی نہیں کہ اسلام کی حفاظت وصیانت کا مسئلہ رفتہ رفتہ پیچیدہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ زمانہ کے قدم جوں جوں آگے بڑھ رہے ہیں، نئے نئے فتنے سر اٹھا رہے ہیں۔ مخالفین کی یورشیں تیز سے تیز تر ہو رہی ہیں۔ منافقت نئی نئی آستینوں سے سر ابھار رہی ہے۔ نہ صرف قرآن کے منصوص حقائق کے خلاف بلکہ نفس اسلام کی بنیادیں متزلزل کرنے کے لیے دنیا کے تمام اسلام دشمن عناصر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

ایسے پراگندہ ماحول میں، کمزور، نہتے اور بظاہر بے سہارا مسلمانوں کے لیے دشت کربلا کی تاریخ ایک عظیم درسِ عبرت اور مشعل عمل ہے۔ تاریخ اپنے قدردانوں کو مستقبل کی زندگی کے لیے ہمیشہ عبرت و موعظت کے گراں قدر تحائف سے نوازتی رہی ہے۔ جس دور کے حالات ماضی کی تاریخ کے کسی ورق سے مطابق ہوں گے، اس ورق کو اس دور کے لیے دستور العمل بنانا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ آج کی فتنہ پرور دنیا میں یزیدیت اپنی پوری تیاری کے ساتھ پھر اسلام کو مسخ کر دینا چاہتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ کربلا کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے تو یقینا آج کے ماحول میں کربلا کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔

اسلام کو مٹانے کی ناپاک کوششوں نے اندرونی و بیرونی تمام راستوں سے اپنی دسیسہ کاریوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ اہل حق بے دار ہوں اور وقت کی ضرورت کا احساس کر کے اپنے فرضِ منصبی کے لیے آمادۂ عمل ہوں۔ مذہب وملت کے مرجھائے پودوں کو پھر خون کی ضرورت ہے۔ حسینیت آواز دے رہی ہے کہ اے بادہ کشاں محبت! خوابِ غفلت سے چونک پڑو! اسلام و ایمان کی حفاظت کے لیے، دین و دانش کے تحفظ کے لیے، کلمۂ توحید کے فروغ کے لیے، کمر بستہ ہو جائو۔ کیوں کہ: ؎

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حسین شہید وفا

سانحہ کربلا، جس کی تاریخِ عالم میں کوئی نظیر نہیں۔ اس کی پیشین گوئی سید الانبیا صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے اپنی ہی زبانِ بلاغت افشا سے فرمائی تھی۔ صحابہ میں بہت پہلے اس کی شہرت ہو چکی تھی۔ چنانچہ وقت معہود پر یہ امتحانِ عظیم رونما ہوا۔

۶۱ھ میں ولید ابن عقبہ نے یزید کے حکم سے امام عالی مقام سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ امام نے یزیدی نمائندوں کا رجحان پہچانتے ہی فتنہ کو دبانے کے لیے مکہ کی طرف ہجرت کرلی، تاکہ حرمِ الٰہی میں پہنچ کر فاسق کی بیعت سے نجات حاصل کریں۔ مکہ میں امام کی تشریف آوری کے بعد یہاں کے مسلمانوں نے اور خود حضرت عبداللہ ابن زبیر نے پیش کش کی کہ حضور اب وقت آگیا ہے کہ آپ اپنا دست مبارک بڑھائیں، تاکہ ہم سب آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں اور آپ اگر مدینہ کو اس وقت غیر مامون سمجھتے ہوں تو مکہ ہی میں قیام کرلیں۔ مگر امام عالی مقام نے کوفیوں کے متواتر خطوط اور قاصدوں کے جواب میں کوفہ جانے کی حامی بھرلی تھی۔ جب آپ نے کوفہ کے لیے رخت سفر باندھا تو تمام متعلقین واقربا نے بڑی شدت سے روکا اور کہا کہ ان دغابازوں پر اعتماد کرکے آپ کو مکہ سے ہجرت نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کے برادرِ مکرم اور والد ماجد کے ساتھ ان لوگوں کا جیسا سلوک رہا، مخفی نہیں۔ عمرو سعد جو اس وقت حاکم مکہ تھا، اس نے بھی یہی مشورہ دیا۔ روانگی سے کچھ پہلے حضرت ابن عباس نے کہا: میں خاموش رہنا چاہتا تھا، مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ اس کے بغیر کام نہ بنے گا۔ اس لیے اب عرض گزار ہوں کہ میں اس راہ میں آپ کی ہلاکت دیکھ رہا ہوں۔ اہل عراق بدعہد ہیں، ان کے پاس ہرگز نہ جائیے۔ حجاز ہی میں قیام فرمائیے۔ یہاں آج کل آپ سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ اگر اہل عراق آپ کو بلاتے ہیں تو ان سے کہیے کہ پہلے مخالفین کو نکال کر دارالامارۃ کو قبضہ میں کرو، پھر میں آنے کے لیے تیار ہوں۔ اور اگر آپ کا مقصود صرف حجاز سے جانا ہے تو یمن تشریف لے جائیے، جہاں حضرت علی شیر خدا کے دیوانوں کی کمی نہیں۔ وہاں کی سرزمین کشادہ ہے۔ وہاں آپ ان یزیدیوں کی دسترس سے باہر ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ اہل یمن آپ کی راہ میں جانیں نچھاور کردیں گے۔

حضرت امام حسین نے ان کی بات بھی نہ مانی اور جواب دیا: ابن عم! اس میں شک نہیں کہ آپ میرے خیر خواہ ہیں، مگر کیا کیا جائے کہ عزمِ مصمم کرچکا ہوں۔

امام کے چچیرے بھائی حضرت عبداللہ ابن جعفر نے پُرزور خط مدینے سے روانہ کیا اور لکھا: میں خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ یہ خط دیکھتے ہی اپنا ارادہ کو منسوخ فرمادیجیے، کیوں کہ اس راہ میں آپ کی ہلاکت اور اہل بیت کی بربادی ہے۔ اگر آپ پر کوئی آنچ آئی تو کائنات کا نور بجھ جائے گا۔ (ابن جریر)

حضرت عبداللہ محمد ابن زبیر نے منت و سماجت کی۔ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر نے استخارہ کیا اور روکنے کی کوشش کی۔ جب آپ نے کسی کی ایک نہ سنی تو انھوں نے کہا: اگر آپ جا ہی رہے ہیں تو براہِ کرم اہل بیت کو ہمراہ نہ لے جائیں۔ لیکن بھلا تقدیر الٰہی کے آگے کس کا زور چل سکتا ہے۔ نوشتہ قدرت کس کے مٹانے سے مٹ سکتا ہے۔ مرضیٔ الٰہی کا پابند حرم کی وادی سے اس وقت نکلا، جب کہ عید قرباں کا چاند

نظر آچکا تھا۔ مسلمانانِ عالم سنت ابراہیمی کو زندہ کرنے کی تیاری میں مشغول تھے۔ اور ادھر راکبِ دوشِ نبی نینوا کی پتھریلی سرزمین پر اپنے خون کی روشنائی سے ایک اہم تاریخ مرتب کرنے جارہا تھا۔

یکم ذی الحجہ کی رات کا آخری حصہ سرمئی تاریکی کے انداز میں باقی تھا۔ جب مکہ کی اونچی اونچی پہاڑیوں اور کھجور کے درختوں نے اور زیتون کی پتیوں نے ایک نوحہ درد کے ساتھ الوداعی سلام کیا اور اہل بیت نبی کا قافلہ وادئ حرم سے دور ہوتا گیا۔ راہ میں جرماح ابن عدی حاتم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بھی آپ کے ارادہ کی سختی سے مخالفت کی اور عرض کیا: میں اس مقدس ترین کارواں کی بربادی صاف طور پر دیکھ رہا ہوں۔ میں نے صرف آپ کے لیے کوفہ میں اتنا بڑا لشکر دیکھا ہے، جتنا کثیر انبوہ کبھی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ ہاں اگر آپ اطمینان کی جگہ قیام فرمانا چاہیں تو ہمارے ساتھ ''آجا'' پہاڑ کے نیچے اتر چلیے، جہاں دس روز کے اندر قبیلہ بنی طے کے بیس ہزار جوان آپ پر تصدق ہونے کے لیے جمع ہوجائیں گے۔ آپ نے جواب دیا: جزاک اللہ! ہم چوں کہ اہل کوفہ سے وعدہ کر چکے ہیں۔ اس لیے قدم پیچھے نہیں ہٹا سکتے۔ (ابن جریر کامل)

پھر کاروانِ حسین مختلف مراحل سے گزرتا ہوا، ۲ر محرم الحرام کو دشت نینوا میں جا پہنچا۔ راہ میں حضرت مسلم ابن عقیل کی شہادت کا حال سن لینے کے بعد بھی اگر چاہتے تو واپسی کا موقع تھا، مگر کوئی کیا کرے کہ: ؎

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

کربلا کی سرزمین پر پہنچنے سے قبل بھی حُر ابن یزید ریاحی نے مخلصانہ درخواست کی کہ اگرچہ میں ابن زیاد کا مقرر کردہ ہوں۔ میرا فرضِ منصبی کچھ اور ہے، مگر اے ابن رسول! تاریک راہ میں دھاوے کے راہ سے آپ اس وادئ کربلا سے نکل جائیں۔ میں صبح اپنے لشکر کو کچھ دور تک دوڑا کر واپس کرلوں گا۔ مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوسکی۔

ترجمہ طبری وغیرہ میں ہے کہ سات راتیں اسی کوشش میں صرف ہوگئیں، مگر ہر رات کوچ کرنے کے بعد خود کو دشتِ بلا ہی میں پاتے۔ پھر اونٹوں کو ہانکتے تو قدم آگے نہ بڑھاتے تھے۔

بہر حال اب تو دشت بلا میں آپ پڑے تھے۔ جہاں نہ سبزے کا نام و نشان تھا، نہ کوئی اور ہریالی، ایک حد نظر تک پھیلا ہوا سرخ سرخ چٹیل میدان تھا۔ دن میں دھوپ کی تمازت سے قیامت کا سماں پیدا ہوجاتا۔ ہر چہار جانب ہُو کا عالم، اسی عالم میں ایک روز امام عالی مقام کی آنکھ لگ گئی۔ آپ نے دیکھا کہ نانا جان سید دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ملائکہ کے ایک گروہ کے جلوس میں تشریف لائے اور آپ کو گلے سے لگا کر بولے: اے نورِ نظر! دشمنوں نے تیرے قتل کا تہیہ کر لیا ہے۔ عنقریب خدائے تعالیٰ تجھے شہادت کی دولت سے نوازے گا۔ جنت کی بہاریں منتظر ہیں۔ حورانِ بہشت آنکھیں فرشِ راہ کیے ہوئے ہیں، تیرے والدین ہمہ تن انتظار میں ہیں۔ پھر حضور نے آپ کے سینہ پر اپنا دست مبارک رکھا اور یہ دعا دی:

''اللھم اعط الحسین صبرا و اجرا''۔

آپ نے بے دار ہوکر لوگوں کو یہ خواب سنایا اور سب کی زبان سے نکلا

''انا للہ وانا الیہ راجعون''۔

۷؍ محرم الحرام کو ابن زیاد نے ۲۲؍ ہزار کے لشکر کے ساتھ پہنچ کر دریائے فرات پر قبضہ کر لیا اور حسینی قافلہ پر پانی بند کر دیا۔ نوشتہ الٰہی نے ہر طرف سے لاکر دشت بلا میں محصور کر دیا تھا۔ کربلا وہی سرزمین ہے، جہاں کل شورِ قیامت بپا ہونے والا تھا۔ کل کی صبح، صبحِ الم تھی اور کل کا دن روزِ ابتلا و آزمائش۔

نویں محرم کا دن گزرا اور رات ہوئی۔ یہ رات مسافرانِ کربلا کی وہ رات ہے، جس کی صبح کو امتحانِ وفا ہونے والا تھا۔ تاریخ کے دریچوں سے مشاہدہ کیجیے!

تاریک شب ہے اور کربلا کی بنجر زمین پر خیمۂ حسینی میں گہرے سکوت کا عالم ہے۔ دو روز سے پانی بند ہونے کے باعث بچوں کے چہرے بھی کمھلائے ہوئے ہیں۔ نگاہوں سے گہرا اضمحلال جھانک رہا ہے۔ ماں جائی زینب نے علی اکبر کا اداس چہرہ دیکھا تو بلک کر رہ گئی اور اپنی ردا سے ہوا دینے لگی۔ عون و محمد پیروں سے لپٹ کر سوکھے دہن دکھا رہے ہیں تو انھیں کلیجے سے لگا رہی ہیں۔ ایک طرف امام حسن کا نورِ نظر ہاتھ باندھے نظر پڑا، ننھے سے علی اصغر کی زبان تالو سے چپک چپک جا رہی ہے۔ یہ فضا تھی اس پُر سماں شب کا، جس کے بعد ان قدسی صفاتوں کو کوئی دوسری شب میسر نہ ہونے والی تھی۔

عشا کی نماز ختم ہوئی اور امام عالی نسب نے رفقا کو جمع کیا اور ایک مختصر تقریر فرمائی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

”اے میرے جاں نثارو! میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیفیں پہنچیں، مصیبتیں جھیلنی پڑیں، مجھے معلوم ہے کہ اس رات کے بعد مجھے کوئی رات میسر نہ ہوگی۔ اس لیے میں آپ تمام کو بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ جو جانا چاہے جا سکتا ہے اور اگر آپ لوگوں کو میرے سامنے جاتے ہوئے شرم مانع ہو تو میں چراغ گل کیے دیتا ہوں، جاؤ! میرے ساتھ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو“۔

مگر آپ کے رفقا میں سے کسی نے حرکت نہ کی اور سب نے زبانِ حال سے یہی کہا: یاحسین! ہماری اسلامی غیرت کیسے گوارہ کر سکتی ہے کہ نبی کے نواسے کو دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کریں۔ ہمیں تو آپ کی طرف دشمن کا تیکھی نظروں سے دیکھنا بھی ناقابل برداشت ہے۔ خدا نے چاہا تو کل آپ دیکھ لیں گے کہ دشمنوں کے تیر ہمارے جسموں کی فصیلیں عبور کیے بغیر آپ تک ہرگز نہ پہنچ سکیں گے۔

امام عالی مقام اور تمام رفقا نے شب عاشورہ عبادت و ریاضت میں گزاری۔ تسبیح و تہلیل، رکوع و سجود، گریہ و زاری کی کیفیت سادات کے خیمے پر چھائی ہوئی تھی۔ امام عالی مقام بالخصوص رات بھر اپنے پروردگار کے حضور کامل جذبۂ عبودیت کے ساتھ محوِ رکوع و سجود رہے۔ زبان پر خدا کی کبریائی کے کلمے تھے اور جسم کبھی عالم الخفا میں اور کبھی زمین پر خاک آلود، کبھی دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتے، آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو کا قطرہ اپنی خاموش زبان سے گویا تھا:

”اے قید میں دعائے یوسفی کو قبول فرمانے والے! مچھلی کے شکم میں حضرت یونس کی حفاظت فرمانے والے! منیٰ کی پہاڑی پر حضرت خلیل کی قربانی کو قبول کرنے والے! تیرا بندہ حسین دشت کرب و بلا میں اپنی اور اپنے اہل بیت کی مختصر جانوں کا نذرانہ لیے حاضر ہے تو اسے قبول فرما۔

رب العالمین! بچوں کی بھولی بھالی صورتیں قربانی کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں، زینب کا مغموم چہرہ، شہر بانو کے آنسو اور زین العابدین کی کراہیں، میرے ہاتھ سے دامنِ استقلال نہ چھڑا لیں۔

خداوندا! اس امتحان گاہِ ہستی میں تیرا حسین، تیرے دین کی حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ فدا کر رہا ہے، اس جانِ ناتواں کا نذرانہ تیرے حضور صرف تیری رضا کے پیش نظر ہے، اس کے بعد اس لٹے ہوئے قافلے کا تو ہی نگہبان و محافظ ہے"۔

دعا و استغفار کا یہ سلسلہ پوری رات دراز رہا۔ آدھی رات کے بعد دشمن کے کچھ سپاہی خیمۂ حسینی کے پاس سے گزرے تو امام عالی مقام نے بلند آواز سے یہ آیت تلاوت کی:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ۔

ترجمہ:۔ دشمن یہ نہ سوچیں کہ ہماری ڈھیل ان کے لیے بھلائی ہے۔ ہم صرف اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ ان کا جرم زیادہ ہو جائے۔ خدا مومنین کو اِسی حال میں چھوڑنے والا نہیں، وہ پاک کو ناپاک سے الگ کر دے گا۔

یزیدی فوج کے ایک افسر نے سنا تو زور سے چیخا، خدا کی قسم! ہم ہی طیب ہیں اور تم سے الگ کر دیے جائیں گے۔

الغرض! رات گزرنے لگی۔ شب کی سیاہی کو زمانہ جانب شرق کھینچ رہا تھا۔ آپ نے اپنے منجھلے صاحبزادے کو حکم دیا: شبیہ پیمبر! تم اٹھو اور فجر کی اذان دو۔ تاکہ دشت کربلا کا چپہ چپہ گواہ بن جائے کہ صبح عاشورہ ہم شکل پیمبر نے اسی لہجہ و انداز میں تکبیر کی آواز پر امن و اتحاد کا غلغلہ بلند کیا تھا، جس طرح کبھی دنیا نے فاران کی چوٹی سے آواز بلند ہوتے سنی تھی۔ حضرت علی اکبر نے اذان دی۔ خدائے لاشریک کی کبریائی کی صدا سے پورا بیابان روشناس ہو گیا۔ مگر حسین دشمنی کے نشے میں شرابور انسانوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ نماز ختم ہوتے ہی لشکر یزیدی سے نقارۂ جنگ کی آواز آئی۔ اور پھر تاریخِ عالم کا وہ معرکہ در پیش ہوا کہ جس کے غم میں بہنے والے آنسو بھی اگر یکجا ہو جاتے تو کسی فرات سے کم نہ ہوتے۔

امام کی تقریر میدانِ کربلا میں

امام عالی مقام سرکار حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے رفقا نے فجر کی نماز کا سلام پھیرا اور ادھر یزیدی لشکر سے نقارۂ جنگ کی آواز آئی۔ سرکار امام حسین نے اپنی دعا ختم فرمادی اور اپنے تمام رفیقوں کو سربستہ کیا۔ خود ایک اونٹنی پر سوار ہوکر صف اعدا کے روبرو تشریف لے گئے۔ ہاتھ میں قرآنِ عظیم تھا۔ بلند آواز سے حمد و ثنا پڑھی اور خطبہ ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! میری چند باتیں اور سن لو! بہت جلدی نہ کرو۔

میں بار بار اتمامِ حجت کر چکا، اب ایک بار اور اپنی بات تمہارے گوش گزار کرتا ہوں، کچھ نصیحتیں کر لینے دو، کچھ میرا عذر بھی ہے اور تمہارے پاس آنے کی وجہ بھی۔ اگر عذر معقول ہو اور انصاف کی توفیق ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ اور اگر میری باتیں سن لینے کے بعد بھی تم اپنے ارادے پر ڈٹے رہو تو پھر مجھے کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ جیسے چاہے میرے ساتھ پیش آنا، جو سلوک چاہنا کرنا۔ بلکہ سب لوگ یک بارگی مجھ پر ٹوٹ پڑنا، پھر میں شکوہ نہیں کروں گا۔ میرا تمام تر بھروسہ خدائے حی و قیوم پر ہے، وہی مفلسوں کا حامی، بے کسوں کا مددگار اور حق پر قائم رہنے والوں کا معاون ہے"۔

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ آپ نے خیمہ سادات سے کسی خاتون کی سسکیاں سن لیں۔ اپنے بھائی عباس علم بردار اور صاحبزادہ علی اکبر کو بھیجا کہ انھیں صبر کی تلقین کریں۔ اس موقع پر آپ نے حضرت عبداللہ ابن عباس کا نام لے کر ان کے لیے درازیٔ عمر کی دعا فرمائی، کیوں کہ حجاز سے روانہ ہوتے وقت جن لوگوں نے آپ کو روکنے کی کوشش کی تھی، ان میں حضرت ابن عباس بھی تھے۔ انھوں نے جب امام کے ارادے کو ٹلتے نہ دیکھا تو مشورہ دیا تھا کہ "آپ اگر خود تشریف لے جارہے ہیں تو اپنے ساتھ کم از کم عورتوں اور بچوں کو تو نہ لے جائیے، ممکن ہے ان کی نگاہوں کے سامنے آپ کو دشمنوں کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑے"۔ مگر سرکار حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی رائے قبول نہیں کی تھی، آج اس وقت ان کی بات یاد کر کے ان کے لیے دعائے خیر فرمانے لگے۔ پھر خطبہ دینے لگے:

"اے لوگو! میں کون ہوں؟ تم میں سے ہر ایک جانتا ہے۔ ممکن ہے تم میں سے کوئی نہ جانتا ہو تو جان لے کہ میں تمہارے نبی کی شہزادی، خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہرا کا بیٹا ہوں۔ حیدرِ کرار، صاحب ذوالفقار علی مرتضیٰ کا فرزند ہوں۔ ذوالجناحین کا بھتیجا ہوں۔ تم میں سے سبھی جانتے ہیں کہ سید الشہدا امیر حمزہ میرے باپ کے چچا ہیں۔ نبوت و رسالت کی امانت کبریٰ آخری بار میرے نانا جان کو سونپی گئی ہے۔ خدائی صحیفہ لے کر حضرت جبریل امین جس دہلیز پر آیا کرتے تھے، میں نے اسی گھر کے گہوارہ میں پرورش پائی ہے۔

وہ مقدس زبان جو صرف وحی ربانی بیان کرنے ہی کے لیے کھلا کرتی تھی، اس نے میرے اور میرے محترم بھائی امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے کے لیے فرمایا: "سیدا شباب اہل الجنۃ" دونوں (حسن و حسین) بہشتی جوانوں کے سردار ہیں۔ اگر میرا یہ بیان سچ ہے اور یقیناً سچ

ہے، کیوں کہ بخدا ہوش سنبھالنے سے اب تک میں نے زبان سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ پھر تمہیں بتائو۔ تم اپنی ننگی تلواروں، بلند نیزوں اور برچھیوں سے جو میری طرف لپک رہے ہو، کیا میں اسی کا مستحق ہوں۔

اگر تمہارا یقین میری بات پر نہ ہو تو تمہارے درمیان خود ایسے لوگ موجود ہیں، جن سے معلوم کر کے تم اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔ تصدیق کر لو۔ جابر بن عبداللہ انصاری سے کہ انھوں نے حسن وحسین کے بارے میں رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہیں سنا، کیا یہ حقیقت بھی میری خوں ریزی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ واللہ! اس وقت پوری دنیا میں میرے سوا کسی نبی کی بیٹی کا کوئی بیٹا زندہ نہیں۔ تمہارے رسول کا بلا واسطہ نواسہ ہوں۔ کیا میں نے کسی کا خون بہایا ہے کہ تم مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہو۔ میں نے کسی کا مال غصب کیا ہے کہ ستم توڑنے پر آمادہ ہو؟ بولو! کیا بات ہے؟ میرا کیا قصور ہے؟''۔

بار بار پوچھنے کے باوجود یزیدی لشکر میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بالآخر آپ نے اہل کوفہ میں سے مشاہیر کے نام لے لے کر انھیں مخاطب کیا۔ اے شیث ابن ربیع! اے مجاز بن الحیر! اے قیس ابن الاشعث! ۔ کیا تم لوگوں نے مجھے یہ خط نہیں روانہ کیا تھا کہ باغ کے پھل پک کر تیار ہیں۔ زمین سرسبز و شاداب ہوگئی۔ نہروں کا پانی اب ابال کھا رہا ہے۔ ہم آپ کے چشم براہ ہیں۔ آپ یہ سمجھ کر تشریف لائیے کہ اپنی فوج اور اپنے لشکر میں آرہے ہیں۔

آپ کے تخاطب پر ان سب نے بیک زبان جواب دیا: ہم نے ایسا کب لکھا تھا؟

آپ نے جواب سن کر فرمایا:

سبحان اللہ! کیا میری بات غلط ہے؟ واللہ! تم ہی لوگوں نے لکھا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تم لوگوں نے جس وقت لکھا تھا وہ کچھ اور وقت تھا۔ اب تم لوگوں کی نگاہیں بدل چکی ہیں۔ اس لیے میری کوئی بھی بات اور میں تمہیں پسند نہیں۔ سنو! اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہے۔ مجھے چھوڑ دیں، میں واپس چلا جائوں گا۔

اس پر قیس ابن الاشعث نے کہا: اس سے بہتر تو یہ ہوگا کہ خود کو اپنے عم زادوں کے حوالے کر دیں، وہ آپ کے ساتھ پسندیدہ سلوک کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

امام عالی مقام: کیا تم لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ مسلم بن عقیل جیسا سلوک میرے ساتھ بھی کرو۔ یہ کہہ کر آپ نے اونٹنی بٹھا دی اور عتبہ بن سمعان سے فرمایا کہ اس کی کونچیں باندھ دیں۔

اس اثنا میں دشمن کا لشکر آگے بڑھنے لگا۔ زہیر ابن القیس نے گھوڑا بڑھایا اور لشکر کے روبرو پہنچ کر بلند آواز سے چلائے۔ اے اہل کوفہ! عذابِ الٰہی سے ڈرو۔ سنو!

جب تلواریں نیام میں ہیں، اس وقت تک ہم پر ایک دوسرے کے خون کی حرمت قائم ہے۔ یہی جب نکل پڑیں گی اور جنگ کا آغاز ہوجائے گا تو موقع باقی نہ رہ سکے گا۔ ہر مسلمان کا حق ہے کہ حتی الوسع اپنے دینی بھائیوں کو امر بالمعروف کرتا رہے۔ آج خداوند تعالیٰ اپنے نبی زادوں کی حرمت و تکریم کے سلسلہ میں ہمارا امتحان لے رہا ہے کہ کون نبی سے کیسا تعلق رکھتا ہے۔ میں اپنی طرف سے تمہیں امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اہل بیت مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حمایت و نصرت کی دعوت دیتا ہوں۔ ان کی غلامی میں مرجانا اور جینا، زندگی کی

معراج ہے۔ عبید اللہ ابن زیاد تمہیں ساداتِ کرام کا خون بہانے کی دعوت دے رہا ہے۔ یقین کرو کہ نسبتِ رسول کی حرمت توڑنے والے سرکش حکام سے تم کبھی سکھ چین نہ پاؤ گے۔ ان سے تمہیں کوئی بھلائی کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ یہ ظالم، ایک وقت ایسا آئے گا کہ تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔ تمہاری آنکھیں پھوڑیں گے۔ تمہارے چہرے مسخ کریں گے۔ تمہیں درختوں کے ساتھ لٹکا لٹکا کر مار ڈالیں گے۔ تم میں سے دین داروں کا قتل عام کریں گے۔ کیا تم بھول گئے، ابھی کل کی باتیں۔ ہانی بن عروہ اور حجر بن عدی وغیرہ کے خون ابھی خشک نہیں ہوئے ہیں۔ آخر ان زندہ شواہد کو تم اتنی جلدی کیوں فراموش کر رہے ہو۔ یہ تو تم میں معزز افراد تھے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری جن کی زندگی کا لازمہ تھا۔ انھیں رسول اللہ اور ان کے مقدس خانوادے سے کتنا گہرا ربط تھا۔ صرف اسی بنیاد پر ان نیک بختوں کے سر قلم کر ڈالے گئے۔ یہ واقعہ کوئی داستانِ پارینہ تو نہیں۔

زہیر بن القیس کی باتیں سن کر یزیدی آپس میں بھنبھنانے لگے۔ بعض نے اونچی آواز میں کہا: اب تو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہم حسین اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر ڈالیں یا انھیں امیر کی خدمت میں لے جا کر پیش کر دیں۔

زہیر نے ان کا جواب سنا تو کہا: خیر! اگر تمہارے نزدیک سمیہ کا لڑکا (ابن زیاد) فاطمۃ الزہرا کی اولاد سے زیادہ معزز ہے اور اس کی حمایت پر تم مطمئن ہو تو کم از کم اتنا تو کر ہی سکتے ہو کہ امام عالی مقام سیدنا حسین کو ان کے عم زاد یزید کے پاس پہنچا دو۔ وہ آپس میں اپنے معاملات طے کر لیں گے۔ بخدا! یزید کی خوش نودی تم لوگ امام کے خون سے ہاتھ رنگ کر نہیں حاصل کر سکتے۔ مگر افسوس کہ سنگ دل یزیدیوں پر دشمنی کا بھوت اس طرح مسلط تھا کہ امام عالی مرتبت کی تقریر اور زہیر بن القیس کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ وہ اور زیادہ اپنے جذبۂ قتال میں چور ہو گئے۔ سچ ہے کہ دشمنی اور عناد کا نشہ جب ذہن پر محیط ہو جاتا ہے تو معقولی اور منقولی سارے دلائل کی دھاریں کند ہو جاتی ہیں۔ ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

جنت کا انتخاب

تاریخ کربلا کے قارئین کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ سرکار حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کارواں کو میدانِ کربلا تک گھیر کر لانے میں حُر بن یزید ریاحی نے کتنا اہم رول ادا کیا ہے۔ دسویں محرم الحرام ۶۰ھ کو صبح تڑکے یزیدی فوج کی آراستگی اور جنگ کی تیاری کا منظر دیکھ کر حُر کا ماتھا ٹھنکا۔ دل میں گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے۔ گھبراہٹ بزدلی کے سبب سے نہ تھی، کیوں کہ جنگ وجدال تو ان کی زندگی کا لازمہ تھا اور کوفہ کے جنگ جو شہسواروں میں حُر کا نام سرفہرست تھا۔ اس وقت جو منظر حُر کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں، اس میں ظالم اور مظلوم کی شکلیں بالکل نمایاں تھیں۔ حُر کے اندرونی ہیجان نے انھیں یقین تک نہیں پہنچایا تھا کہ کوفہ سے کوچ کر کے آنے والا لشکر نبی کے نواسے کو گھیر کر قتل کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ عدی ابن حرملہ کے بیان کے مطابق ابن سعد نے جب اپنی فوج کو جنگ کا حکم دیا تو حُر بن یزید ریاحی اس کے پاس پہنچے۔

حر بن یزید ریاحی: کیا سچ مچ آپ ان سے جنگ کریں گے ؟

ابن سعد: واللہ! جنگ ہوگی اور ایسی جنگ جس میں کم سے کم سر کٹیں گے اور شانوں سے ہاتھ الگ ہوں گے۔

حُر: کیا ان کی پیش کی ہوئی تینوں شرطوں میں سے کوئی بھی قابل قبول نہیں ؟

ابن سعد: مجھے کیا، میں تو منظور کر لیتا، مگر کیا کروں کہ تمہارا حاکم کبھی اس پر راضی نہیں ہوگا۔

یہ جواب سن کر حُر کے دل کی دنیا میں زلزلہ آگیا۔ انھوں نے واضح طور سے حقانیت اور نفسانیت کا تصادم ملاحظہ کر لیا۔ ابن سعد کے پاس سے چل کر فوراً اپنی جگہ پر آئے اور چند لمحوں بعد بغل ہی میں متعیّن ایک دوسرے ہم قبیلہ سپاہی ”قرۃ ابن قیس“ سے گھوڑے کو پانی پلانے کے بارے میں پوچھ کر صف سے نکل آئے۔ تاکہ وہ حقیقت کو بھانپ نہ لے۔ حُر لشکر ابن سعد سے نکل کر میدان کی طرف بڑھے۔ سپاہیوں نے سمجھا، حُر لشکر حسینی پر حملہ کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ سب ان کی بہادری اور بسالت سے خوب واقف تھے۔ بعض نے شاباشی بھی دی۔ مہاجر نامی ایک شخص نے پوچھ ہی لیا:

”حُر کیا حملہ کرنے جا رہے ہو“۔

حُر اس کے سوال کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئے۔ اس نے کہا:

”مجھے تم پر شبہ سا ہو رہا ہے۔ آج سے پہلے متعدّد لڑائیوں میں میں نے تمہاری بہادری کے جوہر دیکھے ہیں۔ مگر آج جو کچھ دیکھ رہا ہوں، یہ کیفیت ہی جداگانہ ہے۔ قسم خدا کی اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ پورے کوفہ میں سب سے بہادر اور شمشیر آزما کون ہے؟ تو میں تمہارے سوا کسی اور کا نام ہرگز نہ لوں گا۔ پھر آخر تمہاری یہ کیا حالت ہے ؟“۔

حُر کا اس وقت ٹکا سا جواب تھا۔ بڑا ہی ٹھوس اور مبنی بر حقیقت:

”واللہ! میں جنت اور دوزخ کا انتخاب کر رہا ہوں۔ بخدا میں نے جنت منتخب کر لی۔ اگرچہ میرے جسم کے ٹکڑے اُڑ جائیں“۔

اتنا کہنے کے بعد گھوڑے کو ایڑ لگائی اور امام عالی مقام کے روبرو پہنچ گئے۔ حسینی جاں بازوں نے حُر کو بڑھتے دیکھا تو متوجہ ہو گئے۔ حُر قدمِ حسینی پر جھک گئے۔ قدم بوسی کی اور معافی طلب کرنے لگے۔

اے شہزادۂ رسول! میں اپنی بدبختی پر جتنا ماتم کروں، کم ہے۔ کہ میری وجہ سے آپ پر یہ سخت گھڑی آئی ہیں۔ وہ شقی ہوں، جس نے خانوادۂ رسول کو وطن لوٹنے سے روک کر اس مصیبت میں لا ڈالا۔

خدا شاہد! میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ اس قدر زیادتی کریں گے اور اس حد تک پہنچ جائیں گے کہ آپ کا خون بہانے کے درپے ہوں گے۔

یاسیدی حسین! افسوس اپنی کارستانیوں کو اس نتیجہ تک پہنچنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خدارا! آپ مجھے معاف فرمادیں۔ اپنے کرتوت پر شرمندہ ہوں اور ندامت کے ساتھ اشقیا کے زمرہ سے نکل کر آگیا ہوں۔ میرا دل مجھے ملامت کر رہا ہے کہ ساقیِ کوثر و زمزم کے نواسہ پر میری وجہ سے پانی بند ہے۔ کل میں جن کے دست مبارک سے جامِ کوثر کا امیدوار ہوں اور جن کی شفاعت کا متمنّی ہوں، افسوس انھیں کے جگر گوشوں کو میں نے پیاس میں تڑپایا۔

سرکار! میں حقیر جان کا نذرانہ لے کر آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔ اگر میرے حلقوم سے گرنے والا خون آپ کے قدموں میں قبول ہوجائے تو ممکن ہے کہ خدائے تعالیٰ میری خطائوں کو معاف فرمائے۔

امام عالی مقام نے حُر کی عرض داشت سنی اور ان کے سر پر دست شفقت پھیرا اور دعا دی:

”خدا تیری توبہ قبول فرمائے۔ اے حُر! تیرا نام تیری ماں نے حُر رکھا ہے۔ جا تو دنیا اور آخرت میں حُر (آزاد) ہی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ“۔

امام سے دعائیں لے کر حُر لشکر یزید کی طرف پلٹے اور پکار کر کہا:

اے لوگو! امام عالی مقام کی پیش کردہ شرطوں میں سے کوئی ایک قبول کیوں نہیں کر لیتے۔ وہ فرماتے ہیں:

(۱)... مجھے وہیں لوٹ جانے دو، جہاں سے آیا ہوں۔

(۲)... یا مجھے یزید سے ملنے کا موقع دو تا کہ میں اپنا معاملہ خود طے کر لوں۔

(۳)... یا مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیج دو۔ وہاں کے لوگوں پر جو گزرتی ہے، وہی مجھ پر گزرے گی۔

کیا ان میں سے کوئی شرط ایسی نہیں، جس پر تم لوگ خود کو راضی کر سکو۔ کیا تم اپنے اعمال نامہ کے صفحات نبی زادوں کے خون سے رنگین کرنا چاہتے ہو؟ اس عظیم آزمائش و امتحان کو سمجھو۔ یہ عام جنگوں کی طرح ایک جنگ نہیں۔ تم نبی کے نواسے کا خون بہانے جا رہے ہو۔

اس تقریر کو سن کر کوفیوں نے حُر پر تیر چلائے اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حُر رفقائے امام عالی مقام کی طرف لوٹ آئے۔

ابتداءً تو جنگ اس طرح ہوتی رہی کہ دونوں طرف سے ایک ایک آدمی نکل کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتا رہا۔ مگر یہ سلسلہ کچھ دیر بعد ختم ہو گیا۔ کیوں کہ انفرادی مقابلہ میں حسینی جاں بازوں کا پلہ بھاری تھا۔ جب عام حملہ ہوا تو ہر طرف سے امنڈتے ہوئے بادل کی طرح

یزیدی فوجی، مٹھی بھر حسینیوں کو اپنے نرغہ میں لینے کے لیے بڑھنے لگے۔ اس دوران حضرت حُر نے اپنی بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے۔

ایک چشم دید گواہ، جو یزیدی لشکر میں موجود تھا۔ خود بیان کرتا ہے کہ حُر ابن یزید کے گھوڑے کو خود میں نے زخمی کیا۔ ان کا بدن زخموں سے لہولہان ہورہا تھا۔ گھوڑا معذور ہوگیا تو وہ کود کر نیچے آگئے۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تیزی سے گردش کررہی تھی۔ اس سے وہ کسی بھوکے شیر کی مانند حملہ آور ہوتے تھے۔ سامنے پڑجانے والا، صحیح سلامت نہ بچ پاتا۔ ان کی زبان پر اس گھڑی یہ رجز تھا: ؎

ان تعقروا بی فان ابن الحر

اشجع من ذی لبذ هریر

ترجمہ:۔ اگر تم نے میرا گھوڑا بے کار کردیا تو کیا ہوگیا، میں شریف باپ کی اولاد ہوں اور شیر سے زیادہ بہادر۔

لشکر یزیدی چاروں طرف سے اپنا گھیرا تنگ کررہا تھا۔ امام عالی مقام کے رفقا نے چاروں طرف سے اپنے خیموں کو اس طرح سے سمیٹ لیا تھا کہ دشمن کو ایک جانب سے آنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اس وقت دوپہر کا سورج نصف النہار کی لکیر کو چھورہا تھا۔ دھوپ کی شدت، گویا انگارے برسارہی تھی۔ ادھر زمین تپ کر آگ بگولا بن رہی تھی۔ یہ وقت رفقائے امام کے لیے بڑا سخت تھا۔ میسرہ کے سپہ سالار حبیب ابن مظاہر شہید ہوگئے تو ادھر کا پلہ ہلکا ہوگیا۔ حبیب کی شہادت دیکھ کر حُر کے تن بدن میں بجلیاں بھر گئیں۔ اس وقت ان کے جوش کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک وار میں کئی ایک کو کاٹتے چلے جاتے۔ جدھر جھپٹتے یزیدی دبک کر جان بچاتے۔

اس عالمِ جوش میں آپ دشمن کی صف میں گھس پڑے۔ زبان پر یہ اشعار جاری تھے: ؎

لیس لا اقتل حتی اقتلا

ولن اصاب الیوم والا تقبلا

ترجمہ:۔ میں نے قسم کھالی ہے کہ جب تک قتل نہ کروں، قتل نہ کیا جاؤں گا اور آج مروں گا تو آگے بڑھتے ہوئے۔

اضربهم بالسیف ضربا مقصلا

لا تاکلا عنهم ولا مهللا

ترجمہ:۔ انھیں تلوار کی کاری ضربوں سے ماروں گا، نہ بھاگوں گا اور نہ دوڑ لگاؤں گا۔

نہایت جرأت و عزیمت کی مردانہ وار جنگ کرتے رہے اور زخموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ جسم کی قوت خون کے ساتھ کم ہوتی گئی۔ حتی کہ ایک کاری زخم پر تلملا کر گرے اور جامِ شہادت نوش فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عجب انداز ہے دنیا میں کچھ اہل محبت کا
وہ جیتے ہیں تو گویا موت کی حسرت میں جیتے ہیں

باب پنجم: تاریخ

ہندوستان میں اشاعت اسلام کے اسباب ووجوہ

ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی غیر معمولی ترقی کے اسباب ووجوہ پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ نے مختلف سیاسی سماجی وجوہات کی نشان دہی کی ہے اور اسلام کی اشاعتی تحریکوں کو کریدنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ مغربی مورخین اور قلم کاروں کا طریقہ ہے کہ وہ تمام چیزوں کو سیاسی ڈھانچہ سے منطبق کرتے ہیں۔ مصنف موصوف نے بھی اسی آئینے میں یہاں اسلامی ترقی کی جستجو کی ہے۔ مگر تھک ہار کر بالآخر لکھتے ہیں:

”ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد میں جو سریع ترقی ہوئی ہے، مذکورہ بالا تحریکیں اور انفرادی کوششیں اس کی توجیہ کے لیے قطعًا ناکافی ہیں۔ اس سے طبعی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آبادی کے قدرتی اور طبعی اضافے کے علاوہ وہ کون سے اسباب ہیں، جن سے مسلمانوں کی آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے؟ اس سوال کا جواب ہندوؤں کے معاشرتی حالات میں مضمر ہے۔ اعلیٰ ذات کے ہندو، ادنیٰ ذاتوں کی تحقیر کرتے تھے اور ان کو ذلیل وخوار سمجھتے تھے۔ اور اگر پنچ ذات کا کوئی فرد اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا تھا تو اونچی ذات والے ہندو اس کے راستے میں طرح طرح کی سخت رکاوٹیں ڈالتے تھے۔ ایسے سماج کے مقابلے میں اسلام کے مذہبی نظام کے فوائد نمایاں نظر آتے ہیں، جس میں کوئی شخص برادری سے خارج نہیں ہے اور ہر شخص کو ترقی کرنے کے لیے پوری آزادی حاصل ہے“۔

اس سلسلے میں ایک مثال دینے کے بعد آگے لکھتے ہیں:

”اسی قسم کی ایک اور نمایاں مثال ہمیں اسی صوبہ بنگال کے مشرقی حصے کی تاریخ میں ملتی ہے۔ اس علاقے میں ۱۵۵۰ء میں کچھ قوم کے آد باسیوں نے اپنے ایک بڑے سردار باجو کی سرکردگی میں ایک حکمراں خاندان کی بنیاد ڈالی۔ جب باجو کے پوتے کا زمانہ آیا تو ریاست کے اعلیٰ طبقوں کے لوگ تو ہندوؤں میں شامل کر لیے گئے، لیکن جب ادنیٰ ذاتوں کے اکثر لوگوں نے دیکھا کہ ان کو حقیر سمجھا جاتا ہے اور وہ ہندو برادری سے بدستور خارج، تو وہ مسلمان ہو گئے“۔

اسلام اونچ پنچ اور ذات پات کی جاہلانہ تفریق کا دشمن ہے اور مساواتِ انسانی کا علم بردار ہے۔ اسی بارے میں لکھتے ہیں:

”قبولِ اسلام سے پنچ ذاتوں کے ہندو اعلیٰ ذاتوں کے ظلم وستم سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ اس کی ایک روشن مثال ہمیں انیسویں صدی کے اخیر میں ملتی ہے۔ پنچ ذات کے شنار چند سالوں سے خوش حال ہو گئے تھے اور ان میں سے اکثر نے عمدہ مکانات بنا لیے تھے۔ ان پر آج تک ہندو مندروں کے دروازے بند تھے۔ لیکن اب انھوں نے دعویٰ کیا کہ ہم بھی مندروں میں پوجا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس بات پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور اس بلوے میں شنار قوم کے لوگوں نے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ہاتھ سے سخت نقصان اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شنار نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ چنانچہ ایک گائوں کے چھ سو شنار ایک ہی دن میں مسلمان ہو گئے اور دیگر مقامات کے شنار نے بھی ان کی پیروی کی۔ غرض کہ اسی طرح کی اور مثالیں ہندوستان کے دیگر حصوں سے بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ اگر کوئی ہندو کسی وجہ سے ذات سے خارج ہو جاتا ہے تو اس کے رشتہ دار اور وہ لوگ جن کے ساتھ اس کی نشست وبرخاست ہوتی ہے، اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے

شخص کو طبعی طور پر ایک ایسے مذہب کی طرف رغبت ہوگی، جو اپنے حلقے میں ہر ایک شخص کو بغیر کسی تفریق و امتیاز کے قبول کرتا ہے۔ اور اس کو اپنے معاشرے میں وہی درجہ دیتا ہے، جو اس کو اپنے پہلے سماج میں حاصل تھا۔ اس طریقے سے جو شخص اپنا مذہب تبدیل کرے گا، اس کے قبولِ اسلام میں خلوص اور یقین شامل ہوگا۔

(دعوتِ اسلامی، ص ۲۸۵،۲۸۶)

مذکورہ اسباب ووجوہ کے ساتھ ساتھ اس خط میں جن عوامل نے اسلام کی اشاعت میں دور رَس اثرات مرتب کیے ہیں، وہ اسلام اور تعلیمات اسلام کی چلتی پھرتی مثالیں فقرا اور درویشوں کی مبارک زندگیاں ہیں۔ جنھیں غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دینے یا سطحی حیثیت دینے والا اصل راز سے بے خبر سمجھا جائے گا۔ اور یہ وہ طبقہ ہے، جس نے کام سب سے اہم کیا۔ اور اتنی ہی لگن سے نام ونمود سے بچتا بھی رہا۔ ان کی نور پر زندگیوں کے اطوار کچھ تو اہل ظاہر کو میسر ہی آگئے ہیں۔ اگلی سطور میں مختصراً ملاحظہ کیجیے:

اصل عوامل:

ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا سب سے مستحکم کام صوفیائے اسلام، مسلم فقرا، درویشوں اور علما نے سرانجام دیا ہے۔ ان بے غرض افرادِ امت نے اپنی تواضع و انکساری اور خدمت خلق کے ذریعہ لوگوں کے دکھ درد میں شرکت کی۔ لوگوں کو راحت پہنچائی۔ اپنی شیریں کلامی اور اخلاق سے ان کے مجروح دلوں کا اندمال کیا۔ اور ہندوستان میں ذلیل، رسوا اور ناپاک سوّر نیچ اور حیوان سمجھی جانے والی انسانی برادری کو عزت و توقیر دی۔ تو وہ اسلام کے گرویدہ ہوگئے۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں ان فقرا اور درویشوں کے اعلیٰ روحانی کمالات نے اپنا مقام بنایا اور ان کو اسلام کی طرف رغبت ہوئی۔

حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ، جو امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے تھے، کے حالات میں لکھا ہے کہ ان سے اس وقت کا بادشاہ علاء الدین خلجی بھی بے پناہ عقیدت و محبت رکھتا تھا۔ اور عام باشندے بھی غایت درجہ احترام کرتے تھے۔ چنانچہ علاقہ پانی پت کے بہت سے راج پوت ان کے اخلاق و کردار اور کمالات سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ لکھتا ہے:

"تیرہویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک بزرگ بوعلی قلندر نے جو عراق عجم کے رہنے والے تھے (نہیں بلکہ ان کے آبا و اجداد عراق کے باشندے تھے اور پانی پت میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ بدر) پانی پت میں آکر سکونت اختیار کی اور سو سال کی عمر پاکر ۱۳۲۴ء میں انتقال کیا۔ اس شہر کے مسلمان راج پوت، جن میں تین سو مرد ہیں۔ ایک شخص امر سنگھ کی اولاد سے ہیں، جن کو اسی ولی نے مسلمان کیا تھا"۔

(دعوتِ اسلام، ص ۲۸۲)

علاقہ دکن میں حضرت نظام الدین اولیا کے مرید و خلیفہ حضرت شیخ برہان الدین کے ذریعہ بھی اسلام کی تبلیغ کا کام ہوا۔ دولت آباد میں آپ نے عمر کے آخری ۲۶۔۲۸ سال گزارے، اور یہیں انتقال کیا۔ بزمِ صوفیہ میں ہے:

"حضرت شیخ اور ان کے ہمراہیوں کی مساعی جمیلہ سے بہت سے غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے"۔

سفینۃ الاولیا میں ہے:

”آپ سلطان المشائخ (نظام الدین اولیاء) کے مریدوں میں سے ہوئے ہیں۔ سلطان المشائخ نے انھیں برہان پور دولت آباد کی جانب اسلام کی ترویج و اشاعت اور رشد وہدایت کے لیے روانہ فرمایا۔ نیز شیخ محسن دہلوی کو اپنے کچھ مریدوں کے ہمراہ ان کے ساتھ کردیا۔ ان کے قدموں کی برکت سے بہت سی جماعتوں نے اسلام قبول کیااور مرید و معتقد ہوئے“۔ (سفینۃ الاولیا، ص ۱۴)

حضرت شیخ برہان کے زبان مبارک کی تاثیر کے متعلق سیر الاولیاء میں ہے:

”جو بھی ایک ساعت ان کی خدمت میں بیٹھ جاتا اور آپ کا پُر محبت، پاکیزہ اور دل نشیں کلام سن لیتا، جمالِ ولایت کا عاشق ہوجاتا“۔ (سیر الاولیا)

حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، مخدوم بہار ہیں، اور بہار میں اسلام کی بہار انھیں کے دم قدم سے آئی۔ آپ نے شاہوں کو بھی نصیحت کی ہے اور فقیروں کو بھی نوازا ہے۔ لوگوں کے دل ان کی محبت اور عقیدت میں کیوں سرشار ہیں اور اپنے پرائے سب گن گاتے ہیں؟ اس لیے کہ ان کے دل میں خدمت خلق بے ریا جذبہ موجِ دریا کی طرح رواں تھا۔ ایک ارادت مند کو خط میں نصیحت فرماتے ہیں:

”اس تاریک دنیا میں قلم، زبان، مال اور جاہ سے جہاں تک ممکن ہو محتاجوں کو راحت پہنچاؤ۔ صوم و صلاۃ ونوافل اپنی جگہ پر اچھی ضرور ہیں، لیکن دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ سود مند نہیں“۔ (بزمِ صوفیہ، ص ۴۳۴)

آپ کے اخلاقِ کریمانہ اور نوازش و مہربانی نیز کمالات سے متاثر ہوکر بہت سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ ایک ہندو خاتون نے آپ کے ذریعہ اسلام قبول کیااور ولیہ بن گئی، پوری پوری رات عبادت میں گزارتی۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ اپنی کتاب میں حضرت مخدوم جہانیاں کے تبلیغی مرکز کا ذکر کرتا ہے۔ اس نے لکھا:

”ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سید جلال الدین کی آمد بہت اہمیت رکھتی ہے، جو ۱۱۸۹ء میں بخارا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ۱۲۴۴ء میں اُچ کے مقام پر سکونت اختیار کی، جو آج کل بھاولپور کے علاقے میں واقع ہے۔ آپ نے اس کے قرب وجوار میں بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا۔ ان کے پوتے سید احمد کبیرؒ مخدوم جہانیاں کے لقب سے مشہور ہیں۔ اور ان کی نسبت مشہور ہے کہ انھوں نے پنجاب کے کئی قبیلوں کو مسلمان کیا تھا۔ (دعوت اسلام، ص ۲۸۰)

الدر المنظوم فی ترجمہ ملفوظات المخدوم میں ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں، مخدوم بہار کی ملاقات کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ رب تعالیٰ نے ان کے نورانی چہرہ میں ایسی کشش اور تسخیر رکھی تھی کہ راستے میں بہت سے لوگ دست مبارک پر مسلمان ہوئے۔ (الدر المنظوم، ص ۷)

متحدہ ہندوستان کا علاقہ سندھ پہلا علاقہ تھا، جہاں اسلام کا اجالا پھیلا۔ مصنف نے مورخین نے اس بابت بہت کچھ لکھا ہے:

”عربی فتوحات کے ابتدائی ایام میں جب محمد بن قاسم نے سندھ میں اسلامی حکومت قائم کی (۷۱۴ء) تو ملتان عالم اسلام کا ایک سرحدی شہر تھا۔ عربوں کے دور حکومت میں جو تین سو سال تک جاری رہا۔ بہت سے لوگوں نے قدرتی طور پر فاتحین کا مذہب اختیار کرلیا۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی دعوت پر سندھ کے کئی ہندو شہزادے بھی مسلمان ہوگئے۔ ساوندری کے لوگوں نے جب محمد بن قاسم کی اطاعت اختیار کی تو

ان کے ساتھ یہ شرط بھی رکھی گئی کہ وہ مسلمانوں کی مہمان داری کریں گے اور ان کے لیے رہبر مہیا کریں گے۔ چنانچہ اس واقعہ کے ایک سو سال بعد بلاذری کا بیان ہے کہ اس کے زمانے میں یہ لوگ مسلمان تھے اور محمد بن قاسم کے مراسلات میں بھی ہندوؤں کے مسلمان ہونے کا اکثر ذکر آیا ہے"۔

(بلاذری، ص۴۰۱، بحوالہ دعوت اسلام، ص ۲۷۰)

علاقہ سندھ میں اسلامی خدمات کے لیے تشریف لانے والے مبلغین میں سرکار غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خانوادہ سے سید یوسف الدین نامی بزرگ ۱۴۲۲ء میں یہاں آئے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ انھیں خواب میں بشارت دی گئی کہ آپ بغداد چھوڑ کر ہندوستان کا سفر کریں اور وہاں دین کی اشاعت میں مشغول ہوں۔ چنانچہ انھوں نے دس برس تک سندھ میں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیا۔ وہاں پر آپ کی کوششوں سے لوہار قوم کے سات سو افراد نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا۔ اس کی تقریب یوں ہوئی کہ لوہانہ قوم کے دو شخص سندر جی اور ہنس راج سید صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ ان لوگوں نے ان کی کرامات اور خوبیاں دیکھیں اور مسلمان ہوگئے۔ یہ لوگ اس قبیلہ کے بااثر لوگ تھے۔ پھر ان کی دلچسپی سے چند اور لوگوں نے دین اسلام قبول کیا۔ اسلام لانے کے بعد سندر جی، ہنس راج دونوں کے نام بالترتیب آدم جی اور تاج محمد رکھے گئے۔

بعد میں آدم جی کے فرزندوں میں سے کچھ لوگوں نے سندھ سے اٹھ کر کچھ میں قیام کیا اور اپنے ہم قبیلہ لوگوں میں تبلیغ اسلام کا ذریعہ بنے۔

(بمبئی گزیٹر، ج۱ر ص ۹۳)

کچھ کے مصیبت زدگان کا غمگسار:

پندرہویں صدی عیسوی کے نصف ثانی کا زمانہ تھا۔ گجرات کا علاقہ کچھ میں خشک سالی کی وجہ سے کسان اور عام لوگ سخت پریشان تھے۔ دوسرا سال تھا کہ آسمان کو زمین پر ترس نہیں آیا تھا۔ لوگ ہر ممکن تدبیر کرکے ہار چکے تھے۔

ایسے میں ایک فقیر منش کا وہاں گزر ہوا، جو پیرانہ (احمد آباد سے دس میل جانب جنوب) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے لوگوں کی بدحالی دیکھ کر رب کائنات کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا اور دو سال کی قحط سالی کے بعد زمین بارش سے ہم کنار ہوئی۔ یہ دیکھ کر بہت سے لوگوں نے اس فقیر پر اسلام قبول کیا۔ ان کا نام "امام شاہ" بتایا جاتا ہے۔

"بیان کیا جاتا ہے کہ پیرانہ سے کچھ یاتری بنارس جارہے تھے، ان کی ملاقات امام شاہ سے ہوئی۔ امام صاحب نے ان کے ہمراہ بنارس جانے کا ارادہ ظاہر کیا، وہ لوگ راضی ہوگئے۔ پھر ہوا یہ کہ ان لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ سب لوگ بنارس میں ہیں، اپنی منتیں پوری کر رہے ہیں، مگر چند ثانیہ بعد ہوش آیا تو وہ پیرانہ میں تھے۔ ان لوگوں نے یہ کرامت دیکھ کر اسلام قبول کرلیا۔ کچھ میں آپ کے ذریعہ بہت لوگ مسلمان ہوئے۔ امام شاہ نے ۱۵۱۲ء میں وفات پائی"۔ (دعوتِ اسلام، ص ۲۰۵)

ہاشم پیر:

سولھویں صدی عیسوی کے آخری دور میں بیجا پور کے بادشاہ ثانی کے پاس گجرات کی سرزمین سے ایک بزرگ تشریف لائے، جن کی بزرگی اور کمالِ روحانی دیکھ کر شاہ بیجاپور ان کے مرید ہوگئے۔ اور بھی بہت سے لوگوں نے ان کے ذریعہ اسلام قبول کیا۔ دھارا داڑ کے ضلع میں بہت سے نور باف موجود ہیں، جن کے آبا و اجداد کو ہاشم پیر ہی کے ذریعہ اسلام کی دعوت نصیب ہوئی تھی۔ وہ لوگ اپنے پیر کے اہل خانوادہ کے ساتھ اب تک نہایت حسن سلوک سے پیش آتے ہیں۔

(بمبئی گزیٹڈر، ج۲۲ر ص۲۴۲)

شاہ سرمست:

اس علاقہ کے اسلامی مبلغین میں حضرت شاہ محمد صادق سرمست حسینی کا نام نامی بھی بہت روشن ہے۔ ناسک کے علاقہ میں اسلام ان کے دم قدم سے رائج ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں وارد ہونے والے مبلغین اسلام میں آپ سب سے زیادہ کامیاب ہوئے۔ ۱۵۶۸ء حضرت سرمست حسینی مدینہ منورہ سے تشریف لائے تھے۔ اور مغربی ہند کے اکثر علاقوں کا سفر کرنے کے بعد ناسک کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا۔

(بمبئی گزینٹر، ج۲۶ر ص۷۵۔۷۶)

خواجہ خوند میر حسینی:

اس علاقہ میں حضرت سرمست حسینی سے پچاس سال پہلے ایک کامیاب مبلغ اسلام خواجہ خوند میر حسینی اپنی تبلیغ کی داغ بیل ڈال چکے تھے، ممکن ہے حضرت سرمست انھیں کے سلسلۂ نسل کی کوئی کڑی ہوں۔ جنھوں نے اپنے بزرگ کے چھوڑے ہوئے کام کو آگے بڑھایا۔

سید محمد و سید عمر:

علاقۂ بلگام میں اسلام کی تبلیغی خدمات کی ابتدا دو عرب مبلغین سے منسوب کی جاتی ہے، جن کے نام سید محمد بن سید علی اور سید عمر عید روس باشیبان بتائے جاتے ہیں۔ (بمبئی گزینٹر، ج۲۱ر ص۲۰۳)

لداخ اور اس کے نواح میں اسلام کس طرح پہنچا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ لکھتے ہیں:

"لداخ میں ایک مخلوط قوم کے لوگ ہیں، جو ارغون کہلاتے ہیں۔ وہ تبتی عورتوں کے بطن سے ہیں۔ لیکن ان کے باپ مسلمان تاجر تھے، جو لیہ میں آئے تھے اور انھوں نے تبتی عورتوں سے شادیاں کرکے ان کو مسلمان ہونے کی ترغیب دی تھی۔ یہ ارغون تمام مسلمان ہیں اور اپنے باپ دادا کی طرح تمام تبتی عورتوں سے شادیاں کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خالص تبتی نسل کے لوگوں کے مقابلہ میں ان کی آبادی بڑھ رہی ہے"۔ (دعوتِ اسلام، ص۲۸۹)

آگے چل کر تبت کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"کشمیری تاجروں نے اسلام کو تبت خاص میں پہنچا دیا اور ان مسلمان تاجروں کی بستیاں ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ تبتی عورتوں سے شادیاں کرتے ہیں اور یہ عورتیں اکثر اوقات اپنے شوہروں کا مذہب اختیار کرلیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تبت کے دارالحکومت "لہا" میں مسلمانوں کے دو بڑے خاندان آباد ہیں۔ اسلام تبت میں چین کے صوبہ یونان کی طرف سے بھی داخل ہوا ہے۔

اور سوچنگ کے مقام میں، جو تبت اور صوبہ سی چون کی سرحد پر واقع ہے، تبتی باشندوں میں سے بعض لوگ مسلمان ہورہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تبت میں اسلامی اثرات ایران اور ترکستان سے بھی آئے ہیں"۔ (دعوتِ اسلام، ص ۲۹۰)

کشمیر اور اس کے گردونواح میں اسلام کی اشاعت گمنام فقرا اور درویشوں کے ذریعہ انجام پائی۔

"کشمیر میں اسلام کی اشاعت گمنام فقرا اور درویشوں کے ذریعہ ہوئی۔ مشہور روایت ہے کہ کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ، جس کا نام صدرالدین یا شمس الدین تھا، چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک درویش بلبل شاہ نامی کی تلقین سے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۳۸۸ء میں شیخ سید ہمدانی کی کشمیر میں آمد ہوئی اور اسلام نے کشمیر میں ان کے ذریعہ بہت فروغ پایا۔ ان کے ہمراہ سات سو سادات تھے، جنھوں نے ملک کے دوسرے حصوں میں پھیل کر اسلام کی تبلیغ کی۔ کشمیر کے مسلمان بادشاہ سلطان سکندر (۱۳۹۳ء تا ۱۴۱۷ء) کے زمانے میں بھی اسلام کو ترقی ہوئی، اس کا وزیر اعظم بھی نومسلم تھا۔ اکبر کے عہد میں کشمیر پر مغلیہ پرچم لہرایا اور بہت سے علما کشمیر آنے لگے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں کشتواڑ کے راج پوت کے راجہ نے سید شاہ فرید الدین کی کرامات دیکھ کر اسلام قبول کیا اور اس کے ساتھ اس کی بہت سی رعایا بھی مسلمان ہوگئی۔ شاہانِ مغلیہ جس راستے سے کشمیر جایا کرتے تھے، اس راستے پر ایسے راجے اب تک موجود ہیں، جو نومسلم راج پوتوں کی اولاد ہیں"۔ (دعوتِ اسلام، ص ۲۸۹)

مصنف مذکور آگے چل کر لکھتا ہے: "کشمیر کے شمال اور شمالِ مشرق میں، بلقستان اور لداخ کے علاقے ہیں، جہاں ایک مخلوط تبتی نسل کے لوگ رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے یہاں کئی صدیوں سے اسلام مضبوطی سے قائم ہوچکا ہے۔ لیکن ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ یہاں اسلام کب اور کیسے پھیلا۔ بلقستان کے مسلمانوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ ان کے ملک میں خراسان سے چار بھائی آئے تھے اور انھوں نے اسلام کو ایک نئی زندگی دی تھی۔ لیکن اولین مبلغین کے متعلق ان کے یہاں کوئی روایت نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک اسلام یہاں برابر ترقی کرتا رہا۔ لیکن جب مہاراجہ رنبیر سنگھ والیٔ کشمیر نے بدھ مت کے پیروؤں کی حوصلہ افزائی کی تو اس سے اسلام کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگئی"۔ (دعوتِ اسلام، ص ۲۸۹)

حسین انعام

جس زمانے میں مسند خلافت پر غیظ المنافقین حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونق افروز تھے اور شعاعِ اسلام مطلع عرب سے نمودار ہوکر روم و فارس کی وادیوں کو منور کر رہی تھی، مجاہدین اسلام قیصر و کسریٰ کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے، قدم قدم پر نصرتِ خداوندی ان کی یاوری کر رہی تھی۔ اس وقت بادیہ نشینوں کا وہی گروہ مشعل ہدایت لے کر جب مصر کی سرحد میں داخل ہوا تو فرعون کے طاغوت کو سینے سے چمٹائے رہنے والوں کی آنکھیں خیرگی کے عالم میں اسلام کی نورانیت کا انکار کر بیٹھیں اور تمام عیسائی ممالک سے فوجی امداد حاصل کرکے ایک لشکر جرار ماہر سپہ سالار جرجیس کی سرکردگی میں روانہ کیا، جو طوفانی انداز میں مشعل اسلام کو بجھا دینے والے عزائم کے

ساتھ آگے بڑھا۔ لیکن سنگلاخ چٹانوں کو اپنے حوصلوں سے ہموار کرنے والے غازیانِ اسلام نے اس کے تمام ارادوں کا قلع قمع کر دیا اور اپنی کثرت کے باوجود مصری لشکر مجاہدین عرب کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب نہ ہوا۔

عیسائیوں کی تلواریں، اسلامی سد سکندری سے ٹکرا کر کند ہوگئیں۔ جرجیس نے جب دیکھا کہ کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہوتی، لشکریوں کا جوش و خروش اضمحلال و پژمردگی کی جانب مائل ہو رہا ہے تو اپنی ذاتی عزت و آبرو کا سودا کرنے میں بھی کوئی دریغ نہ کیا اور اعلان کر دیا کہ جو شخص اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت عمر بن عاص کا سر کاٹ لائے گا، گراں قدر انعام کے علاوہ اس کے عقد میں اپنی ماہ پیکر لڑکی بھی دے دوں گا۔

تھوڑی دیر میں خبر پورے لشکر میں پہنچ گئی۔ اور مصری فوج کا ایک ایک سپاہی اپنی جان لڑا کر اس حسین انعام کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

ادھر مسلمانوں نے جب یہ خبر سنی تو انھیں اپنے امیر عساکر کی حفاظت کا زبردست انتظام کرنا پڑا اور یہ خبر جب مسلمانوں کے دارالخلافہ مدینہ طیبہ میں پہنچی تو خلیفۃ المسلمین حضرت عبداللہ بن عمر جیسے باتدبیر شخص کو محافظین کے ایک دستے کا امیر بنا کر روانہ فرمایا۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قدرے فکر مند دیکھ کر حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشورہ دیا کہ آپ بھی اسلامی لشکر میں فوراً یہ اعلان کرا دیجیے کہ جو شخص عیسائی سپہ سالار کو قتل کر دے گا، بیش بہا انعام کے علاوہ اسے جرجیس کی لڑکی بھی انعام میں دے دی جائے گی۔

دوسرے دن جب دونوں طرف کی فوجیں صف آرا ہوگئیں تو جرجیس کی لڑکی بھی بہ ہزار ناز و ادا باپ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ مصری لشکر کے ایک ایک سپاہی نے للچائی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور نوشتہ تقدیر کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔

دونوں لشکر ایک دوسرے پر پل پڑے، غازیانِ اسلام کے کانوں میں سورۂ جہاد کی تاثیر رینگنے لگی۔ اور شمشیر و سنان کے سائے میں حیاتِ جاودانی کا راستہ تلاش کرنے والوں نے اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ بارگاہِ الوہیت میں پیش کرنے کا موقع پالیا۔ مجاہدین عرب کو مصر کی وادی میں ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کے علاوہ ''وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' کے اس تلخ فیض سے بہرہ مند ہونے کا بھی شرف نصیب ہوگیا۔ تلواروں کی ضربیں تیزی کے ساتھ موت کے چہرے سے نقاب اٹھانے لگیں۔ کتنوں کے ارمانوں کی دنیا گھوڑے کی ٹاپوں سے پامال ہوگئیں۔ کتنوں کے آرزوؤں کے چمن تیر و تبر کی حرکتوں نے اجاڑ دیے۔ زمین لالہ زار اور فضا گرد آلود ہوگئی۔

دونوں طرف کے سپاہیوں کا جوش و خروش پورے شباب پر تھا۔ جرجیس للکار للکار کر اپنے سپاہیوں کو آگے بڑھا رہا تھا، لیکن تکبیر کی صدائیں تمام حوصلہ افزائیوں پر پانی پھیر دیتیں۔ دوسری طرف حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مجاہدین کو ہدایت دے رہے تھے۔ اب تک فتح کسی ایک کے حق میں متصور نہ تھی۔ یک بیک جرجیس کو اپنے سپاہیوں کی ہزیمت کا کچھ احساس ہوا، اس نے اپنی لڑکی کو ایک طرف اشارہ کیا اور تھوڑی دیر بعد ایک جواں سال دوشیزہ کے حنائی ہاتھوں میں بجلی کی طرح چمکتی ہوئی تلوار دیکھی گئی۔ عیسائیوں کا جوش و خروش یک

بیک دگنا ہوگیا اور خوں فشانی کا بازار اور گرم ہوگیا۔ مسلمانوں نے سنبھل کر ان کے حملوں کو روکا اور تیزی کے ساتھ اپنی تلواروں کو حجازی انداز میں حرکت دینے لگے۔

دونوں سپہ سالاروں کے گرد سنگین حصار ہونے کے باوجود جرأت آزما بہادروں کی تلواریں کچھ دور تک اپنا راستہ ہموار کرلیتیں، لیکن منزلِ مقصود تک پہنچنے سے قبل ہی دست عزازیل ان تک پہنچ جاتا۔ اور پھر یا تو کوئی نیزہ پسلیوں کو توڑتا ہوا اس پار نکل جاتا یا کوئی سنسناتی ہوئی تلوار سر کو گیند کی طرح اُچھال دیتی۔ دفعتہً کوئی سوار جرجیس کے گرد گھیرے ہوئے محافظین کو چیرتا ہوا بجلی کی طرح اس کے سر پر پہنچ گیا اور ایک تلوار متعدّد بار دریائے خون میں ڈوبتی اور اُبھرتی دیکھی گئی۔ چند ثانیہ بعد مصری جاں باز اپنی جانیں بچانے کے لے میدان سے پشت پھیر چکے تھے۔

مسلمانوں کی کامیابی کا غلغلہ پورے زور و شور کے ساتھ بلند ہوا اور ''نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتۡحٌ قَرِیۡبٌ'' کا مژدہ سنایا گیا۔ مسلمان بھاگتے ہوئے مصری بہادروں کو تہہ تیغ کرنے میں مصروف ہوگئے اور بقیۃ السیف کو گرفتار کر لیا گیا۔ جس میں جرجیس کی پری جمال صاحبزادی بھی شامل تھی۔

میدانِ کار زار میں جرجیس کا لاشہ فرعون کی بے سرو سامانی کی یاد تازہ کر رہا تھا اور اللہ کی عظمت کا پھریرا ایوانوں کے سروں کا تاج بن چکا تھا۔

جنگ کا بادل چھنٹ جانے کے بعد حضرت عمرو ابن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجمع عام میں اعلان کیا کہ تمام مسلمان اس خوش نصیب غازی کو جاننے کے لیے بے چین ہیں، جس کے حصے میں جرجیس کے قتل کا انعام ہے۔ کچھ دیر تک سناٹا رہا۔ لوگ چاروں طرف متجسس نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ اب کوئی شہسوار اپنا انعام لینے کے لیے آگے بڑھتا ہے، مگر کوئی نہ اٹھا تو حضرت عبداللہ بن زبیر نے متبسم انداز میں فرمایا کہ میں لوگوں کی جانب سے امیر کی خدمت میں استدعا کروں گا کہ وہ خود ہی اس انعام کو قبول کرلیں، کیوں کہ ایسی حالت میں آپ سے زیادہ کوئی حق دار نہیں ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو یہ اعلان آپ ہی کے مشورے سے ہوا تھا، لہٰذا مجھ سے زیادہ مستحق آپ ہیں۔ اتنے میں دو شخص مجمع کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان میں کا ایک بولا: یہ تو اُس حالت میں بحث چھیڑی جاسکتی ہے، جب کہ حق دار کا پتہ نہ چل سکے۔ لیکن میں نے تو حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جرجیس کے اوپر قریب سے چھپٹتے دیکھا ہے، یقینا یہی اس کے قاتل ہیں۔ دوسرا بولا: میں نے انھیں جرجیس پر حملہ کرکے زیر کرتے دیکھا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ ہر طرف خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سر جھکا کر کہا: یاامیر! بخدا! میں نے جرجیس پر صرف اس لیے حملہ کیا تھا کہ یہ میرا ایک دینی فریضہ تھا، مجھے کسی انعام کی قطعًا ہوس نہیں تھی۔ لیکن تمام مسلمانوں کے اصرار پر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیزوں میں ایک حسین دوشیزہ کا اضافہ ہوچکا تھا۔

آغوشِ اسلام میں

نظریات ومعتقدات کا تعلق چوں کہ ذہن وعقل کے ساتھ ساتھ قلب و روح سے ہے، اس لیے اس کا تغیر و تبدل کچھ آسان نہیں۔ کسی بھی نظریہ کو جاننے اور سمجھنے کا تعلق دماغ وعقل سے ہے اور ماننے کا قلب و روح سے ہے۔ جب کسی بات کو عقل و شعور تسلیم کر لیتے ہیں تو رفتہ رفتہ دل بھی اس سے مطمئن ہوجاتا ہے۔ ایمان کی روح فضل خداوندی ہے، جس کی تجلیات قلوب پر پڑتی ہیں۔ ایمانیات کا تعلق صرف علم ہونے تک نہیں، بلکہ تسلیم و رضا کی وہ منزل ہے، جسے ماننا کہتے ہیں۔ وہ ہے ایمان کا پہلا زینہ جسے، اقرار باللسان وتصدیق بالقلب سے تعبیر کرتے ہیں، عجزوانابت، تسلیم و رضا کی یہ منزل ایمانیات کے باب میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

ہر دم جنوں کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

بعض امور ایسے بھی ہوتے ہیں، جنھیں دلائل و براہین کی محکم تائیدات حاصل ہوتی ہیں، مگر اسے دل تسلیم نہیں کرتا، اسے بفرقِ مواقع تصلب اور ہٹ دھرمی کہتے ہیں۔

حریم کعبہ سیاہ رات کے پردے میں چھپ چکا ہے۔ وادی القریٰ کے بسنے والے خوابِ خرگوش میں کھوگئے۔ مقتولین بدر کا نوحہ کرنے والی عورتوں پر بھی نیند کا طلسم چل چکا ہے۔ میدانِ بدر میں مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد سے تو مکہ سنسان ہوگیا۔ سردارانِ مکہ ابو جہل، شیبہ، عتبہ، ولید، حارث جیسے جواں مرد خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر ختم ہوگئے۔ عباس، عقیل، عدی اور وہب جیسے ستر حوصلہ مند اسیر ہوگئے۔

شکست بدر کے نو روز بعد اسی غم میں ابولہب کی بھی موت واقع ہوگئی۔ ہر ایک اپنی جگہ اداس اور مضمحل، نہ زندگی کی خواہش، نہ موت کا غم۔ دو بے قرار جان، جنھیں اپنی مذہبی اور قومی حمیت نے بالکل زندگی سے بے زار کر دیا تھا۔ عمیر بن وہب، صفوان بن امیہ بن خلف حطیم کعبہ میں بیٹھے راز و نیاز کی باتوں میں مشغول ہیں۔ کافی رات بیت گئی تو کسی نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ دونوں حطیم سے باہر نکلے اور اپنے اپنے گھروں کی جانب چل پڑے۔ رگوں میں خون کی تیز روانی اور آنکھوں میں مستقبل کے منصوبوں کی چمک لیے ہوئے، کسی کو کچھ خبر نہیں، مگر سحر کے چھٹنے کے بعد عمیر نے اونٹنی کسی اور یثرب کی طرف روانہ ہوگیا۔ صبح صادق کی روشنی جتنی سرعت سے تاریکی کو کافور کرتی جاتی تھی، عمیر کی آنکھیں اور تاب ناک ہوتی جاتی تھیں۔ تین شبانہ روز متواتر سفر کے بعد منزلِ مقصود پہ پہنچ جانے کے بعد عمیر کو اطمینان سا نصیب ہوگیا۔ بدر کی ہول ناک جنگ میں ستر قریشی بہادروں کی موت کے علاوہ، جو زبر دست نقصان ہوا وہ ستر کی گرفتاری تھی۔ گرفتار ہونے والے اپنی اپنی جانوں سے ناامید ہوچکے تھے۔ کیوں کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کے رفقا (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) پہ کیے گئے سارے مظالم ایک ایک کر کے یاد آرہے تھے۔ بلال کو تپتی ریت پر گھسیٹنا، عمار کو آگ کے انگاروں پہ لٹا کر قہقہے لگانا، سمیہ کی نعش کے ساتھ بے حرمتی کا برتائو کرنا اور خود محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گلے میں کپڑے کا پھندا ڈال کر کس دینا، سجدہ کی حالت میں پشت مبارک پر اونٹ کی

آلائشیں ڈال دینا وغیرہ، بے شمار نظائر عدوان ان کی نگاہوں کے سامنے کسی مرئی حقیقت کی طرح گھوم رہے تھے۔ مگر رؤف رحیم پیغمبر نے تمام قدیم عداوتوں کی کتاب بند کردی اور جانی دشمنوں کو فدیہ پر رہا کرنے کا اعلان کر دیا۔

مگر اس رہائی سے مقتولین کا غم تو مندمل ہونے کا نہیں۔ قریش کے اہل دانش اپنی قدیمی ساکھ کے لیے سخت متردد تھے، جس کے نتیجہ میں عمیر آج مدینہ میں وارد ہوا تھا۔ بڑے تیکھے اور زہر آلود عزائم کے ساتھ، جس کا علم صفوان اور عمیر دو روحوں کے سوا کسی تیسرے کو نہ تھا۔ راستے بھر عمیر کو اپنی کامیابی کے بعد مکہ میں پھر اپنی اسی عظمت رفتہ کے عود کر آنے کا یقین واثق تھا، جو آئندہ نسلوں پر عمیر کے عظیم احسان سے کم نہیں ہوں گی۔ لوگ بدر کی ساری ہولناکیاں بھول جائیں گے اور جس مقصد کے لیے ایک ہزار بہادروں کا لشکر ناکام رہا، تنہا میری ذات سے انجام پذیر ہوگا۔ پھر تو اونٹنی کی رفتار اور تیز ہوجاتی۔ عمیر کے مدینہ میں جاتے ہی سب سے پہلے حضرت عمر بن خطاب سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے بھانپ لیا کہ یہ دشمن رسول کسی غلط مقصد کے تحت آیا ہے۔ عمیر نے اونٹنی مسجد نبوی کے دروازے پر بیٹھا دی اور حضور کی طرف لپکا۔

عمیر: الصباح الخیر۔

حضور (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تونے جاہلیت کا تحیہ کیا، خدا نے مجھے اہل بہشت کا سلام عطا فرمایا ہے، جو اس سلام سے بہرحال عمدہ ہے۔

عمیر: یا محمد! بخدا! یہ سلام آپ کو تھوڑے دنوں سے ملا ہے۔

حضور: (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) بتائو کیسے آنا ہوا؟

عمیر: اپنے بیٹے کے لیے جو آپ کی قید میں ہے۔

حضور: اگر بیٹے کو رہا کرانے آئے ہو تو گلے میں آڑی تلوار لٹکانے کا کیا مقصد؟

عمیر: ان تلواروں کا بُرا ہو، ہمیں ان سے کیا فائدہ ہوا۔

حضور: عمیر! سچ بتائو، کیا ارادہ کر کے چلے ہو؟

عمیر: بیٹے کی رہائی کے سوا کوئی ارادہ نہیں۔

حضور: (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے فرمایا: عمیر کیا یہ بات سچ ہے کہ تم اور صفوان ابن امیہ فلاں تاریخ کو رات کی تاریکی میں حطیم کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ تم دونوں کے دل میں مقتولین قریش کے بارے میں اظہارِ غم اور ہم لوگوں کے سلسلہ میں اظہارِ نفرت کے انگارے دہک رہے تھے۔ تم لوگ سوچتے سوچتے اس نتیجہ پر پہنچے کہ سر میدان مسلمانوں سے پیش نہ گئی تو حیلہ و فریب سے پیغمبر اسلام کو قتل کر دیا جائے۔ (العیاذ باللہ) اور جوشِ حمیت میں تونے کہا کہ میرے اوپر بارِ قرض اور اہل و عیال کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو میں تن تنہا مدینہ جاتا اور زہر آلود خنجر سے محمد کا کام تمام کر دیتا۔ پھر صفوان نے قرض اور اہل و عیال کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی اور تم مشرکین مکہ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے چل پڑے۔

حضور کے لب ہائے مبارک سے عالم غیب کے حقائق مترشح ہو رہے تھے۔ اور عمیر کا جسم شرم و ندامت سے عرق عرق تھا۔ گویا یہ الفاظ نہ تھے، بلکہ ابر رحمت کے چھینٹے تھے، جو دل و دماغ پر جمی ہوئی شرک کی کالک کو دھو رہے تھے۔ دشمنی و عناد کے سارے منصوبے سرد پڑ گئے اور حقائق اسلام کے سورج کی کرنیں دل کے آنگن تک پہنچ گئیں۔ دل و دماغ، عقل اور شعور کی ترجمان بن کر زبان سے کہا: ''اشهد ان لا الہ الا اللہ واشهد ان محمدا عبده و رسولہ''۔ یا رسول اللہ! قسم ہے واحد رب کی، ان باتوں سے میرے اور صفوان کے سوا کوئی بھی واقف نہیں۔ سچ ہے، اس قسم کا علم اسی ذات کو مل سکتا ہے، جس کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے کہ: ''فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ''۔ حضور نے اصحاب سے فرمایا: لے جائو، اپنے بھائی عمیر کو دینی مسائل سکھائو۔

کتنا مسعود و مبارک ہے دلوں میں وہ دل

پیار سے آپ جسے اپنا مکاں فرمائیں

یوسف بن تاشقین

۷۰۹ء جس زمانے میں طارق بن زیاد نے حضرت موسیٰ بن نصیر والی طبجہ کی ایما پر اندلس کی سرزمین کو غلغلۂ توحید سے آشنا کرنے کے لیے اسلامی بیڑوں کے بادبان کھولے اور اشبیلیہ اور طلیطلہ کے نخلستانوں کو مجاہدین اسلام کے سمند اقبال سے روشناس کرانے کا عزم کیا اور اسلامی بیڑے بحر روم کی بے کراں وسعتوں کو ناپتے ہوئے آگے بڑھنے لگے تھے۔ اسی وقت سے مسیحی تاج دار چراغ پائی کے عالم میں کروٹیں بدلنے لگے تھے اور محلوں کے جھروکوں سے اسلامی بجریے کو "نصر من اللہ وفتح قریب" کا علم لہراتے ہوئے استعجاب بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔

بالآخر قرنہا قرن سے جبر و تشدد کے سہارے غریب رعایا کی ہڈیوں پر اپنے عشرت کدے تعمیر کرنے والے عیسائی حکمراں اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ اور جبل الطارق کی اونچی اونچی چٹانوں نے مسلمانوں کے سفینوں کا خیر مقدم کیا۔

سرزمین یورپ پر مسلمانوں کی کامیابی کا یہ باب مسیحیت کے سینے کا ایک ایسا انمٹ زخم تھا، جو کئی صدیوں گزر جانے کے بعد بھی مندمل نہ ہوسکا۔ اور وہ کسی مناسب موقع کے انتظار میں باہمی اتحاد کی جانب متوجہ ہوئے۔ تقریبًا تین سو سال تک مسلم اسپین کے تعلق قرطبہ سے رہا۔ اور اس طویل عرصہ میں مسلمانوں کے تہذیب و تمدن نے مستحکم طور پر اپنا قدم جما لیا تھا۔

اسپین اب صرف یورپ کا ایک سرسبز و شاداب خطہ نہ تھا، بلکہ علوم وفنون اور صنعت و حرفت میں اپنی نظیر آپ تھا۔ اندلس کے تاجر یورپ کی منڈیوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ دسویں صدی عیسوی میں جب دولت امویہ پر انحطاط کا دور آیا اور مسلم سلاطین خانہ جنگیوں کا شکار ہونے لگے اور آپس کی ناچاقی نے انھیں گرد و پیش سے بے گانہ کر دیا تو وہ عیسائی حکمراں جو مدتوں سے اس وقت کا انتظار کر رہے تھے، میدان میں کود پڑے اور ان ملوک الطوائف کے علاقوں میں جو دولت امویہ کے جمود و تعطل کے دور میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے مسلم اسپین کو ٹکڑوں میں بانٹ چکے تھے، غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ بحر روم کے دوسرے کنارے سے شاہ قشتالہ الفانسو ششم نے اٹھ کر اندلس کے خود مختار حاکم محمد بن عباد کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا، جو اس وقت مسلم خود مختار امرا میں سب سے زیادہ مقتدر اور ذی حیثیت تھا۔ اور اسی کی فوجی قوت کے بل بوتے پر اپنی حکومت کی سرحدیں وسیع کرنے لگا۔ بہت سے علاقے زیر نگیں کر لینے کے بعد صلح و دوستی کے نقاب سے سرکشی اور خوں خواری کا چہرہ بر آمد ہوا۔ اور شہنشاہ نے قومی عصبیت کو بروئے کار لاکر مسلمانوں کے گریبان تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کی اور خود محمد بن عباد سے برجستہ چند قلعوں اور متعدّد علاقوں کا مطالبہ کر دیا۔ لیکن اس قوم کا ایک فرد، جو مسلسل تین صدیوں تک حکومت کے تخت پر متمکّن رہ چکا تھا، یہ گوارا کر سکتا تھا۔ شاہ قشتالہ کے سفیروں کو لوٹا دیا اور ان کے سفیروں کو برسرعام قتل کر دینے کا حکم نافذ کر دیا۔ ابن خطس شاہ قشتالہ نے جب دیکھا کہ ابن عباد اس طرح قبضے میں نہیں آنے والا ہے تو اس نے مراقش کے ہر دل عزیز حکمراں یوسف بن تاشقین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، تاکہ اسے ہموار کر لینے کے بعد عالم اسلام کی طرف آسانی سے ہاتھ بڑھایا

جا سکے۔ دراصل عیسائی حکام نے متحدہ طور پر اندلس کی سرزمین مسلمانوں سے خالی کرالینے کا تہیہ کرلیا تھا۔ اور یوسف بن تاشقین ہی ان کے راستے کا آخری روڑا تھا، جو حملہ آوری کے وقت ان کے عزائم کے درمیان حائل ہوسکتا تھا۔

لہٰذا الفانسو نے اسے بھی اپنے دامِ فریب میں پھنسانے کی کوشش کی۔ لیکن افسوس! اسے معلوم نہ تھا کہ اگر اس نے اسپین کے چند امرا کو اپنا آلۂ کار بناکر اسلامی حکومت کی پشت میں ایک آخری وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ تو اطلس کی سنگلاخ چٹانوں کا سینہ چیر کروادیٔ مراقش کو اسلام کا دفاعی حصار بنانے والے مردِ مجاہد کو اپنی عیارانہ سازشوں میں نہیں لے سکتا۔ اگر حسین مرغابیاں فضائے آسمانی میں محوِ پرواز عقابوں کو اپنی بھولی صورت کی سحر کاری سے مطیع و فرماں بردار بنالیں تو اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے خود فراموشی کا ایک حسین سپنا دیکھا تھا، کیوں کہ عقاب گرد و پیمائی اس لیے کرتا ہے کہ بساطِ زمین پر بکھرے انواع واقسام کے شکار میں سے جس کا جی چاہے انتخاب کرے۔

یوسف بن تاشقین اس وقت اپنے گرد و پیش کے تمام بربر قبائل کو اپنے علَم کے نیچے جمع کرنے میں دل و جان سے منہمک تھا۔ الفانسو ششم کے سفیروں کو دیکھتے ہی تاڑ گیا اور انھیں یہ کہہ کر رخصت کردیا۔

''لا یلدغ المسلم من حجر مرتین''۔

ترجمہ:۔ مردِ مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد اسپین کے مظلوم مسلمانوں کی چیخ و پکار نے اس عظیم اسلام دوست جرنیل کو بحر روم میں اپنے سفینے اتارنے پر مجبور کردیا۔

ایک طرف عیسائیت کی متحدہ طاقت مسلمانوں کی تین سالہ پُرانی تاریخ اسپین کو ملیا میٹ کردینے کے ارادے سے شاہ قشتالہ کی سرکردگی میں بڑھی آرہی تھیں۔ دوسری طرف ملوک الطوائف کے شکست خوردہ حوصلے مرابطی نجات دہندہ کے بیڑے کا انتظار کررہے تھے۔ غرناطہ اور اشبیلیہ کے در و دیوار نے بربری مجاہدین کا سرفروشانہ خیر مقدم کیا۔ اور محمد ابن عباد نے تمام امرائے اسپین کو متحد کرکے اپنے عظیم رہنما کے جھنڈے تلے جمع کردیا۔ اور وہ آرزو کسی زمانہ میں الناصر اور الحاجب جیسے جاں نثارانِ اسلام کے دلوں میں کروٹیں بدل رہی تھی، پوری ہوگئی۔

قشتالہ پیدل کے علاوہ اسّی ہزار سواروں کی کثیر جمعیت کے ساتھ آگے بڑھا اور زیادتیٔ افواج پر فتح وشکست کا تخمینہ لگانے والی یہ قوم، سرفروشی کے جذبات رکھنے والوں کو فراموشی کے پردے میں چھائے ہوئے اسلامیانِ اندلس کا خاتمہ کردینے کے لیے میدانِ یراقہ میں نکل آئے۔ مسلمانوں کے امیر نے جب دیکھا کہ شکار گاہ بھیڑوں اور بکریوں سے بھر گئی ہے تو اسلامی لشکر کا نصف حصہ میدان میں اتار دیا، جو سامنے آتے ہی مسیحی لشکر پر ٹوٹ پڑا۔ تھوڑی دیر میں جنگ کا میدان قیامت خیز ہوگیا۔

عیسائی لشکر بڑھے ہوئے حوصلوں کے ساتھ مسلمانوں کو نرغے میں لینے کی کوشش کررہا تھا۔ اتنے میں یوسف بن تاشقین اپنے جاں بازوں کو لے کر بھوکے شیر کی طرح کچھار سے نکل کر دشمنوں کے ریوڑ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے بلند ہمت مجاہدوں نے یراقہ کے میدان میں ایک بار پھر طارق بن زیاد کی تاریخ کو زندہ کردیا۔ شام ہوتے ہی عیسائیت کے بازو ٹوٹ چکے تھے۔ تورات کی تاریکی نے انھیں اپنے دامن میں پناہ دی۔ مرابطین کی پتھریلی زمین کو اپنے عزم واستقلال کے ذریعہ ہموار کرنے والے مجاہد یوسف بن تاشقین نے قرطبہ پر لہرانے والے علَمِ

اسلامی کو سرنگوں ہونے سے بچا لیا۔ کتنی نسلیں گزر گئیں، مگر اندلس کی مائیں ننھے بچوں کو لوریاں دیتے وقت اس عظیم محسن کی کہانیاں سناتی رہیں، جس کی قومی خدمات آج بھی تاریخ کے اوراقِ پارینہ کی زینت ہیں۔

مسلمان دجلہ کی موجوں میں

قصر ابیض کی پر شکوہ برجیاں، سورج کی شعاعوں سے جگمگا رہی تھیں۔ جس میں شاہانِ ایران کی سیکڑوں سالہ تاریخ جنم لیتی چلی آئی تھی۔ سامنے حد نظر تک دریائے دجلہ کا پاٹ تھا۔ مسلمان عراق کی عظیم الشان فتح کے بعد قادسیہ کی جانکاہ مہم سے بھی فارغ ہو چکے تھے۔ گرد و نواح کے تمام علاقوں پر مکمل تسلط ہوجانے کے بعد اب اسلامی پرچم ساحل دجلہ پر لہرا رہا تھا۔ بہرہ سیر اور دوسرے مفتوحہ مقامات کے حکام جان بچا بچا کر مدائن ہی میں پناہ گزیں تھے۔ یہ شہر ایرانیوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اس لے انھوں نے اسے بچانے کے لیے ممکنہ کوشش سے قطعاً دریغ نہ کیا۔ اہل شہر نے جب دیکھا کہ اسلامی لشکر فریدون کے اس شہر کو بھی روند ڈالنے کے ارادے سے بڑھا چلا آرہا ہے۔ تو انھوں نے دریائے دجلہ پر بنے ہوئے مستحکم چوبی پل کو توڑ کر مغرب سے اپنا رابطہ کاٹ لیا۔ مسلمانوں کے پاس بحری مواصلات اور رسل و رسائل کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔

شاہی محلوں کی فصیلوں پر ٹہلتے ہوئے ایرانی اب یک گونہ مطمئن تھے، کیوں کہ وہ تمام ان مادی ذرائع کو مسدود کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جن پر فتح و کامرانی متصور ہو سکتی تھی۔ انھیں کیا معلوم کہ اسلام کا آفاقی پیغام جس کی نشر و اشاعت کے لیے مسلمان ریگزار عرب سے چل کر ہمارے ملک کی سرحدیں پامال کر رہے ہیں۔ کسی انسان کا شخصی اور فکری مشن نہیں ہے، بلکہ خالق ارض و سما کا نازل کردہ پیغام حق و صداقت ہے۔ جسے مادی اور ظاہری وسائل کے علاوہ بھی بے پناہ قوت واستحکام حاصل ہے۔ (یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝)

ایک طرف دریا کی بے قرار موجیں سر پٹک پٹک کر مالک بے نیاز کی عظمت کا اعلان کر رہی تھیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کے سینے کا طوفان قصر ابیض پر اسلامی علم لہرا دینے کے لیے بے چین تھا۔

اصحابِ کرام کو اپنے مقدس رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی یاد آگئی، جو غزوۂ خندق کے موقع پر سرور کائنات نے اپنی زبانِ غیب ترجمان سے فرمائی تھی۔ جس کا اختتام ''اوتیت خزائن الارض'' پر ہوا تھا۔ ایک وہ دن تھا کہ مسلمان اپنے گھر میں اپنی آبادی کے گرد اپنی حفاظت کے لیے خندقیں کھود رہے تھے۔ آج یہ موقع ہے کہ دشمن مسلمانوں کی دست برد سے بچنے کے لیے دریائے دجلہ کا سہارا لے رہا ہے۔ خندق کھودے وقت سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو آواز دی گئی: یارسول اللہ! فداک ابی وامی، ایک پتھر تو اتنا سخت ہے کہ کسی کے بیلچے کی ضرب اس پر اثر ہی نہیں کرتی۔ فاتح قلوبِ انسانی، فلاحِ دارین کی راہ کا ہر پتھر دور کر دینے والے مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود بیلچہ سنبھالا اور چند ضربوں میں نہ صرف اس سخت ترین پتھر کو پاش پاش کر دیا، بلکہ دو ضربوں کے بعد تو ایک ایک ملک کی فتح کا مژدہ بھی سنایا جاتا رہا۔ تیسری اور آخری ضرب کے ارشاد فرمایا: ''اوتیت خزائن الارض''۔

اور سالوں کی بہ نسبت امسال بارش بھی زیادہ تھی، جس کی وجہ سے دجلہ پورے شباب پر تھا۔ دریا کا پاٹ اس وقت تین میل چوڑا تھا۔ تمام مجاہدین حضرت سعد بن ابی وقاص امیر عساکر کے حکم کا انتظار کر رہے تھے کہ آپ کیا حکم نافذ فرماتے ہیں۔ سردارِ لشکر نے اس وقت مسلمانوں کو بعد حمد وصلوٰۃ یوں خطاب فرمایا:

''ان عدوکم قد اعتصم منکم بھٰذہ البحر فلا تخلصون الیه ویخلصون الیکم اذ شاؤا فی سفنهم فیناوقد رأیت من الرای ان تجاھدوا للعدو قبل ان تحصرکم الدنیا الا انی قد عزمت علی قطع ھٰذا البحر الیھم''۔

(تاریخ الکامل، ج:۲، ص:۲۹۸)

ترجمہ:۔ دشمن نے دریا کی طغیانی میں پناہ لے رکھی ہے، تم ان پر حملہ نہیں کر سکتے اور وہ جب چاہے تم پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ میری رائے ہے کہ اس سے قبل کہ دنیا تم پر غالب آئے اور اس میں پھنس کر تمہارے احوال بد ہوجائیں، صدق واخلاص میں کمی آجائے، دشمن سے جہاد کے لیے دریا میں کود پڑو اور پار اتر جائو۔

ان ساٹھ ہزار مجاہدین میں سے کوئی پیادہ پا نہ تھا۔ سب کے سب گھوڑے پر سوار تھے۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ سردار کی بات کو سب نے قبول کیا اور دریا میں اتر پڑے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پانی میں گزرتے گئے، جیسے خشکی میں باغ کی روشوں میں چہل قدمی کی جاتی ہے۔ حضرت سعد کے ہمراہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ حضرت ابن ابی وقاص کی زبان پر بار بار یہ جملہ آیا:

''واللہ ینصرن اللہ ولیه ولیظھرن دینه ولیھزمن عدوہ مالم یکن فی الجیش یعنی او ذنوب تغلب الحسنات''۔

ترجمہ:۔ قسم خدا کی اللہ اپنے دوست کی مدد کرتا رہے گا اور اپنے دین کو غالب رکھے گا اور دشمن کو مغلوب کرے گا، جب تک ظلم وگناہ کی زیادتی نہ ہو۔

ایرانیوں کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ مسلمان بغیر کشتی اور جہاز کے دریا پار کرنے کی کوئی تدبیر نکالیں گے۔ جب انھوں نے پورے اسلامی لشکر کو سطح دریا پر خراماں خراماں چلتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا تو ان کے اوسان خطا ہوگئے۔ چیخنے چلانے اور بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہ رہا۔ اپنی جان بچا کر بھاگتے ہوئے دولت فریدون کے وارث چلا رہے تھے، دیواں آمدند، دیواں آمدند۔ کیوں کہ انسان تو دریائوں کے عبور کرنے میں کشتی اور جہاز کا محتاج ہوا کرتا ہے۔ یقیناً یہ کوئی مافوق الانسانیت قوت ہے، جو لہکتی ہوئی دجلہ کی موجوں کو روند کر پار اتر جائے۔ پانی میں تیرتے ہوئے گھوڑے جہاں تک جاتے، وہیں پتھر کی چٹانیں ان کے پائوں سے لگ جاتیں اور گھوڑے آرام کر کے تازہ دم ہوجاتے اور پھر چل پڑتے۔ اسی اعتبار سے اس روز کا نام یوم الجراثیم رکھا گیا۔

جب پورا لشکر پار اتر گیا اور کسی کو کوئی گزند نہ پہنچا، نہ کوئی سامان ضائع ہوا تو مالک بن عامر نمیری نے کہا: میرا پیالہ؟ لوگوں نے مذاق میں کہا: تقدیر نے اسے اُڑا دیا۔ انھوں نے بڑے یقین کے ساتھ کہا:

''واللہ انی لعلی حالتی ما کان اللہ یسلبنی قدحی من بین اھل العسکر''۔

ترجمہ:۔ واللہ میں ایسے حال میں ہوں کہ لشکر میں صرف میرا پیالہ نہ گم ہوگا۔

قدرت نے ان کے عزیمت اور یقین کا نتیجہ دکھایا کہ فوراً سطحِ آب پر تیرتا ہوا پیالہ خود بخود کنارے لگ گیا اور مالک نے بڑی پھرتی سے اٹھا لیا۔

جب مسلمان دریا سے پار اترے، کسریٰ کا محل شاہی خاندان سے خالی ہو چکا تھا۔ نہایت آسانی سے ایرانی فوجوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور قصر ابیض کے سب سے اونچے مینارے پر خدائے واحد کی عظمت کا پھریرا بلند تھا۔

درندے اور اہل حق کی اطاعت

قیروان مغربی افریقہ کا سب سے مشہور شہر تھا۔ جو اسلامی حکومت کے گورنر کی قیام گاہ ہونے کی وجہ سے کافی مشہور و معروف ہوا۔ اس شہر کی بنیاد ۵۰ھ میں رکھی گئی۔ شہر کی نیو کے ساتھ اسلام کی لافانی عظمتوں کی تاریخ بھی مرتب ہوئی ہے۔ قبیلہ بربر کے لوگ، جو اس سرزمین پر مدتوں سے آباد تھے۔ نہایت سرکش اور باغی ذہن رکھنے والے انسان تھے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب عقبہ ابن نافع فہری کو افریقہ کا گورنر بنایا تو انھیں اس علاقہ کے باغیوں کی خود سری روکنے کی فکر ہوئی، جو موقع بے موقع اودھم بازی کر کے انتظامی امور میں رکاوٹ ڈال دیا کرتے تھے۔ قبیلہ بربر کے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور وہ امیر اسلام کے ساتھ رہ کر جنگوں وغیرہ میں شرکت بھی کیا کرتے تھے۔ مگر جہاں امیر العساکر وہاں سے ہٹے، وہ غیر مسلم بربروں کے ساتھ مل جل کر سارے عہد و پیمان توڑ ڈالتے اور نو آباد مسلمانوں کو لوٹنا پھونکنا شروع کر دیتے۔

ان تمام حالات کے پیش نظر حضرت عقبہ نے خیال فرمایا کہ مغربی افریقہ کو ایک مستقل صوبہ قرار دے کر ایک فوجی چھاؤنی قائم کر دی جائے اور ان فوجیوں میں مسلم بربروں کو بھی ایک مستقل حیثیت دی جائے۔ جب کثیر تعداد میں یہاں فوج رہے گی تو ایسی صورت میں فتور پسند ذہنوں کو سر اُبھارنے کا موقع نہ ملے گا۔

مرکز سے بھی منظوری حاصل کر لینے کے بعد حضرت عقبہ ابن نافع نے ایک جگہ کا انتخاب فرمایا۔ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے تو مناسب ضرور تھی، مگر بجنسہٖ وہ جگہ بہت ہی خطرناک اور اذیت رساں تھی۔ دراصل وہ ایک خوف ناک قسم کا جنگل تھا، جس کی جھاڑیاں اتنی گھنی اور الجھی ہوئی تھیں کہ جنگلی جانور تو الگ، موذی حشرات الارض، سانپ، بچھو وغیرہ بھی بمشکل اپنا راستہ نکال پاتے تھے۔ گویا وہ علاقہ موذی جانوروں ہی کے لیے مخصوص تھا۔ بربریوں کو جب اس منصوبہ کا حال معلوم ہوا تو اولاً وہ ہنسے اور غیر دانش مندانہ حرکت سمجھ کر تمسخر کیا۔ اور کچھ مصلحت اندیش مسلم مدبروں نے بھی اس کے علاوہ کوئی دوسری جگہ چن لینے ہی کو ترجیح دیا۔ مگر حضرت عقبہ نے جب اس مقام کے افادی پہلو پر روشنی ڈالنی شروع کی تو سب کو خاموش ہی ہونا پڑا۔

امیر کی باتوں پر حامی تو بھر لی گئی، مگر بلی کو گھنٹی پہنانے کا مسئلہ جوں کا توں پڑا رہ گیا۔ جب جنگل کی صفائی کی تدبیروں پر غور کیا جاتا تو دشوار امر محسوس ہوتا۔ حضرت عقبہ ابن نافع نے اپنے لشکر کے تمام لوگوں کو جمع فرمایا اور ان میں سے اصحابِ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ بلایا، جن کی تعداد ستر ہ تھی اور جنگل کے کنارے کھڑے ہو کر یہ خطبہ دیا:

'' ایتھا الحشرات والسباع نحن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارحلوا فانا نازلون فمن وجدناہ بعدہ قتلناہ ''۔

ترجمہ:۔ اے درندو! موذی جانورو! ہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، اس جگہ قیام کرنا چاہتے ہیں، تم یہاں سے چلے جائو، اس کے بعد ہم جسے پاویں گے قتل کر ڈالیں گے۔

اس جملے میں نہ جانے کون سی تاثیر پنہاں تھی کہ جنگل کے تمام بسنے والے موذی جانوروں اور حشرات الارض نے اپنا اپنا راستہ پکڑا۔ شیر، چیتے اپنے جوڑوں اور بچوں کے سنبھالے ہوئے، بھیڑیے اور تمام سباع بہائم سر جھکائے ہوئے ایک رُخ پے روانہ ہونے لگے۔ سانپوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، جو اپنی سنپولیوں کو کمر سے چمٹائے ہوئے جھنڈ کے جھنڈ چلے جاتے تھے۔ یہ ایک ایسا منظر تھا، جسے آج تک انسانی نگاہوں نے نہ دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی قاہر وجابر قوت نے ان کے تمام حوصلوں کو پست کر دیا ہے اور وہ دائیں بائیں دیکھے بغیر اپنا راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ ہزاروں انسانوں نے کھلی آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھا۔ اسباب وعلل کی بنیاد پر ہر بات کا نتیجہ اخذ کرنے والے ماہر دانشوروں سے پوچھا جائے کہ حضرت عقبہ کے ان چند جملوں میں طبعی حیثیت سے کیا اثر آفرینی تھی، جسے بے زبان سباع و بہائم اور حشرات الارض، کیڑے مکوڑوں نے سنا اور چشم زدن میں اس پر عمل کر کے بتا دیا؟؟۔

قومِ بربر جو اس سرزمین کے قدیم باشندہ تھے۔ اور جو اس جنگل کی خوف ناک داستانوں میں پروان چڑھے تھے، یہ بعید از عقل تماشہ دیکھ کر بھی کیسے اسلام کی صداقت کے معترف نہ ہوتے۔ ہزاروں سرکش و ظالم مغروروں نے صمیم قلب سے پیغمبر صداقت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کیا اور مالک، قادر وقیوم کی بندگی میں داخل ہو گئے۔

اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ O

اس کھلی ہوئی کرامت کی روشنی میں توحید کی سچائی، ان پر بے نقاب ہو گئی۔

در و دیوار من آئینہ شد از کثرت شوق
دیدہ ہر جا کہ نہم روئے ترا می بینم

انصاف کی روشنی

پھٹے حالوں ایک مظلوم سلطان محمود غزنوی کے دربارِ عام میں آیا۔ مگر گرد و پیش پر نگاہ ڈال کر کچھ اس طرح مبہوت ہوا کہ زبان سے ایک لفظ بھی بول نہ سکا۔ حالات شناس اور بلند فہم سلطان نے سمجھ لیا کہ ضرور کسی نفسیاتی دبائو نے اس کمزور کو بیانِ حال سے باز رکھا ہے۔ مظلوم خاموش ہی تھا، مگر اس کی دریدہ حالی، زبانِ حال سے سب کچھ کہہ گئی۔ سلطان دربارِ عام سے اٹھا اور خلوت کدے کی طرف چل پڑا، تھوڑی دیر بعد سلطان نے مظلوم کو تنہائی میں بلایا اور حال پوچھا:

مظلوم: جہاں پناہ! میری کیا مجال کہ آپ جیسے عالی گہر کے خانوادہ سے کوئی شکوہ کر سکوں، مگر مگر۔

سلطان: اطمینان رکھو اور اپنے احوال بیان کرو۔ ان شاء اللہ تم مجھے حق و انصاف کا حامی اور ظلم و بدکاری کا مخالف پائو گے۔ اگر تم پر شاہی خاندان کے کسی شخص نے ظلم کیا ہے تو اسے بھی نہ بخشا جائے گا۔

مظلوم: حضور! کئی راتیں گزریں کہ میں کانٹوں پر گھسٹتا ہوں، ایک شخص آتا ہے اور مجھے جبراً گھر سے نکال باہر کر دیتا ہے۔ پوری رات میرے گھر میں گزارتا ہے۔ میں یہ دردناک تماشا اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، مگر کچھ بول نہیں سکتا۔ اپنے جھونپڑے سے آہ و نالہ کی آوازیں سنتا ہوں۔

سلطان: اے بیوقوف! آخر تونے اتنی تاخیر کیوں کی؟ یہ ظلم جس روز سے شروع ہوا تھا، اسی دن مجھے خبر کیوں نہ کی، جا اب جس وقت وہ کم بخت تیرے گھر آئے مجھے اطلاع دینا۔

بدکردار اور کندی ذہنیتیں، اقتدار و تفوق کے پردے میں اپنی غلاظت پھیلاتی رہی ہیں۔ جہاں اختیار و برتری کا تھوڑا سا سہارا ملا، کمینوں کی بن آئی۔ ایسے ہی لوگوں نے ایوانِ شاہی اور مسند امارت و سیادت کو بھی اپنی قربان گاہ نعش پر بھینٹ چڑھا دیا۔ جھوٹی عظمت کے نشے میں نفسانیت و شیطانیت کا دبائو ان کی شخصیت پر کچھ اس طرح محیط ہو گیا کہ انھوں نے اخلاقِ انسانی کے سارے محاسن صدق و دیانت، غریب نوازی و رعایا پروری کا گلا گھونٹ دیا۔

رات ہوئی اور غزنہ کی آبادی پر سکوت چھانے لگا، مظلوم روزانہ کی طرح اپنے گھر میں تھا کہ وہی ظالم دندناتا ہوا اندر گھس آیا، خشم ناک چہرہ، خونخوار نگاہیں، مجسم گناہوں کی خشونت سے متوحش ہاتھ پکڑ کر صاحب خانہ کو باہر ڈھکیل دیا اور خود اس کی مفلوک الحال بیوی پر ٹوٹ پڑا۔

مظلوم دیدۂ حیراں لیے ہوئے یہ تماشہ دیکھتا رہا، وہ بڑی تیزی کے ساتھ سلطان کی بارگاہ کی طرف لپکا اور اطلاع دی۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنی تلوار سنبھالی اور اس کے ساتھ ہو لیا، جا کے جو دیکھا تو بستر پر دو آدمی دراز محو خواب ہیں۔ اس وقت سلطان کا چہرہ غیظ و جلال سے

سرخ ہو رہا تھا۔ پیشانی کی رگیں ذہنی اذیت سے تنی ہوئی تھیں۔ فوراً حکم دیا، چراغ گل کرو اور دوسرے ہی لمحہ تلوار کا ایک ایسا بھرپور وار کیا کہ سوئے ہوئے لمبے تڑنگے مرد کی گردن جسم سے الگ لڑھک گئی۔ اس وقت سلطان کی زبان سے نکلا: الحمد للہ! پھر پانی مانگا اور صاحب خانہ نے کانپتے ہاتھوں سے پانی کا ایک گلاس سلطان کی خدمت میں پیش کیا، جسے نش کرنے کے بعد سلطان جانے کے لیے کھڑا ہوا۔ مگر صاحب خانہ نے دامن پکڑ کر بڑی لجاجت اور عاجزی سے عرض کیا۔

مظلوم: حضور کا بہت بڑا کرم ہے کہ آپ نے ایک مظلوم کو ظلم کی آگ سے نکالا اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ مگر حضور یہ ظالم کا چہرہ دیکھنے سے قبل چراغ کا گل کرا دینا اور قتل کے بعد پانی پینا، میرے فہم وادراک میں نہ آسکے؟

سلطان: نادان! تو نے پوچھا چراغ گل کرانے کی کیا وجہ تھی۔ سن! میں نے سوچا کہ تم پر ظلم کرنے والا یہ شخص میرا کوئی ایسا قریبی عزیز نہ ہو کہ روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ لینے کے بعد میرے ہاتھوں سے عدل و انصاف کا دامن نہ چھوٹ جائے اور میں اس کے قتل سے باز رہوں۔ کیوں کہ اگر ایسا ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رعایا کی عزت وآبرو خود میرے ہاتھوں پامال ہو رہی ہے۔ بلا واسطہ یا بالواسطہ سہی۔ اس دلیر ظلم رانی کا سبب میری ذات ہے۔ تو بھلا بتاؤ! اگر ایسا ہوتا تو روئے زمین پر مجھ سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوتا کہ گناہ کوئی کرے، ظلم وستم کوئی ڈھائے اور مجرم میں بنوں۔ ؎

کرو مشق ستم تم خون عالم میری گردن پر

یہ سوچ کر میں نے اسے اندھیرے میں اس کے چہرے سے چادر اٹھائی اور قتل کیا۔ اور قتل کے بعد پانی اس لیے پیا کہ جس وقت سے تمہارے اوپر ہونے والے اس جبر وظلم کی یہ داستان میرے کان میں پہنچی تھی، اسی وقت سے میں نے عہد کر لیا تھا کہ ظلم کی اس ٹہنی کو جب تک شاخِ زندگی سے جدا نہ کرلوں گا، افطار نہ کروں گا۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

چغتائی خانوداہ کا اقبال مند شہزادہ تو قلق خاں اپنے خدام سمیت شکار گاہ میں گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ پوری تندہی اور کوشش سے شکار جاری تھا۔ شہزادہ کے ساتھ پورا عملہ مصروف تھا۔ اتنے میں شہزادہ کی نظر فقیروں کی ایک جماعت پر پڑی، جو نہایت بے نیازی سے خراماں خراماں راستہ طے کرتے چلے آرہے تھے۔

خود سری، انانیت اور نخوت کا آبائی خمار، جو اس نسل میں چنگیز وہلاکو سے چلا آرہا تھا۔ شہزادہ کے اندر بھی وافر موجود تھا۔ ان پھٹے حالوں کو اپنے شکار گاہ میں مخل دیکھ کر شہزادہ برس پڑا۔

تم لوگوں نے میرے شکار میں خلل اندازی کی جرأت کیسے کی؟

ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے کہ کسی ممنوعہ قطعۂ زمین میں داخل ہورہے ہیں۔ درویشوں کے سردار نے سادگی سے جواب دیا، تو قلق خان: تم سے تو ایک کتا اچھا ہے۔

درویش: ہاں، یقیناً، ہم کتوں سے بھی بدتر ہوتے، اگر دین حق پر نہ ہوتے۔

خان اس درویش کے جواب سے بہت متاثر ہوا۔ اور حکم دیا کہ اسے حراست میں رکھا جائے اور شکار سے فارغ ہونے کے بعد میرے سامنے پیش کیا جائے۔ شکار کے بعد خان نے درویش سے تنہائی میں تفصیلی گفتگو کی۔

خان نے پوچھا:

دین حق کیا ہے؟ اور اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟

درویش نے جواباً خان کے سامنے اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال کی توضیح کی۔ زبان کے ساتھ جب دل کی وابستگی بھی قائم ہوتی ہے تو بولے جانے والے کلمات فضائوں میں رائیگاں ہونے کے بجائے دل پر منقش ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اسلامی نظامِ زندگی کے پردہ میں دنیا اور آخرت کی کامیابیوں اور سرخروئیوں کی دل افروز داستان اور اسلام وایمان سے برگشتہ رہ کر عذاب وعقاب کا لامتناہی اور ناقابل برداشت سلسلہ، خداترس درویش کے بے لوث کلمات کے ذریعہ تو قلق خان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے لگے۔ اس کے فکر واحساس کی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ خود فراموشی کا آبائی طلسم، جس نے لاکھوں کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرکر کے ظلم و تعدی کی تاریخ میں گھنائونے ابواب کا اضافہ کیا تھا، چکنا چور ہوگیا۔ خان اپنی بہادری، صلابت اور جرأت مندی کی تمام صلاحیتوں کے باوجود، روحانیت در آوش چند جملوں سے شکست کھا چکا تھا۔

اے درویش! تو یقیناً قدرت کے غیبی اشاروں پر چلنے والا انسان ہے۔ ایسا لگتا ہے، زمین و آسمان کے خالق ومالک نے تجھے میری ہدایت اور رہنمائی ہی کے لیے اس طرف بھیج دیا ہے۔ شاید تجھے یہ معلوم نہ ہو کہ میرا تعلق، مغل حکمرانوں کی اس نسل سے ہے، جسے چغتائی کہتے ہیں۔ جو اسلام دشمنی میں اپنی مثال آپ تھا۔ چغتائی دربار میں اسلامی طور پر جانوروں کا ذبیحہ کرنے والوں کے سر تلوار سے اڑا دینے کی سزا

مقرر تھی۔ اس دربار میں کوئی شخص بھی اسلام کا نام سوائے تحقیر کے نہیں لے سکتا تھا۔ مسلمانوں کو اپنے طور پر اس بادشاہ کی حکمرانی میں غسل اور وضو کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ (جوزجانی، ص۳۸۱، ۳۹۷)

اے درویش! خدا کے فرستادہ! میں دل سے تو دین حق کو آج ہی قبول کرتا ہوں۔ مگر سن! اس وقت جب کہ پوری چغتائی سلطنت انتشار کا شکار ہے، عوام سے خواص تک سب اپنے حکمرانوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، میں اپنے اسلام کا برملا اظہار غیر مناسب سمجھتا ہوں۔ تا آنکہ یہ شکستہ حال سلطنت دوبارہ ایک طور پر اکٹھا ہوجائے اور میں حکمت و مصلحت سے تمام ارکانِ دولت، داعیانِ سلطنت کو اسلام کا پیغام پہنچانے کے لائق ہوجاؤں۔

اے درویش! کاش تو مجھے اپنے روئے روشن کی زیارت کا موقع دے۔ اور دعا کر کہ اس وقت تک میں اپنے آباو اجداد کی حکومت کا وارث بن جاؤں۔

درویش خدامست قطعاتِ ارضی طے کرتا ہوا دلوں کے ویرانوں پر ابر رحمت برساتا ہوا اپنے وطن جا پہنچا۔ اور توقلق خان حکومت کے منتشر شیرازہ کو مجتمع کرنے میں مصروف ہوگیا۔

چنگیز کی موت کے بعد چغتائی کو ترکستان کی حکومت ملی تھی۔ قراملا کو چغتائی کے بعد ۱۲۶۴ء میں اس کی حکومت کا دعویدار ہوا، مگر اس کے چچازاد بھائی براق خان نے اسے جلد ہی تخت و تاج سے محروم کردیا۔ چودھویں صدی مسیحی تک ترکستان کے ان حکمرانوں اور عوام میں اسلام سے سخت بیزاری پائی جاتی تھی۔ اور اس وقت تک چغتائی سلطنت کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ توقلق خاں تیمور نے ۱۳۴۷ء میں نہایت محنت وجانفشانی کے بعد دوبارہ سب کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرلیا۔

ایران کے کسی نواحی خطے میں عظیم المرتبت بزرگ شیخ جمال الدین کی شدید علالت کی خبر سن کر گرد و نواح کے مسلمان اور دور دراز کے عقیدت مند شیخ کی آخری ملاقات کے لیے ان کے دولت کدہ پر حاضر ہورہے ہیں۔

درویش صفت شیخ نے آخری ہچکیوں میں اپنے فرزند شیخ شہاب الدین کو وصیت کی:

''بیٹا! ترکستان شاہی خاندان کا خوش بخت شہزادہ توقلق خاں تیمور عنقریب پوری چغتائی سلطنت کا بادشاہ بننے والا ہے۔ جب وہ اپنے تخت و تاج کا مالک بن جائے تو اس کے پاس جانا اور اسے یاد دلانا کہ شکار گاہ میں ملنے والے درویش سے تم نے جو وعدہ کیا تھا، میں تمہیں وہی وعدہ یاد دلانے آیا ہوں۔ بیٹا! یہ میری وصیت ہے۔ جس طرح روحانی ارجمندی کی لازوال دولت تمہیں مجھ سے ورثہ میں ملی ہے اور تم نے اس کی حفاظت کا حق ادا کیا ہے۔ اسی طرح اس فرض کو بھی اپنے ذمہ قرض تصور کرنا''۔

شیخ نے یہ کہا اور چند ہچکیوں کے بعد واصل بحق ہوگئے۔

الله اکبر الله اکبر . . . . . . الله اکبر الله اکبر . . . . . . اشهد ان لا اله الا الله . . . . . . اشهد ان لا اله الا الله . . . . . . اشهد ان محمدا رسول الله . . . . . . اشهد ان محمدا رسول الله

توقلق خان اپنے شاہی خیمے میں آرام کر رہا تھا۔ جوابدار اور فوجی، محافظت پر مامور تھے۔ صبح تڑکے کا وقت تھا۔ ساری رات کے تھکے ماندے محافظین اور بادشاہ میٹھی نیند میں تھے۔ نسیم سحری کے سرمست جھونکے چل رہے تھے۔ ایسے میں کسی نے اللہ کی تکبیر کا غلغلہ بلند کیا۔

اس آواز نے بادشاہ کو چونکا دیا۔ محافظین دوڑ پڑے۔ ہر شخص اس اجنبی آواز پر متعجّب تھا۔ اور اسلامی اذان دینے والے کی جرأت مندی کو غیظ وغضب کے چتون سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آخر یہ کون ہوسکتا ہے؟

اذان پوری بھی نہیں ہوسکی۔ مؤذن کو سپاہیوں نے گرفتار کرلیا اور سختی سے سوال جواب کرنے ہی والے تھے، اتنے میں خان اپنے خیمے سے باہر نکل آیا اور اجنبی مؤذن کو اپنے پاس طلب کرلیا۔

توقلق خان تیمور نے غصہ میں پوچھا: آخر تم کون ہو؟

اجنبی: میرا نام شہاب الدین ہے۔ میں شیخ قطب الدین کا فرزند ہوں۔ اپنے باپ کی وصیت کے مطابق آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانے آیا ہوں، جو آپ نے ان سے شکار گاہ کی ملاقات کے دوران کیا تھا۔

خان: تم نے مجھ تک پہنچنے کے لیے یہ کون سا راستہ اختیار کیا؟

شیخ شہاب الدین: میں کئی روز سے آپ کے دربار تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کر رہا ہوں، مگر کامیاب نہیں ہو پایا، لاچار آج یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔

خان: تخت نشین ہونے کے بعد یہ بات مجھ کو اچھی طرح یاد تھی اور میں بار بار اسے سوچتا تھا۔ مگر جس شخص کا انتظار تھا، وہ تو آیا نہیں۔ بہر حال، اے آنے والے! آ میں تیرا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور اس جاوداں حقیقت کا دل کے ساتھ ساتھ آج زبان سے اعلان بھی کرتا ہوں۔ جو حیاتِ انسانی کے لیے فوز و فلاح کی ضمانت ہے۔

''اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ''۔

بقول ابوالمغازی: اس صبح کو آفتابِ اقبال نے توفیق الٰہی کے اُفق سے طلوع کیا اور کفر کی تاریک رات کافور ہوگئی۔

خان نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے ارکانِ دولت اور اہلِ خاندان میں نہایت بلیغ حکمتوں اور مصلحتوں کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کی اور تمام شہزادوں نے اسلام قبول کرلیا۔

خان نے ایک شہزادہ جراس کے سامنے جب اسلام کی دعوت پیش کی تو اس نے کہا: میں اس آسانی سے اپنے آبائی طریقہ کو چھوڑنے والا نہیں۔ ہاں اگر شیخ ہمارے پہلوان سے کشتی میں کامیاب ہوجائے تو میں اس کے دین کو حق سمجھ کر قبول کرلوں گا۔

جراس کا پہلوان بہت قد آور، دیو پیکر، طاقت ور انسان تھا۔ وہ دو سال کے اونٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بڑی آسانی سے اٹھا لیا کرتا تھا۔

شیخ نے جب یہ شرط سنی تو بے چون وچرا منظور کرلی۔ توقلق خان اور دوسرے معتقدین نے شیخ کو اس بازی سے باز رہنے کی ہر چند فہمائش کی اور کہا: اسلام کی سچائی کو کشتی بازی سے کیا تعلق؟ آپ کشتی نہ لڑیں۔ مگر شیخ نہ مانے اور فرمایا:

''اگر رب تعالیٰ کو مغلوں کی ہدایت کرنا اور انھیں اسلام کرانا منظور ہوگا تو مجھے میرے مقابل پر غالب آنے کی طاقت ضرور عطا فرمائے گا''۔

الغرض یہ کشتی منظور ہوگئی۔ یہ مبارزت دیکھنے کے لیے بہت لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ایک پہلوان سے دوسرے پہلوان کی کشتی تو عام بات ہے، مگر ایک منحنی بدن، پستہ قد، کمزور فقیر کا مقابلہ ایک دیو پیکر کے ساتھ کس نے دیکھا تھا۔

شیخ پہلے ہی سے اکھاڑے میں موجود تھے۔ پہلوان اپنی طاقت اور بہادری پر اتراتا ہوا، حقارت سے شیخ کی طرف آیا اور مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مارنا شروع کیا۔ دو چار ضربوں کے بعد شیخ نے پہلوان کے سینے پر ایک ہاتھ ایسا مارا کہ وہ چکرا کر گر گیا۔ اور کچھ دیر کے بعد لڑکھڑاتا ہوا اٹھا تو شیخ کے قدم پکڑ لیے اور کلمۂ طیبہ پڑھ لیا۔

صرف اس ایک واقعہ کو دیکھ کر اسی دن ایک لاکھ ساٹھ ہزار مغلوں نے اسلام قبول کیا۔ (ابوالغازی، ترجمہ فرانسیسی، ج ۲/ص ۱۶۶۔۱۸۸)

جیسا کہ تاریخوں سے ثابت ہے، مغلوں کی سلطنت چنگیز خان کی موت کے بعد چار حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ اور ہر ایک حصہ میں الگ الگ حکومت قائم ہوگئی تھی۔ ان چاروں میں صرف خاقان، یعنی خانِ اعظم اسلام کی دولت سے محروم رہا۔ باقی تینوں سلطنتیں مشرف باسلام ہوگئیں۔ سب سے پہلے بلادِ روس میں دشت قپچاق کے آلتون اور دو بولنے والے مغل مسلمان ہوئے۔ اس کے بعد ایران کے ایلخانی اور سب سے آخر میں ترکستانی حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

(حاشیہ پریچنگ آف اسلام (اردو) ص ۲۸۸)

فتنۂ رشدی اور مسلمانانِ ہالینڈ

بدنامِ روزگار "سلمان رشدی" کی کتاب "سیطنت ورسیز" کے زہر آلود گستاخانہ تیروں نے مسلمانانِ عالم کے دلوں کو چھلنی کر دیا ہے۔ اس رسوائے زمانہ کتاب اور اس کے مصنف (لعنۃ اللہ علیہ) برطانوی حکومت کی پناہ میں رہ کر دنیا بھر کے مسلمانوں کی دل آزاری پر کمربستہ ہیں۔

ہر طرف سے مسلمانوں کی صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے۔ سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے نوجوانانِ امت تیار ہیں۔ اپنے نبی کی شان اور آن پر مر مٹنا ہی تو ہماری سعادت کا بلند ذریعہ ہے۔ یہ حیاتِ مستعار اگر ان کے ناموس کی حفاظت کے کام آجائے تو اس سے بڑی سربلندی اور کیا ہوگی۔

الحمدللہ! کہ ہالینڈ میں بسنے والے مسلمانوں نے بھی اپنی ایمانی حرارت کا مظاہرہ کیا اور اس شیطانی منصوبہ کے خلاف صف آرا ہو گئے ہیں۔

یکشنبہ ۲۶/ فروری ۱۹۸۹ء کو روڑدم جامع قرطبہ میں راقم الحروف کی صدارت میں مسلم تنظیموں کا ایک اجلاس ہوا، جس میں ۴/ مارچ کو ایک پُرامن احتجاج کے لیے جلوس نکالنے پر سب نے اتفاق کیا اور جلوس کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ قرطبہ کے سکریٹری آغا صاحب نے جلوس کا پرمیشن حاصل کیا اور احباب نے مل کر بینرس اور اشتہارات تیار کر کے تقسیم کیے۔

احتجاجی جلوس ڈین ہیگ:

جمعہ ۳؍ مارچ ڈھائی بجے ڈین ہیگ میں بھی احتجاجی جلوس کا اہتمام کیا گیا۔ ڈین ہیگ چوں کہ ہالینڈ کا دار السلطنت اور صدرِ مقام ہے، پارلیمنٹ ہاؤس، انٹر نیشنل کوٹ آف جسٹس یہیں ہیں۔ اور ممالک غیر کے سفرا بھی یہیں رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں کا جلوس زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔

ٹھیک ڈھائی بجے مسلمان ہولینڈ اسپور (ریلوے اسٹیشن) پر جمع ہوگئے۔ علما اور ائمہ آگے آگے اور مسلمان نعرے لگاتے ہوئے ان کے پیچھے چلے اور سڑک طے کرتے ہوئے درمیانِ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ پولیس نے راستے صاف رکھ کر جلوس کو اپنی منزل یعنی پارلیمنٹ تک جانے کے لیے سہولتیں فراہم کیں اور ساڑھے چار بجے دعائیہ کلمات کے ساتھ پارلیمنٹ کے باہر جلوس اختتام پذیر ہوا۔

چند پُر جوش جوانوں نے وہاں کتاب نذرِ آتش کی۔ اس جلوس میں انٹر نیشنل اور نیشنل ٹی وی، ریڈیو، نیز اخباری نمائندوں نے شرکت کی اور مسلمانوں کے ردعمل معلوم کیے۔ ہالینڈ ٹی وی کے مطابق چار ہزار۔ اور بی بی سی کے مطابق چھ ہزار افراد جلوس میں شامل تھے۔

اسی رات آٹھ بجے اسلامک اکیڈمی ڈین ہیگ میں علمائے اہل سنت کی تشریف آوری ہوئی اور ضرورت کا احساس کرکے سب نے اپنی طرف سے ایک مشترکہ بیان جاری کیا۔ جسے مولانا افتخار علی چشتی خطیب قرطبہ مسجد نے اخباری نمائندوں اور ذرائع ابلاغ کے حوالہ کیا۔ اعلان مندرجہ ذیل ہے:

علمائے ہالینڈ و بلجیم کا اعلامیہ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مندرجہ ذیل علمائے کرام نے سلمان رشدی کی کتاب ''سیٹنک ورسز'' سے پیدا ہونے والے حالات پر غور کرکے اعلان کیا ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں انبیائے کرام علیہم السلام، بالخصوص خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سخت توہین کی ہے۔

بلاشبہ یہ کتاب اسلام کے خلاف ہی ایک خفیہ سازش نہیں، بلکہ تمام ادیان ہی کی توہین ہے۔ حتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، جن کا احترام ہر آسمانی مذہب کا جزو ہے، ان کی بھی توہین کی گئی ہے۔

لہٰذا شریعت اسلامیہ کے مطابق مصنف مرتد واجب القتل ہے۔ ہر ملک میں اس کتاب کی اشاعت، امن وامان کے لیے نقصان دہ ہے۔ ہم حکومت ہالینڈ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک کی پُر امن فضا کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ رکھے اور ملک میں اس کتاب کی اشاعت وفروخت پر پابندی لگائے۔

اس اعلان وبیان کی تحریر پر راقم الحروف کے علاوہ جن علمائے کرام نے دستخط فرمائے۔ ان کے اسما یہ ہیں:

(۱) مولانا سید سعادت علی قادری، بانی القادری اسلامک سینٹر دی ہیگ (۲) مولانا سید عبدالمنان جامعی مدرجامع قرطبہ روٹرڈم (۳) مولانا اسرار الحق صاحب اشرفی خطیب فیض الاسلام دی ہیگ (۴) مولانا افتخار علی چشتی خطیب جامع قرطبہ روٹرڈم (۵) مولانا مہر علی قادری، خطیب نور الاسلام دی ہیگ (۶) مولانا حافظ نعمت علی چشتی، خطیب غوثیہ امسٹرڈم (۷) مولانا قاری حفیظ الرحمن مہناس، خطیب مسجد الکرم امسٹرڈم (۸) مولانا سردار احمد صاحب، خطیب مسجد غوثیہ برسلز بلجیم (۹) مولانا قاری محمد حنیف صاحب، خطیب شانِ اسلام روٹرڈم (۱۰) مولانا قاری نذیر احمد صاحب، خطیب مسجد غوثیہ روٹرڈم سائوتھ۔

احتجاجی جلوس روٹرڈم:

شنبہ ۴؍مارچ۱۹۸۹ء ۱۲؍بجے دن کو روٹرڈم شہر کے مشہور ہال دولن (DEDOELEN) کے پیچھے میدان میں فرزندانِ توحید کا اجتماع ہوا۔ مختلف بینرس اور احتجاجی پوسٹرس کے ساتھ پُرجوش مسلمانوں نے شرکت کی۔ ڈین ہیگ سے ریزروبس کے ذریعہ یہاں کے مندوبین مولانا مہرعلی صاحب اور راقم الحروف کی معیت میں پہنچے اور نعرۂ تکبیر ورسالت کے ساتھ مسلمانوں کے اس انبوہ میں جاملے۔

مولانا سرداراحمد صاحب برسلز نے انگلش زبان میں جلوس کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ اور پھر جلوس روانہ ہوا۔ مختلف بازاروں اور سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہمیں یہ احساس ہوا کہ یورپین لوگ مسلمانوں کی اس احتجاجی مہم کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک گورا نوجوان اس وقت یک بیک سامنے آکھڑا ہوا۔ جب مسلمان جوش وخروش میں رشدی کی موت کا نعرہ لگارہے تھے۔ اس گورے کے شرٹ پر لکھا ہوا تھا ''میں رشدی ہوں'' جلوس میں پُرامن رہنے اور قانون کی حدوں کا لحاظ رکھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس لیے اس سے درگزر کیا گیا۔ اور جلوس اپنے متعیّنہ راستے طے کرکے منزلِ مقصود پر جاکر تمام ہوا۔ دورانِ جلوس کئی اور لوگوں نے مسلمانوں سے الجھنے کی کوشش کی اور اخباری نمائندوں نے لوگوں کی زبان سے قانون شکن باتیں کہلوانے کی سعی کی۔

مغرب کے اسلام دشمن عناصر کی فکری گندگی کو اپنے بارہ سالہ قیامِ یورپ کے دور میں پہلی بار مجھے اب دیکھنے کا موقع ملا، جب بدنام روزگار ناول نگار رشدی کی کتاب ''سیطنک ورسیز'' طوفانِ بدتمیزی بن کر اٹھی اور یورپین ممالک کے اربابِ کلیسا سے لے کر سیاست دانوں تک سب کے سب سلمان رشدی کی پشت پناہی کرنے لگے۔ ایک ہندوستانی ہونے کے لحاظ سے میں نہایت فخر سے کہا کرتا تھا کہ اس کتاب پر سب سے پہلے ہندوستان میں پابندی لگائی گئی۔ مگر بمبئی کے احتجاجی جلوس پر پولیس کی فائرنگ اور مسلمانوں کا کھلے بندوں قلت، ہندوستان میں مسلم دشمنی طاقتوں کا پولیس میں موجود ہونا صاف بتا رہا ہے۔ کم ازکم بیس مسلمانوں کا اس سلسلہ میں سرزمین بمبئی پر یہ خونِ ناحق ہندوستانی حکومت کے سر پر ہے۔ جن کے لیے حکومت جواب دہ ہے۔

سلمان رشدی کے اٹھائے ہوئے اس فتنۂ عظیمہ کے باعث یورپ اور امریکہ میں آباد مسلمانوں کا سکھ چین غارت ہوگیا ہے۔ جلسوں، جلوسوں، کنونشن اور اخباری بیانات کے اثرات نے ابھی تک برطانیہ میں بھی کتاب پر پابندی نہیں لگوائی۔ برطانیہ سے چل کر یہ آگ تمام مغربی یورپی ملکوں تک پہنچی اور ہر ملک میں ''سیطنک ورسیز'' بکنے لگی اور ترجمے ہونے لگے۔ چند ایک ملکوں نے مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنے یہاں اسے ممنوع قرار دیا۔ جس میں ہندوپاک وغیرہ کے بعد کنیڈا کا نام آتا ہے۔

ایکشن کمیٹی:

ہالینڈ میں آباد مسلمانوں نے جلسہ وجلوس کے علاوہ اس سلسلہ میں اور بھی کارروائیاں شروع کررکھی ہیں۔ جو ہم قارئین کو گوش گزار کرنا چاہتے ہیں:

(ا)......ایک ایکشن کمیٹی ترتیب دی گئی، جس کی رہنمائی ڈچ نومسلم عالم عبدالواحد خان بومل کررہے ہیں۔

اس کمیٹی نے حکومتی ذمہ داروں سے گفت وشنید کا سلسلہ شروع کیا، تاکہ کتاب کی فروخت اور اس کا ترجمہ اس ملک میں ممنوع قرار دے دیا جائے۔

(۲)......ایکشن کمیٹی میں شامل ورلڈ اسلامک مشن کے نمائندوں نے ہالینڈ کورٹ میں اس کتاب کے خلاف مقدمہ دائر کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کی کہ اس کے مندرجات سے ہالینڈ کے چار لاکھ مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ اس لیے اس پر پابندی لگائی جائے۔

(۳)...... ساتھ ہی ساتھ ایکشن کمیٹی نے اپنی یہ پالیسی رکھی کہ ہم لوگ کوئی احتجاجی جلوس نہیں نکالیں گے، بلکہ ممکنہ ذرائع سے مسلمانوں میں اگر اشتعال آئے تو اسے فرو کرنے کی کوشش کریں گے۔

سوبار کر چکا ہے:

دنیا بھر میں مسلمانوں کے احتجاجی جلسے اور جلوس ہو رہے ہیں اور خاص طور سے یورپ اور امریکہ کے مسلمان باشندے اپنا پورا زور صرف کر رہے ہیں کہ اس گندی تحریر کو پابند کیا جائے۔ مگر یورپی ملکوں کے اربابِ سیاست اب تک معاملہ کی نزاکت کو محسوس نہیں کر پا رہے ہیں۔ خدانخواستہ اگر کتاب کی پابندی میں دیر کے باعث مسلمانوں کا جذبۂ تحفظِ ناموسِ رسالت عود کر آیا تو پھر بدامنی برپا کرنے کا الزام مسلمانوں کے بجائے حکومتوں پر عائد ہو گا۔ کیوں کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا جذبۂ دینی اس وقت چیخ چیخ کر یہی کہہ رہا ہے۔ ؎

باطل سے ڈرنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

مئو کی تاریخ اسلامی

مئوناتھ بھنجن (جہاں آباد) جسے ۱۹/ نومبر ۱۹۸۸ء ضلع بنا دیا گیا۔ پہلے مسلم آبادی کا قدیم قصبہ تھا، جو ضلع اعظم گڑھ کا حصہ تھا، محل وقوع اعظم گڑھ سے ۴۸/ کلومیٹر جانب مشرق واقع ہے۔ جس کی موجودہ مسلم آبادی تقریباً ۸۵/ ہزار بتائی جاتی ہے۔

مئو کی آبادی کتنی قدیم ہے، اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اس بستی میں اسلام اور مسلمانوں کے قدم کب آئے، یہ معلوم ہے۔ حضرت سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) کے جواں سال عارف باللہ بھانجے، غزنوی افواج مجاہدین کے امیر لشکر سالار ہوئے فرزند ارجمند حضرت سید سالار مسعود غازی (شہادت ۴۲۴ھ/۱۰۳۳ء) نے بہرائچ شریف جاتے ہوئے اپنے رفقائے مجاہدین میں سے ایک جماعت کو شاہ ملک طاہر علیہ الرحمہ کی سرکردگی میں مشرقی یوپی کی طرف روانہ فرمایا۔ انھیں مقدس مجاہدین کے قدموں کی برکتیں ضلع اعظم گڑھ اور اس کے اطراف میں اسلام کی پہلی کرن ثابت ہوئے۔ اور آپ پورے ضلع اعظم گڑھ اور ضلع مئو کا غائر نظر سے سروے کریں تو ایک دو نہیں، کئی سو ایسے شہدا کی قبریں اور کہیں کہیں گنج شہیداں ملیں گے، جن کی کرامت و جلالت صدیاں گزر جانے کے بعد بھی دلوں میں حکمرانی کر رہی ہیں۔ اور مسلمان تو مسلمان غیر مسلم اہل وطن بھی ان کا احترام کرتے ہیں۔

شاہ ملک طاہر اپنے چند بھائیوں اور رفیقوں کے ساتھ مئو میں وارد ہوئے تو وہاں ان کا مقابلہ ایک خود سر حکمراں نٹ بھنجن سے ہوا۔ آبادی کے باشندے نٹ بھنجن کے ظلم وستم سے عاجز تھے۔ حضرت سید سالار مسعود غازی علیہ الرحمہ کی فوج کے یہ مجاہدین ان مظلوموں کے دادرَس ثابت ہوئے۔ مقابلہ ہوا اور بھنجن کی ظالم جماعت کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہ ملک طاہر، ان کے بھائیوں اور فرزندوں کے ذریعہ مئو اور اس کے اطراف میں اسلام کی تبلیغ ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ نٹ بھنجن کی شکست اور موت کا واقعہ اہل آبادی کے لیے نہایت اہم بات تھی۔ اسی لحاظ سے آبادی کا نام "موانٹ بھنجن" ہو گیا۔ جو اَب بگڑتے بنتے "مئوناتھ بھنجن" بنا ہوا ہے۔

قصبہ مئو کے مشرقی حصہ میں شاہ ملک طاہر علیہ الرحمۃ والرضوان کا روضۂ مبارک موجود ہے۔ اس محلہ کا نام آپ ہی کے نام پر "محلہ ملک طاہر پوری" اور "روضہ" سے مشہور ہے۔ آپ کے بھائی ملک قاسم کے نام پر اس سے متّصل دوسرا محلہ "قاسم پورہ" ہے۔ جو بہت وسیع ہونے کی وجہ سے "قاسم پورہ ہفت پورہ" کہلاتا ہے۔

مئو عہد مغلیہ میں شاہجہاں بادشاہ کی شہزادی جہاں آرا کی جاگیر تھا۔ اس شہزادی نے شمالی ہند کے اس قصبہ میں نور بافی کے ممتاز فنکاروں اور ہنرمندوں کو دور دور سے بلا کر یہاں جمع کیا تھا۔ اسی دور سے یہ قصبہ کپڑے بننے کا عظیم مرکز مانا جاتا ہے۔ اور یہاں کی مصنوعات ہندوستان بھر میں عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

پورے مئو میں اس وقت دو سو مساجد اور چھوٹے بڑے ۲۵/ سے زائد مدارس ہیں۔ ہندوستان اور اکثر عالم اسلام کی طرح مئو بھی تیرہویں صدی تک مسلمانانِ اہل سنت سے معمور تھا۔ اور یہاں بھی ہر شہر، قصبہ اور بستی کی طرح مسلمانانِ اہل سنت متحد و متفق زندگی گزارتے

تھے۔ انگریزوں کی پیدا کردہ وہابی تحریک کے اثرات نے اس قصبہ کو بُری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اب یہاں وہابیت اور دیوبندیت دونوں زوروں پر ہیں۔ ایک وہابی قلم کار معترف ہے کہ تیرہویں صدی تک یہاں مسلمانانِ اہل سنت ہی رہتے تھے، جس کے گواہ ملک طاہر بابا کا روضہ، اس کے ارد گرد پختہ قبریں وغیرہ ہیں۔ قلمکار لکھتا ہے:

”اگرچہ بعد کے اہل علم خصوصاً سلفی علما کی کوششوں سے اکثر ’صنم کدوں‘‘ کی بہاریں داستانِ پارینہ بن چکی ہیں۔ لیکن اب ’’جس جگہ کہ داغ ہے وہاں پہلے درد تھا‘‘۔ کے مصداق ان سنسان صنم کدوں میں پہلے بڑی چہل پہل رہا کرتی رہی ہوگی‘‘۔

(تذکرہ مولانا محمد احمد ناظم صاحب۔ از محفوظ الرحمن فیضی، ص ۲۰۔۲۱ر مطبوعہ مئو)

بقول سوانح نگار صاحب سوانح کے والد اور چچا مشہور غیر مقلد مبلغین ملا حسام الدین مئوی وحافظ عبداللہ مئوی غازی پوری کی تبلیغ سے اہل حدیث ہوئے تھے۔ یعنی ان سے قبل سب اجداد سنی ہی تھے۔ (ص ۵۰)

حضرت شاہ طاہر علیہ الرحمہ کو یہی قلم کار پہلے ملکوتی صفات کا مالک وداعی اور مبلغ اسلام لکھ چکا ہے۔ (ص ۱۸)

بعد میں انھیں کے روضۂ مبارک کو صنم کدہ لکھ رہا ہے۔ ؎

خدا جب دین لیتا ہے تو عقلیں چھین لیتا ہے

ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد

سرزمین ہند پر اسلام اور مسلمانوں کی آمد، عام طور پر مشہور اسلامی سپہ سالار حضرت محمد بن قاسم ثقفی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری کے وقت سے خیال کی جاتی ہے۔ جب انھوں نے حجاج بن یوسف کے حکم سے ۹۳ھ /۷۱۱ء میں سندھ کے قزاقوں کے ہاتھ گرفتار ہوجانے والی مسلم خواتین کی داد رسی کرتے ہوئے اس علاقہ میں قدم رکھا۔ اور راجہ واہد کو شکست دے کر اسلامی حکومت قائم کی۔

اور بعض مؤرخین تو ہندوستان میں باقاعدہ سلاطین غزنی کی وسیع ترین مسلم حکومت کے قیام سے مسلمانوں کی آمد کو شمار کرتے ہیں۔ جو ۳۶۷ھ/۹۷۷ء سے ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء تک رہی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سرزمین ہند پر مسلمانوں کے قدم اس سے بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔

موجودہ مؤرخین میں جناب قاضی اطہر مبارک پوری نے اس موضوع کے نئے نئے گوشے اجاگر کیے ہیں۔ اور ثابت کیا ہے کہ خلافتِ فاروقی کے ابتدائی دور میں حضرت عثمان ابن ابی العاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو بحرین کے والی تھے، اپنے بھائی حکم بن ابی العاص ثقفی کو تھانہ اور بھروچ کی مہم پر روانہ کیا تھا۔ مؤرخ موصوف نے فتوح البلدان، ص ۴۲۰۔ معجم البلدان، ج ۳ر ص ۴۸۱۔ جمہرۃ انساب العرب، ص ۲۶۶۔ اور تاریخ ابن خلدون، ج ۲ر ص ۱۲۴ر کے قیمتی اشتہارات کے ان ثقفی بزرگوں کے ذریعہ سندان، تھانہ اور بھڑوچ پر ۱۵ھ میں مجاہدین اسلام کا آنا ثابت کیا ہے۔

عرب تجار اور ہندوستان:

خدائے حکیم و قدیر نے اپنے آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مبعوث کرنے کے لیے سرزمین عرب کا انتخاب فرمایا۔ قومِ عرب نہایت جفاکش، باہمت، جری، بہادر، تاجر اور سیاح تھی۔ اسلامی کے آفاقی پیغام کی ذمہ داریاں اور قرآن عظیم کی حیات آفریں تعلیمات نے ان کے فطری جوہر کو جلا دی۔ پھر تو خشک زمین کی پشت اور سطحِ سمندر کو روندتے ہوئے تمام دنیا کے گوشوں تک پہنچنا ان کا معمول بن گیا۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اور تبلیغ و جہاد ان کا فریضہ۔

عربوں نے دنیا کے بڑے بڑے ملکوں سے سمندری راستوں کے ذریعے روابط قائم کر رکھے تھے۔ ہندوستان کے ساتھ ان کی وابستگی بحر ہند کے ذریعہ تھی۔ ایران کا ایک حصہ دریائی راستوں ہی کے ذریعہ ان سے ملتا تھا۔ حبش کا سفر عرب تجار سمندری راہوں سے کرتے تھے۔

چینی مصنوعات لانے کے لیے عربوں کے جہاز بحر ہند پار کر کے بحر چین کا سفر کیا کرتے تھے۔ اور وہاں کے مال لاکر ہندوستان کی مختلف بندر گاہوں پر اتارتے تھے۔ اور بحر روم طے کر کے روم تک کے علاقوں میں پہنچاتے تھے۔ اس کے لیے وہ شام سے بحر روم کا بحری سفر کیا کرتے تھے۔ بحرین، عمان، حضر موت، یہ سب عرب کے سرسبز و شاداب ساحل تھے، جہاں سے چل کر عربی بیڑے ایک طرف بحر ظلمات تک اور دوسری طرف بحر ہند اور بحر چین تک پہنچتے تھے۔

بصرہ اور سیراف سے بحر ہند کے جزیروں میں ہوتے ہوئے حدودِ چین تک عربوں کی جہاز رانی صدیوں تک اس کثرت سے ہوتی رہی کہ ان کے بعض جزائر میں اہل عرب کی مستقل آبادیاں قائم ہوگئی تھیں۔ مالدیپ سے جاوا اور سماٹرا اور اس کے آگے فلپائن تک اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے پودے عرب تاجروں ہی نے لگائے۔

عرب تاجر ہندوستان کی جن بندر گاہوں سے گزرتے تھے، ان کا حال ''عربوں کی جہاز رانی'' میں اس طرح لکھا ہے:

''وہ خلیج فارس کے فارسی ساحل سے ہوکر خشبات آتے تھے۔ پھر بلوچستان کے بندر گاہ نیز میں داخل ہوتے تھے۔ پھر سندھ کے بندر گاہ ٹھٹھ میں۔ پھر گجرات اور کاٹھیاواڑ کے بندر گاہوں میں سے تھانہ، کھمبایت، سوبارہ، چیمور، بھڑوچ، بھاڑ بھوت، گندھار، گھوگھا اور لہہ کو سورت میں۔ پھر مدراس کے علاقہ میں ملیبار، کارومنڈل، راس کماری، کولم، منگلور، چالیات، پنڈارانی، چنداپور، ہنور، دہ پٹن، کالی کوٹ مدراس سے ہوکر خلیج بنگال میں داخل ہوتے تھے''۔

دورِ فاروقی میں حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی کی مہمات کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں تھیں۔ عربوں کی تجارتی نقل و حرکت اور بحری راہوں سے ان کی متواتر آمد و رفت اور تجارتی سفروں کی معلومات کے سہارے ہندوستان میں جگہ جگہ ان کی آباد کاری، گویا پہلی صدی ہجری کے اندر ہی ہوگئی تھی۔ جن میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ بعض علاقوں میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوگئیں۔

عرب تجار، بازارِ ہند و سندھ کی رونق:

عربوں کی بحری معلومات اور سمندری راستوں سے ان کی تجارت کے بارے میں انگریز مؤرخ پروفیسر آرنلڈ سعودی کے حوالے سے اپنی کتاب ''دی پریچنگ آف اسلام'' میں لکھتا ہے:

''اس زمانے (نویں صدی عیسوی کے بعد) میں سندھ ہند اور دنیا کے باقی ملکوں کی باہمی تجارت کا سلسلہ عرب تاجروں کے ہی دم سے قائم تھا۔ وہ چین اور لنکا کی پیداوار سندھ کی بندر گاہوں میں لاتے تھے اور وہاں سے براہِ ملتان، ترکستان اور خراسان میں لے جاتے تھے''۔

عرب تجار ہندوستان کے تمام جنوبی سواحل سے اپنے کاروبار کرتے تھے۔ اور اسی آمد و رفت نے ان کے دین اور پیغام کو ان علاقوں کے لوگوں تک پہنچایا۔ ہندوستان باسیوں کو ان تاجروں کے ذریعہ دور دراز ممالک کی اشیا بھی میسر آئی تھی اور ان کے پختہ کردار، عہد و پیمان پر مر مٹنے کی عادت، انسانی اخوت و مساوات اور سب سے بڑھ کر ہر حال میں خدائے ذوالجلال کا خوف اور تقویٰ، عبادت و ریاضت اور ساری زندگی، ہندوستانیوں کے لیے ان کی درآمدات سے زیادہ عجیب تھیں۔ جنھوں نے عوام و خواص سب پر اثر ڈالا اور ہندوستانی راجائوں اور باشندوں نے ان کے قدموں کو اپنی سرزمین کے لیے باعث برکت سمجھ کر انھیں گلے سے لگایا۔

پروفیسر آرنلڈ لکھتا ہے:

”دسویں اور بارہویں صدی عیسوی کے عربی جغرافیہ نگاروں (اصطخری اور ابن حوقل وغیرہ) نے ساحل ہند اور اندرونی ملک کے بہت سے ایسے شہروں کے نام لکھے ہیں، جہاں مسلمانوں نے اپنی مسجدیں بنا رکھی تھیں اور وہ مقامی راجائوں کی حفاظت اور سرپرستی میں رہتے تھے۔ اور ان راجائوں نے ان کو ان کی شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت دے رکھی تھی“۔

گجرات اور سندھ یہ دونوں علاقے عرب تاجروں کے مرکز تھے۔ مسعودی کے ورودِ ہند کے زمانے (۳۰۳ھ) میں گجرات کے بندر گاہ چیمور میں دس ہزار عرب اور عرب نژاد مخلوط النسل آباد تھے۔ اسی طرح کھمبایت میں ان کی آبادی تھی۔ بھڑوچ میں وہ نیل کی تجارت کے لیے قیام کرتے تھے۔ مدراس کی چٹائیاں لے جاکر مصر میں فروخت کیا کرتے تھے۔

گویا سطحِ سمندر ان کے قدموں تلے ہوتی اور وہ اپنے بلند عزائم اور اپنی ایمانی و قرآنی مشعل کے سہارے بلا خوف و خطر اس میں اپنے سفینے دوڑاتے رہتے۔ وہ جہاں جاتے اپنے اخلاق و آئین کی روشنی ساتھ لے جاتے۔ ہندوستان جیسے متوہم ملک میں ان کے ذریعہ توحید و رسالت کا تعارف ہوا۔ ان کے پختہ کردار اور ان ہی ہمدردی کے اسلامی قوانین۔ اور روئے زمین پر فروغ پائی ہوئی اسلامی تہذیب نے اہل ہند کو بھی اس جانب متوجہ کیا۔ ہزاروں قلوب میں ایمانی شمعیں جگمگا اٹھیں اور زمین کا یہ گوشہ بھی مسلمانوں سے معمور ہو گیا۔

ہندوستانی خطوں میں عربوں کی حکمرانی:

فاتح ہند حضرت محمد ابن قاسم کے ہاتھوں سندھ کی تسخیر سے ہندوستان میں مسلمانوں کی قابل ذکر تاریخ کی ابتدا ہوئی۔ سندھ کی فتوحات اور ان کے زمانۂ قیام (۹۶ھ) تک اس علاقہ میں اسلام کا شاندار تعارف ہوا۔ اس نوجوان امیر نے اپنے پاکیزہ کردار اور اعلیٰ اخلاق کے ذریعہ اس سرزمین کے لوگوں پر ایسے گہرے نقوش چھوڑے کہ اس کی موت پر ہندوستانیوں کا دل خون کے آنسو رویا۔ قدر داں ہندو رعایا نے اپنے طریقہ کے مطابق اس کی شاندار یادگار قائم کی۔

”اہل ہند محمد بن قاسم کی موت پر بہت روئے اور انھوں نے کیرج (ایک مقام) میں ان کا مجسمہ بنا کر یادگار قائم کی“۔

آگے چل کر تیسری صدی ہجری میں جہاں عظیم اسلامی فتوحات ہو رہی تھیں، وہیں عالم اسلام میں الگ الگ حکومتیں قائم ہو رہی تھیں۔ علاقہ کے حکام خود مختاری کا اعلان کر رہے تھے۔ عباسی خلفا برائے نام خلیفہ تھے۔ ان کی با اثر خلافت محدود حلقوں تک رہ گئی تھی۔ اس وقت قدیم ہندوستان کے نقشہ پر پانچ خود مختار مسلمانوں کی ریاستیں موجود تھیں۔ جہاں بنو عباس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا:

{ا}...دولت ماہانہ

سنجان (ہند)

از ۱۹۸ھ تا ۲۲۷ھ

مدت حکومت تقریباً ۳۰/ سال

{۲}... دولت ہباریہ

منصورہ (سندھ)

از ۲۴۷ھ تا ۴۱۶ھ

مدت حکومت تقریباً ۱۷۰/ سال

{۳}... دولت سامیہ

ملتان (پنجاب)

۲۸۰ھ تا ۳۶۰ـ۳۷۰ھ

مدت حکومت تقریباً ۷۵/ سال

{۴}... دولت معدنیہ

تیز (مکران)

۳۴۰ھ تا ۴۷۱ھ

مدت حکومت تقریباً ۱۲۰/ سال

{۵}... دولت متغلبیہ

قصدار (طوران)

۳۴۰ھ تا ۴۷۱ھ

مدت حکومت تقریباً ۱۳۰/ سال

ان حکومتوں کے ماتحت لوگ نہایت آرام و سکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ معاشرے کی بُرائیاں ڈھل گئی تھیں۔ سب کے ساتھ انصاف وعدل کا برتائو ہوتا تھا۔ ان سے پہلے حکمرانوں کے دور میں رعایا پر جو ظلم اور زیادتیاں ہوتی تھیں، لوگ ان سے نجات پاکر مطمئن تھے۔

ایک بدظنی:

مغربی مؤرخین کے لیے یہ نہایت حیرت ناک بات ہے کہ سیاسی لحاظ سے مسلمانوں میں سخت کشاکش ہونے کے باوجود اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کے کاموں میں برابر ترقی ہوتی رہی۔

ان مؤرخین اور مستشرقین کا یہ مزعومہ ہے کہ اسلام، حکومت اور سیاست کی طاقت سے ترقی پذیر ہوا۔ حالاں کہ یہ بات غلط ہے۔ مسلمانوں نے فتوحات کیں اور ممالک زیرنگیں کیے، مگر ان کے سیاسی اقتدار نے کبھی جبراً مسلمان بنانے کی راہ اختیار نہیں کی۔ دعوتِ اسلام کا ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ جہاں لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچانا اور اسلام کی تعلیمات سے لوگوں کو روشناس کرانا، بہت بڑا کارِ ثواب ہے۔ وہیں دوسری طرف قبولیتِ اسلام کے لیے کسی پر جبروہ واکراہ اور زبردستی کرنا، اصولِ قرآن کے منافی ہے۔ کیوں کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: ''لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ'' (دین میں کوئی زبردستی نہیں)

اور تبلیغ و اشاعت اسلام میں زبردستی جب رب تعالیٰ کو ناپسند ہے، تو ایسا ناپسندیدہ کام کر کے کوئی اسلامی مبلغ اجر و ثواب کا مستحق کیسے بن سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے عبث کام کا الزام، سلاطین اسلام اور مسلم حکمرانوں پر لگانا اسلام دشمن عناصر کی اپج ہے، جس کا نہ تو کوئی تاریخی ثبوت ہے، نہ عقلی۔

اس بات کے مزید ثبوت ہم آئندہ سطور میں پیش کریں گے۔ فی الحال قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں:

مسیحی مؤرخ (پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ) نہایت کرب اور تکلف سے اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ نویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں خلافت بغداد متعدّد مشکلات میں مبتلا ہوگئی تھی اور بہت سے دور دراز علاقے خود سر ہو کر باغی بھی ہو گئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

''لیکن اپنے سیاسی انحطاط کے زمانے میں بھی اسلام تبلیغی میدان میں فتوحات حاصل کرتا رہا۔ چنانچہ مؤرخ بلاذری نے حسب ذیل قصہ عسیفان کے راجہ کے قبولِ اسلام کے متعلق لکھا ہے۔ بقول بلاذری عسیفان کشمیر، ملتان اور کابل کے درمیان واقع تھا۔

یہاں کے باشندے ایک بت کو پوجتے تھے اور انھوں نے اس کے لیے ایک مندر تعمیر کر رکھا تھا۔ اتفاقاً راجہ کا بیٹا بیمار ہو گیا، راجہ نے مندر کے پروہتوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے دیوتا کے حضور میں اس کے بیٹے کی شفایابی کے لیے دعا کریں۔ وہ پروہت کچھ عرصہ کے لیے چلے گئے اور پھر واپس آکر انھوں نے راجہ سے کہا کہ ہم نے اپنے دیوتا سے دعا کی ہے اور اس نے ہماری دعا کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ راجہ کا بیٹا مر گیا، اس پر راجہ بہت برہم ہوا۔ بالآخر اس نے مسلمان تاجروں کی ایک جماعت کو بلا کر ان کے سامنے کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان ہو گیا''۔

یہ اسلام کی صداقت اور اس کے دین صادق کی صاف شفاف تعلیمات کی برکتیں تھیں کہ سیاسی انتشار اور حکومتی کمزوریوں کے باوجود یہ شجر رحمت پھلتا پھولتا، ترقی کرتا رہا۔ مسلمانوں کی مرکزی حکومتوں کی کمزوری کے دور میں بھی اسلام کی اشاعت و قبولیت کا دائرہ وسیع ہوتا رہا۔

مقدسی بشاری کا بیان:

''احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم'' مشہور عرب سیاح مقدسی (ابو عبداللہ محمد شہاب الدین مقدسی البشاری) کی تصنیف ہے۔ جو چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کی مسلم دنیا کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس عرب سیاح نے اس دور کی مسلم دنیا کی سیاحت کر کے وہاں کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ مقدسی ہندوستان بھی آئے تھے اور انھوں نے اس سندھ کے چھ حصوں مکران، طوران، سندھ،

دلیہند، قنوج اور ملتان کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر سیاح موصوف کی تحریروں سے اس دور کی اسلامی تبلیغی خدمات پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی۔ منصورہ (صدر مقام سندھ) کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ:

''سندھ کا صدر مقام، رقبہ میں دمشق کے برابر ہے۔ عمارتیں مٹی اور لکڑی کی ہیں، لیکن جامع مسجد پتھر اور اینٹ کی ہے۔ کافی بڑی عمارت ہے۔ عمان (صحار) کی جامع مسجد کی طرح اس کے ستون ساگون کے ہیں۔ باشندے خوش سلیقہ، بامروت، ذہین، ہوشیار، مخیر، خلیق اور نرم خو ہیں۔ شعائر اسلام کے خوب پابند ہیں۔ علم کا خوب چرچا ہے۔ ہندو چھائے ہوئے ہیں۔ شہر کے بیرونی حصے اجاڑ ہیں۔ اکابر اور بڑے لوگوں کی بھی کمی ہے''۔

قنوج کے ذکر میں ہے کہ:

''جامع مسجد کی بیرونی آبادی (ربض) میں ہے۔ دریا شہر سے ہوکر گزرتا ہے۔ شہر میں عالم اور داعیان و اکابر موجود ہیں''۔

پروفیسر خورشید احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''مقدسی نے جب قنوج کا سفر کیا، اس وقت قنوج گرجارا پرتیہارا سلاطین کے ماتحت تھا۔ اس خاندان کی حکومت، کرنال سے بہار اور کاٹھیاواڑ سے شمالی بنگال تک وسیع تھی۔ اور اس وقت وہاں سلطان راجبالہ حکومت کرتا تھا''۔

ابن رستہ (تیسری صدی ہجری، مطابق نویں صدی عیسوی) رقم طراز ہے کہ:

''جب تجارت کے لیے قنوج جاتے ہیں۔ یہاں کا سلطان ان کی آئو بھگت کرتا ہے اور سامان خریدتا ہے۔ نیز یہ کہ اس کی عمل داری میں چوری ڈکیتی نہیں ہوتی''۔

مقدسی ملتان کے ذکر میں لکھتا ہے:

''یہاں جسم فروشی نہیں ہوتی، نہ شراب پی جاتی ہے۔ جو ایسا کرتا پکڑا جائے، اسے قتل کردیا جاتا ہے، یا حد لگائی جاتی ہے۔ دوکاندار جھوٹ نہیں بولتے، نہ دھوکہ دیتے ہیں، نہ ڈنڈی مارتے ہیں، نہ کم ناپتے ہیں۔ ضرورت وآرام کی چیزیں فراواں ہیں۔ تجارت ترقی پر ہے۔ خوش حالی کے آثار نمایاں ہے۔ پانی سے بھرپور ایک نہر کا پانی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں کے بادشاہ منصف ہیں۔ بازاروں میں بنی سنوری عورتیں نہیں نظر آئیں گی، نہ کوئی مرد کسی عورت سے برملا باتیں کرتا دیکھا جائے گا۔ پانی خوش گوار ہے اور زندگی پُر لطف۔ باشندے جو بیشتر عرب نسل کے ہیں، پردیسیوں کی آئو بھگت کرتے ہیں''۔

باب ششم: شخصیات

فضل رحمان علیہ الرحمۃ والرضوان (۱۲۰۸ھ تا ۱۳۱۳ھ)

خدائے تعالٰی کی محبت کا دیا جن دلوں کو اپنی تابانی بخشتا ہے، وہ بڑے خوش نصیب اور بخت یاور ہیں۔ جو نگاہیں حسن حقیقی کے جلووں سے لذت یاب ہوجاتی ہیں، انھیں دنیا ومافیہا کی کوئی خوبی ریجھا نہیں سکتی۔ حسن وکمال کا خالق ومالک کہاں اور مخلوق کے عارضی، فانی اور محدود کمالات کہاں؟ کسی عارف نے ہندوستانی پوربی زبان کے اس دوہے کو اپنی زندگی کا ترجمان بنایا ہے۔ ؎

کجرا دیوں تو کر کرائے سرمہ دیو نہ جائے

جن نینن ما پیو بسیں دوجے کون سمائے

اس وقت ہم اپنے نوکِ قلم کو جس ذات والا کے ذکر سے شرف کرنا چاہتے ہیں، وہ ہیں ہندوستان کے شمالی خطہ گنج مرادآباد ضلع اناؤ یوپی کے مشہور بزرگ، عالم ربانی حضرت مولانا فضل رحمن علیہ الرحمہ۔ پاک بازانِ محبت کے طریق واطوار خود شفاف اور صیقل شدہ آئینہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مذہب اسلام کے احوال ومبادی یقیناً قرآن وسنت کے بسیط ذخائر ہیں۔ مگر چلتا پھرتا اسلام تو اہل اللہ، اولیائے اسلام، علمائے دین میں نظر آتا ہے۔ اور اس سے سہل ترین راستہ، اسلام کی تفہیم کے لیے ممکن بھی نہیں ہے کہ خدا ناآشنا کو اللہ کے کسی دوست سے ملا دیا جائے۔ ؎

صحبت مرداں اگر یک ساعتست

بہتر از صد خلوت وصد طاعتست

ایک بار حضرت مولانا کی خدمت میں قرآن مقدس کی آیت کریمہ ''فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ'' پر گفتگو ہو رہی تھی۔ آپ نے اس آیت کریمہ کا دل میں اتر جانے والا ترجمہ سادی اور پُر محبت زبان میں یوں فرمایا:

''ہماری چال چلو تو پیار کرے گا اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو''۔

حضرت مولانا کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کی ولادت ۱۲۰۸ھ ملاواں ضلع ہردوئی میں ہوئی۔ اس سرزمین کو آپ سے بہت پہلے آپ کے مورثِ اعلیٰ حضرت شیخ محمد مصباح العاشقین کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوچکا تھا۔ حضرت مولانا کے والد حضرت شیخ اہل اللہ شادی کے بعد اٹھارہ سال تک اولادِ نرینہ کی خواہش میں مضطرب رہے، بالآخر اپنے پیر ومرشد حضرت مولانا شاہ عبد الرحمن لکھنوی کی زبان سے انھیں اولادِ نرینہ کی بشارت ملی۔ شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ ''یہ فرزند علم وعمل میں ایک آفتاب ہوگا، جس کی کرنیں شرق تا غرب پھیلیں گی''۔ اور انھوں نے ''فضل الرحمن'' تاریخی نام تجویز فرمایا۔

رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو آپ پیدا ہوئے۔ آپ نے تین دن تک مطلق دودھ نہیں پیا۔ آپ کا بچپن لہو ولعب کی عام بچکانہ روش سے الگ تھلگ تھا۔ سنجیدگی، طمانیت کا غلبہ مزاج پر شروع سے تھا۔ بچپن میں بھی بعض اوقات آپ کی زبان سے ایسی حیران کن باتیں نکل

جاتیں کہ سننے والے ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے۔ مؤدب، صاف ستھرے، کم گو اور نہایت شیریں لہجے میں نام پاک ''اللہ'' کا ذکر کرتے۔ غربت و تنگ دستی کے ماحول میں اپنا لڑکپن گزارا، مگر کبھی اس کا شکوہ کرنے کے لیے زبان نہ کھولی، بلکہ تقدیرِ الٰہی پر صابر و شاکر رہے۔

ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی اور پھر لکھنؤ میں مولانا نورالحق بن علامہ انوار الحق فرنگی محلی سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا حسن علی لکھنوی کے ساتھ دہلی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی درس گاہ میں پہنچ کر ان سے اور علامہ محمد اسحاق دہلوی سے صحاحِ ستہ کی تکمیل کی اور وطن واپس آ گئے۔ دہلی کا دوسرا سفر آپ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے وصال ۱۲۳۹ھ کے بعد فرمایا۔

علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد روح کی تشنگی آپ کو دہلی کی سرزمین پر سلسلۂ نقشبندیہ و قادریہ کے عظیم المرتبت شیخ حضرت شاہ محمد آفاق علیہ الرحمہ کے در تک لے گئی۔ حضرت شیخ کی جوہر شناس نگاہ نے اس مسِ خام کو اپنی روحانی حدت اور باطنی توجہ سے نوازنے کے قابل پایا تو التفاتِ خاص سے نوازا۔

قرآن مجید کی آیات کا اپنی دیہاتی زبان میں آپ ایسا پُر محبت ترجمہ فرماتے تھے کہ روح میں تازگی پیدا ہو جاتی اور نفسِ مضمون آفتاب ہو جاتا۔

مال و منال اور اولاد کی حیثیت:

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

ترجمہ:۔ دھن اور پوت سنگار ہے، جیتے جی کا۔

جنت میں اہل جنت کس طرح آرام میں ہوں گے۔ اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ دنیا کی طرح وہاں فضول باتیں سن کر پریشان نہ ہوں گے، بلکہ:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا۔

ترجمہ:۔ اس میں بک بک جھک جھک نہیں سنیں گے۔

قادر و قیوم پروردگار عالم کے حکومت و اقتدار کا بیان:

اَلَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ۔

ترجمہ:۔ جس کے ہاتھ میں راج پاٹ ہے۔

رب تعالیٰ کی نعمتوں سے کائنات لبریز ہے۔ سب کچھ اس کی خلاقیت کے نمونے ہیں۔ انھیں میں یہ بھی جسے زبان قدرت خود بیان فرماتی ہے:

اِنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا۔

ترجمہ:۔ ہم نے جھما جھم برکھا برسائی، پھر تڑا تڑ دھرتی پھاڑی۔

علم ظاہر میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند تھا اور علم تصوف اور باطنی انوار سے بھی پُر نور تھے۔ شریعت طاہرہ کی متابعت کے ساتھ ساتھ عمر بھر عبادت و ریاضت اور خلق خدا کی خدمت میں لگے رہے۔ آپ کا شمار اپنے دور ان خوش نصیبوں میں ہے، جو شریعت اور طریقت کے مجمع

البحرین تھے۔ آپ پر یہ شعر بالکل صادق آتا ہے: ؎

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

محبت رسول:

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے آپ کو جو والہانہ محبت تھی، اس کا جیتا جاگتا ثبوت تو ان کی کامل تابعداری اور پابندئ سنت ہے۔ حدیث مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پڑھنا پڑھانا اور سننا سنانا، آپ کے روح کی غذا تھی۔ آپ ہر سال پابندی سے بارہ ربیع الاول شریف کو عید میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جلسہ کرتے تھے۔ اور موتی چور کے لڈو بانٹا کرتے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ آپ کے نام نامی ہی کی طرح مشہور ہے کہ ایک بار میلاد شریف کا اہتمام ہو رہا تھا۔ صحن میں تقریر کے لیے اسٹیج اور سامعین کے لیے فرش کا بندوبست کیا جا رہا تھا۔ روشنی کے لیے گرداگر لکڑی کی بلیوں پر موم شمعیں یا دیے جلائے جاتے تھے۔ ایک ملا جی نے یہ سب دیکھا تو حضرت مولانا سے کہنے لگے: یہ تو اسراف ہے اور اسراف حرام ہے۔ آپ نے فرمایا: جو آپ اسراف سمجھتے ہیں، اسے بجھا دیجیے۔ ملا جی جوش میں اٹھے اور پھونک مار مار کر شمعیں گل کرنے لگے۔ مگر عجیب بات ہوئی کہ جسے وہ پھونک مار کر بجھاتے تھے، وہ خود بخود جل اٹھتی تھی۔ ملا جی شرمندہ ہو اٹھے۔

حضرت مولانا نے فرمایا: ”ملا جی یہ محبت کی روشنی ہے، اسے بجھانا آسان نہیں۔ افسوس کی بات ہے۔ آج تو ہم رسول اللہ کے نام پر صرف لڑھوا (لڈو) بانٹ رہے ہیں۔ صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) تو مڑوا (سر) نچھاور فرماتے تھے“۔

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تم پر

مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

”صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم“ کا ترجمہ آپ نے عشقیہ زبان میں یوں فرمایا ہے: ”پیار کرے ان کو اللہ اور سلامت رکھے“۔

کبھی کبھی صبح صادق کے وقت محبت رسول کا پیمانہ چھلکتا تو یہ شعر گنگناتے: ؎

بادِ نسیم آج بڑی خوش گوار ہے

شاید ہوا کے رُخ پہ کھلی زُلف یار ہے

آپ کے پسندیدہ اشعار یہ ہیں، جنھیں آپ گاہے گاہے پڑھا کرتے تھے: ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم

الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

کسی کے دردِ محبت نے عمر بھر کے لیے

خدا سے مانگ لیا انتخاب کر کے مجھے

نہ ہو دیدار میسر تو نہ ہو

درِ جاناں کی زیارت ہی سہی

نہ ہو قسمت میں مرے ساغر مئے

تیرے مئے خانے کی خدمت ہی سہی

نسبت کا احترام:

آپ علما اور اہل نسبت کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت طیبہ کے اتباع کا بہت اہتمام فرماتے۔ آپ کی بزم میں قرآن مجید اور حدیث شریف کا درس ہوا کرتا تھا۔ آپ اس سے اتنا شغف رکھتے تھے کہ فرماتے:

"رب تعالیٰ جب مجھے جنت میں لے جائے گا اور حوروں کو خدمت کے لیے بھیجے گا تو میں کہوں گا، آئو میں تمہیں کلامِ الٰہی سنائوں"۔

باوجود یہ کہ سنت رسول کے آپ بہت پابند تھے، عجز و انکسار بھی بے پناہ تھا۔ فرماتے:

"جب کسی سنت پر عمل ہوجاتا ہے تو آسمان سے ایک ایسے نور کی بوچھار محسوس کرتا ہوں، جو گرد و پیش کو گھیر لیتا ہے"۔

بارہ ربیع الاول شریف کے موقع پر جلسۂ عید میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اہتمام نہایت محبت سے فرماتے تھے۔ جب حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر ہوتا تو آنکھیں نم ہوجاتیں۔ بزرگوں کا ذکر جب بھی کرتے، بہت ہی باادب اور مناسب القاب استعمال فرماتے۔

ایک بار کسی عقیدت مند نے کہا: حضرت! اگر حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ حیات ہوتے تو وہ بھی آپ کا ادب کرتے۔

آپ نے برہم ہوکر فرمایا: خاموش رہو۔ کیا بک رہے ہو۔ وہ میرے استاذ ہیں۔ اپنے پیر و مرشد کا نام بیعت کے وقت کے سوا نہ لیتے، جب بھی ذکر کرتے، صرف "حضرت" کہتے۔

پیر و مرشد سے محبت کا یہ حال تھا کہ خانقاہ ابوالخیر علیہ الرحمہ میں حاضر تھے۔ حضرت مولانا شاہ محمد آفاق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی بات میں فکر مند اور متردد تھے۔ حاضر ہوئے اور عرض کی: غلام حاضر ہے، جس کے ہاتھ چاہیے فروخت فرمادیجیے اور تردد دُور فرمائیے۔ اتنا ضرور ہو کہ جو خریدے پانچ وقتوں کی نماز پڑھنے دے اور شب و روز خدمت لیتا رہے، کوئی بات نہیں۔

فاضل بریلوی مولانا شاہ احمد رضا قدس سرہٗ، حضرت محدث سورتی مولانا وصی احمد علیہ الرحمہ کی رفاقت میں گنج مرادآباد ۱۳۱۹ھ میں حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا نے قصبہ سے باہر نکل کر ان لوگوں کا استقبال کیا۔ اپنے حجرۂ خاص میں ٹھہرایا۔ عصر کی نماز کے بعد عقیدت مندوں کی مجلس میں نشست ہوئی تو امام احمد رضا قدس سرہ کے بارے میں فرمایا:

"مجھے آپ میں نور ہی نور نظر آتا ہے"۔

اور نہایت محبت اور اپنائیت سے اپنی ٹوپی ان کے سر پر رکھ دی اور ان کی ٹوپی خود پہن لی۔

آپ کے پاس مٹی کا ایک لوٹا تھا، جس میں بتاشہ وغیرہ رکھتے تھے۔ بس اسے کدوئے درویش ہی سمجھیے، جس میں کیا نہیں تھا۔ ایک اہل حاجت آپ کے پاس بے اولادی کا رونا روتا ہوا آیا۔ آپ نے دعائے خیر کی اور اپنے لوٹے میں سے نکال کر چند بتاشے اور بیریں اپنی ہتھیلی پر

رکھ لیں اور شخص مذکور سے کہا: اس میں سے حسب خواہش لے لو۔ اس شخص نے جتنے بتاشے اور کھجوریں لیں، رب تعالیٰ کی طرف سے اتنے ہی بچوں اور بچیوں کا باپ بنا۔

کسی وقت فرماتے: بھئی بھوک لگی ہے، کوئی چیز کھانے کی ملے تو کھائیں۔ خدام عرض کرتے: حضور جو حکم دیں تیار کر دیا جائے۔ پھر فرماتے: لوٹا اتارو۔ بتاشہ یا جو کچھ اس میں ہوتا، کھا لیتے اور مٹی کے برتن سے پانی پی لیتے۔ یہاں تک کہ سیر ہو جاتے۔ فرماتے: الحمد للہ! آسودہ ہو گیا۔

حضرت مولانا کی عمر میں ابتدائی زمانہ جوانی تک ایسا تھا، جب آپ تنہائی پسند، لوگوں کی صحبت سے گریز کیا کرتے تھے۔ ۱۷ر سال کی عمر میں دہلی کا علمی سفر کیا۔ دوبارہ روحانیت کی طلب میں آپ نے ۱۲۳۹ھ کے بعد جب دہلی کا رُخ کیا تو اس وقت آپ کے استاذِ گرامی، خاتم المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اختیار فرمائی اور ان کے دامن سے وابستہ ہوئے اور مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہوئے۔

حضرت شاہ محمد آفاق کے خلیفہ شاہ محمد اعظم علی صاحب نے آپ سے ایک روز دورانِ گفتگو فرمایا: آج تو آپ دنیا سے اس قدر اجتناب کر رہے ہیں۔ اس روز کیا کریں گے، جب خلق خدا جوق در جوق آپ کے در پر حاضر ہوگی۔ ارادت اور مجاہدات کے ابتدائی دنوں سے ضعیفی کا زمانہ آنے تک آپ پر جلالی کیفیت غالب رہتی تھی۔ آپ کی مسجد میں وضو کے بعد بھیگا ہوا پیر لے کر کوئی قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ بڑے بڑے اہل علم آپ کے سامنے گفتگو کرتے ہوئے تھراتے تھے۔ کتنے اہل حاجت آتے، مگر انھیں بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

وصال سے قبل دس سال کا زمانہ، جمالی کیفیت کا زمانہ تھا۔ اور در اصل مخلوقِ خدا اسی مدت میں آپ سے خوب خوب مالا مال ہوئی۔

تقویٰ اور پرہیزگاری میں آپ نے اپنی زندگی کو ڈھال لیا تھا۔ سادہ، چھپر دار مکان میں تا عمر رہائش اختیار کی۔ سادی غذائیں استعمال کیں۔ پیر و مرشد کے اتباع میں صبح کو مونگ کی کھچڑی اور شام کو مونگ یا ماش کی دال سے روٹی کھاتے تھے۔ نیا کپڑا دھولائے بغیر نہیں پہنتے تھے۔ استراحت کے لیے معمولی سی چارپائی تھی۔

استغنا کا حال یہ تھا کہ اخیر زمانہ میں لوگ نذر و نیاز بہت کثرت سے پیش کرتے تھے۔ اور آپ، لوگوں میں نہایت فراخ دلی سے تقسیم کیا کرتے تھے۔

جے پور کے ایک حکیم صاحب آپ کی خدمت میں ایک معجون بنا کر پیش کی اور عرض کیا: حضرت ضعیفی کا زمانہ ہے، اسے استعمال کرتے رہیں، قویٰ مضبوط رہیں گے۔ آپ نے تھوڑی سی انگلی سے زبان پر رکھی اور حکیم صاحب کو دعائیں دیں۔ فرمایا: ماشاء اللہ بہت لذیذ ہے۔ اتفاقاً آپ کے گھر میں صفائی کرنے والا مہتر، جس کا نام سلطان تھا، سامنے سے گزرا۔ آپ نے اسے بلایا اور فرمایا: سلطان! لے یہ معجون بہت عمدہ ہے تو بہت کمزور ہو گیا ہے، اسے استعمال کرنا، طاقت آ جائے گی۔ یہ حکیم صاحب ہمارے لیے بہت محبت سے بنا کر لائے ہیں۔

رات کا وقت تھا، دربھنگہ کے راجہ صاحب آئے اور تین سو اشرفیوں کی تھیلی پیش کی۔ آپ نے دریافت کیا: راجہ جی! یہ کیا ہے؟ حضور! اشرفیاں ہیں۔ آپ نے فوراً ان دوکان داروں کو بلوایا، جن کے پاس سے سامان آتا تھا۔ تھیلی اٹھا کر دوکان دار کے حوالہ کر دی، خود تو کھول کر دیکھا بھی نہیں۔ وہ سامنے ہی بیٹھ کر شمار کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا: ارے گھر لے جا کر اطمینان سے گن لینا۔ دوکانداروں دوبارہ آیا۔ آپ نے

پوچھا: اب تو تمہارا قرضہ ادا ہوگیا۔ اس نے کہا: حضور! پچاس روپے اور۔ فرمایا: اچھا، چلو اللہ دے گا۔ وہ بھی ادا کردیں گے۔ بمبئی کے ایک دولت مند تاجر نے قیمتی چادر ہدیہ کی۔ آپ نے پسند فرمائی، تعریف کی، سامنے سے مہترانی گزر رہی تھی، بلا کر اسے دے دی۔ سوداگر یہ استغنا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

جذبۂ خدمت گزاری:

محبوبِ عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت کا یہ حال تھا کہ آپ کی بزم میں پابندی سے قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں گونجتی تھیں۔ ایک صاحب رات کے وقت مسجد میں پہنچے۔ حضرت مولانا سے ملاقات کی۔ عربی زبان بولتے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بول لیتے تھے۔ کہنے لگے: یا شیخ الہند! ہمارا سامان کانپور میں چوری ہوگیا۔ میں آپ کے پاس دو سو روپے کا مطالبہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے اصرار کی حد کردی تو آپ نے لوگوں کو بھیجا کہ کہیں سے دو سو روپے کا انتظام کرکے ان کی خدمت میں پیش کرو۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ ایک دوکان دار کو لگا کہ اس سے کہا گیا، اس نے کہا: میرے پاس صرف ڈیڑھ سو روپے ہیں، آپ کہیں تو حاضر کردوں۔ مگر شیخ اتنے پر راضی نہ ہوئے۔ پھر دوسری جگہوں پر تلاش کرکے شیخ کی خدمت کی گئی۔

شیخ نے کہا: ایک چادر، ایک دری اور ایک لوٹا بھی چاہیے۔ آپ نے اپنا یہ سب سامان ان کے حوالے کیا۔ شیخ عرب رخصت ہوکر مسجد کے باہر روانہ ہوئے۔ بارہ بجے رات کا وقت تھا۔ دو باہر پھر واپس آئے اور کہا: تم سے ایک کام اور لینا ہے۔ ہمارے لیے کچھ خطوط لکھ دو، مسجد کے کھلے صحن میں دیا جل رہا تھا۔ حضرت مولانا نے شیخ عرب کے لیے آٹھ خطوط لکھے، اس طرح دو بج گئے۔ حضرت مولانا نے ان کے لیے کرائے کا ٹٹو منگوایا اور اس پر بٹھا کر رخصت کیا۔ جاتے وقت شیخ عرب نے کہا: یا شیخ الہند! اس ٹٹو کا کرایہ واپسی پر آپ دیں گے، میرے ذمہ نہیں۔ آپ نے حامی بھری اور انھیں رخصت کیا۔

آپ کے پاس سے جب کوئی معزز مہمان رخصت ہوتا تو آپ کچھ دور متابعت فرماتے۔ اور یہ شعر پڑھتے: ؎

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

آپ کے نیاز مندوں میں ایک صاحب منشی نیاز احمد تھے۔ ایک بار حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا: منشی جی! میرا مٹکا اٹھانا، اس میں ایک ڈبیہ رکھی ہے۔ انھوں نے دیکھا تو کہا: حضور! یہ تو نہایت قیمتی گھڑی ہے۔ آپ نے فرمایا: کس کام آتی ہے؟ انھوں نے عرض کی: حضور! یہ وقت بتاتی ہے۔ آپ نے فرمایا: وقت تو الحمد للہ! مجھے معلوم ہی ہوجاتا ہے۔ کب صبح ہوئی، کب ظہر کا وقت ہوا، کب شام ہوئی؟ میں نے سمجھا کوئی ڈبیہ ہے، جو میرے بتاشہ رکھنے کے کام آئے گی۔ اگر یہ آپ کے کسی کام آئے تو لے لیں۔ منشی جی نے خوشی سے لے لی۔

لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ گھر سے خبر آئی کہ اہل خانہ نے کچھ پیغام بھیجا ہے۔ ایک طرف ہوکر سننے لگے۔ خبر یہ تھی کہ خرچ کے لیے کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ غلہ وغیرہ تھا، تمام ہوگیا۔ فرمانے لگے: سولہ سیر باجرہ اور سولہ سیر جوار ہم دے کر آئے تھے، سب ختم ہوگیا۔ جنگ تبوک میں ایک خرمہ صحابہ کو ایک دن کے واسطے ملتا تھا۔ سچ فرمایا حکیم مشرق نے: ؎

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہو سکندری سے نہیں

تعلیم سے فراغت کے بعد وطن واپسی پر سنت نکاح کی ادائیگی ہوگئی تھی۔ آپ کی پہلی اہلیہ دو صاحبزادے (جناب عبدالرحمن اور عبدالرحیم) چھوڑ کر دارِ فانی کو سدھاریں۔ کچھ روز بعد ملاواں کو چھوڑ کر آپ نے گنج مرادآباد کو اپنے گنج معرفت سے بہرہ مند کرنے کا ارادہ کیا اور وہاں اقامت گزیں ہوگئے۔ وہیں آپ نے اپنا دوسرا نکاح کیا۔ کچھ روز مطابع میں قرآن مجید کی کتابت شدہ کاپیوں کی تصحیح کا کام کرتے رہے، مگر عمر زیادہ ہوئی تو وطن واپس آگئے۔ زیادہ وقت یادِ الٰہی میں صرف ہوتا۔ سسرالی لوگ معاشی ذرائع نہ پاکر طرح طرح کی اذیتیں دیتے، مگر آپ متوکلاً علی اللہ اپنے معمولات میں مشغول رہتے۔ خلق خدا میں تبلیغ دین اور وعظ وتذکیر فرماتے۔ اہل بینش رفتہ رفتہ آپ کی روحانی قدروں سے واقف ہونے لگے اور دلوں کا رجوع شروع ہوگیا۔ چند سال بعد دوسری اہلیہ بھی خدا کو پیاری ہوئیں۔ کچھ روز بعد آپ نے تیسرا نکاح پنجاب کے اہل محبت لوگوں کی ایما پر کیا، جو رفیقۂ زندگی آپ کے وصال کے بہت روز بعد تک حیات رہیں۔ آپ کا وصال ۲۳؍ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ کو ہوا۔ ہاشمی صفی پوری نے ''مات قطب الہند نور اللہ مرقدہ'' سے تاریخ وفات نکالی۔

۱۲۸۴ھ سے آپ کی جانب خلق خدا کا رجوع اتنا زیادہ ہونے لگا کہ اہل حاجت میں مسلمان، ہندو، عیسائی، سکھ، امیر، غریب، راجہ، نواب ہر قسم کے لوگ آنے لگے۔ بڑے بڑے علما اور درویش متوجہ ہونے لگے۔ طالبانِ دنیا کی طرح روحانی دولت کے طالبین بھی آپ سے سلسلۂ نقشبندیہ اور قادریہ کے فیوض سے حصہ پاتے۔

اہل حاجت کے خطوط بھی کثرت سے آتے تھے۔ مصباح العاشقین نامی رسالہ میں، منشی ظہور احمد شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:

''آپ روزانہ کے خطوط کے جوابات لکھواتے۔ ان خطوط میں لوگ اپنی اپنی تمنائیں اور مرادیں تحریر کرتے تھے۔ آپ کو بہت افسوس ہوتا، جب کوئی شخص کسی کا راز جاننے کے لیے کسی کا خط دیکھتا تھا۔ آپ فرماتے: ''خدا جانے غریب نے کیا کیا لکھا ہوگا''۔ ہر وقت کے حاضر باشوں نے خطوط میں مندرج امیدوں کے پورا ہونے کی عجیب شناخت مقرر کی تھی:

(۱) آپ خط کو فوراً چاک کرکے کنویں میں ڈلوا دیتے (۲) یا کسی اور کو چاک کرنے کا حکم دیتے (۳) کسی خط کو یوں ہی کنویں میں ڈلوا دیتے۔ اول الذکر کام بعون اللہ بہت جلد ہوجاتا، زیادہ سے زیادہ تین دن لگتے۔ دوسری قسم کا کام پورا ہونے میں تقریباً ہفتہ لگتا۔ تیسری قسم میں ماہ دو ماہ لگ جاتے''۔ (مصباح العاشقین، ص۱۴)

بلند شہر کے مضافات سے ایک نوجوان نے آپ کو خط لکھا کہ میں پیدائشی نامرد ہوں۔ والدین نے زبردستی شادی کردی ہے۔ ایک اور جان میری وجہ سے مبتلائے عذاب ہے۔ اب تو زندگی وبالِ جان ہے۔ اگرچہ خودکشی حرام ہے، مگر ایسی زندگی سے کیا فائدہ۔ آپ کو خط لکھ کر جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر جواب نہ ملا تو زہر لاکر رکھ چکا ہوں، کھالوں گا۔ میرے لیے اپنے اس مرض کا علاج ممکن نہیں، مگر آپ کی نگاہِ کرم ہو تو یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں۔ اگر حضور کی توجہ نہ ہوئی تو قیامت کے دن وارِدِ محشر کے سامنے یہی کہوں گا کہ مولانا فضل رحمن نے مجھے زہر دیا تھا۔

رات کو گیارہ بجے آپ کو یہ خط پڑھ کر سنایا گیا۔ آپ نے خط کو فوراً اپنے ہاتھ سے چاک کردیا۔ اور جواب لکھوایا:

"بھائی ہم تمہارے لیے دعا کرتے ہیں"۔

جوابی ڈاک سے جواب آیا کہ فلاں تاریخ کی رات سے مجھے صحت کا اثر محسوس ہوا۔ اور بحمدہٖ تعالیٰ اب خیریت سے ہوں۔

اخبار "نظارۂ عالم" کے ایڈیٹر جناب منشی قدرت اللہ صاحب، حیدرآباد دکن سے سفر کرکے حاضر ہوئے۔ ٹرین کا سفر تھا، قدیم دور کے تھکا دینے والے ذرائع سفر کے سامنے آرام دہ ذریعۂ سفر ملا تو انھوں نے نمازِ قصر نہ کی۔ آپ کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ روئے سخن انھی کی جانب تھا۔ خانقاہ میں قیام اور صحبت کی لذت کشی کے بعد واپسی کا ارادہ کر رہے تھے۔ حضرت مولانا نے فرمایا:

"اگر اللہ کی نعمت مل رہی ہے تو اسے نہ لینا، بندہ کی ناشکری ہے۔ بعض لوگ سفر میں نماز قصر نہیں کرتے اور اپنی رائے کو دخل دیتے ہیں"۔

پھر ان کی جانب دیکھ کر فرمایا: "واپسی میں نمازِ قصر کیجیے گا"۔

الہ آباد کے مضافات سے چند نوجوان حاضر ہوئے۔ آپ کے دسترخوان پر روٹی اور دال سے ان دنوں مہمانوں کی ضیافت کی جاتی تھی۔ ان میں سے ایک نے خیال کیا کہ صرف خشک روٹی اور دال سے سابقہ ہے۔

دسترخوان پر سب لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ حضرت مولانا نے فرمایا:

"بعض لوگ ہمارے یہاں آکر لذیذ غذا تلاش کرتے ہیں۔ فقیروں کے یہاں تو یہی خشک روٹی اور دال ہے (ان صاحب کی طرف دیکھ کر فرمایا) تم نے بھی سنا؟"۔

ایک انگریز افسر حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا: تم بائیس سو روپے پاتے ہو، اگر تمہاری تنخواہ میں ایک ہزار کا اور اضافہ ہوجائے تو ہمیں کیا دوگے؟۔

کہنے لگا: مولانا! ایسا ہونا ممکن نہیں۔ صرف چھ ماہ تک مجھے اور ملازمت کرنی ہے۔ اس کے بعد پنشن ہوجائے گی۔ اچھا، اگر ایسا ہوجائے تو خوش ہوگے؟ اس نے کہا: ممکن ہی نہیں۔ فرمایا: جاؤ ایک ہزار کا اضافہ ہوا۔ چند روز بعد ہی وہ کسی دوسرے محکمہ کا افسر اعلیٰ بنا دیا گیا اور اس کی تنخواہ ۳۲/ سو روپے ہوگئی۔

ملاواں اپنے مولد کی ایک مسجد کے صحن میں آپ نے پاکڑ کی ایک ٹہنی سے مسواک کی اور اسے زمین میں گاڑ کر فرمایا: "یا اللہ! اسے سرسبز کردے"۔ الحمدللہ! کہ وہ مسواک آج تک گھنیرے درخت کی شکل میں سرسبز ہے۔

آپ کا گزر قصبہ جاج مئو کی آبادی کے اندر سے ہوا۔ ایک برہمن زادہ پختہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھا کپڑا دھو رہا تھا، چھینٹیں کنویں میں جارہی تھیں۔ آپ نے منع کیا، مگر وہ نہیں مانا۔ آپ نے اپنا عصا زمین پر ٹیک کر اس پر سر رکھ لیا اور آنکھیں بند کرلیں، چند ثانیہ بعد کنویں کا پانی جوش زن ہوا اور اُبل کر منہ تک آگیا اور کئی بالشت بلند ہوکر بہنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر گاؤں والے قدموں پر گرنے لگے۔ آپ نے فرمایا:

"میں نے تو صرف یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ اس کنویں کی نجاست کو دور کردے"۔

آپ نے انتقال ہونے سے ۱۲/ برس پیشتر ایک خادم کو ڈانٹا: "بے ادب! جہاں میری قبر ہوگی، وہاں تو پاؤں رکھتا ہے"۔

ہندوؤں کا کوئی مذہبی تیوہار تھا۔ میلہ کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ آپ اپنی مسجد کے پاس چبوترہ پر تشریف رکھتے تھے۔ لوگوں کا ریلا سامنے سے گزر رہا تھا۔ ہندو سادھوؤں کی وضع قطع میں ایک شخص گزرا۔ ہاتھ میں چمٹا لیے ہوئے مست۔ حضرت مولانا کے قریب پہنچا تو رُک گیا۔ آپ نے پوچھا: تم کہاں جا رہے ہو؟

کہا: خدا کو دیکھنے آیا ہوں۔

آپ نے فرمایا: خدا کہاں ہے؟

کہا: جس نے فضل رحمان کو دیکھا، خدا کو دیکھا۔

آپ اپنی جگہ سے اٹھے، اس کی پیٹھ پر زور کا دھپ لگایا، اسے مٹھائی دلوائی اور رخصت کر دیا۔ خدا ہی کو معلوم ہے، وہ خدا کا کون سا بندہ تھا۔

سلسلۂ قادریہ میں آپ کو ۱۹/ واسطوں سے حضرت سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اور ۳۱/ واسطوں سے آقائے کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک رسائی حاصل ہے۔ شجرۂ طیبہ یوں ہے:

{۱}...... حضرت مولانا شاہ فضل رحمان

{۲}...... حضرت مولانا شاہ محمد آفاق

{۳}...... حضرت خواجہ ضیاء اللہ

{۴}...... حضرت قبلۂ عالم محمد زبیر

{۵}...... حضرت محمد نقش بند ثانی

{۶}...... حضرت ایشاں محمد معصوم

{۷}...... حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی

{۸}...... حضرت شاہ اسکندر

{۹}...... حضرت کمال کیتھلی

{۱۰}...... حضرت سید فضل

{۱۱}...... حضرت سید گدا رحمن

{۱۲}...... حضرت شمس الدین

{۱۳}...... حضرت گدا رحمن بن ابی الحسن

{۱۴}...... حضرت شمس الدین صحرائی

{۱۵}...... حضرت سید عقیل

{۱۶}...... حضرت سید بہاء الدین

{۱۷}...... حضرت سید عبدالوہاب

{۱۸}...... حضرت شرف الدین قتال

{۱۹}...... حضرت سید عبدالرحمن

{۲۰}...... حضرت سید محبوبِ سبحانی غوثِ صمدانی شیخ عبدالقادر جیلانی

{۲۱}...... حضرت سید ابو صالح

{۲۲}...... حضرت موسیٰ جنگی دوست

{۲۳}...... حضرت سید عبداللہ

{۲۴}...... حضرت سید یحییٰ زاہد

{۲۵}...... حضرت موسیٰ مورث

{۲۶}...... حضرت سید داؤد مورث

{۲۷}...... حضرت سید موسیٰ الجون

{۲۸}...... حضرت سید عبداللہ محض

{۲۹}...... حضرت حسن مثنیٰ

{۳۰}...... حضرت امام حسن (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین)

{۳۱}...... حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم

{۳۲}...... حضرت سرورِ کائنات شفیع محشر محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وبارک وسلم

امام احمد رضا کا ذوقِ سخن

امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ ایک جامع الصفات شخصیت کا نام ہے۔ تاہم اگر کوئی کہے کہ اردو ادب و انشا کی حیثیت سے آپ نے کچھ نہیں کیا تو اس حد تک تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے صرف ادب برائے ادب کچھ بھی نہ کیا۔ مگر جہاں تک ادب نوازی کا سوال ہے، آپ کے فتاوے کم و بیش لاکھ صفحات پر مشتمل ہیں۔ جن میں عربی اور فارسی سے کہیں زیادہ اردو ادب وانشا کے نادر نمونے موجود ہیں۔

آپ کے قصائد کے مجموعے "حدائق بخشش" کی دو جلدیں ہیں، جن میں صنائع وبدائع کی خوبیاں اپنے عروج پر ہیں۔ مگر نثر و نظم ہر ایک کا مطالعہ ذہن پر یہ اثر مرتب کرتا ہے کہ آپ کی تمام تر قلم کاری عشق و فرمانِ محمدی کے نشہ میں شرابور ہے۔ اس سے جدا ہو کر آپ نے کبھی کچھ نہ لکھا۔

مندرجہ ذیل مضمون میں ہم صرف چند ایسے اقتباسات درج کریں گے، جن سے امام احمد رضا قدس سرہ کی شعری دلچسپی اور محل وقوع کے اعتبار سے اشعار کے استعمال میں مہارت کا اندازہ ہوگا۔ بات ظاہر ہے کہ فتویٰ اور فقہ و تفسیر، نیز دیگر علوم کا اپنا الگ اسلوبِ بیان ہے، جس میں اشعار کے استعمال کا تُک ہی نہیں۔ لامحالہ جہاں معاملات سے کچھ سابقہ پڑا ہے، امام کے قلم کی یہ صفت ظاہر ہوئی ہے۔ اس مضمون کی ترتیب کے لیے ہمیں آپ کی دس کتابوں سے مدد ملی اور غائر نظر سے مطالعہ کے بعد ادب شناسوں کو کہنا لازم ہو جاتا ہے کہ: ؎

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

زندۂ جاوید:

"انوار البشارۃ" حج وزیارت کے موضوع پر آپ کا نہایت جامع رسالہ ہے۔ ضروری مسائل اور مقاماتِ زیارت وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس میں جبل احد کا ذکر ہے، جو قتیلانِ محبت کی آرام گاہ ہے۔ یہیں غزوۂ محبت برپا ہوا اور ستر صحابۂ کرام نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اور وہی لوگ آیۂ مبارکہ:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ (آل عمران)

ترجمہ:۔ جو لوگ راہِ خدا میں شہید ہوئے، انھیں مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کی طرف سے روزی دیے جاتے ہیں۔

کے اولین مصداق ہیں۔ ان شہیدانِ محبت کے ذکر جمیل میں مندرجہ ذیل اشعار ثبت فرمائے: ؎

زندۂ جاوید ہیں سوزِ محبت کے قتیل
یہ شرر ٹھنڈے نہیں ہوتے ہیں بجھ جانے کے بعد

رتبہ شہید عشق کا گر جان جائیے

قربان ہونے والوں پہ قربان جائیے

فنا فی اللہ کی تہہ میں بقا کا راز مضمر ہے

جو جینا ہے تو مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ (انوالبشارۃ، ص۱۳۷)

قرار ایں جا:

آدابِ زیارت کی نصیحتوں کے باب میں ۳۹/ ویں نمبر پر مزاراتِ بقیع و قبا وغیرہ کا ذکر فرمایا۔ جس کے اخیر میں ایک ایسا جاندار مصرعہ تحریر کیا، جو آپ کے ذوقِ شعری کے ساتھ ساتھ عقیدت مندانہ گرویدگی کی نشانی ہے۔ لکھتے ہیں:

"بقیع و احد کی زیارت سنت ہے، مسجد قبا کی دو رکعت کی سنت کا ثواب ایک عمرہ کے برابر ہے اور چاہو تو یہی حاضر رہو۔ سیدی ابن ابی حمیرہ قدس سرہ جب حاضر حضور ہوتے، آٹھوں پہر برابر حضور میں کھڑے رہتے۔ ایک دن بقیع وغیرہ زیارات کا خیال آیا، پھر فرمایا: یہ ہے اللہ کا دروازہ۔ بھیک مانگنے والوں کے لیے کھلا ہوا اسے چھوڑ کر کہاں جائیں۔ ؎

سر ایں جا سجدہ ایں جا بندگی ایں جا قرار ایں جا

(انوارالبشارۃ، ص۱۰۲)

سجدہ گاہ اہل نظر:

مسجد الرایہ، جسے زباب بھی کہتے ہیں۔ مدینہ طیبہ سے شام کو جانے والے راستہ میں پہاڑ کی بلندی پر ہے۔ سرکار جب غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو اس مقام پر خیمہ نصب ہوا تھا اور حضور نے اسی جگہ نماز ادا فرمائی تھی۔ اس کے ذکر جمیل پہ بہت ہی مناسب شعر نصب فرماتے ہیں: ؎

بز مینے کہ نشان کف پائے تو بود

سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

ترجمہ:۔ یعنی جس زمین پر آپ کے قدم ناز کا نشان پڑ جائے وہاں اہل بصیرت کا سالہا سال سجدہ ہوگا۔ (انوار البشارۃ، ص۱۲۶)

تو تنہا داری:

"الاستیعاب لعبد البر" کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عالم شیر خوارگی میں حلیمہ سعدیہ کی گود میں تھے، قبیلہ بنی سلیم کی تین کنواری لڑکیوں نے بھولا بھالا نورانی پیکر دیکھا تو منہ میں پانی بھر آیا، لپک کر گود میں اٹھا لیا اور اپنے پستان دہن اقدس میں رکھ دیے۔ تینوں کے دودھ اتر آیا۔ ان تینوں کا نام عاتکہ تھا۔ آگے خود ان کی تحریر ملاحظہ کریں:

"یہ اس مرتبہ کی تکمیل تھی کہ مسیح کلمۃ اللہ (صلوات اللہ و سلامہ علیہ) کو بے باپ کے کنواری بتول کے پیٹ سے پیدا فرمایا"۔ ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ترجمہ:۔ جتنی خوبیاں تمام انبیا علیہم السلام رکھتے ہیں، یارسول اللہ تنہا آپ میں سب موجود ہیں۔ (شمول الاسلام، ص۲۸)

دعوتِ فکر:

کذبِ باری کو ممکن جاننے والوں کے رد میں ایک سو بائیس دلیلیں پیش کیں، پھر بھی خاتمۂ کتاب میں فرماتے ہیں:

''ہزارہا ہزار بار حاشا للہ میں ہرگز ان کی تکفیر پسند نہیں کرتا۔ ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اہل ''لا الہ الا اللہ'' کی تکفیر سے منع فرمایا ہے۔ جب تک وجہ کفر آفتاب سے زیادہ روشن و جلی نہ ہوجائے اور حکم اسلام کے لیے کوئی ضعیف سا بھی محل نہ رہے۔

''فان الاسلام یعلوا ولا یعلی''۔ (سبحان السبوح، ص۱۰۰)

ذکر دلائل کے بعد غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں اور تمنا کرتے ہیں کہ کاش کوئی ایک دلیل بھی انھیں عقیدۂ باطل سے لوٹا دیتی تو میری محنت برآتی۔ اسی مفہوم کو بسیط عبارت میں پرونے کے بعد یہ شعر نصب فرماتے ہیں: ؎

می توانی کہ دہی اشک مرا حسن قبول
اے کہ دُر ساختۂ قطرۂ بارانی را

ترجمہ:۔ کیا تم میرے آنسوؤں کو قبول کر سکتے ہو، اگر ایسا ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ بارش کے قطرے کو تم نے موتی بنادیا۔

(سبحان السبوح، ص۱۱۵)

امید کرم:

امام احمد رضا کی تحریروں میں اسلام دشمن عناصر کے لیے تلخی محض ان کے تصلب فی الدین اور ''الحب للہ والبغض للہ'' کی وجہ سے ہے۔ ایسا نہیں کہ کسی دبائو یا دنیاوی لالچ نے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ بلکہ امام کا جذبۂ حب رسول تو اس منزل پر تھا کہ کسی دنیادار کی فلاح و ستائش بھی وبال تصور فرماتے تھے۔ جیسا کہ خود کہا: ؎

کروں مدحِ اہل دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرا دین پارۂ ناں نہیں

حضور ختمی مرتبت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین صاحب ایمان تھے۔ اس کے ثبوت میں دلائل پیش فرمانے کے بعد، خود ہی اس کی علت بیان فرماتے ہیں کہ:

اس مسئلہ کو ضبطِ تحریر میں لانے کا مقصود! شاید مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو کہ تمام جہان سے اکرم وارحم وابتر و اوفی ہیں، محض اپنے کرم سے نظر قبول فرمائیں، ورنہ کسی صلے میں بلکہ اپنے خاص فضل کے صدقے میں اس عاجز بے چارہ، بے کس، بے یار کا ایمان حفظ فرماکر دارین میں عقاب و عذاب سے بچائیں۔ ؎

برکریما کارہا دشوار نیست (شمول الاسلام، ص۳۲)

فطرتِ روباہی:

چند متعصب مزاجوں نے دلائل الخیرات جیسی مقبول دعا ودرود کی کتاب کو شرک و بدعت کا مجموعہ کہہ دیا۔ اس پر دین دارانہ برہمی فرماتے ہیں:

دلائل الخیرات شریف کو تالیف ہوئے پونے پانچ سو برس گزرے، جب سے یہ کتاب مستطاب شرقاً غرباً عرباً عجماً تمام جہان کے علما واولیا وصلحا میں حرزِ جان، وظیفۂ دین وایمان ہو رہی ہے۔ یہ حسن قبول خدا اور سول زید و عمرو کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ ؎

ہمہ شیرانِ جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند

روبہ از حیلہ چناں بگسلد ایں سلسلہ را

ترجمہ:۔ دنیا کے تمام شیر اس سلسلہ سے وابستہ ہیں، لومڑی مکر سے اسے کہاں توڑ سکتی ہے۔

ہاں اب نئے زمانے فتنے کے گھرانے ہیں۔ وہ گمراہ بھی پیدا ہوئے ہیں، جو معاذ اللہ دلائل الخیرات کو معدنِ شرک و بدعت کہتے ہیں۔ مگر ان کے بکنے سے امت مرحومہ کا اتفاق واطباق نہیں ٹوٹ سکتا۔

مہ نشاند نور وسگ عوٗ عوٗ کند

ہر کسے بر خلقت خود می تند

ترجمہ:۔ چاند روشنی لٹا سکتا ہے اور کتا بھونکتا رہتا ہے، ہر شی اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتی ہے۔ (شفاء الوالہ، ص۱۷)

روح:

روح اور عرفانِ نفس کے سلسلہ میں ایک شعر کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

روح عالم امر سے ایک چیز ہے، عقل کا حصہ اسی قدر ہے۔ آگے اس کی ماہیت اکابر اہل باطن جانتے ہیں۔ سبحان اللہ آدمی خود اسی روح کا نام ہے اور یہ اپنے ہی نفس کے جاننے میں اس قدر ناکام ہے۔ ؎

تنت زندہ بجانِ جاں نہانی

تو از جاں زندہ وجاں راندانی

(کشف الحقائق، ص ۷)

دیارِ حبیب کی عظمت:

حج وزیارت کے مسائل بیان کرتے ہوئے، امام احمد رضا جب اس مقام پر پہنچتے ہیں کہ ایک دیوانۂ رسول دیارِ حبیب میں قدم رکھ دیا ہے۔ منیٰ وعرفات کے مراحل سے گزر کر جلوہ زارِ حبیب میں پہنچ رہا ہے۔ اور سرکار مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حاضری کی منزل آتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ مسائل بیان کرتے ہوئے بھی ایک مفتی اور فقیہانہ اسلوبِ تحریر کو ترک کرکے محض ایک دیوانۂ رسول کے انداز میں رقم طراز ہیں:

"راستے بھر درود شریف میں ڈوب جائو۔ جب حرم مدینہ نظر آئے، بہتر یہ ہے کہ پیادہ پا ہو۔ سر جھکائے، آنکھیں نیچے کیے، جب قبۂ انور پر نگاہ پڑے، درود و سلام کی کثرت کرو۔ جب شہر اقدس تک پہنچو، جلال وجمالِ محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تصور میں غرق ہوجائو۔ ہو

سکے تو ننگے پائوں چلو، بلکہ:

جائے سرست ایں کہ تو پامی نہی
پائے نہ بینی کہ کُجامی نہی
حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا
ارے سر کا موقع ہے، او جانے والے!

(انوار البشارۃ، ص ۹۲)

تاویل بارد:

امکانِ کذب باری تعالیٰ اور علم غیب مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں علمائے دیوبند کی ہفوات کے جواب کی جانب جب علمائے اہل سنت نے توجہ کی تو انھوں نے اپنے اقوال ہی سے انکار و گریز اور تحریروں کی بعید از قیاس تاویلیں شروع کردیں۔ امام احمد رضا اس موقع پر ان عبارتوں کا مع حوالہ جات جائزہ لیتے ہوئے نہایت برمحل فرماتے ہیں: ؎

نہاں کے ماند آں رازے کزد سازند محفلہا

ترجمہ:۔ وہ راز بھلا کہاں چھپ سکتا ہے، جس نے کئی مجلسیں آراستہ کردیں۔ (الاستمداد، ص ۱۷۵)

تأسف:

ڈپٹی کلکٹر مولوی امداد علی بہادر کو بعض علمائے سونے ایسا بہکایا کہ امام اہل سنت اور علمائے اسلام سے گفت و شنید تک بند کرادی، کہ مبادا ہماری ہانڈی ٹھنڈی ہو جائے۔ کلکٹر صاحب کو مخاطب بنا کر کتنا برمحل شعر ارقام فرماتے ہیں: ؎

صبر اس پر اس ہماری حسرتِ دیدار کا
بند جس نے کر دیا روزن تری دیوار کا

(س یف المصطفیٰ علی ادیان الافترا، ص ۱۸)

بریں علم و دانش:

فتاویٰ رشیدیہ کے ایک بے سروپا فتوے پر صرف ایک مصرعے کے ذریعہ کتنا جامع تبصرہ فرماتے ہیں۔ جو اپنے اندر طنز کی تلخی کے ساتھ ساتھ بھرپور معنویت لیے ہوئے ہے۔ من وعن ملاحظہ کریں:

سوال: نصرانی یا ہندو وغیرہ مسجد بنادے تو اس میں نماز کا کیا حکم ہے؟ ثواب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: جس کافر کے نزدیک مسجد بنانا عمدہ عبادت کا کام ہے، اس کے مسجد بنانے کو حکم مسجد کا ہوگا۔

ع۔ تو د مسجد اے فارغ از عقل و دیں (الاستمداد، ص ۱۸۸)

سروخفی:

علومِ ظاہر کے علاوہ آپ علومِ باطن کے بھی امام تھے۔ عرفان و حقیقت کے مئے چشیدہ و بادہ کش تھے۔ شرعی استفتا کا آپ کے پاس تانتا بندھا ہی رہتا تھا۔ بعض اہل دل، عالمِ اسرار کے روحانی و عرفانی سوالات بھی پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ سر وخفی و روح وقلب کے رموز پر رقم طراز ہیں:

"اور سر وخفی و روح وقلب لطائف حضرات نقشبندیہ (قدست اسرارہم) جن میں تجلیاتِ حق کے رنگارنگ ذوق کا ادراکِ کار، عیاں ہیں۔ نہ کار، بیاں۔

ذوق ایں مئے نشناسی بخدا تانہ چشی

ترجمہ:۔ واللہ! اس شراب کا لطف اس وقت تک نہیں پاسکتے جب تک چکھا نہ جائے۔ (کشف حقائق، ص۷)

دیارِ قنوج:

مولوی بشیر الدین قنوجی، جو علمائے دیوبند کے نہایت چابک دست ہمنوا تھے۔ علمائے اسلام کی عبارتوں میں کتر بیونت اور حذف و اضافہ اور چابک دستی کے ذریعہ اپنے آقایانِ نعمت کے عقیدہ ونظریہ سے عطر کشید کرتے تھے۔ امام احمد رضا کا خیال ہے کہ طائفہ علمائے دیوبند، اس نئے قنوجی مہرے کو پاکر بے حد مسرور ہوا۔ مگر افسوس! اس کی کوششوں سے تیار شدہ امام کے الفاظ میں پہلی شیشی "کتاب تفہیم المسائل"۔ (سیف المصطفیٰ، ص۲۹)

اور دوسری شیشی "غایۃ الکلام میلاد شریف کے عدمِ جواز میں" بھی عقائد میں رخنہ انداز نہ ہوسکی۔ اور ان حضرات کے عقائد فاسدہ کی بابت ان کی فحش قلم کاری نے اہل ایمان کے مزاج کو جس قدر مکدر کیا تھا، قنوجی صاحب کی یہ شیشیاں اپنے حسن کلام کی خوشبو کے لحاظ سے کچھ مفید نہ ہوسکیں۔ امام تحریر فرماتے ہیں:

"طائفہ بھر کا مشورہ ٹھہرا کہ اب انھیں کی عرق ریزی سے کچھ عطر بیزی کی امید ہے، مگر

"لن یصلح العطار ما افسد الدھر"۔

ترجمہ:۔ جس نے زمانے کی فضا مکدر کردی، اس کی درستگی عطار کا کام نہیں۔

قنوجی صاحب نے وہ گندی روِش اختیار کی، جس کی برکت سے مذہب کے علاقہ بھر میں سچ کا پھول مارا گیا، جہاں دیکھو تحریف و تصرف کا اموا کھلا۔ ؎

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

(سیف المصطفیٰ، ص۲۳)

چھیڑ چھاڑ:

امام احمد رضا کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل نہایت لطیف انداز میں اجازت طلب کرتے ہیں:

سرکار نازک مزاجی سے اجازت ملے تو بطریق نمونہ اس خروار سے چند مشت پیش کرے۔ ؎

کون کرتا ہے گلہ تم سے مکر جانے کا

چھیڑ کر لطف اٹھا لیتے ہیں جھنجھلانے کا

(سیف المصطفیٰ، ص ۲۳)

خونِ دیانت:

قنوجی صاحب نے مذکورہ کتابوں میں در مختار، سراجیہ، رد المختار، مطابۃ المومنین وغیرہ کتب کی عبارتوں میں قطع و برید کا جو فن کارانہ انداز استعمال کیا ہے۔ اس پر امام ان کی دیانت کا ماتم کرتے ہیں: ؎

جعل مزا جھوٹ غذا ہو گیا

ہائے دیانت تجھے کیا ہو گیا

(سیف المصطفیٰ، ص ۲۹)

عنقا:

قنوجی صاحب نے بعض عبارتیں تو ایسی لکھ ماری ہیں، جن کے لیے کسی کتاب کا نہیں بلکہ ان کے اختراعی ذہن کے صفحات کا مطالعہ کرنا ہو گا۔ امام اس پر ایک تشریحی شعر ثبت فرماتے ہیں: ؎

نہ ملے قرض میں بھی ان کا پتہ لاکھ برس

ناز پروردۂ عنقا ہیں حوالے تیرے

(سیف المصطفیٰ، ص ۳۰)

شوخی چشم:

غایۃ الکلام میں قنوجی صاحب کتاب شرح معینہ اور عباد اللہ المخلصین سے عدمِ جواز استمداد کے لیے استدلال کرتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کتاب میں توسل کے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ مگر آنجناب اپنے مقصد کی عبارتیں کتر کر لمبی چوڑی تمہید و تبصرہ کے ساتھ کتاب میں نقل کرتے ہیں (جس کا مکمل جائزہ امام کی اسی محولہ کتاب کے حاشیہ پر مولانا سلطان احمد خاں قادری نے لیا ہے) امام ان کی شوخی چشم کی داد اس انداز میں دیتے ہیں:

ایسا سچا سچا دعویٰ، آپ کی تو کیا تعریف کروں، میں تو ان آنکھوں کا قائل ہوں کہ ایسے ادعا کرتے وقت جن کے تیور تک نہیں بدلتے۔ ؎

شوخی و فتنہ تو ہر وقت ہے ان آنکھوں میں

کیوں حیا! تم کو بھی ہے حکم کبھی آنے کا؟

(سیف المصطفیٰ، ص ۴۰)

تجاہل عارفانہ:

نادانستہ طور پر غلطی کرنے والے اس شخص کے احسان مند ہوتے ہیں، جو اسے غلطی سے مطلع کردے۔ مگر اس شخص کا کیا علاج؟ جو دیدۂ ودانستہ شریعت و دیانت کے خلاف کمربستہ ہو۔ اسی مفہوم کو بیان کرنے کے بعد عربی کا یہ شعر تحریر کرتے ہیں:

فان کنت لا تدری فتلك مصیبة

وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

ترجمہ:۔ بے علمی ایک مصیبت ضرور ہے، مگر دیدہ و دانستہ لاعلم بننا تو بہت بڑی مصیبت ہے۔ (سبحان السبوح، ص ۹۳)

کورچشمی:

زاغ معروفہ کو حلال فرمانے والے اور ان کے ہم جماعت دیگر علما کی رہبری اور قیادت کا تذکرہ فرماتے ہوئے کیا ہی مناسب شعر تحریر کیا ہے: ؎

اذا کان الغراب دلیل قوم

سیھدیھم طریق الھالکینا

ترجمہ:۔ اگر کوّا کسی قوم کا رہنما ہو تو وہ قوم جلد ہلاکت کے گھاٹ اترے گی۔ (سبحان السبوح، ص ۹۹)

احوالِ دل:

مسائل مختلف فیہا میں دلائل قاہرہ سے مزین کتابیں پیش کرنے کے باوجود ضد اور ہٹ دھرمی نے آپ کی آواز حق کو ہمیشہ ناقابل اعتنا سمجھا۔ بارہا نہایت نرمی سے اس حق گریزی کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں: ؎

کہنے کو ان سے کہتا ہوں احوالِ دل مگر

ڈر ہے کہ نازِ حسن پہ شکوہ گراں نہ ہو

(سبحان السبوح، ص ۷۳)

حزم واحتیاط:

حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین صاحب ایمان ہیں۔ بے شمار دلائل و براہین سے ثابت کرنے کے بعد منکرین کو تنبیہ کے طور پر نہایت برمحل مصرع تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

طبرانی میں ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: مردوں کو بُرا کہہ کر زندوں کو ایذا نہ دو۔ یعنی حضور تو زندہ ابدی ہیں۔ ہمارے تمام افعال و اقوال پر مطلع ہیں۔ اور اللہ عزوجل فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ O

ترجمہ:۔ جو لوگ رسول اللہ کو ایذا دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

عاقل کو چاہیے کہ اس جگہ سخت احتیاط سے کام لے۔ ؎

ہشدار کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

(شمول الاسلام، ص ۲۲)

مرضی الٰہی:

انسانوں میں عقل و شعور، مال و دولت وغیرہ کے لحاظ سے تفاوت اور فرق ہوتا ہے۔ اس کی نہایت عمدہ مثال سے تفہیم فرماتے ہیں:

یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ۔

ترجمہ:۔ اللہ جو چاہے کرتا ہے، اس کی شان ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ۔

ترجمہ:۔ اللہ جو چاہے حکم فرماتا ہے، اس کی شان ہے۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ۔

ترجمہ:۔۔ وہ جو کچھ کرے اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں اور سب سے سوال ہوگا۔

زید نے روپے کی ہزار اینٹیں خریدیں، پانچ سو مسجد میں لگائیں، پانچ سو پاخانہ کی زمین اور قدم چوں میں صرف کیا۔ اس سے کوئی الجھ سکتا ہے کہ ایک ہاتھ سے بنائی ہوئی، ایک مٹی سے بنی ہوئی، ایک اویں میں پکی ہوئی، ایک روپے کی مول لی ہوئی، ہزار اینٹیں تھیں۔ ان پانچ سو میں کیا خوبی تھی کہ مسجد میں صرف کیں اور ان میں کیا عیب تھا کہ جائے نجاست میں رکھیں۔ اگر کوئی احمق اس سے پوچھے بھی تو وہ یہی کہے گا کہ میری ملک تھی، میں نے جو چاہا کیا۔ جب مجازی جھوٹی ملک کا یہ حال ہے تو حقیقی سچی ملک کا کیا پوچھنا۔

ہمارا اور ہماری جان و مال اور تمام جہان کا وہ ایک اکیلا پاک نرالا سچا مالک ہے۔ اس کے کام، اس کے احکام میں کسی کو مجالِ دم زدن کیا معنی؟ کیا کوئی اس کا ہم سریا اس پر افسر ہے؟ جو اس سے کیوں اور کیا کہے۔ وہ مالک علی الاطلاق ہے۔ بے اشتراک ہے، جو چاہا کیا او جو چاہے گا کرے گا۔ ذلیل، فقیر، بے حیثیت اگر بادشاہ جبار سے الجھے تو اس کا سر کھجایا ہے، شامت نے گھیرا ہے۔ اس سے ہر عاقل یہی کہے گا کہ ”او بد عقل! بے ادب! اپنی حد پر رہ۔ جب یقینا معلوم ہے کہ بادشاہ کمال عادل اور جمیع کمال و صفات میں یکتا و کامل ہے تو تجھے اس کے احکام میں دخل دینے کی کیا مجال؟

گدائے خاک نشینی تو حافظا مخروش

نظامِ مملکت خویش خسرواں دانند

(التحبیر بباب التدبیر، ص ۴)

نظریۂ توکل کی غلط توجیہہ:

نظریۂ توکل کی ایک مکروہ توجیہہ یہ ہے کہ آدمی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کسی گوشہ میں بیٹھ جائے اور تقدیر الٰہی کے تحت روزی کا انتظار کرنے لگے۔ امام اس اندازِ توکل کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ملائکہ کا بے آب وغذا زندگی گزارنا کسے نہیں معلوم، مگر یہ انسان میں خرقِ عادت ہے۔ جس پر ہاتھ پائوں توڑ کر بیٹھنا، جہل و حماقت، یہاں تک کہ اگر تقدیر پر بھروسے کا جھوٹا نام دے کر خوردونوش کا عہد کرے اور بھوک پیاس سے مرجائے تو بے شک حرام موت مرے۔

اور اللہ تعالیٰ کا گنہگار ٹھہرے۔ مرگ بھی تو تقدیر سے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کیوں فرمایا:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ۔

ترجمہ:۔ اپنے ہاتھوں اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالو۔ ؎

گرچہ مردن مقدر ست ولے

تو مرو در دہان اژدہا

ترجمہ:۔ اگرچہ موت تقدیر ہی سے آتی ہے، مگر جان بوجھ کر اژدہے کے منہ میں نہ چلے جائو۔ (التجیر بباب التدبیر، ص۳)

حقیقی توکل:

توکل کی صحیح رُخ سے توضیح کرتے ہوئے قلم بند فرمایا:

تلاش حلال و فکر معاش و مقاطی اسباب ہرگز منافی توکل نہیں، بلکہ عین مرضی الٰہی ہے کہ آدمی تدبیر اور بھروسہ تقدیر پر رکھے۔ اسی لیے جب ایک صحابی نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کی: اپنی اونٹنی کو آزاد چھوڑ دوں اور خدا پر بھروسہ رکھوں یا اسے باندھوں اور خدا پر توکل کروں؟ ارشاد فرمایا: ''قید و توکل''۔ باندھ اور خدا پر تکیہ رکھ۔ ؎

بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

(التجیر بباب التدبیر، ص۹)

اظہارِ افسوس:

ادلہ واہبہ، صفحہ ۱۲۴ر کی ایک عبارت پر جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ کے لیے بیوی بچے ہونا عقلاً محال ہوتا تو نصاریٰ اتنی عقل مند اور ایسے صناع ہیں، وہ اسے کیوں مانتے؟ امام احمد رضا ان گندم نما جو فروش دین داروں کی عقل پر اظہار افسوس فرماتے ہیں اور یہ شعر لکھتے ہیں: ؎

چشم باز و گوش باز و ایں ذکا

خیرہ ام در چشم بندی خدا

ترجمہ:۔ آنکھ کان صحیح سلامت ہوتے ہوئے عقل ایسی خدائے تعالیٰ کی اس حکمت چشم بندی پر میں حیران ہوں۔

(پیر کان جانگداز، ص۱۵۷)

خان ناحق:

علمائے سو کی تردید فرماتے ہوئے ان کے آزارِ قلم کی زبوں کاریوں کا ذکر کیا، جس نے لا تعداد سچے مسلمانوں کو خارج از اسلام قرار دے دیا، جس کے دست برد سے صحابۂ کرام، تابعین، علما و صلحا، حتیٰ کہ مولانا شاہ ولی اللہ اور مولانا عبدالعزیز محدث دہلوی تک محفوظ نہ رہ سکے۔ پھر

یہ خود اس سے بچ کر کہاں جاتے۔ انھیں خود ان کی شامت اعمال نے درگزر نہ کیا۔ امام تحریر فرماتے ہیں: ”کے کرد کہ نیافت .....کمال تدین قداں“۔

دیدی کہ خونِ ناحق پرواز شمع را

چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

(سبحان السبوح، ص ۱۰۵)

بے حیاباش:

ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے معائب کا امکان رکھنے والوں اور مراتب انبیاعلیہم السلام میں چنیں وچناں کرنے والوں کو مبدائے دین و شرع پر کلوخ زنی کے باوجود دعوئ ایمان داری ہے۔ ان کے عقائد فاسدہ کی واضح تردید فرماتے ہوئے سبحان السبوح صفحہ ۶۱ / پر ”بے حیاباش ہر چہ خواہی کن“ پر نہایت ستھری اور مبنی بر حقیقت تضمین کرتے ہیں: ؎

تیر بر جاہ انبیاء انداز

طعن در حضرت الٰہی کن

بے ادب زی و ہر چہ دانی گوئے

بے حیاباش ہر چہ خواہی کن

(سبحان السبوح، ص ۶۱)

شوخی رفتار:

ائمہ مجتہدین اور فقہائے قدیم کی جس کے نزدیک کوئی وقعت نہ ہو، اسے آپ کیا کہیں گے؟ انھیں حضرات میں کہ ایک شوخ چشم مجتہد العصر ہیں۔ امام احمد رضا نے ان کے اکیس اجتہادات پر گرفت فرمائی ہے، جس میں انھوں نے بزعم خویش مسائل مختلف فیہا پر بڑے نپے تلے تیر مار رہے ہیں۔ مگر محولہ کتابوں سے اپنے مقصد کی عبارتیں اخذ کرنا اور عقائد حقہ کی تائید کے باب در باب نظر انداز کر دینا، جو کہ ان حضرات کا جماعتی وطیرہ ہے۔ بغی شدت سے عامل ہیں۔ امام فرماتے ہیں:

العظمۃ للہ دربارۂ قیام ان کے ایک لفظ متحمل پر جس کے معنی علامہ حلبی نے واضح کر دیے، اتنا اچھلنا اور اسی مجلس اقدس کے باب میں انھوں نے دفتر کے دفتر لکھے اور کسی زور و شور محققانہ سے اس کے عمدہ مستحبات اور اجلۂ محسنات سے ہونے پر عرشِ تحقیق ثابت کر دیا۔ وہاں یوں دبے پائوں نیچی نظریں، بدن چرائے نکل بھاگے جانے ہم نے دیکھا ہی نہیں۔ اللہ رے تغافل۔ ؎

فتنہ آنکھیں ہیں غضب شوخ ہے چلنا تیرا

کر گیا کام یہ بچ بچ کے نکلنا تیرا

(سیف المصطفیٰ، ص ۴۶)

جدید فقہ:

ایک صاحب کو اردو فقہیات میں کچھ شد بد ہوگئی۔ انگریزوں کی شہ پر اجتہاد کا شوق چرایا۔ آپ نے اُلو کا گوشت حلال کر دیا۔ پھوپھی اور بھتیجی کو حرمت کی فہرست سے نکال کر حلت کے دائرے میں لا بٹھایا۔ اس پر دنیا دار لوگ چاہے "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" بنے رہتے۔ مگر وقت کے امام کو کہاں تاب؟ ایسی خبر لی کہ ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ ایک شعر خاص انھیں کے لیے موزوں فرمایا: ؎

کہاں کا اسلام کیسی ملت مجوسیت کو نہال کیجیے

مزے سے اُلو کا گوشت کھا کر پھوپھی بھتیجی حلال کیجیے

(سیف المصطفیٰ، ص۵۷)

ہٹ دھرمی:

سابق والی محمد آباد نے بھی کچھ اسی قسم کی گل افشانی کی، جس پر امام احمد رضا نے مواخذہ کیا۔ تحریر کا آخری پیراگراف ملاحظہ کریں:

صفحہ ۴۰؍ پر صاحب در مختار کو ان لوگوں میں داخل فرمایا، جو صلوٰۃ الرغائب اور نماز نصف شعبان کو بدعت منکرہ کہتے ہیں۔ یہاں بھی در مختار دیکھنے کا تصدعہ نہیں دیتے، مگر جناب ڈپٹی المجسٹریٹ بہادر کے رسالہ "امداد المسلمین" پر ذرا نگاہ روبرو ہوجائے کہ صفحہ ۱۲؍ پر فرماتے ہیں:

بعض فقہا، جیسے صاحب در مختار وغیرہ نے حدیث پر اعتماد کر کے جواز لکھ دیا ہے۔ الغرض: ؎

رحم آتا ہے حیا مجھ کو تری غربت پر

خوب شوخی نے لٹائی ہے کمائی تیری

(سیف المصطفیٰ، ص۸۱)

بوکھلاہٹ:

علم و استدلال کے میدان میں علمائے دیوبند نے امام احمد رضا کی تصنیفات کے جواب لکھے۔ مگر بوکھلاہٹ میں اپنی پچھلی تحریروں کی خود ہی تردید کر گئے۔

چنانچہ تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کو ایک ساتھ رکھئے تو ان میں بے شمار مسائل ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ انھیں بوالعجبیوں کا ذکر تھا، جس پر امام نے یہ شعر ثبت فرمایا: ؎

گہ بت شکنی گاہ بمسجد زنی آتش

از مذہب تو گبر و مسلماں گلہ دارند

زندرُوبہ لنگ لاف شکار:

میلاد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں قیامِ تعظیمی کا ثبوت دیتے ہوئے سینکڑوں دلائل پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اب منصف انصاف کرے۔ علمائے مکہ و مدینہ وجدہ وحدیدہ وروم و شام و مصر و دمیاط ویمن وزبید و بصرہ وحضر موت وحلب وحبش وبرزنج وبرع وکرد و داغستان و اندلس وہند کا اتفاق ارباب عقول کو قابل قبول نہ ہوگا...؟ تعصب نہ کریں تو ہم ایک تدبیر بتائیں۔ ذرا اپنے دل

کو خیالاتِ ایں وآں سے رہائی دیجیے اور آنکھیں بند کرکے، گردن جھکا کر یوں دل میں مراقبہ کیجیے کہ گویا یہ سینکڑوں اکابر ایک وقت میں سب کے سب زندہ موجود ہیں اور اپنے مراتب عالیہ کے ساتھ ایک مکان عالی شان میں جمع ہوئے ہیں اور ان کے سامنے مسئلہ قیام پیش ہوا ہے اور ان سب نے یک زبان ہوکر بآوازِ بلند فرمایا ہے کہ بے شک مستحب ہے۔ وہ کون ہے جو اسے منع کرتا ہے؟ ذرا ہمارے سامنے آئے۔ اس وقت ان کی شوکت وجبروت خیال کیجیے۔ اور مشتے چند مانعین ہندوستان میں ایک ایک کا منہ چراغ لے کر دیکھئے۔ ان میں سے کوئی بھی اس عالی شان مجمع میں جاکر ان کے حضور اپنی زبان کھول سکتا ہے۔ اور یوں تو: ؎

چوں شیراں برفتند از مرغ زار

زند روبہ لنگ لاف شکار

(اقامۃ القیامۃ، ص۲۱۔۲۲)

صدر الشریعہ اور درس وتدریس

کاروبارِ تدریس کی تقدیس وطہارت پر ڈاکٹر اقبال کی زبان سے جب یہ ریمارک سننے میں آیا: ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا

کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

تو ذہن میں خیال گزرا کہ مدارس و مدرسین نظامِ عالم میں قانونِ رحمت کی عطر بیزیاں گھولنے کا ذریعہ ہیں، نہ کہ انسان کی فطری صلاحیتوں کا خون کرنے والے۔ گویا اقبال کا اشارہ مدارسِ اسلامیہ کی روحانی طہارت کو بدنام کرنے والے لوگوں کی طرف ہے، معًا نگاہ تاریخ اسلامیانِ ہند کی اس صفحہ پر ٹک گئی، جب اورنگ زیب عالمگیر جیسے باجبروت شہنشاہ کا ایک قاصد امیٹھی جیسی غیر معروف بستی میں ایک خرقہ پوش درویش صفت عالم کا دروازہ پر باادب کھڑا ہے۔

کون ہے یہ؟

عالم ربانی ملا احمد جیون علیہ الرحمہ کے پاس شاہ جہاں آباد دہلی سے بادشاہ کا مکتوب لے کر آنے والا قاصد، عالم ربانی نے شاہی لفافہ چاک کیا اور فرمانروائے ہند کا مکتوب پڑھنے لگے، جس میں بادشاہ نے نہایت منت وسماجت سے ان کو طلب کیا تھا اور سواری کے لیے خاص اپنا گھوڑا بھیجا تھا، پورا خط پڑھنے کے بعد آپ کی زبان سے ایک جملہ برآمد ہوا ”کاش کہ اورنگ زیب کو معلوم ہوتا کہ میں بھی اس سے کچھ کم مصروف نہیں“۔

اس کے بعد اورنگ زیب کو جو جواب تحریر فرمایا، اس کا یہ فقرہ بھی لائق توجہ ہے ”تم جانتے ہو یہاں تشنگانِ علوم دینیہ اس نیاز مند سے رشتہ جوڑے پڑے ہیں، ان پر علم کا دروازہ کیسے بند کردوں“۔

جملہ کی گہرائی اور معنی خیزی پر توجہ دیجیے تو مدارس کی فضاؤں میں مرتب ہونے والا تدریس وتعلم کا رنگ وآہنگ مملکت و سلطنت پر فائق نظر آرہا ہے۔ ٹوٹی چٹائیوں پر بیٹھے ہیں، مگر تختِ طاؤس ان کی قدم بوسی کو بے قرار ہے۔ ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق رائیں قوم

شہانِ بے کلہ وخسروانِ بے کمر اند

انھیں شاہانِ مملکت علم و ادراک میں چودھویں صدی کے نصف اوسط میں مسند تدریس سے علوم نبویہ کی تقسیم فرمانے والے عظیم عالم ربانی حضرت صدرالشریعہ فقیہ اعظم علیہ الرحمہ بھی ہیں، جن کی تدریسی سرگرمیوں نے ہندوستان میں حافظ ملت بانی الجامعۃ الاشرفیہ اور پاکستان میں محدث پاکستان مولانا سردار احمد گورداس پوری جیسے اشخاص کے ذریعہ علم و شعور کی خنک روشنی عطا کردی۔ حضرت صدرالشریعہ فقیہ اعظم

مصنف بہار شریعت کی تدریسی خدمات پر روشنی ڈالنا ان کی بارگاہ سے بلا واسطہ خوشہ چینی کرنے والے کسی عالم جلیل ہی کا کام ہے۔ ہاں میں زیادہ سے زیادہ نزدیک و دور بکھرے ہوئے جلوہ زار علم کی کچھ کرنوں کو سمیٹ سکتا ہوں۔ ؂

ہم سے جمالِ یار کی تابندگی نہ پوچھ
ہم تو بتانے والوں پہ قربان ہوگئے

حضرت صدرالشریعہ میدانِ تدریس کے شہ سوار تھے۔ میدان کے کسی رُخ سے بھی جن کے علمی پیکار کی خوبیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ تدریسی سلسلہ میں حضرت کی چند نمایاں خصوصیات پر ان کے جن تلامذہ نے جو کچھ لکھا ہے، مختصراً حاضر خدمت ہے:

''آپ حدیث، تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ، معانی، بیان، بدیع، فلسفہ، منطق، نحو، صرف، حساب، ہیأت، ریاضی، ہندسہ، اصولِ حدیث، طب، تاریخ اور جملہ مروجہ علوم وفنون پر یکساں نہ صرف عبور رکھتے تھے، بلکہ طلبہ کو گھول کر پلانا بھی جانتے تھے''۔

انداز تدریس ایسا فطری بتایا جاتا ہے کہ پہلے طالب علم سے عبارت پڑھواتے، اسی سے ترجمہ کراتے، عبارت و ترجمہ کی درستگی کے بعد تشریحی و توضیحی تقریر فرماتے۔ تقریر اتنی جامع اور مانع ہوتی کہ وارد ہونے والے اعتراضات خود ہی دفع ہوجاتے اور کبھی اونچی اونچی کتب قاضی مبارک، امور عامہ، میر زاہد خیالی، شمس بازغہ وغیرہ میں تقریر درس کے بعد خود ہی اہم مقامات پر محاکمہ بھی فرماتے۔ تقریر کا انداز ایسا دل پذیر ہوتا کہ ذہن پر مرتسم ہوجاتا۔

ترجمہ کرنے میں بعض الفاظ سے چڑھ تھی، مثلاً فی کا ترجمہ بیچ اور اندر کرنے سے فرماتے کہ اندر اسم ہے اور فی حرف ہے، حرف کا ترجمہ حرف سے اور اسم کا اسم سے ہونا چاہیے۔ ترجمہ کرنے میں اس بات کا خاص خیال رکھتے کہ اردو زبان وادب کا حسن زائل نہ ہونے پائے۔

میدانِ درس وتدریس میں ایک مرحلہ مدرسین کی لیاقتوں کی باہمی تصادم اور معاصرانہ چشمک کا بھی آتا ہے۔ حضرت فقیہ اعظم بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ اس دور کے بعض علما امتحان کے موقع پر حضرت کے شاگردوں سے غبار خاطر کا اظہار کردیتے۔ چنانچہ دادوں کے ایک امتحان کے دوران جناب مولانا خلیل صاحب سے ایک ممتحن خارج از کتاب سوال کرنے لگے اور انھوں نے صدرالشریعہ کی شاگردی کا حق ادا کرتے ہوئے یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ یہ سوال میری کتاب سے بلند ہے جواب دے دیا۔

صدرالشریعہ خود اپنے تلامذہ کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اس امتحان کی رپورٹ ملی تو فرمایا: ''میرا خلیل انھیں درس دینے کی صلاحیت رکھتا ہے''۔

تصنیف و تالیف کی اہمیت ہر زمانے میں مسلم، مگر اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ ایک مصنف اپنی تصنیف سے مطالعہ کرنے والوں کو تو ضرور مستفید کرسکتا ہے، مگر علومِ اسلامیہ کے تمام ماہرین اسی جانب متوجہ ہوجاتے تو بعد کے دور کو علما کہاں سے میسر آتے؟۔

آپ کا دور اعلیٰ حضرت کی تصنیفات کی دھوم دھام کا دور تھا۔ فقیہ اعظم اگر اسی جانب متوجہ ہوجاتے تو ایک عظیم پیمانہ کا دارالمصنفین قائم کرسکتے تھے یا خود اپنے زور قلم سے تصنیفات کا ایک انبار چھوڑ سکتے تھے، عہد ساز ضرورتوں کے پیش نظر فقہ حنفی کی عظیم کتاب شرح معانی الآثار جلد اول نصف پر حاشیہ محض سات ماہ کی قلیل مدت میں تحریر فرمانے والے قلم کار کے لیے کچھ دشوار نہ تھا، مگر ان کی دور بیں نگاہوں

نے اس طرف کوئی خاص شغف نہ رکھا۔ چوں کہ ان کا مقصود یہ تھا کہ میں کیوں نہ درس گاہ کی چٹائی پر بیٹھ کر فیضانِ نظر سے ایسے دیوانے پیدا کروں، جو نظامِ مصطفی کے قیام واستحکام کا ستون بنیں۔

مجھے کہنے دیجیے کہ صدرالشریعہ کی نگاہ مستقبل کے ہندو پاک پر تھی، جب ان کی بارگاہ کے خوشہ چینیوں سے بساطِ علم وتہذیب کی لالہ کاری ہونے والی تھی، صدرالشریعہ کی تدریس نہ ہوتی تو حافظ ملت کہاں سے پیدا ہوتے، محدث پاکستان کا وجود کہاں سے ہوتا؟ دنیا شیخ العلما کو کہاں سے پاتی اور کہاں ہوتے علامہ ازہری اور مولانا وقار الدین جیسے علما۔

مذکورہ مدرسانہ کمالات میرے نزدیک ہرگز لائق اعتنا نہ ہوتے، اگر اس عظیم شخصیت میں فیضانِ نظر کی صفت نہ پائی جاتی۔ اللہ اللہ! کیا نظر تھی، جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا۔

تدریسی اور تعلیمی مہارت وکمالات اپنی جگہ، اس کا تو یہ عالم ہے کہ نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں شیروانی جیسا دور اندیش زمانہ میں ان الفاظ میں اعتراف کر رہا ہے: ”میرا جو ذاتی تجربہ ہے، وہ یہ کہ جس کو مدرس کہتے ہیں وہ ہندوستان میں چار پانچ سے زائد نہیں، ان چار پانچ میں سے ایک مولوی امجد علی صاحب ہیں“۔

(روداد مدرسہ سعیدیہ دادوں، بابت ۱۳۵۷ھ۔۱۳۵۸ھ)

جب اخلاص مند سینوں پر علم نبوی کا پرتو پڑتا ہے تو ایک تنہا انسان خدمات اور کارناموں کی پوری انجمن پر بھاری ہو جاتا ہے، پھر اس کا ہر اقدام کس پوشیدہ قوت کے مقناطیسی اشاروں پر متحرک ہوتا ہے، ایسے لوگ ہی جب مسند تدریس پر جلوہ آرا ہوتے ہیں تو درس گاہوں سے فکر غزالی اور شعورِ رازی کا انعکاس ہوتا ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے اس اضطراب دروں کا جو علوم اسلامیہ کے مدرسین کا طرۂ امتیاز ہے۔

نہ عیش کوشی وسروت نہ حب جاہ وحشم
جو اضطراب نہ دیکھے وہ زندگی کیا ہے

ایسی زندگیاں ہی عہدوں اور قرنوں کی زندگی کی ضمانت ہوتی ہیں، یقیناً فقیہ اعظم ایک عہد کے مسیحا اور ایک دور کے مؤسس ہیں۔ فعال، متحرک اور حیات بخش۔

عشق کی رہ میں فنا ہو گیا دیوانہ تھا
روش کش مکش دہر سے بے گانہ تھا
ہند کی خاک کا بے مثل فقیہ اعظم
شمع محرابِ رسالت کا یہ پروانہ تھا

مفتی اعظم اور دورِ حاضر کے علما و مرشدین

جرأتِ حق گوئی:

علمائے دین کا اصل وقار، حق گوئی و بے باکی ہے۔ جسے اسلام نے "افضل الجہاد" کا مقام عطا فرمایا ہے۔ علم کو انحطاط ہو رہا ہے۔ دین کی قدریں پامال کی جا رہی ہیں۔ قرآن و حدیث کی منشا جاننے اور اس سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے بجائے، مصلحتوں کی پیروی کا رواج ہو رہا ہے۔ حالات کے رُخ پر ڈٹ کر حق کی صدا بلند کرنے والے روپوش ہوتے جا رہے ہیں۔

علمائے قدیم فرمایا کرتے تھے:

"لوگوں پر عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ ایک تندرست و توانا، موٹا تازہ شخص، جس کے بدن پر چربی کی تہیں جمی ہوں، شہر شہر تلاش و جستجو کرتے کرتے، نحیف و نزار، دُبلا پتلا ہو جائے گا۔ لیکن اسے کوئی ایسا متقی نہ ملے گا، جو سنت پر عامل ہو۔ لوگ اپنی ذاتی رائے اور مصلحت آمیز باتوں کو فقہ کا نام دیں گے"۔

خود مخبر صادق سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی قربِ قیامت کی علامتوں میں شریر فقہا کی پیشین گوئی فرمائی ہے۔ طبرانی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"قیامت قائم نہ ہوگی، تا آنکہ کتاب اللہ کو عار سمجھا جائے گا۔ زمانہ باہم قریب ہو جائے گا۔ محبت و خلوص کم ہو جائے گا۔ خیانت کرنے والے امین بنائے جائیں گے۔ امانت داروں پر الزام لگایا جائے گا۔ جھوٹے کو سچا کہا جائے گا۔ سچے کو جھوٹا گردانا جائے گا۔ لوٹ، مار، قتل کی زیادتی ہوگی۔ بغاوت، حسد اور کینہ فروغ پائے گا۔ لوگ معاملات میں اختلاف کریں گے۔ خواہشات کی پیروی کی جائے گی۔ ظن (گمان) پر فیصلے صادر ہوں گے۔ علم اٹھا لیا جائے گا، جہالت بڑھے گی"۔

اسی طرح طبرانی سیدنا عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ آقا و مولا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ان لوگوں کا کیا حال ہوگا، جو لوگ ہلاک کرنے والوں کی عزت کریں گے اور عبادت کرنے والوں کو ذلیل سمجھیں گے۔ قرآن سے جو ان کی خواہش کے مطابق ہوگا، عمل کریں گے اور جو خلاف ہوگا، اس کو چھوڑیں گے۔ اس طرح وہ بعض پر ایمان رکھیں گے اور بعض سے کفر کریں گے"۔

ان فرامین مبارکہ کے صاف و شفاف آئینوں میں ہمیں قیامت کے نزدیک آنے کی آہٹ محسوس ہو رہی ہے۔ ذرا ایک اُچٹتی سی نظر اس سرزمین پر ڈالیے، جسے دنیا "عالمِ اسلام" کہتی ہے۔ ایک سے ایک قد آور اہل علم، دنیاوی آرام و آسائش کی دلدل میں پھنسے ہوئے، خواہشاتِ منصب اور تفوق و برتری کی دُھن میں غرق ہیں۔ مسلم ملکوں کے اقتدار پر صیہونیت، مسیحیت، اشتراکیت، سامراجیت اپنے اپنے پنجے گڑائے ہوئے ہے۔ رسولِ اعظم و اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ سے استمداد کو شرک و کفر گرداننے والے۔ امریکہ، برطانیہ اور ان کے حواریوں سے مدد کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ مسلمان، مسلمان کی گردنوں پر سوار ہے۔ مسلم حکومت، مسلم حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر

رہی ہے۔ اور علما خاموش ہیں۔ اگر کوئی زبان کھولتا بھی ہے تو اپنے ملک کے حکمرانوں کی حمایت میں، دین و دیانت، حق گوئی اور سچائی کے گلے پر چھری پھیر کر مذہب کا کٹا ہوا سر حاضر کر دیتا ہے۔ الامان والحفیظ۔

سعودی حکمرانوں کو اپنی حکومت کی حفاظت کے لیے ، رب کعبہ سے زیادہ امریکہ پر اعتماد ہے۔ حرمین طیبین کی فضائوں سے کفار و مشرکین کے طیارے گزرتے ہیں اور امامِ کعبہ خاموش ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کی زبان پر تالے لگے ہیں۔

ایسی روح فرسا گھڑی میں، ہمیں ہندوستان کے شہر بریلی کا ایک مرد قلندر یاد آرہا ہے۔ جسے دنیا والے ''مفتی اعظم'' اور اہل بریلی ''بڑے مولانا'' کہا کرتے تھے۔

اللہ اللہ! کیسی جرأت و بصاصت تھی اس بندۂ مومن میں، جس نے کروڑوں ہندوؤں کی آبادی کے ملک میں رہ کر حکومت وقت کے فیصلے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مصلحتوں کے پجاری سرنگوں ہیں۔ حالات اور فضا کی برہمی اپنی جگہ ہے۔ نہ جانے کتنے صاحبانِ جبہ و دستار حکومت کے مزاج سے صلح کر چکے ہیں۔ علما کے وقار پر دھبے لگ رہے ہیں اسلامی اور ایمانی جرأت کا خون ہورہا ہے۔ پاس مادی وسائل نہیں۔ طوفانِ بلا کو ٹالنے کا سامان نہیں۔ مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہورہا ہے اور حکومتی قانون کا سہارا لے کر نس بندی کے نام پر لاکھوں انسانوں کے سلسلۂ توالد و تناسل کو منقطع کر دیا گیا۔ عورتوں کے آپریشن کر دیے گئے۔ پولیس مدد کر رہی ہے۔ حکومتی اہل کار شہر شہر، قریہ قریہ، گائوں گائوں، محلہ محلہ اور گھر گھر دستک دے رہے ہیں۔ آپ کے کتنے بچے ہیں؟ اگر دو یا تین ہیں تو نس بندی کرائیے۔ کہیں لالچ دے کر، کہیں ڈرا دھمکا کر، کسی پر زور دبائو ڈال کر آئندہ کے لیے لوگوں پر اولاد کا سلسلہ بند کیا جارہا ہے۔

مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی تمام قوموں کے لیڈروں نے حالات سے نظر پھیر لی ہے۔ اس وقت ایک اسّی سالہ بزرگ، گوشہ نشین، مرد خدا، مفتی اعظم کے کانوں تک بات پہنچتی ہے۔ آپ نے حالات کی ناسازگاری، حکومت وقت کے ظلم و ستم اور ملک بھر کے عام رجحان کے خلاف اپنا فتویٰ صادر فرمایا اور مسلمانوں کو تاکید فرمائی کہ خبردار! کسی لالچ، حرص یا دبائو میں آکر مسلمان اس ناجائز کام میں ملوث نہ ہوں۔

فتوے کی ہزاروں نقلیں تیار کی گئیں اور تمام اطراف ہند میں بھیجی گئیں۔ حکومت کے ایوانوں میں بھی یہ فتویٰ پہنچا اور شہروں، گائوں اور بستیوں کے چوپالوں میں بھی اس کے مضامین دہرائے گئے۔ خدا کی قدرت ایسی کہ ایمرجنسی کے دوران اسی نس بندی کے جبری نفاذ نے ہندوستان بھر میں برسراقتدار جماعت کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑا دی۔ اور اس کے بعد جو حکومتی انتخاب عمل میں آیا، اس نے ایمرجنسی اور نس بندی کے ذریعہ ظلم و ستم کرنے والوں کو بُری طرح ذلیل کر کے رکھ دیا: ؎

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے تھے اندازِ خسروانہ

اس بارے میں حضرت علامہ سید محمد مدنی میاں کچھوچھوی لکھتے ہیں:

''ایمرجنسی کے دور میں ظالم و جابر حاکموں نے ظلم و جور کی حد کر دی اور خاندانی منصوبہ بندی کے غیر اسلامی نظریہ کو منوانے کے لیے وہ ستم ڈھائے گئے کہ الامان والحفیظ۔ اس جور و ستم کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما کی زبانیں گونگی ہوگئیں۔ بلکہ ابن الوقت، حکومت وقت کی حمایت پر اتر

آئے۔ کرائے کے مفتی مسند افتا کی مٹی پلید کرنے لگے۔ ایسے خوف وہراس کے عالم میں خدا نے اپنا دین بچایا مفتی اعظم ہند کے ذریعہ، جنھوں نے اندیشۂ سوئے زیاں سے بے نیاز ہوکر، حکومت وقت کے خلاف فتویٰ دیا اور سائیکلو اسٹائل کرا کے ملک کے گوشے گوشے میں روانہ کیا۔ چوں کہ دیگر جملہ ذرائع ابلاغ و ترسیل پر گورنمنٹ کے آہنی پنجوں کا دبائو تھا، اس لیے ان کو اشاعت کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکا''۔ (استقامت کانپور، مفتی اعظم نمبر، مئی ۱۹۸۳ء، ص۱۳۶)

اس وقت ملک کی فضا کتنی مسموم تھی۔ مسلمان اقلیت تو درکنار، اکثریتی طبقہ کی زبانوں پر تالے لگے ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں جرأتِ رندانہ کا یہ اقدام کوئی مردِ حق آگاہ ہی کر سکتا تھا۔ حضور مفتی اعظم کی اس شیرانہ جست نے مسلمانانِ ہند میں مسرت کی لہر دوڑا دی اور ہزاروں قلوب کی یاس وقنوطیت، بے بسی و حرماں نصیبی کے دلدل سے نکل کر ایمان باللہ کی جلوہ گری دیکھنے لگے۔ حضور مفتی اعظم کی ذات اس وقت اسلام کا مینارِ عظمت بن کر بلند ہوئی اور بریلی کی خانقاہ سے حسینی شان کا پرچم بلند ہوا۔ حق گوئی و بے باکی کا پرچم۔

شہزادۂ خانوادۂ برکات مولانا سید محمد امین میاں مارہروی لکھتے ہیں:

''یوں تو مجھے حضرت والد کی بہت سی باتیں متاثر کرتی ہیں، مگر جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ''استقامت فی الدین'' اور شرعی احکام کا کھلم کھلا اعلان ہے۔ فیملی پلاننگ کے مسئلہ پر سارے علما اور مشائخ نے رخصت پر عمل کیا۔ اکثر علما نے سکوت اختیار کیا اور بہت سے نام نہاد دیوبندی مفتیوں نے سرکاری روِش کے حق میں فیصلے دیے۔ مگر چوں کہ مفتی اعظم ہند رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، لہٰذا انھوں نے حق کا بآوازِ بلند اعلان فرمایا۔ اور اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ اس کا نتیجہ ان کے حق میں کیا ہوگا؟ اور تاریخ شاہد ہے کہ فیملی پلاننگ کے خلاف فتویٰ دینے کے باوجود ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ حضرت کی عمر شریف جہاد بالسیف کے دور سے گزر چکی تھی، مگر ان کے قلمی جہاد نے ثابت کر دیا کہ: ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی''

(ایضاً، ص۱۳۸)

حضرت مولانا الحاج صوفی نظام الدین بستوی شیخ الحدیث مدرسہ تنویر الاسلام امرڈوبھا تحریر فرماتے ہیں:

''۷۶۔۱۹۷۷ء کا وہ پُرسوز دور، جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک ایسے بھیانک طوفان میں کھڑا کر دیا تھا، جہاں سے اسلامیانِ ہند کے سفینۂ اعتقاد کے تختے ٹوٹتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ سعودی ریال، امریکی ڈالر اور حکومت کے ٹکڑوں پر پلنے والے ابنائے وقت علما کے قدموں میں لغزش آگئی تھی، اور نس بندی کے جواز پر مسند افتا پر بیٹھنے والے مفتیوں نے فتویٰ صادر کر دیا تھا۔ ریڈیو، اخبار کے ذریعہ خوب خوب پرچار بھی کیا گیا۔ ہندوستان کا مسلمان اب ایسے موڑ پر پہنچ چکا تھا، جہاں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ طوفان ہی طوفان تھے۔ پوری مسلم قوم ایک ایسے میر کارواں کی تلاش میں سرگرداں تھی، جو اسے سہارا دے۔ ایمان واعتقاد کی کشت ویراں کو لالہ زار بنائے۔ سب کی نگاہیں شہرِ عشق و محبت، پاسبانِ ناموسِ رسالت بریلی کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ یکایک بریلی کا مردِ مجاہد، مخالفتوں کی تیز آندھیوں میں اپنے علمی وقار سے

اٹھتا ہے اور بمصداقِ حدیث شریف ''افضل الجہاد کلمۃ حق عند السلطان الجائر'' ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا افضل جہاد ہے۔ آپ نے اعلان فرمایا: نس بندی حرام ہے۔ حرام ہے۔ حرام ہے''۔ (ایضًا، ص۱۰۶)

یقینا یہ جرأتِ مردانہ اور حق و صداقت کے اعلان کا تیور، حضور مفتی اعظم ہند کا حق تھا۔ ان کی زندگی کی کتاب مطالعہ کرنے والوں نے کوئی ایسا ورق نہیں پایا، جب وہ کسی خلافِ شرع امر کے مرتکب ہوئے ہوں، یا کسی ناحق یا نامناسب بات کو سن کر ان کے حق گو لبہائے مبارک خاموش رہے ہوں۔ کیوں نہ ہو؟ دین حق کی حمایت میں عمر عزیز کی شب و روز قربان کرنے والے مجاہد اسلام مجددِ ملت کے شہزادے ہیں۔ انگریزوں کے خلاف جامع مسجد دہلی میں اعلانِ جہاد فرمانے والے علامہ فضل حق کے جانشین ہیں۔ ؎

جس کا نصب العین تھا اعلانِ حق تبلیغِ حق
زندگی جس کی تھی شرعِ مصطفی کا آئینہ

بلادِ عربیہ کے علما:

بلادِ عرب میں تعلیم و تعلم کا قدیم دستور باقی نہیں رہا۔ دنیاوی تعلیم کے مدارس، اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں دینیات اور اسلامیات اور دیگر علوم و فنون کے شعبے قائم ہیں۔ سعودیہ، مصر اور چند ایک اور ملکوں میں اسی اسلوب پر خاص اسلامی جامعات بھی ہیں۔ مگر ہر مسلم ملک میں دینی تعلیم کی پُرانی روش کو تقریبًا خیرباد کہہ دیا گیا۔ اسی لحاظ سے قدیم بار سوخ علما بھی کم ہو رہے ہیں۔

علمائے قدیم جیسی دین سے شیفتگی، والہیت اور فدائیت، دین اور مذہب کے لیے قربانی کے جذبات سرد پڑ رہے ہیں۔ مغربی طرزِ زندگی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ علم حدیث، علم کلام، فقہ اسلامی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے ایک سبجیکٹ کے لحاظ سے اپنے فن کو پڑھتے تو ہیں، مگر ان میں فقہائے اسلام کی پاکیزہ نفسی، محدثین اسلام کے کردار کا پرتو، صلحا کی زندگیوں کا عکس کہیں نظر نہیں آتا۔ مغربی تہذیب کا جنون اس بُری طرح ان کے اعصاب پر سوار ہے کہ سب کچھ پڑھتے ہیں، پڑھاتے ہیں، سیکھتے ہیں، سکھاتے ہیں، مگر خود ان کی زندگیاں مغربیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں۔ (الا ماشاء اللہ)

عالم اسلام کے علما میں دنیا طلبی، حصولِ مراتب اور مصلحت کوشی کی عادتیں عام ہو رہی ہیں۔ اور چوں کہ علم دین خالص مقاصد دینی کے بجائے دوسری مصلحتوں کے تابع ہو گیا، اس لیے مسلم حکمرانوں کی غلط کاریوں پر حق بات کا اظہار کرنے کی جرأت بھی جاتی رہی۔ اگر واقعی یہی حصولِ دنیا ہے تو یقینا عرب حکمرانوں کے کرتوتوں کی حمایت کرنے والے اہل علم، کیا اس فرمانِ نبوی سے غافل ہیں؟:

''من تعلم علما مما یبتغی به وجه الله لا یتعلمه الا لیصیب به غرضا من الدنیا لم یجد عرف الجنة، یعنی ریحها''۔

ترجمہ:۔ جس علم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی جاتی ہے، ایسے علم کو جس نے کسی بھی دنیاوی غرض کے لیے حاصل کیا وہ جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا۔ (احمد اور ابو داؤد، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

پیرانِ برطانیہ:

ہمارے قریبی ملک انگلینڈ میں بھی بعض نام نہاد علما اور پیروں نے مذہب کا بیڑا غرق کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ ان حضرات کے ذریعہ اصحابِ صفہ کے فیوض کیا تقسیم ہوں گے۔ صفائے باطن کی نعمت کیا ملے گی۔ حصولِ زر اور مریدوں، معتقدوں کی بیش از بیش کھیتی اُگانے کی ریس میں، برصغیر کی سیاسی تنظیموں جیسی تمام اخلاق سوز اسکیمیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ ہر ایسا پیر اپنے مریدوں سمیت، گویا اپنی الگ امت تشکیل دے رہا ہے۔ حقیقی فقرا اور درویش جو نام و نمود کے مخالف، پروپیگنڈے سے بیزار اور انسانی سینوں سے ریا، کینہ، حسد او بغض جیسی نجاستوں کو پاک فرمانے کے منصب پر فائز ہوا کرتے تھے۔ ان کے حریص جانشینوں نے امت اسلامیہ میں اپنے وجود سے انتشار، اختلاف، اور تنافر بین المسلمین کے اتنے دروازے کھول دیے ہیں کہ مغربی ماحول میں آنکھ کھولنے والے مسلمانوں کی نئی نسل نہ صرف ''پاکیزہ تعلیماتِ صوفیا'' بلکہ اسلام سے منحرف ہوتی نظر آرہی ہے۔ ان پیروں میں بعض ایسے بھی ہیں، جو مدیح مصطفی کے اشعار جو شاعر روئے والشمس اور زلف واللیل والے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں پڑھتا ہے، اسے اپنی ذات پر منطبق کرتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ سرمجلس نعت خواں نے مازاغ البصر کی تشریح کرتے ہوئے، حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی چشمانِ مبارک کی تعریف کی تو پیر جی نے اپنی آنکھوں پر انگلیاں پھیر لیں۔ زلفوں کا ذکر کیا تو اپنے بالوں پر ہاتھ گھما دیا اور حضور اقدس کے روئے زیبا کی توصیف کی تو پیر صاحب نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ اور حسن اعتقاد میں سرشار مریدوں میں ایک فداکارانہ ہلچل مچ گئی۔

ان میں کا ایک پیر، دوسرے کے مریدوں پر اس طرح قبضہ کرتا ہے، جس طرح مغربی لٹیروں نے ایشیا اور افریقہ کے علاقوں کو اپنی کالونی بنانے کے زمانے میں یورشیں کی تھیں۔ قدیم خانقاہیں تو بھید بھاؤ، اپنے پرائے، زبان و وطن کے خلاف اسلامی جہاد کا عملی مظہر ہوا کرتی تھیں۔ اب اہل ہوا کی جدید خانقاہوں میں مسلمانوں کو اسلام اور روحِ اسلام سے برگشتہ کرنے کے سارے طاغوتی اسلحے استعمال کرنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ سکوں کی چمک محسوس ہو تو ان میں کے بعض پیر اپنے حاشیہ برداروں سمیت کسی اپنے سے ماڈرن (کتوں کی محافظت میں رہنے والے) پیر کے ہاتھوں بک بھی جایا کرتے ہیں۔ یورپ کی دنیا میں ایشیائی پیروں کے کئی طبقے ہیں۔ ان میں کے جو با اصول اور باوضع ہیں، وہ تو گویا پیر ہیں ہی نہیں۔ یہاں کی دنیا میں یہ حضرات اپنی ساکھ جمانے کے لیے برطانوی سامراجیت کے تمام فرسودہ ہتھیاروں کو استعمال کرتے ہیں۔ مظلوم علما کی زبان فقیر کو یہ روایت ملی ہے کہ یہ لوگ اپنے مکر و حیلہ کے ذریعہ مسلمانوں کی تنظیموں پر حاوی ہو جاتے ہیں اور مفتوحہ تنظیم میں کام کرنے کے لیے اپنا مولوی متعیّن کرتے ہیں۔ جس مولوی کی ذمہ داریوں میں سے یہ اہم ذمہ بھی ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پیر جی کے دامن میں باندھے۔ بعض مولویوں سے ماہانہ اور سالانہ حساب لیا جاتا ہے کہ تم نے کتنے لوگوں کو ہمارا ہم خیال اور مرید بنایا۔ کارکردگی اگر متعیّنہ نشانے سے کم ہوتی ہے تو مولوی کی خیر نہیں۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے مولوی کو ایسے جعلی پیر کی من گھڑت کرامت (جو دراصل کراہت ہے) بھی بیان کرنی پڑتی ہے۔ ظاہر بات ہے، اس قسم کے کام دین و دانش کا شعور رکھنے والا کوئی غیرت مند عالم تو کر نہیں سکتا۔ لہٰذا پیروں نے نہایت چالاکی سے کام لیتے ہوئے بس نماز کی امامت، فاتحہ خوانی، ناظرہ کی تعلیم دینے اور دین کی معمولی شد بد رکھنے والوں، مگر حلقہ کی توسیع میں مہارت رکھنے والوں کو ترجیح دینا شروع کر دیا۔ بھول بھٹک کر کسی علمی غیرت رکھنے والے مولوی کو بلا بھی لیا تو وہ بہت جلد گلے کا قلادہ اتار کر آزاد ہو گیا۔ پیر کی ساکھ پر جس کا اثر پڑنا لازمی امر ہے۔ کچھ مفاد پرست مولویوں نے ایسے پیروں سے تعلقات بھی رکھے ہیں، تاکہ ان کے حلقے میں چرنے، چگنے کا موقع ملتا رہے۔ ایسے گھناؤنے ماحول کو دیکھ کر ہمیں برصغیر کے ان

غریب اور مخلص خدامِ اسلام کے قدموں کی خاک چوم لینے کے لائق معلوم ہوتی ہے۔ جنھوں نے تکالیف، مصائب اور پریشانیوں کے باوجود اپنی علمی غیرت پر آنچ نہ آنے دی۔

علمائے عرب اور پیرانِ برطانیہ کے حالات کا آئینہ سامنے رکھ کر، ہم ماضی قریب کے ایک عالم ربانی اور مرشد کامل کی حیات کا مطالعہ کریں تو مشرق و مغرب کا بُعد نظر آئے گا۔

اور مفتی اعظم ہند:

ہم حضور مفتی اعظم علیہ الرحمہ کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے لیل و نہار، سفر و حضر، خلوت و جلوت ہر عالم میں رضائے حق کے کاموں میں بسر ہوئے نظر آتے ہیں۔ اللہ کی مرضی کے لیے جینا اور اسی کی رضا جوئی میں زندگی کے سانس سانس کا محاسبہ کرنا، حضور مفتی اعظم میں دیکھا گیا۔ انھوں نے علومِ اسلامیہ اور تعلیماتِ ربانی کی تبلیغ و اشاعت ہی میں اپنی عمر لگا دی۔ جاگیر دار تھے، زمینوں کے مالک تھے۔ یوں بھی ان جیسے خدا آشنا بندوں پر مال و دولت نچھاور کرنے والوں کی دنیا میں کمی نہیں۔ مگر انھوں نے کبھی اپنے دامن کو دنیا طلبی سے آلودہ نہیں کیا۔

نبیرۂ اعلیٰ حضرت مولانا ریحان رضا رحمانی میاں فرماتے ہیں:

”مفتی اعظم دنیا میں دنیا میں رہ کر بھی دنیا کے نہ ہوئے۔ بلکہ دنیا کے پیدا کرنے والے کے بن کر جیے۔ مہد سے لے کر لحد تک ۹۲/ سال کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا، جس سے آپ کی دنیا میں دلچسپی ظاہر ہو“۔

(استقامت مفتی اعظم نمبر، ص۱۱۱)

حضرت رحمانی میاں اسی مضمون میں آگے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

”بار بار ایسا دیکھا گیا کہ دنیا والے بڑی بڑی پیش کش لے کر آپ کی بارگاہ میں حاضر ہیں، مگر آپ ٹھکرا رہے ہیں۔ دولت مند ہزاروں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں، آپ سختی سے رد کر رہے ہیں۔ جب کسی نے بہت اصرار کیا تو ایک روپیہ اس کی دل جوئی کی خاطر لے لیا۔ اور اگر آمدنی کو مشکوک سمجھا تو کسی بھی قیمت پر کوئی نذرانہ قبول نہیں کیا۔ یہ تھے ہمارے مفتی اعظم! کاش! مولویانِ زر پرست اور پیرانِ تجارت پیشہ ان کے کردار سے کچھ سبق حاصل کرتے اور دین و ملت کی بے غرض خدمت کرتے“۔

(ایضاً، ص۱۱۹)

خادمانِ اسلام کا سب سے عظیم انعام، اللہ جل شانہ کی رضا حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خوش نودی ہوتی ہے۔ مال و دولت جائز راستوں اور حلال بنیادوں پر حاصل ہو تو لینے میں کوئی حرج نہیں، مگر پاک بازانِ امت کے بے داغ سجادے حرص و ہوا کی آماج گاہ بن جائیں تو درد مند مسلمان رو پڑتا ہے۔ گلیم بوذر اور چادر زہرا، زر اندوزی کے لیے نہیں ہیں۔ پنجاب کے ایک دیدہ ور نے انہی حالات کا مشاہدہ کر کے کہا تھا: ”خانقاہوں میں مجاور رہ گئے، یا گورکن“۔

مگر آنکھ والو! آؤ تمھیں سکوں کے جھنکار کے متوالوں، ڈالروں، ریالوں اور پونڈوں کے شیدائیوں کی بھیڑ میں ایک نرالی شخصیت کی زیارت کراتا ہوں۔ جس کے اجلے دامن کی خیرات آج بھی ہزاروں خانقاہوں، ہزاروں مدارس اور محراب و ممبر کے وارثین میں نظر آتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد پی ایچ ڈی، سندھ کی زبان سنو!:

"عشق و محبت نے اس (حضور مفتی اعظم) کو ایسا مست و بے خود کر دیا تھا کہ نہ کسی کی جاہ و حشمت نظروں میں جچتی تھی اور نہ مال و دولت۔ ان کے والد گرامی نے ان کو اور اپنے تمام وابستگان کو یہ نصیحت کی تھی: تاکید اور سخت تاکید کی جاتی ہے کہ دست سوال دراز کرنا تو درکنار اشاعت دین و حمایت سنت میں جلب منفعت کا خیال دل میں بھی نہ لائیں کہ ان کی خدمت خالصتاً لوجہ اللہ ہو"۔

(الرضا، شمارہ ربیع الآخر و جمادی الاولی، ۱۳۳۸ھ ص ۹)

اس ہدایت و نصیحت پر ایسا عمل کیا کہ باید و شاید، متاعِ غرور سے ایسی نظریں پھیریں کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

سنیے سنیے!

حج بیت اللہ شریف سے بمبئی واپسی ہے۔ ایک مرید باصفا نے ایک گراں قیمت کار اس نیت سے خریدی کہ بمبئی سے بریلی تک اس میں لے جائے۔ راستے میں مریدوں اور معتقدوں کو ملاتا جائے۔ اور جب بریلی پہنچے تو یہ کار نذر کر دے۔

بمبئی سے روانہ ہوئے۔ جاں نثار و فدا کار راستے میں زیارت کرتے رہے۔ بریلی پہنچے۔ تکمیل آرزو کا وقت آگیا ہے۔ مرید وفا شعار دست بستہ کھڑا ہے۔ اپنی کار خدمت اقدس میں نذر کر رہا ہے۔ مگر ان کی نگاہ کی رفعت کا عالم نہ پوچھیے: ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

وہ حرماں نصیب اپنی کار واپس لے کر لوٹ رہا ہے، مگر حریمِ جاناں سے درسِ محبت لے کر لوٹ رہا ہے۔ جس کی نظر میں محبوب سما جائے، پھر اور کوئی نہیں سما سکتا۔ ساری آرزو کا حاصل صرف ایک آرزو ہو جاتی ہے۔ ؎

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو سبھی کچھ مل جائے

سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

(ایضاً، ص ۱۴۸)

حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے محاسن اخلاق کے آئینہ خانے سے ورع و اتقا، خدمت خلق، غربا نوازی، انکساری و تواضع، مروت و خیر خواہی، مساکین و اہل حاجت سے ہمدردی اور اہل ثروت سے اجتناب وغیرہ متعدّد اہم نگینے دورِ حاضر کے علما کے تقابل میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جو سب اپنی جگہ قابل توجہ بھی ہیں اور لائق تقلید بھی۔ مگر میری دوسری مصروفیات مانع ہیں۔ توفیق ایزدی شامل حال رہی تو "سوانح مفتی اعظم" میں اس کی آرزو کی تکمیل کروں گا۔ ان شاء اللہ المولی الکریم۔

دامن نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

گل چیں بہ ازیں تنگیٔ داماں گلہ وارد

خدمت علما میں دردمندانہ گزارش!:

بُرائیوں کو مٹانا اور نیکیوں کو فروغ دینا، اسلام کے خدام کی اہم ذمہ داریاں ہیں۔ جہاد جیسا اہم فریضہ بھی ازالۂ منکر ہی کی ایک قسم ہے۔ یورپ ہو یا امریکہ، ایشیا ہو یا افریقہ، دنیا کے ہر خطہ میں بُرائیاں، مفاسد اور منکرات کا نہایت سرعت سے فروغ ہو رہا ہے۔ وہ امور جو کھلم کھلا

صراحتاً حرام ہیں اور تو اور مسلمانوں میں فروغ پا رہے ہیں۔ ایسے حالات میں علمائے اسلام کی کیا ذمہ داریاں ہیں...؟

اسلام کے داعیٔ اعظم، رسول مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

"اذا ظهرت الفتن او قال البدع فليظهر العالم علمه ومن لم يفعل ذالك فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين لا يقبل الله منه صرفا ولا عدلا"۔

ترجمہ:۔ جب ظاہر ہوں فتنے، یا فرمایا: بدمذہباں، تو فرض ہے کہ عالم اپنا علم ظاہر کرے اور جو ایسا نہ کرے، اس پر اللہ، فرشتوں اور انسانوں تمام کی لعنت۔ اللہ تعالیٰ نہ اس کا فرض قبول فرمائے گا نہ نفل۔

اللہ اکبر! کتنی شدید تہدید ہے۔ پڑھ کر روح کانپ جاتی ہے۔ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ جسم میں لرزہ پیدا ہوجاتا ہے۔ کون سی بُرائی ہے، جو ہمارے گرد وپیش نہیں پنپ رہی ہے؟ کون سا فساد ہے، جو بھیانک اژدہا بن کر مسلمانوں کے سامنے کھڑا نہیں ہے؟

سب سے بڑھ کر اسلام دشمن عالمی سامراجی بین الاقوامی نظام، جو دجال دجال بن کر مسلمانانِ عالم کو ان کے دین وایمان سے برگشتہ کرنے میں شب وروز مشغول ہے اور اپنی فتنہ پرور سازشوں سے "ملعون رشدی" جیسے بے شمار اسلام کش خنجروں کو صیقل کرنے میں مشغول ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ قادیانیت، بہائیت، نجدیت اور رافضیت کے سیلاب، دولت وحکومت اور وسائل تشہیر کا سہارا لے کر اسلام کو کمزور کر رہے ہیں۔ مسلمانوں میں بے عملی کی وبا عام ہے۔ شراب، قمار، زنا، فواحش ومنکرات اور بے حیائیوں کی تیزی سے اشاعت ہورہی ہے۔ خادمانِ اسلام طبقہ پر نظر دوڑائیے تو ایک بہت بڑا طبقہ، پیری مریدی کے نام پر شب وروز استحصالِ زر میں لگا ہوا ہے۔ مکروفریب، دجل اور عیاری کے وہ کون سے حربے ہیں، جو ان حریصانِ زر کے استعمال میں نہیں۔ ایسے لوگوں کی سلسلہ بندی، دوڑ دھوپ، مجلس سازی، جلسے جلوس:

این ہمہ از پئے آنست کہ زر می خواہد

وطن اور زبان کے نام پر بندیوں اور گروپ سازیوں کی وبا عام ہے۔ ایسے میں امت کے حال زبوں کی ذمہ داریاں کس پر عائد ہوتی ہیں؟ کیا ہم ان ذمہ داروں کے زمرے سے خارج ہیں؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔

تو آئیے کم از کم اپنے گرد وپیش کو اسلامی تعلیمات اور عملی روشنی سے ہم کنار کرنے کرانے کا کوئی مضبوط پروگرام بنائیں۔ سرزمین یورپ پر ہماری مسلمان نسلیں ارتداد کے نشانے پر ہیں۔ پشتینی مسلمان، شراب وشباب میں ملوث ہیں۔ جوا اور حرام غذائوں سے بہتیرے مسلمان اپنے باطن کو گندا کررہے ہیں۔ اٹھئے کہ اپنے بھائیوں کو ان لعنتوں سے بچانے کا سامان کریں۔ ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر ناداں! عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

جلوۂ مرشد

زندگی کے گزرے ہوئے ماہ و سال کا کارواں جب تصورات کی راہوں پر جلوہ پیما ہوتا ہے، تو ان میں کچھ ایسے انمول لمحات جگمگاتے ستاروں کے مانند ملتے ہیں، جن کی تابانی و لمعانی اپنی پوری کائناتِ زیست پر پَرتو فگن محسوس ہوتی ہے۔

سب کو بھولا، اُن کا ملنا اور بچھڑنا یاد ہے
داستانِ زیست لمحوں میں سمٹ کر رہ گئی

دیدارِ اولیں:

وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے طلبہ، مئو جانے کی تیاریوں میں تھے۔ فرصت کا دن تھا۔ گرمیوں کا زمانہ۔ میں نے اپنے ہم وطن طلبہ سے اس ہماہمی کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا، مئو میں کسی حاجی صاحب کی دعوت پر شہزادۂ اعلیٰ حضرت، تاجدارِ علم و فضل، مفتیِ اعظم ہند تشریف لائے ہوئے ہیں۔ جن کی پیشانی کی سلوٹوں میں معرفت کا نور چمکتا ہے۔ تقویٰ و طہارت جن کے بدن کا لباس اور احقاقِ حق وابطالِ باطل جن کے عمامہ کا طرہ ہے۔ وہ درحقیقت اسلامیانِ ہند کے لیے قابلِ فخر ہستی ہیں۔ مادر زاد ولی اللہ۔ خاندانی عالم ظاہر و باطن ہیں۔ عرب و عجم میں ان کے والد گرامی، مجدد مأۃ حاضرہ کے علمی فضل و کمال اور انقلاب آفرین مذہبی کارناموں کا ڈنکا بج رہا ہے۔ مفتیِ اعظم نائب امام احمد رضا ہیں۔ ان کے چہرے کی لمحہ بھر زیارت، مدت العمر کی بے ریا عبادت سے بدرجہا بہتر ہے۔ آئو تم بھی چلو، ان کی زیارت کرلو۔ ایمان میں جلا، روح میں بالیدگی اور احساس و شعور میں علم کا ذوق نکھر پڑے گا۔ بزرگوں کی نگاہِ کرم سے کیا کچھ نہیں ملتا۔

میں نے اپنے نگراں بزرگ بھائی مولانا حکیم حسام الدین صاحب گھوسوی سے اجازت لی، پھر دارالعلوم کے دفتر انچارج حضرت مولانا علی احمد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) سے اجازت طلب کی اور برادرِ کریم مولانا محمد قاسم قادری، مولانا عبدالمجید نوری وغیرہ کے ہمراہ مئو کے لیے چل پڑا۔ کم عمر اور ناتجربہ کار تھا۔ آقائے نعمت حضور حافظ ملت کے زیرِ سایہ میں ضرور رہتا تھا، مگر اہل اللہ کی بارگاہ کے آداب، میں کیا جانوں؟ ان دنوں ہدایۃ النحو وغیرہ پڑھتا تھا۔ ہم جماعت طلبہ بھی سبھی مجھ سے بڑے تھے۔ حافظ محمد امین جلال پوری، حافظ مونگیری میری جماعت کے ذہین اور محنتی طلبہ تھے۔ میرے ہم ذوق کھلنڈرے طلبہ میں مولوی محمد اسرائیل دیوریاوی میرے اچھے دوست تھے۔ جو نئی نئی طرز میں لا لاکر مجھ سے نظمیں لکھنے کی فرمائش کرتے تھے اور میں شعر و ادب کی فضائوں میں محوِ پرواز رہتا تھا۔

اشرفیہ میری قلبی اور روحانی بالیدگی کا گہوارہ ہے۔ آج بھی یورپ کی دنیا میں دس سال کا زمانہ گزار لینے کے باوجود، میں خواب کی دنیا میں پہنچ کر کبھی وطن مالوف گھوسی کی گلیوں اور کبھی اشرفیہ کی قدیم درس گاہ کے اردگرد طواف کرتا رہتا ہوں۔ اشرفیہ کے ذکر پر خواہ مخواہ بھی جذبات، میری مختصر داستان کو طولانی بنادیتے ہیں۔ نہ جانے کیوں؟ پھر بھی اس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی۔ ؎

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیوں کر ہو

زباں نہ دل کے لیے ہے نہ دل زباں کے لیے (ذوق)

ہم سبھی احباب شوق کے پروں سے اُڑ کر مئو جا پہنچے۔ خوب اچھی طرح یاد ہے کہ مئو ریلوے کراسنگ روڈ کے پاس، شارحِ بخاری، فقیہ عصر، نائب مفتی اعظم علامہ محمد شریف الحق امجدی دامت برکاتہم سے شرفِ ملاقات ملا۔ طلبہ کے سلام پیش کرنے پر حضرت کے رکشارُکی، سب نے دست بوسی کی۔ اور گھوسی کا باشندہ ہونے کے باوجود پہلی بار مجھے نائب مفتی اعظم کی زیارت ہوئی۔ اور یہ حسن اتفاق کیا کہنا کہ مفتی اعظم کی سرکار میں باریابی سے پہلے، ان کے نائب سے ملاقات ہوئی۔ سرکار مفتی اعظم کے میزبان حاجی صاحب کے دولت کدے پر علما کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اس بھیڑ میں میری نگاہوں نے پہلی بار اپنے مرشد طریقت کی زیارت سے شادکامی پائی۔ آقائے نعمت حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے بعد یہ دوسری ایسی شخصیت تھی، جو نگاہوں کی راہ سے میرے دل کے نہاں خانے میں اترتی چلی گئی۔ منحنی پیکر، گندمی رنگ، روشن و تاب ناک چہرہ، دمکتی پیشانی، جھکی جھکی نگاہیں، موتی لٹاتے ہونٹ، روئی کے گالوں سے نرم نرم ہاتھ، مصافحہ کو مل جائے تو آنکھوں سے مل کر دل سے لگاکر بھی نہ جی بھرے۔ ؎

بعض اوقات کسی اور کے ملنے سے عدم

اپنی ہستی سے ملاقات بھی ہوجاتی ہے

بچپن کا شعور ہی کتنا۔ دست بوسی کی، آنکھیں پھاڑے جب تک موقع ملا، انھیں دیکھتا رہا۔ ملکوتی صفات سے مزین، ایک ذات کے گرد، منقول و معقول کے ماہرین، درس گاہِ فقہ و حدیث کے مسند نشین، خانقاہ وزوایا کے خرقہ پوش کیسے پروانہ وار نچھاور ہورہے ہیں۔ میں اس وقت کچھ زیادہ تو نہ سمجھ سکا، مگر حیرت واستعجاب نے یہ احساس ضرور دیا، کہ اپنے اپنے فن کے ان عظیم فن کاروں، علمائے اعلام اور مشائخ کرام کا، شہزادۂ امام احمد رضا کے روبرو، اس طرح سر راہ آنکھیں بچھانا اور عقیدت و احترام میں بے خود ہونا، بلاوجہ تو نہیں ہوسکتا۔ ؎

بے خودی بے سبب نہیں غالب

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

یہ تھی سرکار مفتی اعظم کی روئے تاباں کی پہلی زیارت، جو مجھے نصیب ہوئی۔ میری عمر اس وقت ۱۲/ ۱۳/ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے بعد برادرِ مکرم مولانا رضوان احمد شہید سے جو مفتی اعظم کے مرید تھے، نسبت رضوی و نوری کا نقش ذہن پر ثبت ہوتا رہا اور متعدّد جلسوں اور کانفرنسوں کے مواقع پر اس آفتابِ ولایت کی لمعانیوں سے استفادے کا موقع ملتا رہا۔ تا آنکہ اگست ۱۹۷۸ء ہالینڈ کا سفر در پیش ہوا۔ وہ سفر، جس نے مجھے میرے ماحول۔ میری دنیا۔ میری جولان گاہ۔ میرے وطن۔ اور میرے احساسات اور شعور کی رگوں میں نغمۂ تحریک بن کر گونجنے والی فضائوں سے محروم کردیا۔ ؎

بچھڑ گئے ہیں کہاں ہمسفر خدا جانے

نقوشِ پا بھی نہیں گردِ کارواں بھی نہیں

شرفِ بیعت:

ہالینڈ میں کم وبیش دس ماہ پہلا قیام کرنے کے بعد وطن واپسی ہوئی توروح کی کشش آستانۂ عالیہ رضویہ پر لے گئی۔ میرے ساتھ ہالینڈ کے ایک معمر شخص اسحاق خدابخش اور برادرِ کریم ڈاکٹر محمد قاسم قادری مورانوی بھی تھے۔ سرکار مفتی اعظم نے کرم فرمایا اور اپنے آنگن میں بلاکر شرفِ زیارت وبیعت سے نوازا۔ اور میری خواہش اور طلب کے بغیر شہزادۂ گرامی، حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری قبلہ سے خلافت نامہ منگوا کر پُر کرایا اور دستخط سے مزین فرما کر عنایت کیا۔

میں اس الطافِ خسروانہ پر شرمندہ بھی تھا اور حیران بھی۔ ایک لااُبالی، کھلنڈرا، غیر متوازن انسان، اعمال، اوراد اور معمولات تو الگ، جس کے فرائض و واجبات بھی، اگر رحمن و رحیم رب قبول فرمالے تو قابل قبول ہیں۔ ورنہ: ؎

من آنم کہ من دانم

پھر بھی بزرگوں کا یہ فرمودہ میری تسکین کا ذریعہ بنا: ؎

داد حق را قابلیت شرط نیست

بلکہ شرطِ قابلیت داد اوست

خلافت نامہ کے ساتھ خاص اندرونِ خانہ سے منگا کر اپنا استعمال کردہ، ہلکے ہرے رنگ کا ایک رومال عطا فرمایا۔ رومالِ مبارک جو برادرِ مکرم مولانا ڈاکٹر محمد قاسم قادری، الحاج محمد اسحاق خدابخش اور مجھے مشترک عطا ہوا تھا۔ مگر کرم فرما دونوں رفیقوں نے اپنے حق سے دست بردار ہوکر مجھے ہی بخش دیا۔ جو آج بھی میری گراں قدر متاع ہے۔ اور لباسِ عالم آخرت کا جز بنانے کے لیے بحفاظت رکھا ہوا ہے۔ فقیر قادری کو اس نعمت گراں بہا کا حصول، سرکار مفتی اعظم کی غلامی میں داخلہ اور حصولِ خلافت، ۲۳ر جمادی الاخریٰ ۱۳۹۹ھ/جون ۱۹۸۹ء کو ہوا۔ فالحمد للہ الوھاب علی نعمہ وکرمہ وفضلہ العظیم۔

دس سالہ قیامِ ہالینڈ کے دوران آفات و مصائب کے متعدّد طوفان سامنے آئے۔ مگر الحمدللہ! میرے آقایانِ نعمت کا بے پایاں کرم ہے کہ ہر حال میں میری پشت پناہی فرماتے رہے۔ اور ان حضرات کی پشت پناہی، میرے لیے عزم و ثبات قدمی، بلند حوصلگی، اور بالآخر کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے۔ ؎

اندھیری رات میں گر ان کی یاد ساتھ نہ دے

کہاں اٹھیں یہ قدم اور کہاں ملے منزل

ہالینڈ اور بلجیم کے اندر سلسلۂ عالیہ رضویہ کی اشاعت ہو رہی ہے۔ کئی خانوادوں کو بریلی شریف بھیج کر داخل سلسلہ کرایا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے حرمین طیبین کی سرزمین پر جانشین مفتی اعظم حضرت علامہ اختر رضا خاں قادری دامت برکاتہم کے دامن سے وابستگی حاصل کی ہے۔ اور ایک بار کے سفر ہالینڈ کے دوران، جانشین مفتی اعظم نے ”قادریت و رضویت“ کے انوار سے اس خطۂ تاریک کو خود رونق بھی بخشی ہے۔ ؎

رہے یہ جاری قیامت تک ان کا فیض عام

جہاں میں پھولے پھلے باغِ رضوی و نوری

(بدر)

آخری دیدار:

اسٹرڈم میں (ICN) اسلامک سنٹر نیدر لینڈ کی عملی تگ ودو نقطۂ عروج پر تھی۔ اور وطن ہند میں بھی کئی ضروری کام میرے سفر کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اسی دوران میرے مرشد طریقت کی کشش نے یہاں کے کاموں سے دل اچاٹ کر دیا اور یک بیک میں نے وطن کا رخت سفر باندھا۔ پہلے سیدھے گھوسی پہنچا۔ پھر برادرانِ گرامی مولانا محمد احمد مصباحی و مولانا عبدالمبین نعمانی کے ہمراہ بریلی شریف حاضر ہوا۔ نبیرۂ اعلیٰ حضرت مولانا ریحان رضا خاں علیہ الرحمہ کے ذریعہ مرشد طریقت کی زیارت نصیب ہوئی۔ نقاہت حد سے زیادہ تھی۔ اہل ارادت و محبت کا دن رات تانتا بندھا رہتا تھا۔ معالجین نے لوگوں سے ملنے جلنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ مگر:؎

خود راہ بنالے بہتا ہوا پانی

کے مانند جانبازانِ مفتی اعظم، زیارت اور قدم بوسی حاصل کر ہی لیتے تھے۔ اس وقت حضرت پر اکثر استغراق کی کیفیت رہتی۔ زبان ہمہ دم محو ذکر رہتی۔ جب بھی ہوش میں آتے نماز کے بارے میں پوچھتے۔ مجھے نماز پڑھنی ہے۔ کیا میں نے نماز ادا کی؟۔ یا اللہ میری نماز۔ اس عرصہ میں مخلوقِ خدا شب و روز ٹوٹی پڑتی تھی۔ محلہ سوداگران میں مخلوقِ خدا کا تانتا لگا رہتا تھا، شیخ و شاب، علما و فضلا و عوام، تمنائے دیدار لیے چلے آتے تھے۔

نصف شب کے قریب ہم نے اس آفتابِ ولایت کا دیدار کیا۔ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور ان کے لرزتے لبوں کی دعائیں لیں۔ کسے خبر تھی؟ یہ دیدار ہی ان کا آخری دیدار ہے۔ اور اب اس عالم میں نگاہیں، ان کے جلووں سے محروم رہیں گی۔ دوسرے روز ہم لوگ مبارک پور لوٹ آئے۔

اور وہ چلے گئے:

۱۴؍ محرم ۱۴۰۲ھ، ۱۹۸۱ء کی تاریخ مسلمانانِ برصغیر کے لیے غم واندوہ کی یہ خبر لائی کہ شب میں ایک بج کر چالیس منٹ پر شہزادۂ اعلیٰ حضرت، سرکار مفتی اعظم کا وصال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۵؍ محرم کو اپنی بیٹھک کے اندر نمازِ مغرب سے فارغ ہو کر اہل خانوداہ کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا کہ دارالعلوم اہل سنت شمس العلوم سے مولانا عاصم اعظمی، مولانا رضوان احمد شریفی کا فرستادہ حضرت کے وصال اور ۱۶؍ محرم دو بجے نمازِ جنازہ ہونے کی خبر لایا۔ سنتے ہی بجلی سی گر پڑی۔ اوسان خطا ہو گئے۔ گھر میں جا کر والدہ ماجدہ کو خبر دی اور اجازت لے کر فوراً روانہ ہو گیا۔ بس سے اعظم گڑھ روڈویز پہنچا تو شب کو دس بجے وہاں ہزاروں مشتاقانِ مفتی اعظم کو آمادۂ سفر دیکھا۔ مبارک پور، محمد آباد، جین پور، گھوسی، خیر آباد، چریا کوٹ، شہر اعظم گڑھ اور دیگر قصبات وقریات کے مسلمان سواریوں کے انتظار میں سرگرداں نظر آئے۔

بہرحال ایک بس میں جگہ ملی او رہم لوگ لکھنؤ جا پہنچے۔ برادرانِ گرامی، مولانا محمد احمد مصباحی، مولانا عبدالمبین نعمانی، مولانا عارف اللہ قادری، مولانا نصر اللہ قادری، مولوی قاری شفیق مبارکپوری، مولوی محمد محفوظ ھولندی اور راقم الحروف ہمراہ ہی تھے۔ لکھنؤ سے بھی مناسب

وقت پر سواری مل گئی اور بارہ بجے تک ہم لوگ پھر سرزمین بریلی پر وارد ہوگئے۔ چند روز پہلے تو صرف محلہ سوداگران، عشاق مفتی اعظم سے بھرا پڑا تھا۔ اور آج تو شہر بریلی کا وسیع و عریض دامن بھی انسانی سیلاب سے تنگ ہو رہا ہے۔ ۔

یہ کس کے روئے منور کی جلوہ باری ہے
نظارہ کرنے کو پیر و جواں سبھی نکلے

لاکھوں سوگوار آنکھوں نے، اس آفتابِ ولایت کو زیر زمیں چھپتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عہد کی داستان دفن ہوگئی۔ تقویٰ اور پارسائی کا معیار، اپنے کردار کے دامن میں رکھنے والا چلا گیا۔ مگر ایک روشن تاریخ چھوڑ کر۔ ایک شمع بجھ گئی، مگر ہزاروں چراغ جلا کر۔ انسانی قلوب واذہان میں ایمان وتقویٰ کے نور بکھیرنے والے، مرتے کہاں ہیں؟ وہ تو وفات پاکر زندہ و جاوید ہو جاتے ہیں۔ ۔

کشت گانِ خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

آہ! حضرت علامہ محمد سلیمان بھاگلپوری علیہ الرحمہ

لے اڑی بادِ صبا ہر پھول کا حسن و شباب
اپنے گلشن میں کبھی دور خزاں ایسا نہ تھا

۲۴؍ مارچ صبح ساڑھے آٹھ بجے بذریعہ ٹیلی گرام بھاگلپور سے یہ غم ناک، الم انگیز اور روح فرسا خبر ملی کہ امام المنطق والفلسفہ حضرت علامہ محمد سلیمان صاحب قبلہ بھاگلپوری کا چہار شنبہ ۲؍ ربیع الثانی بمطابق ۲۳؍ مارچ ۱۹۷۷ء کو انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اک شمع کیا بجھ گئی سو بزم سونی کر گئی

مخبر صادق رسول برحق، سید الانبیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اہل علم کی وفات کو قربِ قیامت کی علامت فرمایا ہے۔ ویسے تو اس دنیا کا مکمل نظام ہی ولادت اور وفات کے خط پر مرتب ہے۔ ہر نئی صبح ہزاروں زندگیوں کا پیام لاتی ہے تو ہر شام ہزاروں اموات کی خبر نشر کرتی ہے۔ مگر اس کارخانۂ آمد ورفت میں بھی کچھ ایسے افراد ہیں، جو بڑی خصوصیت کے حامل ہیں۔ جن کے وجود کئی وجوہ سے بنیادِ محاسن ہوتے ہیں۔ جن کے دم سے نظامِ عالم کی بہبودی وابستہ ہوتی ہے۔ ایسے مبارک و مسعود لوگوں کے لیے صرف انسان ہی نہیں، فضائوں کے پرندے اور دریائوں کی مچھلیاں بھی دعائے خیر کرتی ہیں۔ وہ ہیں علمائے اسلام۔ کثرھم اللہ۔

’’وان العالم لیستغفرلہ من فی السموت ومن فی الارض والحیتان فی جوف الماء‘‘۔ (مشکوٰۃ کتاب العلم، ص:۳۴)

ترجمہ:۔ اور عالم کے لیے زمین اور آسمانوں کے باشندے استغفار کرتے ہیں اور پانی میں رہنے والی مچھلیاں۔

حضرت علامہ کے وصال کی اچانک خبر نے حضرات علمائے کرام کو سکتے میں ڈال دیا۔ سوچنے لگے کہ یا خدا! بساطِ عالم کے وہ تمام نگینے، جن سے علم و ادراک کا اجالا تھا۔ فکر و شعور کی وہ تمام قندیلیں، جن سے علم منور تھا۔ اتنی تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ رہی ہیں کہ ابھی ایک کے غم میں ہمارے گریباں چاک ہیں، جب تک دوسرے کی رحلت نے سینہ فگار بنا دیا۔ ابھی اس زخم تازہ کے اندمال کا کوئی سامان بھی نہ ہوسکا کہ تیسرے نے رخت سفر باندھا، جگر پہ اک چرکہ لگا، آہوں نے دل کی زبان بن کر کہا کہ اے رب کائنات!... اب کیا ہوگا؟ یہ پاک نفوس علما، جن کی درس گاہوں سے امت مرحومہ کی رگوں میں خونِ حیات رواں ہے۔ یہ بوریہ نشین گروہ، جس کا جوہر علم بقائے امت کا سبب ہے۔ یہ مقدس لوگ، جن کے قالب ہستی کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بڑی تیز گامی سے شہر خموشاں کی جانب لپک رہے ہیں۔

کل گئے وہ، آج تم اور کل چلے جائیں گے ہم
اس طرح یارو نظامِ مے کدہ تو چل چکا

ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ علمائے اسلام کا ممتاز طبقہ بہت سرعت سے رخت سفر باندھ رہا ہے۔ حضور حافظ ملت، حضرت مفتی جاورہ اور حضرت شیخ العلما تین عظیم علمی ہستیاں دیکھتے دیکھتے رخصت ہوگئیں اور آج کی صبح نے علم و فضل، اخلاص و تقویٰ کے ایک اور نیر

رخشندہ کے غروب کی خبر دی۔ آپ کے وصال سے طبقۂ اولیٰ کے معدودے چند علما میں ایک کی مسند اور اداس ہوگئی۔ اے خدا! اے رب العالمین! اے موت وحیات کے خالق! ان میں کا ہر جانے والا اپنی مسند اداس اور سجادہ خالی کر گیا، توان کانعم البدل عطا فرما، جن کے سوز نفس سے ملت مسلمہ میں نفس تازہ عود کر آئے۔ ایسا بدل جو: ؎

قوت ضبط سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے

حضرت علامہ ضلع بھاگل پور کے باشندہ تھے۔ ابتدائی عربی اور درس نظامی کی کچھ کتابیں مدرسہ اشرفیہ کچھوچھہ شریف میں حضرت مولانا شاہ محمد اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔ پھر جامعہ نعیمیہ مرادآباد، بعدۂ اجمیر شریف وحید العصر صدرالشریعہ کے دربارِ علم وفضل تک رسائی حاصل کر کے خوب خوب سیراب ہوئے۔

دارالعلوم معینیہ عثمانیہ کے دیگر فاضل اساتذہ سے بھی اکتسابِ علم کیا۔ اور وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ دستار بندی کے بعد جامعہ نعیمیہ مرادآباد میں خدمت تدریس پر مامور ہوئے۔ پھر مبارک پور دارالعلوم اشرفیہ میں نائب شیخ الحدیث کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ مبارک پور کے دورانِ قیام آپ کی تدریسی خوبیوں سے طلبہ نے کافی استفادہ کیا۔ کچھ روز بعد مدرسہ بحر العلوم کٹیہار اور کافی عرصہ تک دارالعلوم حمیدیہ رضویہ میں رہے اور چند سال بعد اپنے وطن اگر پور ضلع بھاگلپور میں مدرسہ اشرفیہ اظہار العلوم کے شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین کی حیثیت سے قیام پذیر رہے۔ پھر اخیر دور میں جامعہ حمیدیہ رضویہ بنارس میں دوبارہ تشریف لائے۔

علومِ عقلیہ ونقلیہ کے تمام مروجہ فنون پر محققانہ صلاحیت اور استعداد رکھتے تھے۔ منطق وفلسفہ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ عمدہ مدرس کے ساتھ ساتھ بہترین مقرر بھی تھے۔ آواز نہایت بلند اور باوقار، مضبوط، قوی اور وجیہ چہرہ پہ بھری داڑھی عالمانہ شان میں اور اضافہ کرتی تھی۔ مزاج میں نفاست حد درجہ تھی۔ رہن سہن شاہانہ انداز کا تھا۔ حضرت ممدوح شیخ المشائخ حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمہ مرید اور اسی سلسلہ کے ماذون تھے۔ ساداتِ کرام سے بالخصوص نہایت محبت فرماتے، ان کے سامنے عجز وانکسار سے بچھے پڑتے۔ حضور حافظ ملت کے استاذ بھائی ہونے کے باوجود، ان کی علمی گیریت اور لافانی خدمات کے ہمیشہ معترف رہے۔ الجامعۃ الاشرفیہ کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور سنیت کا عظیم قلعہ فرماتے تھے۔ اخیر دم تک علم دین کی خدمت میں لگے رہے۔ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر کی صدائوں میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور جاتے جاتے بھی قال اللہ اور قال الرسول ہی سے تعلق رہا۔ گویا:

چمن رسالت میں ایک عندلیب عمر بھر جس گل زیبا کے وصف میں رطب اللسان رہا، آج وہ انھیں کی بارگاہِ قدس میں پہنچ گیا۔ ہر طرف شور ہے: ؎

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا

حافظ ملت مرے محسن مرے مہرباں

فلک مصروف ہے ہر دم نیا نقشہ بنانے میں
زمیں کو دیر کیا گزرے ہوؤں کو بھول جانے میں

مگر ہر نقش حیات، نقش بر آب نہیں ہوتا۔ اور نہ ہر انسان ایسا کہ دنیا بآسانی اسے فراموش کر جائے۔ مرنے کے بعد بھی کسی کا انسانی قلوب کی دھڑکن بن کر باقی رہنا، اس کے کارناموں کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے۔ فنا کے بعد بھی تاب و تواں زندگی اس کا حصہ ہے، جو جیتے جی اپنا سرمایۂ حیات، بلند مقاصد، اخلاقی تعمیر اور اعلیٰ نظریات کو فروغ دینے کے لیے وقف کر دے۔

جینا ہے وہی جینا مرنا ہے وہی مرنا
اِک بانکپن سے جینا اِک بانکپن سے مرنا

حیاتِ جاوداں کا طالب ہر ہر نفس کو گردشِ آلام کا مقابل بنائے رکھتا ہے۔ اور اپنے مقاصد جلیلہ کی راہ میں حائل ہونے والی ہر چٹان کو روندنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اگر وادیٔ سینا سوزِ کلیمی کی آئینہ دار...... دشت کربلا، عزمِ حسینی کی علامت...... صحرائے ابتلائے قیس سرمست کی آبلہ پائی کا شاہد...... اور شکستہ چٹانیں فرہاد کی حوصلہ مندیوں کا ثبوت ہیں۔... تو یہ کہنا قرین حقیقت ہوگا کہ الجامعۃ الاشرفیہ بھی کارنامۂ حافظ ملت کی عظیم بساط ہے۔

یہ اس نظریہ کی محسوس تصویر ہے کہ انسانی عزائم اور حوصلے اگر ترقی کر کے دل کی دھڑکن بن جائیں تو آج بھی سنگلاخ چٹانوں سے چشمۂ شیریں رواں ہو سکتا ہے۔ شعلوں کی وادی مہکتے پھولوں کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اور تیز و تند آندھیاں خود چراغ کی ننھی لَو کی محافظت کر سکتی ہیں۔

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

بات اگر قصے کہانیوں جیسی ہوتی تو اس کی واقعیت پر یقین کرنے میں تامل ہوتا، مگر یہ تو عینی مشاہدہ ہے۔ اس لیے بلا خوف تردید عرض کر سکتا ہوں کہ اس ہمارے دور میں، میری محدود نظر اور نظریہ نے حافظ ملت حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث مبارکپوری بانی الجامعۃ الاشرفیہ کو...... ایک مصلح امت...... ایک مقتدائے ملت...... ایک معمارِ قوم...... ایک سچے نائب رسول......... اور عالم ربانی...... ایک درد مند ہستی...... ایک عظیم شخصیت...... ایک بلند ذات......... اور غیر معمولی انسان پایا ہے۔

حافظ ملت! یعنی ؎

گروہِ اہل محبت کا آخری درویش

مرے نصیب کی ڈور:

ہوش کی آنکھیں کھلتے ہی میں نے گھر کے لوگوں سے ان کی علمی جلالت کا تذکرہ اور خدا ترس شب و روز کی باتیں سنیں۔ ماموں جان مولانا عبدالشکور اعظمی (حضرت صدرالشریعہ علیہ الرحمہ کے داماد) والدہ ماجدہ کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کی ہمشیرہ نے انھیں گودوں میں

کھلایا تھا۔ اپنی بہن سے بہت پیار کرتے تھے، ان سے ملنے کے لیے ہمارے گھر آتے تو حافظ ملت کا ذکر، ان کے علمی مشاغل، دینی مصروفیات اور مذہبی خدمات کا تذکرہ نہایت والہیت سے فرماتے۔

انھیں کی کوششوں سے برادرِ مکرم مولانا رضوان احمد شہید علیہ الرحمہ دارالعلوم اشرفیہ پہنچے۔ مبارک پور میں حصولِ تعلیم کے دوران مولانا رضوان احمد صاحب قیام گاہِ حافظ ملت (مدرسہ قدیمہ) کے نزدیک ایک خالی امام باڑہ، موسوم بہ "دفتر قادری، بزمِ ادب" میں رہتے تھے۔ مولانا شہید کے علاوہ دفتر قادری میں مولانا غلام محمد خاں بھیروی (صدرالمدرس انوارالقرآن بلرامپور) ۔ مولانا محمد ابوالليث گھوسوی (صدرالمدرسین فیض الانوار امبکا پور، سرگجہ، ایم پی۔ مولانا عبدالستار پورنوی۔ حافظ عبدالستار گورکھپوری بھی رہتے تھے۔

ان دنوں شہزادۂ حافظ ملت مولانا عبدالحفیظ صاحب اعظم گڑھ شبلی کالج میں زیر تعلیم تھے۔ ہفتہ کی چھٹی میں مبارک پور تشریف لاتے تو زیادہ تر مولانا غلام محمد صاحب اور مولانا رضوان احمد شہید کے ساتھ رہتے۔ پرانے مدرسہ میں قیام کرنے والے طلبہ کو حضور حافظ ملت کی خدمت اور سودے سلوف لانے کی سعادت نصیب ہوتی۔ ان ایام میں مولانا غلام محمد صاحب، حضرت کی خدمت میں سب سے زیادہ رہتے تھے۔ مولانا رضوان احمد صاحب تقریباً ہر ماہ مبارک پور سے وطن (گھوسی) آتے تو حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی نورانی زندگی کے حالات ہم لوگوں کو سناتے۔ ان کے علمی کارنامے، محنت ومشقت، عبادت وریاضت، خاص طور پر قرآن مجید سے حضرت کی والہانہ محبت کا بیان فرماتے۔ ان دنوں میں مدرسہ خیریہ فیض عام مداپور گھوسی میں زیر تعلیم تھا۔ حافظ ملت علیہ الرحمہ کے روئے تاباں کی پہلی زیارت کا شرف مجھے مبارک پور میں حاصل ہوا۔ دوپہر کا وقت، گرمی کا زمانہ تھا، جب میں پُرانے مدرسہ کی خام عمارت کے چبوترہ پر کھڑا، حضرت کے دارالعلوم سے لوٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ تقریباً بارہ بجے دوپہر میں حضرت تشریف لائے۔ میں نے بڑھ کر عقیدت سے دست بوسی کی، حضرت نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ اس کے بعد میں پانچ چھ ماہ تک بھائی صاحب کے ساتھ وہاں رہ کر حضرت مولانا شمس الحق صاحب علیہ الرحمہ کے پاس فارسی پڑھتا رہا۔ حضرت اپنے چھوٹے صاحبزادے جناب قاری عبدالقادر جیلانی بھائی کو تاکید فرماتے کہ وہ میرے ہمراہ دارالعلوم جایا کریں۔ ہم لوگوں میں بہت جلد دوستی ہوگئی، ساتھ ساتھ مدرسہ آنے جانے کے علاوہ ہم لوگ ساتھ ساتھ کھیل کود بھی کرتے۔

کلام اللہ کا ادب:

ایک دن چار بجے شام کو دارالعلوم میں چھٹی کی گھنٹی بجنے کے بعد میں فارسی خانہ سے اور عبدالقادر بھائی حفظ خانے سے نکلے۔ دفتر دارالعلوم کے عقبی زینے سے اتر کر نیچے اس مقام پر پہنچے، جہاں عام طور پر نوٹس بورڈ اور اعلانات لگائے جاتے تھے۔ نوٹس بورڈ دیکھ لینے کے بعد ہم لوگ مین گیٹ کی جانب بڑھنے ہی والے تھے کہ زینے سے حضرت کو اترتے دیکھ کر وہیں رُک گئے۔ حضرت کے پیچھے اور بھی علما اور طلبا تھے، حضرت ہمارے نزدیک تشریف لائے تو ہم نے سلام کیا۔ حافظ ملت نے عبدالقادر بھائی سے کہا: آگے چلیے۔ عبدالقادر بھای حضرت کے احترام میں پیچھے کی جانب سمٹنے لگے تو حضرت نے فرمایا: "آپ قرآن مجید لیے ہوئے ہیں، اس لیے میں نے آپ کو آگے چلنے کے لیے کہا، قرآن ہمارا امام ہے، اسے آگے ہونا چاہیے"۔

سبحان اللہ! کلام اللہ کا کتنا احترام تھا حافظ ملت کے دل میں کہ مصحف شریف اٹھائے ہوئے بچے سے بھی آگے چلنا انھیں گوارہ نہ تھا۔ یقینا ہمارے اسلافِ کرام قرآن مجید کی تعظیم و تکریم کر کے عزت ووقار کے مالک ہوئے تھے۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہوکر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

ایک دن کی بات ہے چار بجے چھٹی ہوتے ہی ہم دونوں (جناب عبدالقادر بھائی اور راقم الحروف) پرانے مدرسہ پہنچ کر کھیل میں مصروف ہوگئے۔ اس بات سے بے خبر کہ کون آرہا ہے اور کون جارہا ہے۔ حضرت دیر سے تشریف لائے، ہم نے انھیں آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہم تو اس وقت چونکے جب محلہ کے ایک لڑکے نے کہا: السلام علیکم مولانا ابا!۔ ہم بوکھلاہٹ میں کھیل سے ہاتھ جھٹک کر کھڑے ہوگئے۔ حضرت نے نزدیک آکر پوچھا: کیا آج مدرسہ نہیں گئے؟ (مخاطب ہم دونوں تھے) جیلانی بھائی بول پڑے: گیا کیوں نہیں تھا؟ ابھی تو آیا ہوں۔ میں نے عرض کیا: ہم لوگ چھٹی ہوتے ہی فوراً چلے آئے۔ حضرت نے اپنی رہائش گاہ کا دروازہ کھولا اور ہم لوگوں کو آنے کے لیے فرماکر اندر تشریف لے گئے۔ ڈبہ سے حلوہ نکالا اور ہم لوگوں کو عنایت کیا۔

آج غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ مجھے عمر بھر کے لیے تلخی حیات کے بالمقابل، ان کی عطاکردہ شیرینی کی حلاوت از بس ہے۔ ؎

اِک جام بخش کر مجھے دیوانہ کردیا
غم ہائے روزگار سے بے گانہ کردیا

ان کی نگاہ، پاک باز ہیں:

دورِ طالب علمی کی بات ہے۔ پرانے مدرسہ میں میں بھی رہتا تھا۔ حافظ ملت اپنے درِ دولت سے برآمد ہوئے۔ حضرت اپنے گھر سے نکل کر جب پُرانے مدرسہ کے چبوترہ پر تشریف لاتے تو ان کے آنے کے انداز، طریقہ اور وقت سے طلبہ جان لیتے تھے کہ حضرت کسی کام سے تشریف لا رہے ہیں، ہم سب لوگ حاضر خدمت ہوجاتے۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ جناب مولوی عبدالرحمن صاحب پورنوی، مولوی نصیر الدین صاحب پلاموی، سید شمیم گوہر الہ آبادی، سید کاظم پاشا حیدرآبادی، مولوی راشد رضا رامپوری وغیرہ کے علاوہ میں بھی حضرت کی خدمت میں آکھڑا ہوا۔ حضرت نے دوکان سے کوئی سامان لانے کے لیے پیسے عنایت کیے، میں فوراً دوکان جانے کے لیے پلٹا۔ اس وقت میں نے جو کرتا پہن رکھا تھا، وہ پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔ حضرت نے متبسم انداز میں فرمایا: ماشاء اللہ مولوی بدرِ عالم پاک باز اور سچے ہیں۔ اور سورۂ یوسف کی یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

وَاِنْ کَانَ قَمِیْصُہٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَکَذَبَتْ وَھُوَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ

(یوسف:۲۷)

ترجمہ:۔ اور اگر ان کا کرتا پیچھے سے چاک ہوا تو عورت جھوٹے ہے اور یہ (سیدنا یوسف علیہ السلام) سچے ہیں۔

طلبہ سے رضا مندی کا معیار:

علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری فرماتے ہیں کہ حافظ ملت جن طلبہ کی علمی مشغولیات سے خوش نہیں رہتے تھے، ان سے کوئی خدمت لینا پسند نہیں فرماتے تھے۔ مبارک پور میں جب تک میں رہا، حافظ ملت کی عنایتیں، کرم فرمائیاں اور توجہات میرے شامل حال رہیں۔ اور اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے حضرت جن طلبہ کو حکم فرمایا کرتے تھے، الحمدللہ کہ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔

حافظ ملت علیہ الرحمہ ان بلند انسانوں میں سے تھے، جو اپنا کام خود کرنا کبھی عار نہیں سمجھتے۔ ایک بار کی بات ہے۔ تعلیمی سال کا آغاز، شروع شوال کی تاریخیں چل رہی تھیں، میں وطن سے آکر حضرت کے دولت خانہ پر حاضر ہوا۔ حضرت بھی غالباً اسی دن مرادآباد سے تشریف لائے تھے۔ میں پہنچا تو دیکھا، حضرت آنگن میں صفائی کر رہے ہیں۔ سلام و مصافحہ کے بعد میں نے صفائی کا کام پورا کیا۔ اور حضرت کا پلنگ جو آنگن میں تھا، برآمدہ میں لے جانے کے لیے اٹھایا۔ حضرت اس وقت اپنے تخت پر بیٹھے کسی کام میں مصروف تھے، پلنگ میری اوقات سے بھاری تھا، جا نہ سکا۔ حضرت کی نظر پڑ گئی، وہیں سے بولے: نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ اور آنگن میں پلنگ کے قریب آکر فرمایا:

''خبردار! یہ بات ہمیشہ یاد رہے کہ اپنی بساط سے زیادہ وزن کبھی نہیں اٹھانا چاہیے۔ ایسا کرنے سے بعض اوقات سخت جسمانی نقصان ہوتا ہے''۔

تندرستی کی اہمیت:

بچپن سے بیرونِ ملک سفر سے پہلے تک میں بہت دُبلا پتلا تھا۔ اکثر شکم کا مریض، سوئے ہاضمہ کا شاکی رہتا۔ استاذِ محترم مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب قبلہ نے جو اُن دنوں دارالعلوم اشرفیہ کے ناظم اعلیٰ تھے۔ ایک بار فرمایا: میں بھی آپ ہی کی طرح تھا۔ ازدواجی زندگی میں داخل ہونے کے بعد جسم پر کچھ گوشت آیا۔ ان شاء اللہ شادی کے بعد آپ تندرست ہو جائیں گے۔ اسی طرح تقاریر محرم کے سلسلہ میں سفر بمبئی کے دوران حضرت مولانا محمد صابر القادری نسیم بستوی نے کہا: ''مولانا! آپ کو اپنی صحت کی جانب بھی توجہ کرنی چاہیے، نوجوانی کے اس عرصہ میں جسم کی ایسی لاغری اچھی نہیں''۔

ایک بار حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے جسمانی قویٰ کی طرف مجھے ان الفاظ میں متوجہ فرمایا:

''اپنی صحت اور جسمانی قوت کی طرف خیال کیجیے۔ دین اور دنیا کا ہر کام تندرستی چاہتا ہے۔ دین کی اچھی خدمت بھی اچھی صحت اور تندرستی پر موقوف ہے۔ اس لیے صحت اور تندرستی کا اہتمام کرنا چاہیے''۔

وعظ و تقریر کا مقصد:

مبارکپور محلہ پُرانی بستی میں حاجی رحمت اللہ صاحب کے آنگن میں میلاد شریف کی مجلس آراستہ تھی۔ حافظ ملت میر مجلس تھے۔ مبتدی طلبہ مشقی تقریریں کر رہے تھے۔ حضرت کا اشارہ پاکر میں بھی کھڑا ہوا اور رٹی رٹائی ہوئی ایک دس منٹ کی تقریر کر ڈالی۔ تقریر کا ابتدائیہ کچھ اس طرح تھا:

''نقش، نقاش کے وجود پر دلیل۔ تصویر، مُصور کے وجود پر برہان۔ اور مصنوع، صانع کے وجود پر حجت۔ ناممکن ہے کہ نقش کو دیکھیں اور نقاش کے وجود کا یقین نہ ہو''۔

ہم لوگوں کی یہ عادت تھی کہ تقریر وغیرہ کرنے میں سامعین سے زیادہ حضرت کے ردعمل پر دھیان دیتے تھے۔ میری تقریر پر حضرت سرخمیدہ، رومال منہ پر رکھے ہوئے، تبسم فرما رہے تھے۔ میلاد شریف ختم ہوا تو حضرت نے مجھ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''ایک نواب صاحب کی حکایت ہے کہ وہ ایک بار اپنی زمین داری کا دورہ کرنے گئے۔ بہت سے کسان مزدور یہ سن کر کہ نواب صاحب آئے ہیں، حاضر ہوئے۔ نواب صاحب نے اَن پڑھ، گنوار مزدوروں سے ان کی زبان میں مخاطب ہونے کے بجائے، فارسی زبان میں باتیں

الفاظ گل افشانی کی:

امسال در کشت گندم تقاطر امطار شد کہ نہ شد، وشد تو چنداں شد؟

دہقان مزدوروں نے نواب صاحب کا کلامِ بلیغ سنا تو باہم یہ کہتے ہوئے ان کے پاس سے چلتے بنے۔ کہ بھیا لوگو! چلو نواب صاحب ابھی قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔

وہی حال آپ کا ہے۔ بھلا بتائیے! ان لوگوں میں برہان وحجت کو کون سمجھے گا؟ ہر بات مخاطب کے لحاظ سے کہی جاتی ہے۔ وعظ اور تقریر کا مقصد لوگوں کو دینی اسلامی، مفید باتیں بتانا ہوتا ہے۔ جن باتوں کو لوگ سمجھیں گے ہی نہیں، ان سے فائدہ کس طرح اٹھائیں گے"۔

اسی طرح مضامین تقریر کے انتخاب کا ذکر کرتے ہوئے، ایک بار فرمایا:

"وعظ اور تقریر میں ایسے مضامین ہوں، جن سے پہلے خود مقرر کا دل متاثر ہوا ہو۔ ایسی باتیں سننے والوں کو بھی متاثر کرتی ہیں"۔ ؎

ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد

کچھ دنوں اشرفیہ سے دور:

کافیہ، قدوری وغیرہ پڑھنے کے بعد، تعطیل کلاں میں وطن گیا تو نیا تعلیمی سال شروع ہوتے ہوتے، چند ساتھیوں کے ہمراہ بنارس کے مدرسہ مظہر العلوم میں داخلہ کرانے کا پروگرام بن گیا۔ اتنی سوجھ بوجھ تو تھی نہیں کہ پیش بینی کرتا۔ جو ارادہ کیا، اس کے لیے والدین سے بھی اجازت لے لی۔ خواہ ناگواری کے ساتھ، مگر والدین نے اجازت دے دی۔ ۶/ یا ۷/ ماہ وہاں قیام رہا ہوگا کہ نانیہال میں سالانہ میلاد شریف کا جلسہ ہوا۔ اس موقع پر میں بھی گھر آیا۔ اس میلاد شریف میں حافظ ملت تشریف لایا کرتے تھے۔ ماموں جان کی بیٹھک میں حضرت تشریف فرما تھے۔ والد گرامی مجھے لے کر حضرت کی خدمت میں گئے، میری تعلیم کے بارے میں والدین کا نظریہ یہ تھا کہ یا تو حضرت کے زیر سایہ رہ کر پڑھو، ورنہ جہاں بھی جاؤ حضرت سے اجازت لے کر جاؤ۔

حضرت نے والد صاحب سے خیریت پُرسی کے بعد مجھ سے دریافت کیا: آج کل آپ کہاں ہیں؟

بنارس مظہر العلوم میں۔

جی ہاں! آپ نے ترقی کی۔ مبارکپور تو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور بنارس ایک بڑا شہر ہے، قصبے سے نکل کر شہر میں جا پہنچے۔ آپ نے تو کافی ترقی کر لی۔

اس وقت والد صاحب پر کھلا کہ میں بنارس حضرت کی مرضی کے خلاف گیا ہوں۔ انھوں نے عرض کیا: حضرت! اسے اپنے سایۂ کرم تلے ہی رکھیں۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ یہ آپ سے دور رہے۔ اس پر حضرت نے فرمایا:

"اشرفیہ آپ کا ہے۔ آپ اشرفیہ کے ہیں۔ انھیں لے کر آجائیے"۔

چنانچہ کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد، حضرت کے کرم سے دوبارہ میرا داخلہ بحال ہوا۔ اور میں اپنے کھوئے گہوارۂ علمی میں دوبارہ لوٹ آیا۔

پیار کا ساگر:

حافظ ملت کی کفش برداری کے طفیل محافل میلاد اور جلسوں میں بھی کم عمری ہی سے حاضری نصیب ہونے لگی۔ مبارکپور میں حضرت کے سایۂ کرم تلے مجھ جیسے کتنے ماں کے ماما اور باپ کا پیار اور شفقت بھول جاتے تھے۔ ایک بار عرس امجدی کے موقع پر علمائے کرام کی موجودگی میں تقریر کر کے میں جب حافظ ملت کی دست بوسی کرنے لگا تو حضرت نے حضور مجاہد ملت کی طرف اشارہ فرمایا، میں نے حضور مجاہد ملت کی بھی دست بوسی کی اور ان کی دعائوں سے سرفراز ہوا۔

ایک مرتبہ بلیا کا سفر درپیش تھا۔ ٹرین کسی اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک مونگ پھلی بیچنے والا آواز دیتا ہوا گزرا۔ حضرت نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور مونگ پھلی خرید کر مجھے عنایت فرمائی اور کھانے کا حکم دے کر خود تلاوت میں مشغول ہو گئے۔

اثرانگیز زبان:

دورِ طالب علمی، ایک عجیب بے شعوری اور آزادی کا زمانہ تھا۔ جب اپنی منفعت و مضرت کا چنداں احساس نہیں تھا۔ بے فکرا اور حوصلوں، امنگوں کا دور۔ مگر حضور حافظ ملت جب کبھی احساس و آگہی سے بھرپور نصیحت فرماتے تو جی چاہتا کہ دنیا کی ساری دلچسپیوں سے منہ موڑ کر اوراقِ کتب میں دفن ہو جائیں۔ حافظ ملت کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کا تاثیر سے یارانہ تھا۔ باتیں کیا تھیں، نپا تلا تیر، جس کا نشانہ خطا نہ کرے۔ الفاظ ان کی زبان سے برآمد ہوتے اور ذہنوں پر مرتسم ہوتے چلے جاتے۔ جس کی بنیادی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ تھی کہ حافظ ملت کی زبانِ مبارک شب و روز تلاوتِ کلامِ ربانی واحادیث محبوبِ یزدانی کے کوثر و سلسبیل سے فیض یاب ہوتی رہتی تھی۔ حافظ ملت لوگوں سے جس قدر ہم کلام ہوتے تھے، اس سے کئی گنا زیادہ ذکر و تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ حداد کے کارخانہ میں جلا پا کر فولاد، اگر شمشیر و خنجر بن جاتا ہے، تو جن مبارک زبانوں کو کن فیکون والے قادر وقیوم کے کلام مبین کا صیقل نصیب ہو جائے، ان سے برآمد ہونے والے الفاظ کا دلوں میں ترازو ہونا کیا بعید ہے؟ حافظ ملت ایسے ہی مرد باخدا تھے۔

حافظ ملت کا دائرۂ اصلاح:

حافظ ملت کے انمول نصائح کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ طلبہ، علمائے اہل ارادت و عقیدت اور عامہ مسلمین ان کے چشمۂ صافی سے سیراب ہوتے تھے۔ نہ جانے کتنے خوش نصیب ان کے آستانے پر پہنچ کر علم و شعور کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ جس کا دامن جتنا وسیع تھا، اس نے اتنا فیض پایا۔ بدر نکما یہ علوم و فنون کا ماہر تو نہ بن سکا۔ البتہ ان کی عنایات کے صدقے محروم نہیں رہا۔ ۱۹/ ۲۰/ سال تک لا اُبالانہ مزاج نے دلجمعی سے کچھ حصولِ کمال تو کرنے نہیں دیا۔ مگر یہ کرم ہے میرے آقائے نعمت کا، جنھوں نے اپنی توجہات اور عنایات سے بہرہ ور فرمایا۔ سچی تصویر کشی شاید خود اپنی نظم کا ایک بند کر سکے، جو میں نے دستارِ فضیلت کے موقع پر ''ہدیۂ تشکر'' کے عنوان سے پیش کی تھی۔ ؎

ہم بھلا سکتے نہیں تیری محبت تیرا پیار
علم کا ساغر لبوں تک تیرا لانا بار بار
شوخیِ بے جا سے اپنا روٹھنا بے اختیار
باوجود اس کے بھی تو نے ہم کو رکھا ہم کنار
آج فرقت کے سوا بھی زخم کیا کیا لے چلے

صدر الشریعہ کا گھوسی:

ایک بار حضرت کے ہمراہ ایک جلسہ کے سلسلہ میں بمبئی کا سفر ہوا۔ ایک جگہ بہت سے علمائے کرام جمع تھے۔ حافظ ملت کہیں تشریف لے گئے اور وہاں حضرت مولانا ابوالوفا فصیحی غازیپوری، مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی اور مولانا سید اسرار الحق صاحبان رہ گئے۔ ان لوگوں میں سے کسی نے مجھ سے میرا نام اور تعلیم وغیرہ پوچھنے کے بعد سوال کیا: کس گھوسی میں رہتے ہو؟ مولانا عبد المصطفیٰ اعظمی کے گھوسی میں یا مفتی شریف الحق کے گھوسی میں؟ میں نے عرض کیا: صدر الشریعہ کے گھوسی میں۔ میرے اس جواب پر وہ لوگ بہت خوش ہوئے اور اس کا ذکر حضرت سے کیا تو حضرت مسکرانے لگے۔

فرشتوں کی ٹرین:

اس سفر کے دوران حضرت کو بمبئی سے بھیونڈی جانا تھا، جہاں جناب عبد الشکور سیٹھ، جناب عبد الغفور مرشد وغیرہما معاونین اشرفیہ سے ملاقات کرنی تھی۔ بھائیکلہ سے لوکل پر سوار ہوئے، ٹرین میں بھیڑ نہیں تھی، کچھ دیر بعد حضرت عمامہ اتار کر آستین اونچی کرنے لگے۔ میں نے سمجھ لیا کہ استنجا اور وضو کا ارادہ ہے۔ عرض کیا: حضور! لوکل ٹرین میں استنجا خانہ نہیں ہوتا۔ فرمایا: ”اچھا! کیا اس ٹرین میں انسانوں کے بجائے فرشتے سفر کرتے ہیں؟“۔

ان کے لطف وکرم کے زینے سے:

حضرت سید العلما مولانا شاہ آلِ مصطفی برکاتی مارہروی علیہ الرحمہ نے بمبئی کی سرزمین پر سنیت کو مستحکم فرمایا۔ ان کی سرپرستی میں وہاں عاشورۂ محرم کے بعد ہر سال ”شہید اعظم کانفرنس“ کا انعقاد ہوتا اور بمبئی بھر میں عاشورہ کی تقریر کے لیے مدعو ہونے والے علمائے کرام ”شہید اعظم کانفرنس“ کے اسٹیج پر رونق افروز ہوئے۔ حافظ ملت علیہ الرحمہ کے کفش بردار کی حیثیت سے ایک محرم کے موقع پر میں بھی بمبئی پہنچا۔ ابا بلڈنگ کے نیچے دس روز تقریر کی۔ مرغی محلہ میں جناب عبد المجید صاحب کے دولت کدے پر حضرت کا قیام تھا، وہیں ان کے قدموں میں میں بھی پڑا رہتا۔

جلسوں کا پروگرام ختم ہوا، شہید اعظم کانفرنس کے دن حضرت کے ہمراہ جناب سیٹھ شمس الحق علیمی صاحب کے دولت کدے پر جانا ہوا۔ کھانے سے فارغ ہوکر حضرت علیمی صاحب کے ساتھ کہیں اور تشریف لے گئے اور مجھے حکم دیا کہ ۹/ بجے تک کانفرنس کے اسٹیج پر پہنچ جاؤ، کانفرنس میں تقریر کرنی ہے۔ علیمی صاحب کے صاحبزادے مولوی معین الحق کے ساتھ گھومتا پھرتا، جب میں مقامِ کانفرنس تک پہنچا تو سہ طرفہ سڑک اسٹیج سے تقریباً سو سو میٹر کی دوری تک کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اب میں نے اسٹیج کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو والینٹیر حضرات نے پکڑ کر پیچھے بٹھا دیا۔ حضرت کا حکم تھا کہ آج کانفرنس کے اندر تقریر کرنی ہے اور میں ڈیڑھ سو میٹر دور سامعین اور منتظمین کی بھیڑ میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نے ایک والینٹیر سے کہا کہ مجھے اسٹیج پر جانا ضروری ہے، مگر اس نے اجازت نہیں دی۔ اس وقت جس مقرر کی تقریر ہو رہی تھی، جب وہ ختم ہوئی تو خطیب مشرق علامہ مشتاق نظامی قبلہ ناظم اعلیٰ سنی جمیعۃ العلما نے میرے نام کا اعلان کیا۔ اعلان کا سننا تھا کہ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور والینٹیرز کے راستے کو چیرتا پھاڑتا اسٹیج کے سامنے پہنچ گیا۔ اسٹیج بھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اگلے ہی حصے سے ایک شخص کے ہاتھوں کا

سہارا پاکر اسٹیج کے اوپر گیا اور مائک سنبھال کر تقریر کی۔ بفضلہ تعالیٰ تقریر کامیاب رہی۔ پھر حضرت حافظ ملت اور سید العلما کی دست بوسی کی، دونوں بزرگوں کی دعائیں حاصل کیں۔

حافظ ملت نے دریافت فرمایا: آنے میں اتنی دیر کیوں کردی؟ میں نے عرض کیا: تینوں جانب کے راستے بالکل بھرے پڑے ہیں اور انتظام کرنے والوں سے میں نے کہا تو انھوں نے پکڑ کر بٹھا دیا۔ اس پر فرمایا: "آپ کو دیکھ کر کون سمجھ سکتا ہے کہ آپ مقرر بھی ہیں"۔

صلاحیت شعر گوئی کا انکشاف:

۱۹۶۴ء کے آخری مہینوں کی کسی تاریخ کی بات ہے۔ "دارالعلوم اشرفیہ" میں تعلیم و تعلم کی گرم بازاری تھی۔ اسی دوران یہ خبر آئی کہ کئی مہینے کی اسیری کے بعد علامہ ارشد القادری صاحب کو رہا کردیا گیا ہے۔ خبر ملتے ہی ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حضرت حافظ ملت نے ایک اعلان کے ذریعہ جملہ علما و طلبہ کو "ہال کمرہ" میں جمع کرنے کا حکم دیا۔ تمام طلبہ جمع ہو چکے تھے، مدرسین کرام کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ جناب قاری محمد اسماعیل ادروی مصباحی نے کہا: دو چار شعر ہو سکے تو لکھ دو، بڑا مزہ آجائے گا۔ مجھے اس دور تک کچھ زیادہ شعری شعور تو تھا نہیں، بس تک بندی کرلیا کرتا تھا۔ فوراً چھ سات اشعار لکھ کر قاری صاحب کو دیا، جسے انھوں نے اپنی دل کش آواز اور لہجہ میں پڑھا۔ لوگوں نے واہ واہ کی۔ جس کے بعد حافظ ملت علیہ الرحمہ نے بطورِ انعام مجھے اپنے دست مبارک سے ایک روپیہ عنایت فرمایا۔ اور ساتھ ہی شعر و شاعری کی الجھن سے گریز کی تاکید کی بھی کی۔ اور بعد میں چل کر ایک ایسا دور بھی آیا، جب میں نے حضرت کی مرضی پر جامعہ کی تعمیری نظمیں لکھیں۔ دورۂ یورپ سے واپسی پر علامہ ارشد صاحب کا استقبالیہ لکھا اور اپنی نعت کے اشعار حافظ ملت کے بزم میں گنگنائے۔

جلسۂ دستار بندی کا منظر:

۱۹۶۹ء میں میری دستار بندی ہوئی۔ فراغت کی خوشی میں نوجوان فضلا، پھولے نہیں سما رہے تھے۔ مگر میں غم والم کی تصویر بنا اپنی جگہ ڈھیر تھا۔ آقائے نعمت کے قدموں سے جدائی کا خیال، ایک ایسا کانٹا تھا، جو احساسات میں چبھ رہا تھا۔ اسٹیج پر حسب ذیل علمائے کرام کی تشریف ارزانی سے رونق تھی۔ صاحب سجادہ کچھوچھہ، حضرت مولانا سید محمد مختار اشرف صاحب قبلہ، صدر العلما حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی صاحب قبلہ، حضرت مولانا محمد یونس صاحب قبلہ مرادآباد، حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب قبلہ بھاگلپوری، حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب قبلہ جونپوری، حضور حافظ ملت اور تمام علمائے اشرفیہ۔

ملک وملت کے ان عظیم شخصیات نے ہمارے سروں پر دستار باندھی، خرقہ پہنایا، اسناد عطا فرمائیں اور اپنی قیمتی دعاؤں سے نوازا۔

اس تقریب سعید کا انتظار طالبین کو شدت سے رہتا ہے۔ سب کے چہروں پر مسرت کی چمک، خوشی کی جھلک تھی، مگر محب گرامی مولانا محمد احمد مصباحی بھیروی کے بغل میں بیٹھا میں نامعلوم غم ناک جذبات میں غلطاں و پیچاں تھا۔ آزادی کے لمحات چھن رہے تھے۔ ذمہ داریوں کا دور شروع ہونے والا تھا۔ ایک ماحول رخصت ہو رہا تھا اور دوسرا ماحول سامنے بازو کشادہ کیے کھڑا تھا۔ کتابِ زیست کے ایک باب کی تکمیل ہو رہی تھی اور سامنے ایک دشت نما میدانِ عمل تھا۔ چٹیل بے آب و گیاہ اور نامانوس میدانِ عمل۔ احباب نے میری حواس باختگی پر ٹھونکے لگائے اور ملامت کی، مگر بقولِ شاعر: ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی

کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دستار بندی کا سلسلہ ختم ہوا تو اپنے مجروح سینے میں احساسات کے چند پھپھولے سنبھالے ہوئے میں مائک تک پہنچا، اس مجبور بچے کی طرح جسے جبراً ماں کی آغوش سے جدا کیا جا رہا ہو اور وہ ہُمک ہُمک کر گہوارۂ مادر میں پناہ لینا چاہتا ہو۔ گردشِ زمانہ سے شکوہ کرتے مادر علمی، مشفق اساتذہ اور اخلاص مند اہل مبارک پور کو اپنا سلام پیش کیا: ؎

مادرِ علمی تری آغوش کے پالے چلے
دور تیری گود سے ممتا کے متوالے چلے
مادرِ علمی تری لطف و محبت کی قسم!
یاد کر کے مامتا تیری بہت روئیں گے ہم
کہہ رہے ہیں سب تری فرزند یہ با چشم نم
بھولنا مت دور گو اس وقت ہو جاتے ہیں ہم
زخم سینوں پر کلیجوں پر لیے چھالے چلے
تو نے ہی بخشا ہمیں بے شک شعورِ زندگی
مل گیا تیری عطا سے ہم کو سوزِ آگہی
تو نے ہی توڑا بت احساس پندار خودی
چھوڑ کر صد حیف یہ تیری سکوں افزا گلی
گردشِ دوراں سے کچھ کرتے ہوئے نالے چلے

مذکورہ بند کا دوسرا مصرعہ ادا ہوا تو الفاظ رندھی ہوئی آواز میں الجھ گئے۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اسٹیج اور گولہ بازار میں سامعین کا پورا مجمع سکتہ میں تھا۔ ہدیۂ تشکر کی نظم پوری بھی نہ کر سکا، ڈگمگاتے قدموں سے مائک چھوڑ کر پیچھے ہٹا تو آقائے نعمت حضور حافظ ملت نے گلے سے لگا لیا۔ حضرت کا منور چہرہ آنسوؤں سے دھل رہا تھا۔ حضرت کے ہاتھوں کے سہارے، حضرت صاحب سجادہ کچھوچھہ قبلہ کے سامنے پہنچا، حضرت نے دونوں ہاتھ سر پر رکھا اور دعائوں سے نوازا۔ اپنی جگہ آکر بیٹھا تو خیال کیا کہ پوری مٹھی روپیوں سے بھری ہوئی ہے۔ علمائے اکابر اور حضرت حافظ ملت کے ہاتھوں کا بخشا ہوا تبرک: ؎

اس بندۂ حقیر پہ یہ بارشِ کرم
منہ دیکھتا ہوں رحمت پروردگار کا

اس موقع کے لیے استاذ الشعرا رحمت الٰہی برق صدیقی اعظمی نے جشن دستار بندی کی تاریخ قلم بند فرمائی تھی: ؎

آج دستارِ فضیلت بدر کے سر پر بندھی
کیوں نہ اشرفیہ کا دنیا بھر میں روشن نام ہو

برق تجھ کو فکر ہے تاریخ ہجری کی اگر
لکھ! الٰہی بدر عالم خنجر اسلام ہو

۸۹ ۱۳ھ

حافظ ملت کے دل کی آج بر آئی مراد
بدر کے سر پر ہے دستارِ فضیلت ضو فگن
برق کے دل کی دعا بھی ہے یہ ارخِ عیسوی
بدر عالم ہو الٰہی روشنی بخش زمن

۶۹ ۱۹ء

یہ جشن دستار بندی ۱۰/ شعبان ۱۳۸۹ھ بمطابق ۲۳/ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو باغِ فردوس کی پُر رونق جلسہ گاہ گولہ بازار میں منعقد ہوا۔

دانش گاہِ اشرفیہ، حضور حافظ ملت کی خدمات کا چمن، ان کی مساعی جمیلہ کا کارخانہ تھا۔ اور اس سے فارغ ہونے والے طلبہ حافظ ملت کے افکار و نظریات اور اخلاص مندی کے آئینے۔ جن کے ذریعہ سرزمین ہند پر اسلامی تحریک کو شیخ عبدالحق محقق دہلوی، علامہ فضل حق خیرآبادی اور امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہم الرحمہ جیسے مقتدایانِ ملت کی روِش پر رواں دواں کرنا تھا۔ حافظ ملت اپنے طلبہ کو علم و شعور کے اسلحے بھی دیتے تھے اور اخلاق و آدب کی زرہ بھی۔ تاکہ اشرفیہ کا فاضل، رزم گاہِ عمل میں بے خوف وخطر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرتا جائے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

''ہم نے حضرت صدرالشریعہ اور دیگر اساتذۂ کرام رحمہم اللہ سے علم بھی سیکھا اور عمل بھی، حتی کہ انھیں کے ذریعہ ہم نے راستہ چلنے کا طریقہ بھی سیکھا۔ ہم نے احادیث میں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے راستہ چلنے کے متعلق پڑھا اور حضرت صدرالشریعہ کے چلنے کو دیکھا تو سنت کے مطابق پایا۔ اس طرح علم کے انوار اور گفتار و کردار ہم نے سب کچھ انھیں سے لیا''۔

ایک بار پُرانے مدرسہ سے دارالعلوم جاتے ہوئے مولانا نصیر الدین صاحب اور راقم الحروف حضرت کے ساتھ تھے۔ عموماً راستہ طے کرتے ہوئے حضرت زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ مگر یہ کہ کوئی ضروری امر ہو۔ فرمایا:

''حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم راستہ چلتے تو رفتار سے عظمت و وقار کا ظہور ہوتا۔ دائیں بائیں نگاہ نہ فرماتے۔ ہر قدم قوت کے ساتھ اٹھاتے۔ چلتے وقت جسم مبارک آگے کی طرف قدرے جھکا ہوتا۔ ایسا لگتا، گویا اونچائی سے نیچے کی طرف اتر رہے ہیں۔ ہمارے استاذ حضرت صدرالشریعہ علیہ الرحمہ سنت کے مطابق راستہ چلتے تھے۔ ان سے ہم نے علم بھی سیکھا اور عمل بھی''۔

اس جتن اور اہتمام کے ساتھ حافظ ملت طلبہ کو علم کی دولت لازوال اور کردار کی آبدار تلوار سے مزین کرنے کی سعی فرماتے تھے۔ حضرت کا طریقہ تھا کہ دستار بندی کے بعد تلامذہ کو جمع کر کے نہایت دردمندانہ انداز میں نصائح فرماتے اور اگر نادانستگی میں کسی کا دل دکھا ہو تو اس کی عذر خواہی کرتے۔ کہ:

"اس طویل دورِ طالب علمی میں میرا آپ لوگوں سے اور آپ لوگوں کا مجھ سے سنار اور مس خام، بڑھئی اور کندۂ ناتراش، آئینہ ساز اور شیشۂ ناصاف جیسا تعلق تھا، اگر میری کسی بات پر کسی کی دل آزاری، حق تلفی یا تکلیف ہوئی ہو تو مجھے معاف کردیں۔ اب آپ حضرات خود ذمہ دار عالم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دین کی خدمت عبادت سمجھ کر سرانجام دینے کے لیے کمربستہ ہوں۔ اپنے دین، مذہب اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا کریں۔ جائیے مولا تعالیٰ آپ لوگوں کا حامی و ناصر ہو"۔

آنسوؤں کی جھڑی کے ساتھ، قلبی جذباتِ درد کو چھپاتے ہوئے، حضرت جب اپنے معنوی جگر گوشوں کو رخصت کرتے وقت مذکورہ باتیں فرماتے تو طلبہ بلک بلک کر رونے لگتے اور قدموں کو تھام تھام کر گویا ہوتے:

"حضور! آپ کی ہر نصیحت اور سرزنش ہمارے بھلے ہی کے لیے تھی۔ ہمیں علم و فن کی جو کچھ روشنی میسر آئی ہے، اساتذۂ کرام اور آپ کی کرم فرمائیوں کے صدقے آئی ہے۔ آپ کے نعلین کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ حضور! اس قسم کی باتوں سے ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ البتہ ہم ناسمجھوں، کج فہموں اور نادانوں سے شانِ مبارکہ میں کسی لمحہ اگر کوئی بے ادبی سرزد ہوئی ہو تو درگزر فرمائیں"۔

انکسار و تواضع، عذر خواہی و اشک فشانی کی یہ بزم عام طور پر جلسۂ دستار بندی تمام ہونے پر نصف شب گزر جانے کے بعد سجتی اور فاضلین اشرفیہ حضرت حافظ ملت اور دیگر اساتذۂ کرام سے دعائوں کا توشہ لے کر اپنے اپنے وطن کا سفر کرتے۔

اپنی دستار بندی کے موقع پر اس بزمِ اشک وآہ میں، میں کچھ تاخیر سے پہنچا۔ اختتام دعا کے بعد سب سے آخر میں میں نے حضرت کی دست بوسی کی۔ تو صبر و ضبط کا بند ٹوٹ پڑا اور جذبات کا دھارا زور و شور سے بہہ نکلا۔ ہزار ضبط کے باوجود میں زور زور سے ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔ کافی دیر تک میں اپنے آنسوؤں سے حضرت کے دامن مبارک کو بھگوتا رہا اور میرے شانوں پر اپنا مبارک ہاتھ رکھے آقائے نعمت تسلی دیتے رہے۔ کچھ دیر بعد جب میں نے خود پر قابو پایا تو ادب سے کھڑا ہوا۔ اس وقت حافظ ملت نے اپنی پدرانہ شفقت کا اظہار جن الفاظ میں فرمایا، زمانہ بیت گیا، مگر وہ الفاظ آج بھی فانوسِ سماع کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

"مولوی بدر عالم! میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں۔ چپ رہو، گھبرائو نہیں"۔

اپنا حال تو کچھ اس شعر جیسا تھا کہ: ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے
ہم نہ تھے ان کے آستانے کے

وہ دن تھا، اور آج کا دن "بدرالقادری" جہاں رہا، جس خدمت پر مامور رہا، حافظ ملت کی قبولیت پیرہن دعائیں، مونس و غم خوار بن کر ساتھ رہیں۔ حافظ ملت کے اکثر مکاتیب میں یہ فقرہ موجود ہوتا:

"میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں"۔

قربان ان کی عنایت درجہ عنایات کے فرمایا کرتے تھے:

"کچھ احباب ایسے ہوتے ہیں، جن کی ملاقات سے خوشی ہوتی ہے۔ کچھ ایسے ہیں، جن کا تذکرہ سن کر مسرت ہوتی ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں، جن کے تصور سے شادمانی حاصل ہوجاتی ہے اور آپ انھیں میں سے ایک ہیں"۔

رجب ۱۳۹۲ھ بہرائچ جامعہ غازیہ سید العلوم کے پتے پر مجھے حضرت کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا۔ اس کا ایک جملہ یہ ہے:

"کچھ احباب ایسے ہوتے ہیں، جن کے تصور سے خوشی ہوتی ہے، انھیں میں آپ بھی ہیں"۔

بدرالقادری! تیرے لیے یہی کیا کم ہے کہ حافظ ملت نے تجھے اپنے غلاموں میں شمار کیا۔

تم نے جو کہہ دیا مرے در کا غلام ہے
میرا مزاج اور بھی شاہانہ ہو گیا

فراغت کے بعد:

دستار بندی کے بعد حضرت نے فرمایا کہ کم از کم دو سال اور میں آپ کو اشرفیہ میں رکھ کر کام کا آدمی بنانا چاہتا ہوں۔ یہی فرمان، محب مخلص مولانا محمد احمد مصباحی بھیروی صاحب کے حق میں بھی صادر ہوا تھا۔ شوال میں ہم دونوں مبارک پور حاضر ہو گئے۔ ایک سال پورا کیا، دوسرا سال شروع ہوا تو خانگی دشواریوں کے باعث والد صاحب حضرت کی خدمت میں مبارک پور آئے اور پوچھا:

حضور! مولوی بدر عالم تو فارغ ہو چکے ہیں۔ اب کب تک پڑھتے رہیں گے؟

حضرت نے فرمایا: علم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ مگر میں انھیں مزید دو سال پڑھانا چاہتا ہوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

والد صاحب نے گھر کی پریشانیاں اور اپنی کمزوری کے حالات حضرت سے بیان کیے۔ سن کر فرمایا:

ان جیسے لوگوں کے لیے جگہ کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو انھیں پڑھانے کے لیے بھیج دیتا ہوں۔

اس کے بعد پہلی مرتبہ میسور اسٹیٹ میں ہبلی کی مشہور درس گاہ "دارالعلوم غوثیہ" کا صدرالمدرسین بنا کر بھیجا۔ کچھ روز بعد وہاں سے انکولہ جانے کا حکم فرمایا۔ گرامی نامہ پاکر میں انکولہ جا پہنچا، مگر انکولہ کا ماحول میرے دِلی مطابق نہیں تھا۔

بمبئی میں عاشورۂ محرم کے اجلاس شروع ہونے والے تھے۔ مجھے اس کی دعوت ملی اور ادھر ۲۷/ ۲۸/ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کو دارالعلوم محمدیہ کے جلسہ میں حافظ ملت کے تشریف لانے کی اطلاع ملی۔ میں بمبئی آ پہنچا اور حضرت کو انکولہ کے حالات بتائے اور جب اپنی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ:

"حضور! وہاں تو بڑی بڑی لڑکیاں پڑھنے کے لیے آتی ہیں، اس لیے میں وہاں نہیں رہنا چاہتا"۔

تو مسکرانے لگے اور فرمایا: "مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ اب آپ کو وہاں نہیں جانا ہے"۔

اور اسی سفر میں مجھے "باغِ فردوس بھیونڈی" کے منتظمین کی ضد پر وہاں رکھا۔ کچھ روز کے بعد میں دمن انجمن اہل سنت کھاراواڑ جا پہنچا۔ وہاں کے بعد پنویل، مومن پاڑہ سنی ٹرسٹ میں دو تین ماہ رہا۔ بعد ازاں حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی صاحب قبلہ کے کرم سے جامعہ غازیہ سید العلوم بہرائچ گیا۔ آخر میں مورانواں ضلع اناؤ میں مدرسہ ضیاء الاسلام کے اندر خدمت تدریس انجام دے رہا تھا کہ حافظ ملت کی طلبی پر پھر مبارک پور لوٹ آیا۔

۱۷/ ذوالحجہ ۱۳۹۰ھ انکولہ کے پتے پر آئے ہوئے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"مجھے آپ کی جدائی سے قلق ہے۔ یہ آپ کے والد صاحب کا کرم ہے۔ بہر حال آپ اپنی ادبی مشق جاری رکھیں"۔

حضرت کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ میں اشرفیہ چھوڑ کر کہیں جانا، ناگوار سمجھتا ہوں۔ حضرت مجھ ادبی مشق کی طرف ہمیشہ متوجہ فرماتے اور ادب و انشاء میں مہارت حاصل کرنے کے لیے تحریر کرتے رہتے تھے۔ حضور حافظ ملت کا یہ وصف نمایاں تھا کہ وہ اپنے تلامذہ کے ذہنی رجحانات اور طبعی میلانات کا جائزہ لے کر جسے جس فن میں دلچسپی لیتے ملاحظہ فرماتے، اسی میں حصولِ کمال پر لگا دیتے تھے اور حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے۔

تحریری کام کی اہمیت:

تصنیفی کاموں کی اہمیت حضرت کے سامنے مقدم تھی۔ آپ کے سامنے علمائے اہل سنت کی کوئی نئی کتاب پیش کی جاتی تو دیکھ کر بے حد خوش ہوتے۔ اپنے تلامذہ اور نئے فاضلین کی قلمی صلاحیتوں کو سراہتے۔ فرماتے:

”تقریر سب سے آسان ہے۔ تدریس اس سے مشکل ہے اور تحریر ان دونوں سے زیادہ مشکل ہے“۔

مضمون نگاری کا شوق مجھے شروع سے رہا۔ ابتداءً واقعات و حکایات کو اپنے الفاظ میں لکھنے کی مشق کرتا تھا۔ ماہنامہ اعلیٰ حضرت، جس کے مدیر اُن دنوں نبیرۂ اعلیٰ حضرت مولانا ریحان رضا خاں صاحب تھے۔ حضرت کے پاس برابر آتا تھا۔ میں نے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے عشق رسول کی بابت اس رسالہ میں ”سوزشِ پنہاں“ کے عنوان سے ایک مضمون بھیجا تھا۔ ایک دن حضرت نے مجھے بلوایا، حاضر ہوا تو دیکھا ”سوزشِ پنہاں“ پڑھ رہے ہیں اور آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں۔ حب رسول کی مئے ناب، آنکھوں کے پیمانے سے چھلک رہی ہے۔

بخدا! نہ آبِ حیواں سے لگاؤ اس کی قیمت
جو غمِ نبی میں آنکھوں سے ٹپک رہا ہے پانی

میں نے دست بوسی کی اور حضرت کی دعاؤں کا انبار لے کر لوٹا۔ حضرت نے قلمی مشق پر خصوصی توجہ دلائی۔ محرم الحرام کا مہینہ قریب تھا۔ میں نے سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا، چھٹی کا دن تھا، حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ میں اسے ماہنامہ ”پاسبان“ الہ آباد میں بھیجنا چاہتا ہوں۔ حضرت نے اپنے ہاتھ سے علامہ مشتاق احمد نظامی کی خدمت گرامی نامہ تحریر فرمایا اور ان سے مجھے قلمی مشوروں سے نوازنے کی سفارش کی۔

۱۹۶۸ء میں سنبھل سے جناب مولانا حبیب اشرف صاحب نے ماہنامہ ”الحامد“ جاری کیا اور حضور حافظ ملت کی خدمت میں مضمون کی درخواست کی۔ حضرت نے مجھے بلا کر ان کا خط دکھایا اور فرمایا: ان کے رسالہ میں بھی کبھی کبھی کوئی مضمون بھیج دیا کیجیے۔ ”اشرفیہ کا ماضی اور حال“ نامی کتاب جب طبع ہو کر آئی تو میں لے کر حاضر خدمت ہوا۔ دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ فرمایا: ”مجھے امید ہے کہ آپ کی ذات سے کام ہوگا“۔ اور پھر ہاتھ اٹھا کر دیر تک دعا فرماتے رہے۔

ماہنامہ اشرفیہ کا ڈکلریشن ملنے میں تاخیر کی وجہ سے میں بہت پریشان رہتا تھا۔ ایک روز حضرت کے پاس پہنچ کر اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو فرمایا: ”ان شاء اللہ ہوگا، مطمئن رہیے۔ دیر آید درست آید“۔

کیچڑ پانی کا موسم تھا۔ راقم الحروف اور مولانا عبدالمبین نعمانی، اردو زبان میں علم حدیث سے متعلق چند کتابیں اٹھائے ہوئے پُرانے مدرسے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ الجامعۃ الاشرفیہ میں حضرت کی مصروفیات کے دن تھے۔ ہم لوگوں نے عرض کیا: حضور!

''معارفِ حدیث'' جو آپ کی کتاب ہے، اسی انداز میں فقہی ابواب کی ترتیب پر آپ کی کتاب ہوجاتی تو بہت بہتر ہوتا۔ فرمایا: ''افسوس! لوگوں نے مجھے تصنیف و تالیف کی فرصت نہیں دی۔ ''المصباح الجدید'' میں نے چند گھنٹوں میں لکھی تھی''۔

ہم لوگوں کے ہاتھ میں کتابوں کا بنڈل دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ٹہلتے ٹہلتے میرے کاندھے پر تھپتھپایا اور فرمایا:

''مجھے تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں اردو کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کا فضل ہے! میں خود تصنیف و تالیف کا فن جانتا ہوں''۔

سرزمین مبارک پور پر منعقد ہونے والی ''کل ہند تعلیمی کانفرنس'' حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی حوصلہ مندیوں کا ایک بلند زینہ تھا۔ جس کے لیے اہل مبارک پور نے اپنی جاں نثارانہ پیش کش سے ایک تاریخی مثال قائم کردی۔ تعلیمی کانفرنس دارالعلوم اشرفیہ کے ہمہ جہتی توسیعی پروگرامات کے فتح باب کا جشن تھا۔ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی قیادت میں علمائے اشرفیہ، مخلصین مبارک پور اور ہندوستان بھر میں مصباحی علما، عزیزی نسبت رکھنے والے اور باشعور مسلمانانِ اہل سنت مصروف تھے۔ تعلیمی کانفرنس کا غلغلہ سن کر میں نے بہرائچ سے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی خدمت میں کانفرنس سے کچھ ہفتے پہلے ہی مبارک پور آنے کی اجازت طلب کی، مگر حضرت نے غایت کرم سے میرے مدرسہ کے تعلیمی نقصان کی جانب توجہ مبذول کرائی اور کانفرنس سے چند روز پہلے آنے کی اجازت سے نوازا۔

اسی موقع پر میں نے علامہ ارشد القادری صاحب، مولانا حکیم فضل الرحمن مصباحی لکچرر تکمیل الطب کالج لکھنؤ اور مولانا محمد اسلم بستوی نائب شیخ الحدیث انوار القرآن بلرامپور کو الجامعۃ الاشرفیہ پروگرام کی اعلامی ضرورت کی جانب متوجہ کیا اور لکھا کہ اتنے عظیم منصوبہ کے لیے بہت سے اشتہارات، کتابچے، رسائل اور کلینڈررز وغیرہ طبع ہونے چاہئیں اور زور دیا کہ کم از کم ایک ماہانہ رسالہ خود اشرفیہ سے نکلنا چاہیے اور یہ تمام باتیں میں نے حضرت حافظ ملت کو بھی لکھ بھیجیں۔ حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا:

۱۹؍ رجب ۱۳۹۳ھ

محب محترم! مولانا بدرالقادری صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ اور آپ کے ساتھیوں کے جذباتِ صادقہ مخلصانہ، قابل قدر ولائق تحسین ہیں۔ اللھم زد فزد!

رسالہ کے اجرا کی ضرورت اور افادیت مسلم۔ میں چاہتا ہوں کہ جاری ہو تو جاری رہے اور دائمی ہونے کے لیے کم از کم آپ کے ایک معاون اور پریس کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے یہ خیال تھا کہ عربی یونیورسٹی کی تعمیر کے بعد آپ اسی عمارت میں باطمینان یہ کام کریں۔

۵؍ ۶؍ ۷؍ مئی ۱۹۷۱ء کو منعقد ہونے والی تعلیمی کانفرنس کے موقع پر میں نے ''حافظ ملت'' کے عنوان سے حضرت کے بارے میں ایک نظم لکھی تھی۔ جسے برادرم نعیم اعجازی وغیرہ کے اصرار پر خوبصورت طریقہ سے طبع کرایا گیا۔ کانفرنس کے اجلاس میں بطورِ تہنیت میں نے اس کے کچھ بند پڑھ کر سنائے اور فریم کیا ہوا حسین و جمیل طغریٰ حضرت سید العلما مولانا شاہ آل مصطفیٰ برکاتی مارہروی قبلہ علیہ الرحمہ و شارحِ بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی قبلہ کے ہاتھوں حافظ ملت کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حضرت نے یہ نذرِ حقیر قبول کرنے کے بعد فرمایا:

”یہ سب مولوی بدرِ عالم کی محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے“۔

قیامِ بہرائچ کے زمانے میں ایک بار میں نے حضرت کو خواب میں دیکھا، جس کی صبح مبارک پور عریضہ حاضر کیا، جس کا ذکر ماہنامہ اشرفیہ کے شمارہ صفر ۱۳۹۶ھ کے اداریے میں ہے۔ حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا:

”خواب کی تعبیر ظاہر و باہر ہے۔ جلد وہ وقت آئے گا کہ عربی یونیورسٹی میں آپ اپنے دونوں بھائیوں (مولانا ڈاکٹر شرر مصباحی و مولانا محمد اسلم بستوی) کی مدد سے قلمی کمی کو پورا کریں گے“۔

مبارک پور طلبی:

حضور حافظ ملت کے ارشاد کے بموجب میں حتی المقدور قلمی مشق کرتا رہا۔ بعض اوقات مضامین لکھ کر رسائل میں بھیج دیتا۔

قیامِ بہرائچ کے زمانے میں ”تذکرہ سید سالار مسعود غازی“ نامی کتاب تالیف کی۔ اس کے بعد مورانواں ضلع اناؤ کے مدرسہ ضیاء الاسلام میں مدرس ہو کر چلا آیا۔ کچھ دنوں بعد حافظ ملت علیہ الرحمہ کا حکم نامہ پہنچا کہ:

”الجامعۃ الاشرفیہ میں شعبۂ نشر و اشاعت قائم کر دیا گیا ہے۔ آپ اس کے انچارج کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے جس قدر جلد ہو سکے مبارک پور آجائیں“۔

مورانواں کے لوگوں کو اس بات کی خبر ہوئی تو وہ بہت فکر مند ہوئے۔ کیوں کہ وہاں بھی کام اچھا ہو رہا تھا۔ دارالعلوم کے لیے نئی تعمیر شروع تھی اور علاقہ کے متمول حضرات مدرسہ کی جانب متوجہ تھے۔ ایسے میں میرا ایک دم چھوڑ کر ہٹ جانا، نقصان دہ تھا۔ تاہم حالات نہایت سنجیدگی سے تعمیری رُخ پر رکھ کر میں نے مبارک پور کے لیے رخت سفر باندھا۔

تجارت اور عبادت:

۱۶ر جمادی الاول ۱۳۹۴ھ، ۷ر جون ۱۹۷۴ء شب میں حضرت کی قدم بوسی کی، حضرت نے اسی وقت حضرت مولانا محمد شفیع اعظمی صاحب قبلہ کو بلایا اور فرمایا: ”مولانا آگئے ہیں، کل سے ان کی حاضری شمار کیجیے“۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے:

”یہ کام بہت اہم ہے، مگر تاخیر سے شروع ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ ہم لوگ پروپیگنڈے کے آدمی نہیں ہیں۔ ایک انگریز کی بات کسی نے بتائی۔ وہ کہتا تھا: ہماری تجارت کی ترقی کا راز یہ ہے کہ جتنا سرمایہ ہم تجارت میں لگاتے ہیں، اس سے زیادہ اس کے اشتہار پر خرچ کرتے ہیں۔ تو جن لوگوں نے یہ کام تجارت کے طور پر کیا، انھوں نے اشتہار پر زور دیا۔ مگر ہم تو اپنے کام کو تجارت نہیں عبادت سمجھ کر کرتے ہیں“۔

مزید فرمایا:

”ہر کام میں خلوص درکار ہے، اس کے بغیر کامیابی نہیں ہوتی۔ آپ اس شعبہ کے انچارج ہیں اور کام بڑھنے پر جو لوگ بھی اس شعبہ میں آئیں گے، وہ آپ کے ماتحت ہوں گے“۔

ستو کا شربت:

گرمی تیز پڑ رہی تھی۔ انسانی پیکر میں لہو کی طراوت خشک کر دینے والی تیز لُو چل رہی تھی۔ ایسے موسم میں مجھے ایک دن دوپہر میں حافظ ملت کی بارگاہ میں حاضر ہونا پڑا۔ میں کسی سفر سے آکر سیدھا خدمت عزیزی میں پہنچ گیا تھا۔ کئی ماہ کے بعد حضرت کی زیارت سے مشرف ہوا

تھا۔

حضرت تخت پر جلوہ افروز تھے۔ عرض سلام کے بعد دست بوسی کی اور نزدیک ہی پڑی ہوئی چار پائی پر بیٹھنا چاہا، مگر حضرت تخت سے اٹھ کر سرو قد کھڑے ہوگئے اور مجھے شرفِ معانقہ سے نوازا۔ گرمی کی وجہ سے میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ حضرت نے ایک بڑے مرادآبادی گلاس میں ستو گھول کر عنایت فرمایا، میں جسے پی کر سیراب ہوگیا۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ مشروبات تو دنیا میں انواع واقسام کے پیے، مگر اس ستو میں جو لذت اور شیرینی تھی، کام و دہن اسے نہیں بھول سکتے۔ ؎

ساقی نے اپنے ہاتھ سے اِک جام کیا دیا
اترا نہ تاحیات نشہ بادہ خوار کا

خوامخواہ تخلیہ:

دورِ طالب علمی میں ایک مولانا صاحب جو حضرت کے مرید بھی تھے، مجھے لے کر حضرت کی بارگاہ میں گئے۔ کچھ دیر کے بعد انھوں نے مجھے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ تخلیہ میں کچھ باتیں کرنا چاہتے ہوں گے، اٹھ کر جانے کا ارادہ کیا، میں سلام کر کے جوں ہی پلٹا۔ حضرت نے روک لیا اور مولانا محترم سے فرمایا:

”خوامخواہ انھیں کیوں بھگا رہے ہیں؟ یہاں کون سی ایسی بات ہوتی ہے، جو ان سے چھپائی جائے“۔

یہ سن کر وہ محترم اپنی حرکت پر خفیف ہو رہے تھے اور میں ان کی خفت پر۔

جوتے پائوں کے تابع:

ایک بار وعظ و تلقین کی ایک بزم برخواست ہوئی تو میں نے حضرت کے نعلین پیش کیے۔ حضرت نے ایک جوتے میں پائوں داخل کیا تو مجھے لگا کہ میں نے نعلین الٹے رکھ دیے ہیں۔ اب جو ہاتھ بڑھا کر سیدھا کرنا چاہا تو فرمایا:

”رہنے دیجیے! ٹھیک ہی ہے۔ الحمد للہ! کہ میں جوتوں کا پابند نہیں ہوں، بلکہ جوتے میرے پائوں کے تابع ہیں، جس طرح بھی استعمال کروں یہ مجھے تکلیف نہیں دیتے“۔

حضرت ہمیشہ سلیم شاہی ناگرہ جوتے استعمال کیا کرتے تھے۔

دستخط کرنا:

اعظم گڑھ شہر میں راجہ کنور معظم صاحب کے گھر شب میں میلاد شریف تھا۔ حضرت کے ساتھ خادمانہ میں بھی تھا۔ صبح کو فجر کی نماز کے بعد حضرت نے واپسی کی اجازت مانگی تو راجہ صاحب نے عرض کیا: حضور! والدہ ماجدہ کی خواہش ہے کہ غریب خانے میں قدم رکھ دیں، ناشتہ فرما کر پھر جائیں۔ ناشتہ کا دسترخوان شاہانہ انداز میں مرصع تھا۔ راجہ صاحب میزبانی کر رہے تھے۔ حضرت اور میں دو آدمی ناشتہ کر رہے تھے۔ انواع و اقسام کے برتنوں کا ہجوم تھا۔ چائے کی پیالی میں ڈالنے کے لیے میں نے دودھ کا برتن اٹھایا تو کوئی برتن ڈھلک گیا، میں نہایت شرمندہ ہوا۔

ہم لوگ راجہ صاحب کے دولت کدے سے چل کر رکشہ کے ذریعہ بس اسٹینڈ پہنچے اور مبارک پور کی بس میں سوار ہوئے۔ حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا: دستخط کرنا کسے کہتے ہیں، معلوم ہے؟ میں نے عرض کیا: حضور! دستخط کرنا یعنی اپنا نام لکھنا۔ فرمایا: ایک دستخط کرنا وہ بھی ہے، جو آج دسترخوان پر واقع ہوا۔ علما کو باوقار اور سنجیدہ ہونا چاہیے۔ دنیاوی کروفر سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ خوانِ شاہی ہو یا سفرۂ درویش، ہمارے نزدیک نہ کوئی حقیر ہے اور نہ باعظمت۔ خدا کی مخلوق ہونے میں شاہ وگدا سب برابر ہیں۔

دنیا کا گھر:

کسی موقع پر حضرت کا رہائشی مکان جو خستہ تھا، اس کا تذکرہ ہوا تو فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے مسلمانوں کے لیے جنت کے محل تعمیر کرائے ہیں، اب ہم چند روز کے لیے دنیا کے گھر کی فکر میں پریشانی کیوں مول لیں"۔

جاں نثارانِ مبارک پور:

مبارک پور کا بچہ بچہ حافظ ملت کا دیوانہ تھا اور آج بھی ہے۔ حضرت اپنے گھر کے لیے سودا خریدنے، خاص طور پر گوشت لانے کے لیے طلبہ کو بھیجتے۔ تو اس بات کو ناپسند فرماتے کہ طلبہ حضرت کا نام بتا کر سودا خریدیں۔ کیوں کہ بعض دوکاندار یہ سن کر بہت ارزاں سودا دے دیتے، یا کبھی پیسے لینا ہی پسند نہ کرتے تھے۔ اہل صنعت و حرفت ہوں یا صاحبانِ تجارت، سب یکساں طور پر حضرت کے عقیدت مند اور نیاز مند تھے۔ حضرت راستے سے گزرتے تو مسلمان بے حد احترام کرتے اور بعض ہندو بوڑھے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوجاتے۔ ہر ہفتہ جمعہ کی نماز کے بعد حضرت سے تعویذ لینے والے پُرانے مدرسہ میں جمع ہوجاتے، جن میں اپنے پرائے سبھی ہوتے۔ اور حضور حافظ ملت بلا امتیاز ہر ایک کی پریشانی اور حاجت سن کر دعا فرماتے اور تعویذ عنایت کرتے۔ حضرت اگر سفر میں ہوتے تو ان کے نائبین (محترم قاری عبدالحکیم صاحب گونڈوی، مدرس شعبۂ قراءت الجامعۃ الاشرفیہ، علامہ مولانا ضیاء المصطفیٰ قادری، مولانا نصیر الدین عزیزی) یہ خدمت انجام دیتے۔ وہی طریقہ عزیز ملت قبلہ کے ذریعہ ہنوز جاری ہے۔

کام زندگی ہے، آرام موت:

الجامعہ الاشرفیہ کے شعبۂ نشر واشاعت میں تقرری کے بعد، دارالعلوم کے اسی کمرہ میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگا، جہاں پہلے حضور حافظ ملت درس دیا کرتے تھے۔ کچھ روز بعد شعبۂ عربی ادب میں مولانا محمد یٰسین اختر مصباحی، مولانا افتخار احمد قادری بھی مقرر کیے گئے۔ میرے اشرفیہ آمد کے ایک سال چند ماہ بعد "کتب خانہ اشرفیہ" کے انچارج کی حیثیت سے محب محترم مولانا عبدالمبین نعمانی صاحب بھی مبارک پور آگئے۔

یکم اگست ۱۹۷۵ء کی تاریخ تھی۔ نعمانی صاحب، مولانا یٰسین اختر صاحب اور راقم الحروف، ہم تینوں حافظ ملت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اشرفیہ کے اہل انتظام، نعمانی صاحب پر کتب خانے کے علاوہ کچھ دفتری ذمہ داریاں بھی لگانا چاہتے تھے۔ اور ان کا یہ خیال تھا کہ میں اتنی ہی ذمہ داری قبول کروں، جس قدر بہ سہولت نبھاسکوں، اس لیے دفتری کام کا ذمہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ غالباً حافظ ملت کو اس کی خبر ہوچکی تھی، اس لیے اس طرح نصیحت شروع فرمائی:

''انسان کو کام سے نہیں گھبرانا چاہیے، اس لیے کہ ہم اور آپ ، دنیا میں کام ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں، آرام کے لیے نہیں۔ آرام تو مرنے کے بعد ملے گا''۔

اسی نشست میں فرمایا:

''میں نے ایک بار دورانِ مطالعہ یہ پڑھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جن سے چرند وپرند تک گفتگو کرتے تھے، انھوں نے فرمایا: ''اعظم المصائب فوت الوقت بغیر فائدۃ''۔ ایک مرتبہ سید قناعت علی صاحب بریلوی نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ، سیدنا اعلیٰ حضرت عظیم البرکت علیہ الرحمہ کا تذکرہ کیا۔ اس درمیان فرمایا کہ ایک روز حضور اعلیٰ حضرت نے صبح کی نماز ادا کی اور لکھنے بیٹھ گئے۔ پھر ایک بجے شب تک برابر لکھتے رہے، سوائے نماز اور دیگر ضروری حاجات کے توقف نہ فرمایا۔ ایک بجے لکھ کر فارغ ہوئے اور آرام کے لیے بستر پر تشریف لے گئے تو اس طرح لیٹے کہ سر نیچے ہاتھ رکھ کر اس پر ٹیک لگائی اور پیروں کو سمیٹ کر گھٹنے شکم کے نزدیک کر لیے (اس طرح جسم کے اعضا سے اسم پاک محمد تحریر ہو گیا) میں نے حضرت کے پائوں پکڑ کر پھیلانا چاہا تو اعلیٰ حضرت فوراً چونک کر بیٹھ گئے اور عالمِ جلال میں فرمایا: آپ نے میرے پیروں کو ہاتھ کیوں لگایا (یہ اس لیے کہ اعلیٰ حضرت کے پیروں کو کوئی شہزادۂ رسول سید ہاتھ لگائے، انھیں یہ بات سخت ناگوار تھی) میں نے عرض کیا: حضور! صبح سے اب تک پائوں سمیٹ کر لکھتے ہی رہے، اب تو ذرا آرام فرمالیں۔ اس پر فرمایا:

''کیا مسلمان دنیا میں پائوں پھیلا کر سونے کے لیے آیا ہے؟''۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

میں نے اپنی جوانی میں پانچ سال تک چار آدمیوں کا کام تنہا کیا۔ (۱) مدرسہ حفظ القرآن میں پڑھاتا تھا۔ (۲) جامع مسجد میں امامت کرتا تھا۔ (۳) اپنے پڑوسیوں سے زیادہ گھر کا کام کرتا تھا۔ (۴) اور ساتھ ہی ساتھ روزانہ ایک ختم قرآن مجید پڑھتا تھا''۔

''مسلمان کو دنیا میں زیادہ آرام کی تلاش میں نہیں پڑنا چاہیے، کام زندگی ہے اور آرام موت''۔

استعداد کے ساتھ اخلاص:

الجامعۃ الاشرفیہ کے اہل انتظام کے اندر کئی بار میری جگہ کسی اور کو شعبۂ نشریات میں رکھنے کی گفتگو اٹھائی گئی۔ شدہ شدہ ایک بار اس کی خبر مجھے بھی ہوئی۔ اتفاق سے اسی روز حضرت کی خدمت میں جانا ہوا۔ دورانِ گفتگو آپ نے فرمایا:

''میاں! کام کرنے کے لیے صلاحیت اور استعداد کے ساتھ ساتھ اخلاص بھی بہت ضروری ہے''۔

مجلس انتظامیہ میں ماہنامہ اشرفیہ کے اوپر اعتراض کرتے ہوئے کسی نے کہا: اس میں اقبال شاعر کو علامہ اقبال لکھا ہوا ہے۔ حضرت نے جواباً فرمایا:

''علامہ اقبال بطورِ علم لکھا گیا ہے۔ صرف اقبال کہنے سے کسی کا ذہن شاعر مشرق کی طرف جائے گا؟''۔

آخری دیدار:

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ سے آخری گفت و شنید کا موقع مجھے شنبہ ۲۹/ مئی ۱۹۷۶ء یعنی وصال سے دو روز پیشتر ملا۔ حضرت کی علالت کے باعث تیمار داروں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ بھوجپور مرادآباد سے حضرت کے برادران اور اعزہ بھی آئے ہوئے تھے۔ میں نے حاضر ہوکر دست بوسی کی۔ اس وقت حضرت اپنی بیٹھک میں ٹہل رہے تھے، وہاں کئی لوگ موجود تھے، خیریت پُرسی کے بعد باہری چوکھٹ کی طرف نکلتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں پوچھا: آنے والے سہ شنبہ کو کہیں کا کوئی پروگرام تو نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا: جی نہیں۔ فرمایا:

''میرے وطن بھوجپور ''بڑے حافظ جی'' (حافظ ملت کے والد ماجد حافظ محمد نور صاحب علیہ الرحمہ) کا عرس ہے، جس میں آپ کو جانا ہے۔ان لوگوں کے ہمراہ چلے جائیے۔ (اشارہ حافظ ملت کے برادرِ خورد جناب حافظ عبدالرشید صاحب اور شہزادۂ اصغر قاری عبدالقادر جیلانی بھائی کی طرف تھا)

ہم لوگ حضرت کا آخری دیدار کر کے شام ہی کو چل پڑے۔ نو بجے کی ٹرین سے شاہ گنج پہنچے۔ تین بجے شاہ گنج سے مرادآباد کے لیے ٹرین ملی، مرادآباد سے چل کر پانچ بجے بھوجپور پہنچے۔ بھوجپور میں حافظ ملت کی علالت کے بارے میں لوگ بہت پریشان تھے۔ لوگوں نے حالات دریافت کر کر کے ہمیں تھکا دیا۔

سہ شنبہ کی رات میں عشا بعد جلسہ شروع ہوا۔ مدرسہ فاروقیہ کے طلبہ اور علما، نعت خوانی اور تقریر کرتے رہے۔ میں ساڑھے دس بجے وضو کر کے اسٹیج پر پہنچا۔ مجمع نہایت بے کیف محسوس ہوا۔ قمقمے روشن تھے، مگر ان میں بھی ایک تاریکی سی جھلک رہی تھی۔ ساڑھے گیارہ بجے تقریر شروع کی، بمشکل ایک گھنٹہ طبیعت پر جبر کر کے بولتا رہا۔ تقریر کا آخری حصہ صرف حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق تھا۔ مگر اجلاس پر ویسی ہی بےلطفی، اداسی اور بے کیفی چھائی رہی۔ اتنی مضمحل مجلس شاید میں نے کبھی محسوس کی ہو۔ جلسہ ختم ہوا، اس کے بعد علما اور احباب کی نشست میں ڈھائی بجے تک حضرت ہی کا ذکر ہوتا رہا۔ خیال تھا کہ صبح آٹھ بجے والی ٹرین سے مرادآباد روانہ ہوجاؤں گا، مگر جیلانی بھائی اور واصف صاحب نے ۳/ بجے کی ٹرین سے حضرت کی دوائیں اور کچھ دوسرے سامان کے ساتھ روانگی کی اجازت دی۔

۵/ بجے کاشی وشوناتھ ایکسپریس میں مرادآباد سے بمشکل کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ رامپور کے اسٹیشن پر ٹرین رُکی تو حضرت کے برادران اور جیلانی بھائی اسی ڈبے میں داخل ہوئے۔ سب کے چہرے اترے ہوئے، آنکھیں اداس۔ میں نے کہا: جیلانی بھائی! آپ کہاں؟ اور جیلانی بھائی بھری پڑی ٹرین میں مجھ سے چمٹ کر رو پڑے۔ بدر بھائی! ہم یتیم ہوگئے۔ آپ کی روانگی کے فوراً بعد تار ملا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (وقت وصال سہ شنبہ ۲/ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۶ھ، ۳۱/ مئی ۱۹۷۶ء شب ۱۱/ بج کر ۵۰/ منٹ)

اعظم گڑھ پہنچ کر آٹھ بجے نماز جنازہ ہونے کی منادی سنی گئی۔ ہمارا یکہ الجامعۃ الاشرفیہ گیٹ کے قریب پہنچا تو مبارک پور سے حافظ ملت کا جلوسِ جنازہ مدفن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ہر چہار جانب انسانی سروں کا ہجوم تھا۔ جو مبارک پور کے گوہر گرانمایہ کی آخری زیارت کے لیے امڈا چلا آرہا تھا۔ ؎

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

آہ شیخ العلماء!

اشرفیہ اور دنیائے سنیت، ابھی اپنے مربی و مقتدیٰ حضور حافظ ملت کے سانحۂ ارتحال کے غم میں نڈھال تھی جب تک ؎

خبر رسید کہ یک قصہ علم و فضل نماند

یعنی محب الاتقیا، بقیۃ السلف، شیخ العلما حضرت علامہ شاہ محمد غلام جیلانی امجدی شیخ الحدیث دارالعلوم فیض الرسول برائوں شریف، اس دنیا کی بزمِ فانی سے دارالبقا کی طرف کوچ کر گئے۔ اناللہ واناالیہ راجعون۔

دل کو غم والم نے کچھ اس طرح نچوڑا
سینے سے آہ نکلی آنکھوں سے اشک ٹپکے

ماہنامہ اشرفیہ کے گزشتہ شمارہ میں حضرت کے لیے دعا کی درخواست کی گئی تھی۔ رسالہ ابھی پریس کے مراحل سے گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ مجیب الدعوات نے اپنے اس مقبول بندے کو رنج و محن کی اس بستی سے دارالقرار کی بہاروں میں بلا لیا۔ سنا ہے عشاق کو قرب کی منزل تک بڑی ناز برداری سے پہنچایا جاتا ہے۔ قدم قدم پر رحمت ایزدی پیشوائی کرتی ہے، تو پھر کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ:

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیاز مندے

ہندو پاک کی علمی مجالس پر نظر پڑتے ہی ایک حقیقت فلک آشکار محسوس ہوتی ہے کہ فقیہ اعظم حضرت صدرالشریعہ علیہ الرحمہ کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ سے ہر انجمن، انجمن آفتاب اور ہر بزم، بزمِ ماہتاب بنی ہوئی ہے۔ ان کا فیضانِ علم بہت وسیع پیمانے پر گہربار ہے۔ اس کوہِ گراں علم کے سقوط کے وقت کسی نے کہا تھا کہ جانشین بوحنیفہ چلا گیا۔ مگر سیکڑوں ایسے افراد پیدا کر گیا، جن میں کا ہر ایک اپنی جگہ شانِ امجدی کا حامل ہے۔ مگر اب درس گاہوں کے در و بام ان شخصیتوں کو کہاں سے لائیں، جن سے علم وآگہی کی آبرو قائم تھی۔ صدرالشریعہ کی بزمِ دوشیں کا ایک رند اور چلا گیا۔

شیخ العلما اس دور کے قابل قدر شخصیتوں میں سے تھے۔ جب اسلام دشمن فرقوں نے صحیح اسلامی معتقدات کو نشانہ بنا رکھا تھا، آپ ہی کے ہم عصروں نے اپنی علمی و عملی سنجیدگی سے حضاراتِ اسلامیہ کے تحفظ و بقا کی جنگ لڑی۔ شیخ العلما شخصی اعتبار سے علومِ اسلامیہ کے ماہر، مدرسانہ خوبیوں کے بدرجۂ کمال مالک، متبحر عالم، محتاط فقیہ، عمدہ حدیث داں، نکتہ رس فلسفی اور ادبِ عربی کے بے مثل ادیب کے ساتھ ساتھ صوفی باصفا، درویشانہ صفات کے حامل تھے۔ عربی کے محاورات و مقولے نوکِ زباں پہ رہتے۔ علمی مجالس میں اکثر اس کا اظہار ہوتا۔

حضرت شیخ العلما گھوسی کے ایک علمی گھرانے میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی حضرت مولانا صدیق صاحب علیہ الرحمہ مشہور عالم دین گزرے ہیں۔ آپ کا اسم گرامی اشرفیہ کے ابتدائی مؤسسین میں آتا ہے۔ ابتدائی دور میں مبارک پور کی سرزمین پر آپ نے نہایت جانکاہی اور لگن سے جس پودے کی آبیاری فرمائی، وہ آج پوری ملت مسلمہ کے لیے شجر رحمت بنا ہوا ہے۔ آپ حضرت مولانا ہدایت اللہ

صاحب علیہ الرحمہ کے تلامذہ میں تھے۔ یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ علامہ فضل حق خیر آبادی کے خوانِ علم وادراک سے استفادہ کرنے والوں میں حضرت مولانا ہدایت اللہ صاحب کا کیا مقام تھا۔ ایسے گہوارہ میں آنکھیں کھولنے والا بچہ علم و شعور کی نورانیت سے کس طرح بے فیض رہتا۔

تعلیم کے ابتدائی مراحل گھوسی میں طے کیے اور کچھ روز کے لیے والد گرامی کے ساتھ مبارک پور رہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد فقیہ اعظم حجۃ العصر حضرت صدرالشریعہ کی درس گاہ میں منظر اسلام بریلی شریف چلے گئے، جہاں منیۃ المصلی سے اخیر تک کی کتابیں مثلاً جلالین، ہدایہ اخیرین، بیضاوی شریف، رسالہ میر زاہد وغیرہ پڑھیں۔

۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء میں حضرت صدرالشریعہ علیہ الرحمہ جب بریلی سے اجمیر شریف روانہ ہوئے تو آپ بھی جامعہ معینیہ عثمانیہ میں ہمراہ پہنچے۔ اجمیر شریف میں ایک سال رہ کر آپ نے فرنگی محل کے دارالعلم مدرسہ نظامیہ کی طرف رُخ کیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے جوہر قابل دیکھا تو قدر کی نہایت شفقت کا برتاؤ فرمایا۔ مدرسہ سے قیام و طعام کی جملہ سہولتوں کے ساتھ ساتھ ۹؍ نو روپے بطورِ وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہاں آپ کو مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبدالقادر فرنگی محلی، مولانا قطب میاں وغیرہ ماہرین فنونِ اساتذہ سے اکتساب کا بہترین موقع ملا۔ آپ نے ان علما سے تفسیر مدارک، مسلم الثبوت، ملاحسن، ملا جلال، میبذی، شرح عقائد، صدرا، حمداللہ اور عربی ادبیات کی تحصیل کی۔ امتحان میں نمایاں کامیابی پر خوش ہو کر مولانا عبدالباری علیہ الرحمہ نے تکمیل سے پہلے ہی آپ کو مولانا کی سند عطا کر دی۔

۱۳۴۲ھ میں آپ پھر بریلی شریف منظر اسلام میں داخل ہوئے اور مولانا شاہ محمد رحم الٰہی منگلوری اور حجۃ الاسلام مولانا شاہ حامد رضا رحمہما اللہ سے صحاح ستہ کا دورہ کیا۔ حجۃ الاسلام نے جلسۂ عام میں دستار باندھی اور سند سے نوازا۔

تدریسی سلسلہ میں بقول علامہ مفتی شریف الحق صاحب قبلہ شش جہت ہندوستان کے مختلف مدارس آپ کی تدریس سے بہرہ مند ہوئے۔ سب سے پہلے مدرسہ محمدیہ امروہہ کی مسند تدریس سنبھالی۔ اس زمانہ میں آپ سے کسب علم کرنے والوں میں بہترین علمی شخصیتیں ہیں۔ مثلاً آپ کے برادرِ خورد مولانا غلام یزدانی صاحب علیہ الرحمہ، شیخ الحدیث دارالعلوم مظہر السلام بریلی۔ مولانا عبدالمصطفیٰ صاحب اعظمی، شیخ الحدیث منظر حق ٹانڈہ۔ مولانا معین الدین خاں، شیخ الحدیث جامعہ عربیہ سلطان پور۔ حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ، نائب شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور۔ حضرت مولانا غلام آسی صاحب وغیرہ۔

چوں کہ طبیعت میں استغنا حد درجہ تھا، اس لیے اراکین یا متعلقین مدارس سے اگر کوئی خلافِ مزاج برتاؤ دیکھتے، فوراً انتقالِ مکانی فرما لیتے۔ امروہہ کے علاوہ جن مدارس میں آپ کے من حیث المدرس پہنچنے کا علم مجھے ہو سکا ہے، وہ یہ ہیں:

دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور، مدرسہ باقیات الصالحات دیلور مدراس، مدرسہ مسکینیہ دھوراجی، مدرسہ مظہر اسلام بریلی، مدرسہ احسن المدارس قدیم کانپور، مدرسہ خانقاہ مارہرہ شریف اور اخیر میں دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف۔

طبقۂ مدرسین میں زمانۂ دراز تک یہی شہرت رہی کہ آپ ادبِ عربی کے بہترین ماہر ہیں۔ آپ مقاماتِ حریری، دیوانِ حماسہ، متنبی وغیرہ اعلیٰ ترین کتابیں پڑھانے میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ عربی تحریر و تقریر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ آپ کی زبان نہایت شستہ اور فصیح و بلیغ

مادری زبان کی طرح بے تکلف تھی۔ گاہے گاہے عربی اشعار بھی کہتے تھے۔ حضرت صدرالشریعہ علیہ الرحمہ کے وصال پر آپ نے جو مرثیہ لکھا ہے، وہ ادبِ عربی کا بہترین شاہکار ہے۔ اپنی بھتیجیوں کی شادی کے موقع پر:

اتیناکم اتیناکم فحیانا وحیاکم

ولولا الحنطة السمراء لم لیسمن عدراکم

پر ایسی بے نظیر تضمین کی کہ علما جھوم جھوم اٹھے۔ آپ کے ادبِ عربی کی شہرت کا سبب یہ نہیں کہ اور دوسرے فنون آپ کی دسترس سے باہر تھے، بلکہ ادبِ عربی میں امتیازی شان کے ساتھ ساتھ حدیث، تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ وغیرہ میں آپ کو یکساں دست گاہ تھی۔ آپ کی پچاس سالہ تدریسی خدمات اس بات کی روشن برہان ہیں کہ آپ ہر فن کو ماہر فن کی طرح پڑھانے پر قادر تھے۔ اشرفیہ کے قیام کے زمانے میں جب درجاتِ عالیہ کا نصاب جاری ہوا تو درجہ عالم فاضل کی جملہ کتابیں جن میں منطق و فلسفہ کی اونچی کتابیں بھی داخل ہیں، اس طرح پڑھائیں کہ آپ کے زمانے میں نتائج عموماً سو فی صد آئے۔ بریلی شریف قیام کے زمانے میں قاضی مبارک کا درس دیتے تو معلوم ہوتا تھا کہ آپ شیخ المعقولات ہیں اور برائوں شریف میں آنے کے بعد جب دورۂ حدیث پڑھانا شروع کیا تو یہ ثابت کر دیا کہ آپ ایک اعلیٰ درجہ کے محدث بھی ہیں اور فقیہ بھی۔ آپ کا حافظہ نہایت قوی، ذہن رسا، طبیعت ذکی تھی۔ مطالعہ کا شوق موروثی تھا، اس لیے جملہ علوم و فنون پر متبحرانہ عبور رکھتے تھے۔ مشکل سے مشکل مسائل کو اتنی آسانی سے طلبہ کو سمجھا دیتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی اور اگر کبھی موڈ میں ہوتے تو لطائف و ظرائف کی چاشنی سے مجلس تدریس کو لالہ زار بنا دیتے۔ بات میں بات پیدا کرنا، ایک کلام کی مختلف وجوہ پر فوراً ذہن دوڑا لینا، آپ کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ حاضر جوابی ایسی تھی کہ بعض دفعہ اجلہ علمائے کرام انگشت بدنداں رہ جاتے۔ کانپور کے زمانۂ قیام تک خوب تقریریں کرتے تھے۔ علمی مضامین، مصلحانہ انداز، مزاح کی چاشنی، لطائف و ظرائف کی آمیزش، آپ کی تقریر میں سبھی کچھ ہوتا۔ تھے تو بہت ہی نحیف البدن، دُبلے پتلے، مگر آواز کافی بلند اور جاندار تھی۔ بعد میں تقریر کرنا ترک کر دیا تھا، مگر پھر بھی جب لوگوں کے اصرار یا تقاضے پر تقریر کرنے کھڑے ہو جاتے تو آپ پر کسی کہنہ مشق خطیب کا دھوکا ہوتا۔

تقریر کے ساتھ ساتھ تحریر سے بھی لگائو تھا، جس کے شاہد وہ مضامین ہیں، جو وقتاً فوقتاً فیض الرسول اور دیگر ماہناموں میں چھپتے رہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں۔ کتابوں کے وہ نوٹس، جو دورانِ درس آپ طلبا کو لکھواتے تھے، وہ آپ کی علمی دسترس کا کچھ مظہر ہیں۔

حضرت شیخ العلما سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ امروہہ سے بیعت تھے۔ طلب فیض کے لیے اور متعدّد بزرگوں کے دامن سے بھی وابستہ رہے۔ حضرت صدرالشریعہ، حضرت مولانا سید محمد میاں قبلہ کچھوچھوی، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مارہروی، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب بھینسوڑی سے بھی اکتسابِ فیض کیا۔ سادہ مزاجی، درویش خصلتی کا یقین آپ کو ایک نگاہ دیکھنے والے پر مرتب ہوتا تھا۔ یقینا آپ سلف صالحین کا نمونہ اور علمائے متقدمین کی نشانی تھے۔ رب تعالیٰ آپ کی خدماتِ جلیلہ کے طفیل بہتر جزا عطا فرمائے۔

شیخ العلما ہماری بزم سونی کر گئے۔ ابنائے گرامی کی دل دوز آہیں، اربابِ تعلق اور اہل مودت کی بے قرار سسکیاں لاکھ پکاریں، مگر مسافر اپنی منزل سے ہم کنار ہو چکا۔ قدس سرہ ورحمہ اللہ تعالیٰ۔

نہ جانے کون خوش قسمت غمِ دوراں سے بچ نکلا
درِ زنداں پہ اِک ٹوٹی ہوئی زنجیر دیکھی ہے

فقیر نور محمد قادری

اسم گرامی: فقیر نور محمد سروری قادری بن حاجی گل محمد۔
پیدائش: ۱۳۰۳ھ بمقام کلاچی ڈیرہ اسماعیل خاں۔ بلحاظِ نسل آپ گنڈا پوری پٹھان تھے، جن کا سلسلہ بندہ نواز گیسودراز سے ملتا ہے۔
پیر و مرشد: حضرت صالح محمد صاحب، سجادہ نشین دربارِ باہیہ۔

آپ کے والد حاجی گل محمد عبادت گزار، نمازِ تہجد، صلاۃ التسبیح ہر شب پڑھنے کے عادی تھے۔ ہر آٹھویں روز قرآن مجید ختم کرتے۔ حج کے لیے مکہ معظمہ گئے تو ہر صبح نماز کے بعد دوپہر تک تلاوت کرتے اور دلائل الخیرات شریف کھڑے ہوکر پڑھتے۔ وہ ہر شب ۷۵/ ہزار دفعہ آیت کریمہ کا ورد فرماتے تھے، جس کا مؤکل فقیر صاحب نے گھوڑے کی شکل میں دیکھا۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
(اقبال)

ایک بار مجھ سے کسی نے باطن میں سوال کیا کہ: تمہارا شجرۂ نسب کیا ہے؟ میں نے جواب دیا:
میرے والد ماجد سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ، میرے دادا حضرت پیر دستگیر محبوبِ سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) قدس سرہ ہیں۔ اور میرے پردادا حضرت سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ واصحابہ وسلم ہیں اور میں ان تینوں پاک شخصیتوں کی نوری، حضوری، لطفی اولاد ہوں۔ (حیات سروری)
ایک مرتبہ مجھے باطن میں یہ ندا آئی:

وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًاO

ترجمہ:۔ تجھ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل و کرم ہے۔
ایک مرتبہ میں نے رات کو واقع میں دیکھا کہ آسمان پر نوری جلی حروف میں یہ عبارت خوشخط عربی تحریر میں لکھی ہوئی ہے:

''نور محمد کان حفیظا مسلما وما کان حسن المشرکین''۔

اس واقعہ کے دیکھنے سے مجھے اپنے حقیقی موحد اور دین حنیف کے پیرو ہونے کا پورا یقین اور اطمینان ہوگیا۔ (حیات سروری)

فقیر نور محمد صاحب کو ان کے والد صاحب کلاچی کے ایک بزرگ حاجی مدہ صاحب کے پاس لے جایا کرتے تھے۔ انھوں نے فقیر صاحب کے صاحب باطن ہونے کی بشارت دی تھی۔ انھوں نے ایک بار خواب دیکھا کہ میں بحری سفر کر رہا ہوں، اچانک جہاز میں ایک پنگھوڑے کے

اندر سے کسی بچے کی آواز آئی کہ جہاز روکو۔ میں نے دیکھا کہ پنگھوڑے میں نور محمد ہے۔ اس کے بعد جہاز روک دیا گیا اور آپ کے والد پانی کو طے کر کے جہاز تک پہنچے اور جہاز میں سوار ہوگئے اور جہاز چل پڑا۔ حاجی گل محمد کو جناب مدہ صاحب نے اس کا یہ مطلب بتایا کہ آپ کا بیٹا اولیاء اللہ میں سے ہوگا اور اس کے ذریعہ آپ زمرۂ اولیا میں شامل ہوں گے۔ (حیات سروری، ص۱۶۔۱۷)

بچپن میں فقیر نور محمد صاحب کے گھٹنے میں ایک دفعہ کہیں چوٹ لگ گئی تو آپ کے والد نے فقیر مدہ صاحب کو خواب میں دیکھا، جو پوچھ رہے تھے کہ نور محمد کے گھٹنے کا کیا حال ہے؟ جب کہ ان کے انتقال کو عرصہ گزر چکا تھا۔ (حیاتِ سروری، ص۱۸)

تعلیم:

آپ نے ابتدائی تعلیم کلاچی میں پائی، عربی، فارسی والد صاحب سے سیکھی، وہیں مڈل کا امتحان دے کر صوبہ بھر میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔ میٹرک کا امتحان ڈیرہ اسماعیل خاں۔ اس کے بعد آپ نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا، مگر وہاں سے آپ کے فقر کا دور شروع ہوگیا۔ آپ اس سے پہلے ہی اپنی دونوں آنکھوں کے درمیان توجہ کر کے مراقبہ کیا کرتے تھے اور اس حال میں کبھی کبھی بے ہوش بھی ہوجاتے تھے۔ لاہور اسلامیہ کالج کے زمانہ میں آپ نے فقر کی جانب کشش زیادہ محسوس کی، مگر دل میں تعلیم کا شوق بھی تھا۔ چناں چہ ایک روز اس کشمکش کے سلسلہ میں انھوں نے فقیر محمد اسلم کی خانقاہ میں جاکر دو رکعت نماز بہ نیت استخارہ پڑھی اور لیٹ کر سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ، دروازۂ مزار پر کھڑے ہیں۔ اسی دوران آپ نے اپنے والد کو بھی دیکھا، جنھوں نے کہا کہ بیٹا سلطان العارفین فرماتے ہیں کہ کالج نہ جاؤ۔ انگریزی تعلیم تم کو راس نہیں آئے گی۔ (ص۲۲۔۲۳)

اسلامیہ کالج میں آپ دو سال رہے۔ ان ایام میں آپ پر گریہ کی کیفیت طاری رہتی اور آپ بستر پر پڑے پڑے روتے رہتے۔ آپ نے اپنی اس حالت کو چھپانے کے لیے کمرے کی کھڑکی کے شیشوں پر حنائی رنگ کے کاغذ چپکا دیے تھے۔

باطنی کشش نے آپ کو کالج سے اس طرح نکالا کہ آپ ایک بار سخت بیمار ہوئے، لاغری لاحق تھی، اسی دوران آپ نے دل میں ٹھان لی کہ شفایاب ہوا تو کالج چھوڑ دوں گا۔ مرضئ مولا کہ دوسرے ہی دن تندرست ہوگئے۔ چنانچہ کتابیں اور سامان کالج میں چھوڑ کر آپ نے لاہور کو خیرباد کہا اور شور کورٹ کے راستے سلطان باہو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار پر جا پہنچے اور فقیروں کے ساتھ رہنے لگے۔ گھر والوں اور اہل تعلق آپ کی اس حالت پر افسوس کرتے۔

ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں ہی آپ کی شادی ہوچکی تھی۔ اسلامیہ کالج کے زمانہ میں آپ کے گھر لڑکی پیدا ہوئی۔ بچی کو دو سال کی چھوڑ کر، معمولی سی بیماری میں اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی والدہ نے کچھ روز بعد اپنی ضد سے آپ کی دوسری شادی کرادی کہ اس طرح شاید آپ کی دل بستگی ہو اور آپ تنہائی پسندی، صحرانوردی اور خاموشی کو ترک کریں، مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ والدین کے اصرار پر چند ماہ گورنمنٹ کالج کلاچی میں ملازمت بھی کی، پھر یہ کہہ کر کہ میں انگریزوں کی نوکری نہیں کر سکتا، وہ بھی چھوڑ دی۔ اکثر اوقات دربارِ سلطان باہو میں رہتے۔ وہیں اہلیہ کو بھی ساتھ لے گئے۔ کلاچی سے اراضی کی آمدنی کا کچھ حصہ پہنچ جاتا، اسی میں عسرت سے گزر ہوتا۔

اس زمانے میں حضرت سلطان العارفین علیہ الرحمہ کی قلمی کتابوں کی تلاش، ان کا مطالعہ اور ان کی نقل آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس عرصہ میں آپ نے حضرت کی تیس چالیس کتابیں تلاش کرلیں۔ انھیں کتابوں کو آپ نے اپنا ''پیر صحبت'' بنایا۔ (ص۳۱)

آپ کے صاحبزادے فقیر عبدالحمید سروری رقم طراز ہیں:

''حضرت سلطان العارفین کی کتابوں کی حیثیت اور اہمیت سے دنیا کو متعارف کرانے اور ان کے فقر سے طالبانِ راہ حق کو روشناس اور آگاہ کرنے کا شرف اور سعادت صرف آپ کے حصے میں آئی تھی''۔ (ص ۳۲)

۱۹۱۲ء میں آپ نے بغداد شریف کا سفر کیا۔ آپ کے والد صاحب کا یہ تیسرا سفر بغداد شریف تھا۔ آپ نے ان دنوں اپنے بیوی بچوں کو سلطان باہو کے آستانے پر متوکلاً علی اللہ چھوڑ دیا اور خود ساٹھ ستر زائرین کے ہمراہ اولیانِ ملتان و دہلی کی زیارت کرتے ہوئے بمبئی سے جدہ ہوکر عراق پہنچے۔ قیامِ بغداد کے دوران آپ اپنے اخراجات کے پیسے دربارِ شریعت کے باہر بیٹھے ہوئے نابینا مسکین کو دے دیتے اور خود بھوکے رہتے۔ اس طرح سرکارِ غوثیت مآب کی توجہات کو اپنی جانب متوجہ کرتے اور لازوال انعاماتِ روحانی سے مالا مال ہوتے۔ اس سفر میں آپ نے دربارِ غوثیت سے فقر کی دولت حاصل کی۔ اس سفر میں باب الشیخ پر ۱۲/ سال سے ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے ایک مجذوب عبدالرحمن نے اپنی جگہ سے اٹھ کر فقیر صاحب پر ایک بھرپور نظر ڈالی، جس سے آپ کے جسم پر خوف کی کیفیت طاری ہوئی۔

مزارِ غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حاضری کے بعد رسالہ روحی شریف پڑھنے سے اور حضرت سلطان باہو و پیرانِ پیر کی توجہ سے یہ کیفیت زائل ہوئی۔ وہ مجذوب فقیر اپنے رنگ میں رنگ کر مجذوب بنانا چاہتا تھا۔ (ص ۴۰)

جس زمانے میں آپ سلطان باہو کی کتابوں کو تلاش کر کے مرتب کیا کرتے تھے، پنجاب کے ایک قصبہ میں ایک بزرگ کے روضہ پر اس نیت سے معتکف ہوکر دعا پڑھی کہ ان بزرگ کی روحانیت کے توسط سے شاید حضرت سلطان باہو کی کسی اور کتاب کا سراغ ملے۔ آپ دعا میں مشغول تھے کہ ایک اجنبی شخص آیا اور آپ کے پاس کپڑوں میں لپٹی ہوئی ایک کتاب رکھ گیا۔ آپ نے کھول کر دیکھا تو اس میں حضرت کی نایاب کتاب ''محکم الفقراء'' تھی، جو کشمیری موٹے کاغذ پر حضرت سلطان باہو کے دستخط سے مرصع تھی۔ (ص ۵۲)

آپ نے حضرت سلطان باہو کی چالیس کتابوں کو جمع کیا۔ آخری کتاب ''عقل بیدار'' شائع کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ پروانۂ اجل آپہنچا۔

فقیر نور محمد صاحب نہایت خوشخط تھے۔ دربارِ باہو پر منشی غلام حیدر صاحب سے کبھی کبھی خوش نویسی کا مقابلہ بھی ہوتا تھاآپ کو حضرت سلطان العارفین حضرت باہو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے غایت درجہ محبت تھی۔ آپ نے عالم رؤیا میں اور چشم باطن سے متعدّد بار سلطان باہو کی زیارت اور فیض رسانی کے واقعات اپنے قلم سے تحریر کیے ہیں، جو اہل روحانیت سے بعید نہیں۔ حضرت سلطان باہو کی نایاب کتابیں جمع کرنے اور انھیں ترتیب و تزئین اور اشاعت کے کام میں آپ نے جو نمایاں اور جاں گسل کام سرانجام دیا ہے، وہ آپ ہی کا حق ہے۔ اور کتابوں کی یہی جمع و ترتیب اور انہماکِ مطالعہ دراصل آپ کی ریاضت ثابت ہوئی۔ طریقت و معرفت کے جو ابواب آپ دن میں مطالعہ کرتے اور لکھتے، حضرت سلطان باہو کی روحانی توجہ سے شب میں آپ وہ مراحل و مدارج طے کرلیتے۔ فقیر عبدالمجدی سروری نے آپ پر سلطان باہو کے فیضان کا تذکرہ خوب کیا ہے۔

صاحبزادہ محترم ایک بار آپ نے کسی کتاب میں حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ کرامت پڑھی کہ آپ گھوڑے پر سوار ہوتے وقت ایک رکاب میں پاؤں رکھنے کے بعد دوسرے رکاب میں پاؤں رکھنے تک ایک ختم قرآن کرلیا کرتے تھے۔ فقیر صاحب کو اس

سے بڑا اتر دد ہوا۔ اسی رات حضرت سلطان العارفین کو خواب میں دیکھا، حضرت مزار سے گھوڑے پر نمودار ہوئے اور فقیر صاحب پر توجہ کی، آپ پر وجد طاری ہوا اور بال بال تلاوت میں مشغول ہوگیا۔ اس طرح آپ نے سمجھ لیا کہ لمحہ بھر میں کئی بار قرآن مجید ختم ہوگیا۔ (ص ۹۱)

روحانی کشش:

فقیر صاحب ایک بار میانوال میں تھے۔ قیام گاہ کے قریب ہی ایک بزرگ کا مزار تھا۔ رات ہوئی تو آپ نے سوچا کہ کچھ دیر آرام کر کے مزار پر حاضری دوں گا اور دعوت پڑھوں گا، مگر نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ سو گئے۔ کافی رات گئے تیز ہوا چلی او فقیر صاحب کی ٹوپی اُڑ کر میدان میں کہیں غائب ہوگئی۔ مہمان و میزبان دونوں کی تلاش بسیار کے باوجود ٹوپی کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ مایوس ہوکر فقیر صاحب نے سوچا آخر نیند تو اچٹ ہی چکی ہے، بزرگ کے مزار پر چلوں۔ وہاں گئے تو دیکھا کہ ٹوپی مزار کے سرہانے رکھی ہوئی ہے۔ آپ سمجھ گئے کہ یہ تمام اس روحانی اہل قبر کی کشش تھی، ورنہ جائے قیام سے ٹوپی کا وہاں اتفاقاً پہنچنا ناممکن تھا۔

فقیر صاحب کہا کرتے تھے کہ روحانی اہل قبور کی یہ زبردست خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اہل فقر، زندہ دل ان کے پاس آکر تلاوتِ کلامِ پاک کرے، کیوں کہ اس سے انھیں فائدہ پہنچتا ہے۔ قرآن پاک کا نور ان کی غذائے روحانی ہے۔ (ص ۹۳)

حضرت فقیر نور محمد صاحب پر سلطان العارفین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی توجہاتِ خاص کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے۔ متعدّد ایسے واقعات پیش آئے، جب روحانی طور پر سلطان العارفین نے دستگیری فرمائی۔ سانپ نے کاٹا تو آپ نے خواب میں ناک، منہ اور کانوں سے خون جاری ہوتے دیکھا۔ اسی وقت کسی نے ایک گلاس دوا پلائی اور زہر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسی طرح ایک بار رمضان کا چاند دیکھ کر کلاچی سے دور بے سروسامانی میں روزہ رکھا، پیدل دھوپ میں کلاچی کے لیے روانہ ہوئے، شدتِ پیاس کا غلبہ ہوا، کہیں لیٹے کہ کسی طرح گرمی کا اثر کم ہو، مگر کامیابی نہ ملی۔ کچھ غنودگی ہوئی تو کسی نے شربت کا گلاس پیش کیا، جسے آپ نے پیا، جس کا یہ اثر ہوا کہ افطار کے وقت بھی پیاس نہیں لگی۔ (ص ۹۵)

ایک بار کان میں شدید درد تھا۔ اس کا علاج بھی غیبی اور روحانی طور پر ہوا۔ وجع المفاصل کا مرض بھی اسی طرح زائل ہوا۔ (ص ۹۶)
آپ تہجد کے پابند تھے اور کبھی تھکن یا سفر کے دوران اگر نیند کا غلبہ ہوتا تو موکلین آپ کو بیدار کر دیا کرتے تھے۔ (ص ۱۰۹)

سفر حیدرآباد دکن:

فقیر صاحب نے کتب خانہ آصفیہ کے نوادرات دیکھنے کے شوق میں حیدرآباد دکن کا سفر کیا تھا۔ پہلا سفر ۱۹۴۱ء میں اور دوسرا ۱۹۴۲ء میں در پیش ہوا۔ کتاب نور الہدیٰ اور عرفانِ اول کی طباعت کے لیے خزانہ آصفیہ نے تعاون کیا تھا۔ آخری سفر میں مرزا یار جنگ بہادر نے فقیر صاحب کے اعزاز میں عشائیہ بھی دیا تھا، جس میں تمام اکابرین ریاست مدعو تھے۔ جس نشست میں فقیر صاحب نے مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود، مراتب خلفائے راشدین اور مشغولیت فی التصوف پر نہایت فاضلانہ باتیں فرمائی تھیں، جو حیاتِ سروری میں صفحہ ۱۲۰ر سے صفحہ ۱۲۶ر تک درج ہیں۔

آپ کو اجنہ سے بھی سابقہ پڑا۔ جنھیں آپ نے اپنی روحانی طاقت سے زیر کیا۔ آپ کو سورۂ مزمل کی دعوت اور دیگر وظائف و معمولات سے بے پناہ روحانی فیض ملا اور کشف قبور وغیرہ حاصل ہوا۔ آپ جس پر توجہ کرتے، اس پر اثر ظاہر ہوتا۔

ایک بار ایک سرائے میں رات کو رُکنا پڑا۔ آپ نے تہجد کی نماز شروع کی، اتفاقاً ایک ہندو کا سر آپ کے سجدہ گاہ کے سامنے تھا۔ آپ کی نظر نماز کے بعد چند بار اس پر پڑی، اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ نیند ہی نیند میں کلمہ طیبہ پڑھنے لگا۔ اپنی آواز خود سن کر اٹھا اور سرائے سے نکل بھاگا۔ (حیاتِ سروری، ص٦٩)

اس زمانے میں آپ مزارِ مبارک سے ذرا دور ایک چھوٹی سی مسجد میں بیٹھ کر حضرت سلطان باہو کی کتابیں لکھا کرتے تھے۔ اکثر اس جگہ سے (ایک بزرگ) حضرت نور احمد صاحب کا گزر ہوتا تھا اور آپ اکثر گھوڑے پر سوار ہوا کرتے تھے۔ فقیر (نور محمد) صاحب یوں تو ہر روز باطن میں حضرت سلطان باہو کی نظر کیمیا اثر سے فیض یاب ہوتے تھے۔ مگر ایک رات آپ پر حضرت سلطان العارفین کی بہت عظیم الشان مہربانی ہوئی اور اس کی وجہ سے بہت بلند اور ارفع مقامات تک آپ کی رسائی ہوئی۔ دوسرے دن جب آپ حسب معمول اس مقام پر کتابیں لکھنے بیٹھ گئے، تو حسب معمول حضرت نور احمد صاحب بھی گھوڑے پر سوار اس طرف آنکلے، مگر اس دن بجائے گزر جانے کے سیدھے فقیر صاحب کے نزدیک آکر گھوڑا کھڑا کر دیا۔ فقیر صاحب تعظیماً کھڑے ہوگئے اور سوچنے لگے کہ آج نہ جانے کیا بات ہے۔ حضرت صاحب تو روز اس طرف سے آتے اور گزر جاتے ہیں، مگر آج یہ خلافِ معمول کیا ایسی بات پیش آگئی ہے۔ اس پر حضرت نور احمد صاحب نے بلند آواز سے فرمایا: نور محمد! رات کو سلطان باہو نے تم پر جو بے انتہا مہربانی فرمائی ہے، اس کا علم مجھ کو بھی ہے۔ یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے واپس چلے گئے۔ (ص٤٩)

فقیر صاحب نے سلطان باہو کی کتابیں تلاش کرنے کے سلسلہ میں دور دراز کے سفر بھی کیے۔ سلطان العارفین کی ایک کتاب ''اسرارِ قادری'' کے بارے میں آپ کو معلوم ہوا کہ حیدرآباد دکن کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے، تو وہاں تشریف لے گئے۔ آپ نے اس طرح سلطان العارفین کی تقریباً ٤٠ ر کتابیں جمع کیں۔ صاحبزادہ عبدالحمید سروری لکھتے ہیں:

''آپ کو ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ اس کے علاوہ بھی حضور کی کوئی کتاب ہے یا نہیں؟ چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک بار آپ نے سلطان العارفین کے روحانی دربار میں شرف یابی حاصل کی۔ حضور کے پاس دو نورانی چہروں والے صاحبزادے تشریف فرما تھے۔ فقیر صاحب نے دریافت کیا کہ یا حضرت! آپ نے ان کتابوں کے علاوہ بھی کوئی کتاب لکھ چھوڑی ہے یا نہیں؟ انھوں نے فرمایا: ان کتابوں کے علاوہ ایک کتاب میں لکھ رہا تھا اور ابھی وہ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ پیک اجل پہنچ گیا۔ فقیر صاحب نے مزید کہا: حضور! میں نے آپ کی کتابیں شائع کی ہیں۔ فرمایا: مجھے اس کا علم ہے اور میں اس سے بہت خوش ہوں۔ پھر فقیر صاحب نے کہا: میں آپ کی کتاب ''عقل بیدار شریف'' شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ فرمایا: بہت نیک ارادہ ہے۔ فقیر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے، میں عقل بیدار شائع نہ کر سکوں گا اور میرا بھی وصال ہوجائے اور یہی پیش آیا''۔ (ص ٥٣۔٥٤)

فقیر صاحب کو ان کے دور کے بعض پیروں سے مناقشہ بھی پیش آیا، جسے آپ نے اپنی بصیرت سے کام لیتے ہوئے خوش اسلوبی میں تبدیل کر دیا۔

فوائد:

قادری سلسلہ کے فقرا اور اہل سلوک کی باطنی قوت کو کوئی سلب نہیں کر سکتا۔ ان کی روحانی قوت ہمیشہ ترقی پذیر رہتی ہے۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود:

وحدۃ الوجود کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی دن کے وقت آسمان پر سورج کی روشنی محیط پاتا ہے اور اس روشنی میں ستاروں اور سیاروں کو معدوم سمجھتا ہے۔ حالاں کہ وہ بھی موجود تو ہوتے ہیں۔

مگر وحدۃ الشہود کے نظریہ کی مثال ایسی ہے: ایک آدمی دن کے وقت سورج کو بھی دیکھتا ہے اور نگاہ کی تیزی کے باعث ستاروں اور سیاروں کو بھی ساتھ ساتھ دیکھتا ہے۔ ثانی الذکر اول الذکر کی بہ نسبت زیادہ حقیقت بیں اور تیز نظر واقع ہوا ہے۔

روزِ ازل ارواح پر اللہ تعالیٰ کی تجلی پڑی تو ان ارواح کی نظریں تجلی سے خیرہ ہوگئیں۔ انھوں نے دنیا میں آکر بغیر نفی کے اللہ تعالیٰ کو ثابت کیا اور ہر شئے میں اس کا پرتو دیکھ کر مختلف مظاہر قدرت کو ذاتِ واجب الوجود تصور کیا۔ یہ مشرب ہمہ اوست۔ اور وحدۃ الوجود، لغزشوں اور رجعتوں سے پُر ہے۔ مشرب ہمہ اوست اگر توحیدی اور حالی ہے تو اس کے جواز کی صورت ہو سکتی ہے۔ عوام اہل تقلید اس میں لغزش کھاتے ہیں اور ہر شئے کو مظہر ذات سمجھ کر پوجنے بھی لگتے ہیں۔

مثلاً حسن پرستی، بُت پرستی، قبر پرستی، سورج پرستی وغیرہ کا جواز یہاں سے نکالتے ہیں۔

منصور کا انا الحق اگرچہ حالی تھا، تب بھی شریعت نے اس پر مواخذہ کر کے انھیں سولی پر چڑھایا۔ مگر فرعون کا انا ربکم الاعلیٰ دجالی تھا، کیوں کہ نفسانی لوگوں کا کبر و انانیت نفس سے ادا ہوتی ہے اور اہل اللہ لوگوں کا انا اور ذات کبریا سے ہوتا ہے۔ اس مشرب میں جو لوگ صاحب توحید ہیں، حالی ہیں۔ وہ معذورین مجذوبین کہلاتے ہیں۔ اور جو صاحب تقلید، صاحب قیل و قال ہیں، وہ ضالین۔

اس کے برعکس ہمہ اوست اور وحدۃ الشہود کا عقیدہ رکھنے والے زیادہ بلند حوصلہ، قوی استعداد اور دور بین واقع ہوئے ہیں۔ ان کی ارواح اور قلوب پر روزِ ازل میں الست کی تجلی ہوئی تو دنیا میں بھی ان لوگوں نے نورِ حق کو قیامِ ربوبیت میں اور اپنے وجود کو قیامِ عبدیت میں الگ الگ دیکھا۔ انھوں نے دنیا میں آکر دل و جان سے اس کی ربوبیت کا اظہار نہ کیا اور اپنی عبدیت کا ظاہری و باطنی اور عملی و علمی طور پر اقرار کیا۔ ان لوگوں نے اپنے حادث وجود میں اس کے قدیم رنگ سے اس کی معرفت اور شناخت کا فائدہ اٹھایا اور اسی شمع جمای پر پروانہ وار جل کر اپنے آپ کو اس پر مٹایا۔ اور اپنے تمام غیر مامور مطلوبوں اور نفسانی مقصدوں اور فانی معبودوں کی نفی کر کے اس کی ذات واجب الوجود کو ثابت کیا۔ اور اپنے آپ کو اس کی ذات حی و قیوم میں فنا کر کے اس کے وصل و مشاہدہ سے جامِ بقا پیا۔ یہ فرقہ محبوبین ہمہ ازوست اور وحدۃ الشہود کا ہے۔ یہی نظریہ اہل سنت اور اہل حق کا ہے، جو سمجھتے ہیں کہ سب اسی سے اور وہ سب کا خالق و مالک ہے۔ لیکن اس کی ذات مخلوق کی گرد و غبار سے پاک و منزہ ہے۔ قرآن میں ہے: ''وَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ''۔ (حیاتِ سروری، ص ۱۲۱۔۱۲۴)

فقیر صاحب کے ذریعہ تین لاکھ انسانوں کو فیض باطنی نصیب ہوا۔ (ص ۱۹۷)

انتقال: ۲۶؍ ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ / ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو لائلپور میں انتقال ہوا۔

ارشد وصالِ شیخ پر ہاتف نے دی ندا
کہ ”آفتاب قادری گیتی میں چھپ گیا“

۸۰ ۱۳ھ

فرمودات:

☆ ...... نفسانی شہوانی خواہشات کا غلبہ ہو تو اسم اللہ ذات ناف پر مرقوم کرنا چاہیے۔

☆ ...... دنیاوی حرص کے لیے دل پر اسم محمد کا تصور جمانا چاہیے۔

☆ ...... چشم بصیرت کھولنے کے لیے اسم اللہ ماتھے پر تصور کرے۔

☆ ...... ناف نفس کا، سینہ قلب کا اور ماتھا روح کا مقام ہے۔

☆ ...... تصور کرتے وقت پاس انفاس ساتھ ساتھ کرنا چاہیے۔ یعنی سانس اندر لیتے وقت اللہ اور باہر نکالتے وقت ”ھُ“ دل سے ادا کیا جائے۔ یا اندر ”لا الہ“ اور باہر ”الا اللہ“ خیال میں ہو۔

☆ ...... پاس انفاس اور ہر دیگر اذکار بغیر وضو بھی جائز ہیں۔

☆ ...... اسم اللہ ذات کا تصور کمال کو پہنچتا ہے تو اسم ذات کے ہر حرف سے الگ مقامات اور منازل طے ہوتے ہیں۔ مثلاً ”ل“ سے تصرف کی منزل ”ہ“ سے مراقبہ کی۔ اسی طرح الف سے الگ منزل۔

☆ ...... اللہ تعالیٰ کے وصال کے لیے سب سے اعلیٰ عمل شیخ کی خوش نودی ہے۔

☆ ...... سخت دل والا تصور کے وقت دل کو سیاہ سخت پہاڑ تصور کرے اور خود کو کلیم اللہ۔ اور سوچے کہ اس کی ضرب سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح مسلسل کرنے سے دل نرم ہو گا۔

☆ ...... توجہ کی مثال کوہِ طور پر پڑنے والی تجلی کی ہے۔

☆ ...... مبتدیوں کو مجذوبوں سے بہت بچنا چاہیے۔ وہ ڈاکوؤں کی طرح پونجی اُڑا لیتے ہیں۔

ہماری دوسری اردو کتابیں

بہار تحریر (اب تک چودہ حصے)۔ عبد مصطفیٰ آفیشل	اللہ تعالیٰ کو اوپر والا یا اللہ میاں کہنا کیسا؟۔ عبد مصطفیٰ
اذان بلال اور سورج کا نکلنا۔ عبد مصطفیٰ	عشق مجازی (منتخب مضامین کا مجموعہ)۔ عبد مصطفیٰ آفیشل
گانا بجانا بند کرو، تم مسلمان ہو!۔ عبد مصطفیٰ	شب معراج غوث پاک۔ عبد مصطفیٰ
شب معراج نعلین عرش پر۔ عبد مصطفیٰ	حضرت اویس قرنی کا ایک واقعہ۔ عبد مصطفیٰ
ڈاکٹر طاہر اور وقار ملت۔ عبد مصطفیٰ	مقرر کیسا ہو؟۔ عبد مصطفیٰ